

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سنسنی ڈائجسٹ

ماہنامہ

اگست 2012



نگران اعلیٰ

معراج رسول



مسافر

نئی سنسنی خیز داستان کی
چھٹی قسط اندر کے صفا پیر

154

محفل شعرون

قارئین

آپ کے ہاتھوں ہی ایک نغمہ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

174

مسافر

ناصر ملک

گل دگلزار سے راہ پر حرات تک ایک
مسافر بے نوا کی روداد حیات

157

ویلٹاپ کے خوشی

نسیم اقبال

گلنماحون ہر موسم کا حصار
اور مینارِ احساسات کا اظہار

227

حضرت سلیمان علیہ السلام

رضوانہ ساجد

ایک عظیم بادشاہ اور عظیم
پیغمبر حضرت سلیمان کی روداد حیات

217

امانت

بابر نعیم

سجاد کے روپ میں
چند قسم گروں کا قصہ

239

وارحہ

ثمر عباس

پھونکنے کی کڑواہٹ رکھنے والے
ایک شاعر محرم کی عیسیٰ

237

چھوٹا بخشتی

نجمہ شکور

حبیبی کرنی ویسی
بھرنی کی کھلی تفسیر

000

کے کفر و کفر

ادارہ

دنیا بھرے اصرار اور ہرے لطیفے چمکے اقتباسات
مسکرائیں اور قہقہے سب کو چہرے کیلے

248

پانچواں آدمی

ایچ اقبال

طبقاتی نظا کی کشمکش، بکھرتی سچوں کا
انتشار اور محبت کے مہربان لحات کا احوال

11

انشائیہ

جون ایلیا

غلام سے آزادی تک کی ان دیکھی
زنجیروں کا قصہ یادگار لحات کا عکس

20

فیصلہ فقیرانہ

ڈاکٹر ساجد امجد

ماضی کا آئینہ با اختیار اور با اختیار انسانوں
کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

12

آپ کے خط

مدیر اعلیٰ

سپنس کی مجلس اور ت قارئین کی تلخ و
شیرین باتیں، گلے شکوے اور پر خلوص مشورے

63

آدم جگر لکڑ بھگ

نجمہ مودی

نشت کا اثر شادی کے مابین کھیلے
جبانے والا لکڑ بھگ

49

ہندی دنیا

کاشف زبیر

پر خطر راستوں پر شتمل موت کے
جورے میں زندگی کی جولانی

99

قصر حسنہ

ایم اے راحت

زرخیز زمین کے ہاتھوں بٹا ہونے
والے ایک بے وقوف انسان کا احوال

68

پکشلوں

انوار صدیقی

اسرار اور تحیر کے پردے میں
لپٹا ایک منفرد و طویل سلسلہ

141

جنت

تنویر ریاض

سنی جنت کی دنیا
میں غربت کا ایک دلچسپ انداز

116

پڑھنا

ملک صفدر حیات

گاؤں کی حنا موش فصفا
میں بہتے لہو کی چٹخ و پکار

آزادی

وقت نے بہت سے دشمنوں کو دوست بنایا ہے اور بہت سے دوستوں کو دشمن۔ سیاسی اور اجتماعی حکمت عملی کے تقاضے حالات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ سیاسی اور اجتماعی حکمت عملی تو کیا، خود کائنات ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ یونان کے عظیم ترین فلسفی ہرقلیطاس نے کہا ہے کہ آپ ایک دریا میں دوبار پاؤں نہیں ڈال سکتے۔ ہرقلیطاس نے جو بات کہی ہے وہ اپنی جگہ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ آپ دریا میں ایک بار بھی پاؤں نہیں ڈال سکتے اس لیے کہ آپ جس لمحے دریا میں پاؤں ڈال رہے ہوں گے، اس لمحے کے لاکھوں حصے میں دریا یکسر بدل چکا ہوگا۔

آج کا دشمن آنے والی کل کا بہترین دوست اور آج کا دوست آنے والی کل کا بدترین دشمن ثابت ہو سکتا ہے۔ جو لوگ حقیقت کو چاہے وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، ایک ٹھہرا ہوا پانی سمجھتے ہیں، ان کی رگوں میں جو ہڑ سڑتے ہیں اور ان کے سانس زندگی کی زندگی پرور فضا میں زہر پھیلاتے ہیں۔

ہمارے عہد کی دشمن ترین قومیں آج ایک دوسرے سے افہام و تفہیم کی دانش مندانہ حالت میں گفتگو کر رہی ہیں۔ تاریخ سیاست کے وقتی رویوں سے کہیں بڑی حقیقت ہے۔ تاریخ عظیم اور جلیل وقت کی نمائندگی کرتی ہے اور تاریخ کے حساب سے پچاس ساٹھ برس لمحوں کے ٹھٹھول سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ قوموں کو تاریخ کا اور تاریخ کی خلاق حرکیت کا پوری طرح احترام کرنا چاہیے اور اس کی عظمت کو سلام کرنا چاہیے، مؤدبانہ سلام۔ جو قومیں تاریخ کے شعور کا ثبوت دینے میں ہچکچاہٹ سے کام لیں گی، وہ اپنے قتل نامے کے ”محضر“ پر مہر ثبت کریں گی۔ زندگی کی تمام حقیقتوں کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے لیکن تاریخ، پُر جلال تاریخ کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخ کے تقاضوں کو نظر انداز کرنے کی جو بھیانک سزا بھگتنی پڑتی ہے اسے ہم میں سے بہت سے لوگ جانتے ہیں۔

پاکستان اور ہندوستان گزشتہ چوتھے پینسٹھ برس سے باہمی دشمنی کو اپنا اخلاقی اور سیاسی فرض سمجھتے رہے ہیں۔ تاریخ سے محول کرنا ان کی عادت بن چکا ہے۔ ہمیں اپنے نقطہ نظر کے صحیح ہونے پر ہرگز کوئی اصرار نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کی باہمی دشمنی ہی ان دونوں کے پیچیدہ ترین مسئلوں کا حل ہو لیکن میں اور معراج رسول ایک سوال کرنا چاہتے ہیں اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا آپ دونوں کی باہمی دشمنی نے آپ کے پیچیدہ ترین مسئلوں کو حل کیا ہے یا انہیں اور پیچیدہ تر بنا دیا ہے۔ اگر آپ ہمارے اس سوال کا جواب دینے سے گریز کرتے ہیں تو پھر ہمیں اپنے اس سوال کا خود ہی جواب دینا ہوگا اور وہ جواب یہ ہے کہ آپ ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہیں بلکہ دردناک حد تک خود اپنے دشمن ہیں، آپ دونوں اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے جس سمت میں چلتے اور آگے بڑھتے رہے ہیں، اس سمت کی ہوا میں آپ کے سانسوں کے لیے زہر ہی زہر ہے۔

سمت کے لفظ پر خیال آیا کہ نفرت اور خونریز عداوت اور تباہ کن خیالوں اور رویوں کا سارا کھیل شمال کے آسمان کے نیچے اور شمال کی زمین کے اوپر کھیلا جاتا رہا ہے۔ دوسری سمت کا عیب و ہنر تو بس یہ تھا کہ وہ تھیں اور یہ ہے کہ وہ ہیں۔ ان سمتوں کو یہ بات سن کر ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کی ”اہمیت“ کو نظر انداز کیا جا رہا ہے، یہ تو ایک اور ہی بات ہے جو نہایت اذیت کے ساتھ کہی جا رہی ہے۔

آسمان شام کے پرندے شمال کی طرف پرواز کر رہے ہیں اور معراج رسول اور میں اسلام آباد، دلی، لاہور اور لکھنؤ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر ان پرندوں کے پروبال پر کیا گزرتی ہے؟ ہمیں بتایا جانا چاہیے کہ آخر کیا گزرتی ہے ان پرندوں کے پروبال پر اور ان کے ساتھ دوسری سمتوں کی طرف پرواز کرنے والے پرندوں کے پروبال پر؟ ہم بہت سوچتے ہیں مگر یہ بات کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہمارے بزرگوں نے انگریزی سامراج کی پتھر پٹی دھاندلی سے آخر کیوں لکری تھی۔ انہوں نے اس سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے لیے کیوں اپنا لبو بہایا تھا، کیوں اذیتیں اٹھائی تھیں اور کیوں عذاب بھگتے تھے، کیا یہ وہی آزادی تھی جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں؟

پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپ کو تمام ڈائجسٹ

ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ

آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ

لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

ماہ اگست کا سہ ماہی آپ کے ذوق مطالعہ کے لیے حاضر ہے۔ سب سے پہلے تو تمام قارئین کو ماہ رمضان المبارک اور قیام پاکستان کی 65 ویں سالگرہ کی مبارکباد قبول ہو۔ کیا حسین اتفاق ہے کہ اس سال بھی 1947ء کی طرح اگست اور رمضان المبارک ایک ساتھ ہی آئے ہیں اور 14 اگست اور شب قدر بھی قریباً ساتھ ساتھ ہی ہیں مگر حالات کی تم نظریاتی کتب غیروں پر غیروں کے ظلم تھے مگر آج..... انہوں کا انہوں کے ساتھ بدر سلوک..... ایک بدترین مثال..... اسے عوام کا مقدر کہا جائے یا حالات کی سازش..... کہ آج بھی تفرقات نے اس قوم کو ایک ٹکٹے پر مرکوز نہ ہونے دیا۔ بقول شاعر

مست ہیں لوگ سبھی حال دگر میں اپنے
گھر کی سی بات نہیں ہے کوئی گھر میں اپنے

حال ہی میں نیو سلائی لائن بحال کر دی گئی ہے، ایک بار پھر پارلیمنٹ کی بالادستی کا راگ الاپنے والے حکمرانوں نے پارلیمنٹ کی ”بالادستی“ کا ایک نہایت شاندار مظاہرہ کیا۔ کسی زمانے میں سرسام کی بیماری بڑی موذی تصور کی جاتی تھی، ہمارے حکمرانوں کو بھی یہ ”Sir Sam“ (انگل سام یعنی امریکا بھادر) کا مرض ایک عرصہ سے لاحق ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس مرض سے شفا نصیب فرمائے۔ جبکہ وزارت عظمیٰ پر بھی چہرہ بدل دیا گیا مگر..... حالات جوں کے توں، اس بدلاؤ سے کیا حاصل جس میں کوئی کمال نہ ہو۔ وطن عزیز میں آج کل کچھ عجیب حالات چل رہے ہیں۔ اللہ ہماری ملک اور قوم پر اپنا رحم اور فضل و کرم عطا فرمائے۔ رمتوں کے سائے سائے چلتے ہیں ہم بھی اپنی محفل کی جانب.....!

✽ گستاخ انجم اپنے گستاخانے کے ساتھ دینی سدا، کھاریاں سے ”امید واثق ہے کہ غربت و افلاس، بیروزگاری و فاقہ کشی، مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ سے بے حال عوام لاقانونیت کے کٹہرے میں کھڑے انصاف کی گھڑی کے انتظار میں سانس لے رہے ہوں گے حالات کی چکی میں پسے والے بے حال ہوتے ہیں اور بے حال لوگوں کا حال دریافت کرنا ان کے رستے زموں میں نمک چھڑکنے کا نام ہے۔ یہ بات تو زیر اور اک نہیں کہ جریدہ کب سرائے عامہ میں وارد ہوا تاہم اس بات کی سچائی میں کسی قسم کی بھی تشکیک شدہ بات نہیں کہ یہ دلدار 24 جون کو ہماری چشم تر کا مہمان ہوا۔ ایک مدت بعد دیکھا تو شائستگی کی جھلک ابھری۔ قلب مفتوح میں ایک ہوک سی اٹھی۔ کاپتے ہاتھوں سے تھا۔ اضطرابی اور اضطرابی کیفیت میں چاک گریباں کی بائیں سمت سے پل دوپل کے لیے لگا۔ کچھ چہن کا تاثر کم ہوا اور نظر سے ”نظر“ کو جی بھر کے دیکھا۔ سرورق کا پس منظر ساحل سمندر پہ دوڑتے ہوئے گھوڑے اور گیلی ریت پہ پاؤں کے نشانات پر متوجہ دل کو بھلا محسوس ہوا تاہم حسینہ سرورق اک نگاہ نہ بھائی۔ اس کی وجہ بھی بیان کیے دیتا ہوں۔ اپنے سونے کے جھمکوں کی نمائش کر داری ہے۔ سونے کے بھاؤ کا اندازہ کیے بغیر..... اویسے مصور کا مخصوص انداز ”ڈاکر“ کہیں بھی موجود نہیں ملا۔ کیا یہ فن پارہ کسی اور کے دست کمال کا مرقع ہے؟ فہرست کا تفصیلاً موازنہ کرتے ہوئے نگاہوں نے بارہا نواب صاحب کے اہم کمال کو ڈھونڈا مگر ان کو کہیں بھی نہ پا کر دل ہلکا سا مغموم ہوا تاہم بقیہ مستند قلم کاروں کے اسمائے گرامی نے دل گستاخ کی مغمومیت پل بھر میں رفع کر دی۔ فہرست کے بعد جون ایلیا کے انشائیے کو بہ غور پڑھا۔ ”مشاعرے“ کے ارتقا و افرا کے بارے میں بے حد معلومات میسر آئیں۔ عصر حاضر میں مشاعرہ خال خال ہی سننے میں ملتا ہے تاہم نئے شاعر کافی میدان کارزار میں بے خطر کود رہے ہیں۔ محفل میں آپ کی خوب صورت باتوں نے دل دہلا کے رکھ دیا۔ کاش یہ سب جھوٹ ہو۔ ہم بھی ایسی عوام بن جائیں جو ایسی باتوں کو دیوانے کے خوابوں سے تشبیہ دیتی ہیں۔ کاش میرے گستاخوں میں ایسے مائی آئیں جو پھول توڑنے والے نہ ہوں، پھول بانٹنے والے ہوں..... لیکن اکاش بے بسی اور مایوسی کی انتہا ہے۔ محفل میں تفسیر عباسیہ کے خوب صورت تبصرے نے بے حد احتیاط سے نوازا۔ دیگر تبصروں میں ثاقب نواز ثاقب صاحب ”مختصر، پراثر“ کے فارمولے پر عمل پیرا نظر آئے۔ خوب صورت تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ عمران حیدر بلوچ صاحب ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ بابر عباس صاحب بھی محفل پر چھائے ہوئے تھے۔ ہمایوں سعید راج کی نوک جھوک خوب ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آخری صفحات کو زیر مطالعہ کرتے ہوئے ”در اور دروازہ“ کے تجسس کو پرکھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب اپنے مخصوص انداز میں ”در اور دروازہ“ کے اسرار و رموز کو اکارتے ہوئے ملے۔ کہانی بے حد لطافت آمیز اور تیز رفتار ثابت ہوئی۔ سائیں سادون فقیر اور نور خاتون کا کردار بہت اچھا لگا۔ سائیں کی قربانی کی داد نہ دینا بہت بڑی حماقت ہے۔ کہانی کا سب سے خوب صورت جملہ جودل کی دھڑکن پہ دل بن کے دھڑکا۔ وہ یہ ہے ”درو کو جھلانے والے جب نفس کے دروازے کا رخ کرتے ہیں تو.....“ بہت ہی خوب صورت بات کہی ہے۔ بہت ہی پراثر تحریر پڑھنے کو ملی جو عشق حقیقی کی طرف رغبت کو بڑھاتی ہے اور عشق مجازی کو بھی اسی کے عوض قبول کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ غلام قادر کی ”گمن پکر“ مکالموں پر متوجہ تحریر پڑھنے میں مزہ آیا۔ ”طوائف“ شیر شاہ سید صاحب کی تحریر بے سرو پا محسوس ہوئی۔ کہانی تیز رفتار تھی مگر پسند نہیں آئی۔ کاشف زبیر صاحب کی تحریر ”راکھ کے پھول“ دوسری جنگ عظیم کی ایک دیدہ و دل کو متاثر کرنے والی تحریر تھی جس نے احتیاط بھی بخشا اور درد بھی ہرا کیا۔ لولیتا کی مظلومیت پر ترس آیا۔ جیڈ کی بہادری قابل تعریف ہے۔ طاہر جاوید محفل صاحب کی تحریر ”غیر ضروری“ نے بہت متاثر کیا۔ کردار کی ایک غیر ضروری سی حرکت نے ایک ہنستے ہنستے گھر کو اجاڑ کے رکھ دیا۔ کہانی پڑھنے کے بعد دل رنجیدہ سا ہو گیا۔ نسیم جاوید سید صاحب کی تحریر ”چشم کم“ میں وائلٹ کی غلط بات بھی صحیح ثابت ہوئی اور جارج کی قسمت بد خوش کے پیرائے میں ڈھل گئی۔ ”غلامی“ مغربی رشتوں کی ناقدری کی عمدہ مثال ثابت ہوئی۔ معصوم بچوں پر بہت ترس آیا۔ باقی تھاریر میں نمکین لاش، ایٹس ٹرے کی چوری، عمدہ سبق خا سے کی تھاریر تھیں۔ مرزا صاحب کی ”سازشی کردار“ نے بہت محظوظ کیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی ”چراغ افناں“ نے تاریخ کے دھندلوں کو اجاگر کیا۔ عظیم بادشاہ اور عظیم پیغمبر حضرت سلیمان کی سوانح حیات پڑھ

کر ایمان تازہ ہوا۔ انوار صدیقی صاحب کی ”کھول“ اور ناصر ملک صاحب کی ”مسافر“ ابھی تک زیر مطالعہ ہیں۔ پرانے جریدوں کا مستلاشی ہوں اور بہت سے احباب کی عنایات بھی ہیں کہ نوازر ہے ہیں۔ امید واثق ہے کہ ہمارا سنگم مانند رست قائم و دائم رہے گا۔ پچھلے کافی عرصے سے ہم ولایت یاراں نہ ہو پائے تاہم اس سہو کے لیے گستاخی معاف.....! امید واثق ہے کہ گستاخ کو کسی جگہ پر ضرور پذیرائی ملے گی خواہ وہ آخری کالی فہرست ہی کیوں نہ ہو۔ تمام اہل وطن کے بانیوں کو آزادی مبارک.....! خدا حافظ.....!“ (آپ کے ٹیکل تبصرے کا از حد شکریہ۔)

✽ جو یزید بنت ڈاکٹر نعیم اکبر سحر، مانسہرہ سے محفل کی زینت بنی ہیں ”پہلی مرتبہ میں کسی بھی رسالے میں خط بھیج رہی ہوں (خوش آمدید) اس بار سہ ماہی 2 کو ہی مل گیا تھا۔ سب سے پہلے میں نے سرورق والی ”خالہ“ کو ہائے کہا اور پھر ان کے حسن کی تاب نہ لاتے ہوئے میں نے ان کو ایک منٹ کے اندر اندر ہی بائے کہا اور ایک ہی لمبی سی جھلاک مار کر میں ”آپ کے خط“ کی محفل میں پہنچ گئی اور کرسی صدارت پر قابض تفسیر عباسیہ کا تبصرہ پڑھا اور واقعی..... ان کا تبصرہ تو تھا ہی کرسی صدارت کے لائق اور عمران حیدر بلوچ آپ کو 24 ویں سالگرہ بہت مبارک ہو۔ اور اللہ کرے کہ یہ آپ کی آخری سالگرہ ہو..... زندگی میں نہیں جی جیل میں آخری ہو۔ ابوجب بھی سہ ماہی لے کر آتے ہیں تو میں سب سے پہلے آخری کہانی پڑھتی ہوں پھر اس کے بعد ملک صفدر حیات اور کاشف زبیر اگر موجود ہوں تو ان کی کہانیاں پڑھتی ہوں۔ مرزا امجد بیگ میرے موٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ میں ان کی کوئی بھی تحریر نہیں مس کرتی۔ اس مرتبہ کی محفل شعر و سخن بھی بہت زبردست تھی۔ انوار صدیقی کی کھول بھی بہت زبردست جا رہی ہے۔ لگتا ہے میں کچھ زیادہ ہی بول گئی ہوں اور ہاں یاد آیا اس مرتبہ لطائف بہت مزیدار تھے۔ اتنا لہا تبصرہ کرنے کا موقع تب ہی ملا کیونکہ فرسٹ ایئر کے ایگزٹام دینے کے بعد چھٹیاں ہیں۔ آپ سب قارئین سے گزارش ہے کہ میرے رزلٹ کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے بہت اچھے نمبروں سے پاس کریں۔“ (آمین)

✽ عمران حیدر بلوچ ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ”اس ماہ کا شمارہ پوری آب و تاب کے ساتھ 20 تاریخ کو ہماری کال کوٹھریوں میں ستارے کی طرح چکا۔ سرورق پر ساحل سمندر پر حسینہ بیٹی شاید کراچی کے حالات پر حیران ہو رہی تھی کہ نہ جانے روشنیوں کے شہر کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔ محفل میں تفسیر عباسیہ کا تبصرہ پڑھا اور حیران ہوئے۔ مبارک باد کے بعد ان کی آرا سے اتفاق کرتے ہیں، خطوط کے صفحات بڑھا کر زیادہ سے زیادہ خط شامل کیے جائیں۔ حسین عباس بلوچ کو داد دی کہ انہوں نے عون لکھنے کی دیدہ دلیری کی۔ طاہرہ یاسمین آپ کے کزن سے کئی بار ملاقات ہوئی گزشتہ محرم الحرام میں عزاداری کے لیے پہلا عشرہ اکٹھے ہی رہے۔ آپ کے کزن کو کراچی والا کے نام سے پکارتے ہیں۔ عمران علی بھیا دعاؤں میں یاد رکھتے کا شکریہ۔ ساجدہ راجا کو محفل میں خوش آمدید۔ بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارے نواحی گاؤں سے کسی نے محفل میں شرکت کی، آپ کے شہر کے ظفر اقبال کو کھر میرے ساتھ رہتے ہیں اور میرے بھائیوں کی طرح ہیں محفل میں شمولیت یقینی بنائیں۔ انور یوسف زئی و حکیم ابا بابر عباس بھائی پڑھ کر دکھ ہوا کہ آپ نے جیل جیسی محسوس جگہ دیکھی۔ اگر جرم کیا ہو تو معاشرے کا توازن برقرار رکھنے کے لیے سزا ضروری ہے۔ اگر کوئی میری طرح بے گناہ قید کاٹ رہا ہو تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ ہمایوں سعید راج بھائی رابطہ نمبر دیں میرے چھوٹے بھائی نے آری جوائن کر لی ہے اور کوہاٹ میں ٹریننگ کر رہے ہیں تاکہ وہ آپ سے مل سکیں، ایسا کہاں غائب ہیں بتائیں کہ زرسالانہ جمع کروادیں اور کتابوں کے بارے میں بھی آگاہ کریں۔ ہمارے دوست ریاض شاہد پیٹرن کاکیس ہائی کورٹ میں سماعت ہو رہا ہے تمام دوست دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو رہائی نصیب فرمائے۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی، معلوم ہوا پروین کو اغوا کیا گیا ہے۔ شہر یار نے جیت شاہ کو قتل کر دیا اور یوں لکھا کہ اس سے اظہار محبت اور جس شخص کو شہر اکٹھے کر چکا تھا یقیناً کھالا ہی ہوگا۔ کھول میں سراج اور درنگ زیب کو لیاقت حسین نے محفوظ کر لیا۔ شبنم کا اغوا اور شیخ حامد کے گھر پر حملہ اس کے لیے کارنی ضربیں تھیں۔ رضوانہ ساجد کی تحریر کردہ حضرت سلیمان کی روداد ایمان افروز ہے۔ ملک سہا کی ملکہ بقیوں کو دعوت توحید کا طریقہ زبردست لگا۔ نسیم جاوید سید کی چشم کم میں وائلٹ کی غلطی جارج کے کام آئی اور پھر اس کے قابو آ گیا۔ سلیم انور کی عمدہ سبق میں تک نے کرسی سے رٹ لی اور اس کے شوہر کو قتل کیا، ابھی ہوئی کہانی تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید نے طوائف میں بینکاک کے بازار حسن کی تفصیل بیان کی اور آگاہی دی۔ محفل شعر و سخن میں تمام اشعار اچھے تھے۔“

✽ شیر علی خان نامعلوم مقام سے تبصرہ کر رہے ہیں ”اس دفعہ سہ ماہی 17 کو ملا اور تاثرات معمول سے کچھ ہٹ کر اور بہار جیسا لگا جس میں ایک لڑکی کے خیالات کا گھوڑا کسی کے نقش پا کو تلاش کرتا بھاگا جا رہا ہے۔ جون ایلیا کے ”مشاعرہ“ سے انشائیہ کا ذائقہ کچھ تبدیل ہوا ہے اور شاعرانہ معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔ لوڈ شیڈنگ کی صورت حال یہ ہے کہ یہ خط بھی موم بنی کی روشنی میں لکھا جا رہا ہے۔ بہر حال ملکی حالات واقعات کو پھلانگتے ہوئے محفل یاراں میں پہنچتے تفسیر عباسیہ بھائی مسند خلافت پر متمار ہے تھے۔ میں ان کی بزم یاراں کے صفحات بڑھانے کی بات سے بالکل متفق ہوں۔ ایسا انصاری اب بہت ہو گئی ہے اس لیے مجھے لگتا ہے پڑھائی سے جی چرانے کے بجائے اپنی گم شدہ کتابیں پڑھنی شروع کر دی ہوں گی۔ راجا ثاقب مختصر تبصرے کے لیے میں بھی آپ کا ہم خیال ہوں۔ قدرت اللہ نیازی صاحب ماہا ایمان کی عمر کا اندازہ لگانے کے لیے سب دوستوں نے ٹیکلو لیٹر پکڑ لیے ہیں۔ جعفر حسین لگتا ہے آپ نے ایسا انصاری کے محاورات چرا لیے ہیں کہ آپ کا خط محاورات سے بھر پور ہے۔ حاجی عبدالحکیم صاحب آپ پلیز زیادہ اختصار نہ کر دیا کریں۔ ہمایوں سعید آپ حجاب والوں کا خیال نہ رکھ کر بے حجاب نہ ہوں۔ اس دفعہ کھول کو پڑھ کر ایسا لگا کہ یہ کہانی اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ دیکھتے ہیں صدیقی صاحب کے پاس اور کتنے واقعات باقی ہیں۔ شہر یار کی مسافر گاڑی اب گاؤں سے نکل کر شہر کے ہنگاموں میں داخل ہو چکی ہے، لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورت حال کے باوجود کہانی بہت ترتیب سے آگے بڑھ رہی ہے۔ مرزا امجد بیگ کی ایک اور پر تجسس تفتیش نے آخر سازشی کردار کو بے نقاب کر دیا۔ غیر ضروری کچھ خاص لوگوں کے لیے نصیحت آموز کہانی ہے کہ انسان اپنی خوشیوں کے حصول کے لیے دوسروں کی خوشیوں کا خون کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب تاریخ کے جھروکوں سے خوب صورت تحریر لے کر آئے جو کہ حقیقی طور پر دل کو بہت اچھی لگی اور علم میں بھی اضافہ ہوا۔ راکھ کے پھول جنگ عظیم کے اقتدار کی جنگ کے ہنگاموں



میں آخر کار لولیتا اور جیڈ کے ایک خوب صورت انجام پر ختم ہوئی۔ تو ریاض نے ہمیں بتایا کہ بچوں کی صحیح طور پر پرورش حقیقی والدین ہی کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی طوائف شاید کچھ لوگوں کو عام سی تحریر لگے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں بھی لوگ جانے پہچانے ناموں سے ایسے راستوں کے مسافر ہیں۔ رضوانہ ساجد کی تحریر سے حضرت سلیمان کی زندگی کے حالات سے آگاہی ہوئی اور اللہ تعالیٰ ان کے قلم کو نہ روکے۔ (آمین) میرے والد صاحب 24 مارچ کو اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ آپ تمام ان کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں بہت اعلیٰ مقام عطا کرے۔“ (آمین)

ریاض شاہد، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ ماہنامہ ڈائجسٹ سسٹمز کا شمارہ انیس تاریخ کو ملا اور سرورق پر دو شیزہ بس واجبی کی جی کیونکہ میں خود آرٹسٹ کے شعبے سے وابستہ ہوں اور اس وقت ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا میں سزائے موت کا قیدی ہوں، ماہنامہ سسٹمز اور جاسوسی کا عرصہ 21 سال سے قاری ہوں اور بڑی شدت سے ہر ماہ ایڈیشن کا انتظار رہتا ہے پہلی دفعہ خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں امید ہے پذیرائی ملے گی۔ (خوش آمدید، بہت خوب صورت پھول بوٹے اور نقش و نگار سے سجاوٹ ہے آپ کا) بانی کفکول اور مسافر دونوں اچھی کہانیاں ہیں اور جب تک ایڈیشن پڑھ نہ لیں بند کرنے کو دل نہیں کرتا۔ بابر عباس صاحب، اور یس احمد خان صاحب، محمد قدرت اللہ نیازی صاحب، حمیرا رضا صاحب، ماہا ایمان صاحبہ، حاجی عبدالکیم صاحب اور ساجدہ راجا صاحبہ کا تبصرہ پڑھ کر حقیقت میں ایسا لگا کہ جسے کسی بہت مجھے ہوئے رائٹر نے تبصرہ لکھا ہے۔ مختصر اور جامع تبصرہ لکھنے پر میری طرف سے ساجدہ راجا صاحبہ آپ کو دلی طور پر مبارکباد قبول ہو۔ محض شعر و سخن میں تمام اشعار معیاری تھے تقریباً سب پسند آئے۔ آخر میں تمام قارئین سے استدعا ہے کہ میری لاہور ہائی کورٹ میں اپیل سماعت ہو رہی ہے۔ تمام قاری دل سے دعا دیجیے گا کہ اس گناہ گار انسان کو خدا معافی دے اور رہائی نصیب کریں۔“ (آمین، ثم آمین)

حکیم سید محمد رضا شاہ، نورنگہ، میانوالی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ جولائی 2012ء کا شمارہ ہاتھ میں ہے۔ جون ایلیا صاحب کا بیدار مغز مشاعرہ پڑھا۔ گہرائی کی تحریر ہے۔ محترم معراج رسول صاحب کی ملکی صورت حال کے بارے میں تشویش بجا ہے۔ خاص کر لڑکیوں کے نکل پر دلی صدمہ ہوا، اللہ تعالیٰ ملک کو انتہا پسند مذہبی جنونیوں سے محفوظ رکھے، آمین۔ سرورق میں حسینہ کے ساتھ گھوڑا اور پھر قدموں کے نشان کیسے ہیں؟ برادرم و محترم جناب نقیر عباس اس پر کچھ لب کشائی کریں گے کیا؟ صدمہ محفل میں ان کا خط پڑھا۔ ان کی فرمائش کے خطوط کے لیے ایک درجہ حادیں۔ بہتر تجویز ہے۔ راجا ثاقب نواز کا مختصر اور جامع تبصرہ دل کو بھا گیا۔ راجا صاحب مبارکباد۔ قارئین حضرات خط مختصر لکھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ حضرات شامل محفل ہو سکیں۔ جیل کے بھائیوں حسین عباس بلوچ، عمران حیدر بلوچ آپ کی تکلیف خدا تعالیٰ جلد ختم کرے اور آپ حضرات کو جیل سے رہائی نصیب ہو۔ قدرت اللہ خان نیازی کا تبصرہ پڑھا۔ آپ تو محفل کی جان ہیں۔ نیازی صاحب، طاہر الدین بیگ، عمران علی، جعفر حسین، حاجی عبدالکیم کے محبت نامے پڑھے اور خاص کر بابر عباس کا تبصرہ پڑھا۔ آپ تو محفل کی جان ہیں۔ نیازی صاحب، طاہر الدین بیگ، عمران علی، جعفر حسین، حاجی عبدالکیم کے محبت نامے پڑھے اور خاص کر بابر عباس صاحب کی طویل عمر سے کے بعد آمد پر خوشگوار حیرت ہوئی۔ بابر صاحب دنگا فساد سے دور رہا کریں۔ میانوالی کے احسان سحر صاحب شامل محفل۔۔۔ ہونے کے بعد اب خوش و خرم ہوں گے۔ ہمایوں سعید راج اور رائے نقیر عباس نکل کی تحریریں بھی بہتر تھیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی چراغ افغان میں بہلول لودھی کے حالات زندگی پڑھے اور تاریخی حقائق سے آگاہی ہوئی۔ ایک بزرگ کی دعائے بہلول لودھی کو دہلی کی حکومت دلا دی۔ انوار صدیقی کا طویل سلسلہ کفکول ایک خوب صورت تحریر ہے جس میں تنگی اور بدی کی جنگ جاری ہے۔ خاص کر لیاقت حسین کا کردار عمدہ ہے۔ دوسرا طویل سلسلہ ناصر ملک کا مسافر نے بے حد متاثر کیا ہے۔ سید می سادی تحریر اور گاؤں کی مخصوص فضا میں گاؤں کے بایسوں کی رہائش کی بود و باش پر عمدہ تحریر ہے اور خاص کر پیر فراتوٹ صاحبیں دل جیت کے انجام پر خوشی ہوئی۔ ہاں ایک بات اور ان طویل سلسلوں میں شہر یار اور غزالہ بیگی نام مصنف بار بار دہراتے ہیں کیوں؟ پہلے بھی طویل سلسلوں میں یہ نام چلتے رہے ہیں۔ میرے خیال میں ان ناموں میں چارم ہے۔ ایٹل ٹرے میں تک ویلٹ سے ایک بار پھر ملاقات ہوئی ہے۔ طاہر جاوید مغل کی ہر کہانی میں وہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ غیر ضروری میں کیا ہوتا کہ اگر مغل صاحب دونوں فیصلیہ کو یکجا کر دیتے۔ سازشی کردار امجد بیگ نے معاشرتی ناسوروں کو اجاگر کیا ہے۔ غلام قادر کی گھن چکر اور ڈاکٹر شیر شاہ کی طوائف مختصر تحریریں ایک نیا مزہ دے گئیں۔ مریم کے خان کی انتخاب میں جون مالکو اور ایلس جوزف کی محبت آخر کار رنگ لائی۔ حضرت سلیمان کے واقعات پڑھ کر قارئین کو حقیقت کا پتا چلتا ہے۔ واقعات انبیاء کی تحریریں سسٹمز ڈائجسٹ کا زیور ہیں۔ عمدہ سبق میں سلیم انور نے تک کے ذریعے بیوی شوہر کو ایک عمدہ سبق دیا ہے۔ آخری کہانی در اور دروازہ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی عمدہ کاوش ہے۔ الف خان اور اس کا بیٹا در خان اپنی سازش کا شکار ہو گئے۔ کتر نہیں بھی خوب تھیں اور خاص کر محمد جاوید بلوچ، ماہا ایمان صاحبہ، ریاض بٹ، حسین بلوچ کی کتر نہیں اور لطفائف خوب تھے۔ سسٹمز ڈائجسٹ میں قارئین کی دلچسپی کا سامان موجود ہے، ایک بہتر اور مکمل جریہ ہے۔“

عبدالغفور خان خشک، چھب ضلع انک سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ڈائجسٹ 18 کو ہی مل گیا۔ ٹائٹل پر نظر پڑی تو اس کی خوب صورتی پس منظر میں گھوڑے کے چال اور سب سے بہترین چیز جو کہ خوب صورت ٹائٹل کو بتاتی ہے وہ ہے، پانی کا ہونا عورت کی تصویر بھی اچھی ہے۔ محفل میں جا کر دیکھا تو ہمارے برادرم جناب نقیر عباس بابر صدارت کی کرسی سنبھالے صنف نازک کو منہ چڑا رہے تھے۔ عمران حیدر آپ کو سالگرہ ایڈوائس مبارک ہو۔ میری دلی دعا ہے کہ یہ آپ کی آخری سالگرہ ہو اور اگلی اپنے گھر والوں کے ساتھ منائیں (آمین) اور یس بھائی، شکر ہے کہ پانچ ماہ کے بعد آپ کو اپنا خط نظر آیا ویسے نظر کمزور تو نہیں ہے کہ پہلے نہیں دیکھا۔ حاجی عبدالکیم صاحب، بزرگوار آپ تو ہماری محفل کی چھت ہیں، ٹھنڈی چھاؤں اگر ہم سے ہر ناتا تو ہاتھ ہم ایک سایہ دار درخت سے محروم ہو جائیں گے۔ ہماری محفل میں آتے رہا کریں۔ شکر یہ (ہم بھی التجا کریں گے) ہمایوں سعید، بابر عباس، حسین نظامی کے خط ایسے



تھے۔ باقی محفل میں نوک جھوک جاری تھی۔ ویسے معراج انکل میرے گاؤں کے ایک انکل اکبر ہیں جو کہ ہم سے بھی پہلے کے سسٹمز کے قاریوں میں ہیں لیکن وہ خاموش قاری ہیں۔ ان کے بھائی اقبال کی وفات کراچی میں ہوئی ہے۔ میں سسٹمز کی معرفت ان سے افسوس کرتا ہوں کہ اللہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین) بچا اقبال جو کہ مجھے جب میں 2009ء میں کراچی سول اسپتال کے ساتھ رہائش پذیر تھا تو ملنے آتے تھے (اللہ مرحوم کے درجات بلند اور لوہا تھیں کو صبر عطا کرے۔ آمین) سسٹمز نمبر 1 پر جا رہا ہے، اس کے بعد میرے خیال میں نمبر 2 جاسوسی ہے اور نمبر 3 سرگزشت ہے۔ انکل اگر مغربی کہانیوں کی جگہ پر اپنے وڈیو سندرہ کے یا پھر اور کسی کلچر پر کہانی لکھی جائے تو وہ شائع کر دائیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے کفکول پڑھی، اس میں ابھی رائٹر، انوار صدیقی کو کہانی پر مکمل گرفت نہیں ہے۔ لیاقت حسین کی پراسرار گر میاں اور سراج صاحب اور اورنگ زیب کے ساتھ وفاداری تریف کے قابل ہے۔ مسافر پڑھی جس میں شہر یار کی بہن کا لاپتا ہونا تھا۔ میڈم کی کاوش رنگ لائے گی اور وہ شہر یار کی ہمیشہ دل جانے ناصر ملک کی کہانی مسافر میں اس ماہ کچھ زیادہ پاورفل قسط تھی اور قہر دل والی بھی۔ شہر یار کو میڈم بھی جان گئی کہ یہ ایک جی دار آدمی ہے۔ حضرت سلیمان کی دو اقساط پڑھیں اکثر و بیشتر پڑھ چکا ہوں لیکن ایک دفعہ دل کا دروازہ کھل گیا۔ حضرت سلیمان کی داستان پڑھ کر سکون ملا۔ در اور دروازہ بھٹی صاحب کی ان تحریروں میں سے ایک بھی جو کہ اکثر ہمارے سندرہ کے معاشرے سے تعلق رکھتی ہے۔ نور کی قرآن سے (نور اللہ) شادی کی جاتی ہے کہ ایک امید کی کرن خالقو آجاتا ہے وہ لے کر بھاگ جاتا ہے لیکن سامین بی بی نے حقیقی قربانی نور اور خالقو کے لیے دی، اس قربانی کی مثال نہیں ملتی۔ مختصر کہانیوں میں چشم کشم کشم جاوید کی ایک معمولی سی غلطی سے ایک آدمی کا کام بن گیا۔ اچھی تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سیدی کی تحریر طوائف بھی اچھی تھی۔ اس کے بعد گھن چکر پڑھی وہ بھی اچھی کاوش تھی اور آخر میں طاہر جاوید مغل کے تو کیا ہی کہنے۔ غیر ضروری پڑھی ایک ہمزاد سے شروع ہوئی کہانی کا اختتام والد پر ہوا عجب اتفاق تھا۔ بہترین کہانی تھی۔“

سید محی الدین اشفاق، فتح پور، لیہ سے تشریف لائے ہیں۔ ٹائٹل، ساحل سمندر اور حسینہ کی سوچتی نگاہیں واہ! جون ایلیا مرحوم ایک زندہ تحریر اور ایک زندہ جاوید شخص محترم انکل معراج رسول کی بات کر رہے تھے۔ نقیر عباس بابر مبارکباد۔ ویسے آپ کے بغیر یہ محفل اداس ہو جائے گی۔ راجا ثاقب نواز صاحب، اس ملک کو اللہ ہی چلا رہا ہے آپ پریشان نہ ہوں۔ طاہرہ یاسمین آپ نے سعدیہ بخاری کو دیکھا ہے؟ قدرت اللہ نیازی صاحب آپ نے بی اے اسی عمر میں کیا تھا پھر ایسا انصاری کو طعنہ کیوں؟ طاہر الدین بیگ بھی لوڈ شیڈنگ سے پریشان تھے۔ بابر عباس اور جعفر حسین کے تبصرے منفرد تھے۔ مسافر کا پس منظر اور محترم رائٹر صاحب کا تعلق ہمارے ہی علاقے سے ہے۔ سو کہانی ڈیل مزہ دے رہی ہے۔ شہرے اور میڈم ٹھیکہ کا تعلق شاید شہرے کو بہت آگے پہنچا دے گا۔ البتہ انوار صدیقی صاحب نے کہانی کو ایک ہی ڈگر پر کر دیا ہے، پلیز کہانی تھوڑی سی پراسرار کریں جیسا کہ آغاز میں تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب نے در اور دروازہ ایک اچھی کہانی لکھی۔ دد محبت کرنے والے مل گئے اور دوئل کراہورے رہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سیدی ایک تلخ حقیقت کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ گرمیوں کی لمبی دوپہریں اور سسٹمز کے مزے۔“

حسین عباس بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے چلے آ رہے ہیں۔ اس ماہ کا شمارہ انکس کی صبح کو ملا، ٹائٹل پر موجود دو شیزہ خوب صورت تھی لیکن آئیڈیل نہ تھی۔ محفل میں نقیر عباس بابر صاحب کو پہلی پوزیشن سے نوازا گیا۔ مبارکباد قبول کیجیے، جناب کے تمام خیالات ماشا اللہ بہت ہی اعلیٰ تھے۔ عمران حیدر اسیر بھائی جی، جناب کی سننے کی سماعت تو پہلے ہی بند تھی اب شاید دیکھنے کی بصارت بھی جاتی رہی۔ محمد قدرت اللہ نیازی جی، جناب نے جو اپنے خوب صورت تبصرے میں موتی پر دئے وہ لائق تحسین ہیں۔ عمران علی، اللہ آپ کو ہر امتحان میں کامیاب کرے۔ میں جھنگ موڈ منڈی کا رہائشی ہوں۔ احسان سحر جی پر غلوں دعاؤں کے لیے شکر یہ۔ حسن نظامی صاحب موسٹ ویکم، جی آیاں نوں۔ شہانہ حسن جی نے مختصر لیکن خوب صورت الفاظ کا چناؤ کیا۔ انکل بابر عباس جی، اللہ تمام مسلمانوں کو اس عقوبت خانے کی زندگی سے دور رکھے، آپ کی اسیری کا دکھ ہوا۔ ہمایوں سعید راج صاحب بہن بھائی کے رشتے پر کسی کو بھلا کیا اعتراض ہوگا اور ہاں سیری میں تو پہلے سہرا سجائیں بعد میں حج کروالیا جائے گا اور حاجن والی مراد پوری ہو جائے گی نہیں تو.....؟ حمیرا رضا بہن جی اپنے اس بھائی کے لیے اب خصوصی دعا کرنا کیونکہ پانچ برس تین ماہ ہو گئے ہیں ان کا کال کوٹھریوں میں، اب کیس ایک دو ماہ ہائی کورٹ میں سماعت ہونے والا ہے۔ حضرت داتا گنج بخش کے دربار پر ضرور جانا۔ حاجی عبدالکیم صاحب، جناب ہمارے بزرگ ہیں جناب کی تدوین سے کی جانے والی دعائیں انشا اللہ کبھی بے اثر نہ ہوں گی۔ جناب کا سایہ مبارک مجھ جیسے اور بچوں پر تازہ زندگی قائم و دائم رکھے (آمین) کہانیوں میں کفکول کی آٹھویں قسط اچھی تھی۔ انوار صدیقی صاحب کی اچھی تحریر تھی۔ مسافر اپنے سفر پر رواں دواں بڑی دلکش اسٹوری ہے۔ انکل طاہر جاوید مغل صاحب غیر ضروری میں جلوہ گر ہوئے۔ تمام ہی اسٹوری سسٹمز کی شان و شوکت کی عکاس تھیں۔ محفل شعر و سخن میں تمام دوستوں کے اشعار قابل داد تھے لیکن ریاض شاہد پیٹرن کے شعر کو میری طرف سے پذیرائی ملی۔“

رائے قیصر عباس کھرل، سینٹرل جیل گوجرانوالہ سے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ میں شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ میرا خط چار پانچ مہینے کے انتظار اور کوشش کے بعد شائع ہو گیا ہے۔ یقین کریں بڑی خوشی ہوئی (خوش رہیے) خطوط کے میلے میں ماہا ایمان جی غیر حاضر تھیں۔ ماہا جی کہاں گئی ہیں، حاجی عبدالکیم صاحب ہم سب آپ کی وابستگی کا انتظار کریں گے۔ سرگودھا والوں نے کافی رونق لگائی ہوئی ہے۔ طاہرہ یاسمین صاحبہ آپ کا کوئی کزن گوجرانوالہ جیل میں ہے۔ اگر ہے تو بتا دیں۔ ہم اس کا خیال رکھیں گے (اللہ آپ سب کی مدد فرمائے، آمین) اب کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی۔ شہر یار بھی جرم کی دنیا میں داخل ہو گیا ہے۔ اللہ ہی خیر کرے۔ کہانی میں لڑکیاں بہت زیادہ انٹر ہو گئی ہیں، مولا بچائے۔ اس کے بعد کفکول پڑھی۔ واقعی بڑا مزہ آیا۔ لیاقت اپنے ہاتھ اچھے دکھا رہا ہے۔ آخری صفحات پر در اور دروازہ ایک اچھی تحریر تھی لیکن کہانی اپنا ماحول نہیں پیدا کر سکی۔ تاریخی کہانی



چراغ افغان بھی شیک تھی۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔“

✽ راجا ثاقب نواز ثاقب، رتی بی، ساہیوال سے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ ”ویسے تو اس مہنگائی، بدامنی، سیاسی ابتری اور لوڈ شیڈنگ کے عذاب کے باعث کسی کی خیریت پوچھنا گویا کہ جلتی پر تیل ڈالنا ہے مگر بہر کیف جیسے کا سامان تو کرنا ہی ہے۔ انسان کا ذہن جب ذاتی اغراض، مفادات اور اہداف سے اٹ جائے تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے جو ہمارے ملک میں ہو رہا ہے۔ ان گنت مسائل کا عفریت ملک میں غربت کا باعث بن رہا ہے اور غربت اور بے روزگاری ملک میں جرائم کا سبب بن رہے ہیں۔ کیونکہ پاپی پیٹ تو ہر کسی کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اسے بھی تو بھرتا ہے، چاہے حرام سے بھرے یا حلال مال سے۔ جولائی کا شمارہ شعبان کی ابتدا میں ملا۔ سرورق پر مسافر ساحل کی ریت پر اپنے نقش یا چھوڑتا ہوا کہیں بہت دور نکل گیا۔ جو بہت دور نکل جاتے ہیں ناں، پھر ایک روز وقت کی بے رحم لہریں ان کا نشان بھی دھو ڈالتی ہیں۔ شاید یہی بات نائل گرل بھی سوچ رہی ہے۔ ابتدا میں میں جون جی مشاعرہ میں شریک تھے۔ تاریخی کہانی چراغ افغان میں تاریخ چچ چچ چچ چچ ہر حکمران وقت کو کبھی نظر آتی ہے کہ مجھ سے سبق لےکھو، مجھ سے عبرت پڑو مگر کوئی نہیں جو اس سبق آموز نندہ پر آواز دھرتا ہو۔ دوسری جنگ عظیم کے بھڑکتے شعلوں کے مابین پیار کی چنگاری کو راکھ کے پھول میں سلگتا ہوا محسوس کیا۔ ہر بار ہمارے دل کو چڑا لینے کے فن سے آشنا تک ویلٹ اب کی بار ایک فیس میں دوبار ایش ٹرے چراتے نظر آئے۔ غیر معمولی مشابہت نے غیر ضروری میں تو جیسے آغا انکل کے ہنستے ہنستے گھر میں ہم ہی پھوڑ دیا۔ سازشی کردار میں بیگ صاحب جان تو زحمت کے بعد اصل قاتل طارق شاہ کا چہرہ قانون کے سامنے لانے میں کامیاب رہے۔ مگر پھر کہانی کم اور دوا فراد کے مابین ہونے والی مکالمہ بازی زیادہ لگی۔ سسپنس ڈائجسٹ کے مستقل مصنف ڈاکٹر شیر شاہ سید نے طوائف کے روز شپ کا احوال قلم بند کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری ہائی کلاس سوسائٹی کے طرز زندگی کے منہ پر طمانچا مارا ہے۔ انتخاب میں جان مالکوا اصلی کو اس کی محبت ایس جوزف مل گئی، بس اقرار محبت کرنے میں تھوڑا وقت لگ گیا۔ غلامی میں مارش کا باپ تو بالکل مشرقی دادا ثابت ہوا۔ چشم کم کے اختتام نے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ حضرت سلیمان کی اسلامی داستان کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ایک بار پھر اگلے حصے کا ابھی سے انتظار ہے اور یوں ہم حکمین لاش سے عمدہ سبق حاصل کرتے ہوئے در اور دروازہ پر جا پہنچے۔ صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ عشق حقیقی اور عشق مجازی کے درمیان فرق جاننے والے با ذوق قارئین کے لیے در اور دروازہ حتمہً خاص ثابت ہوگی۔ ہمارے محبوب سسپنس ڈائجسٹ کا اگلا شمارہ رمضان المبارک اور آزادی کی خوشیاں ایک ساتھ لائے گا۔ میری طرف سے یہ خوشیاں سسپنس کی پوری ٹیم کو خصوصی طور پر اور سسپنس کے با ذوق قارئین کو مجموعی طور پر مبارک ہوں۔“ (آپ کو بھی مبارک ہوں۔)

✽ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن، خانوال سے تشریف لائے ہیں۔ ”جولائی 2012ء کا شمارہ بہت تاخیر سے ملا۔ اس تاخیر کا سبب 18 جون کو لوڈ شیڈنگ کے خلاف ہونے والا خونی احتجاج تھا۔ عوام احتجاج کرتے ہوئے وزیر اعظم کے مشیر اور ”ایرا“ کے چیئر مین احمد یار ہراج کے محل نما مکان پر پہنچے تو پرائیویٹ سکیورٹی کارڈز نے بجائے ہوائی فائرنگ کر کے ہجوم کو منتشر کرنے کے عوام پر سیدھا فائر کھول دیا جس سے 3 افراد ہلاک اور 5 زخمی ہو گئے۔ اس خونی واقعے کے بعد خانوال شہر میدان جنگ بن گیا (اللہ اس ملک پر رحم فرمائے) سرورق پر موجود لڑکی نہ ہوتی یا کچھ بہتر ہوتی تو سرورق یقیناً لائق تحسین ہوتا۔ جون ایلیا مشاعرہ کو تجارتی بنیادوں پر استوار کرنے کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ کیا کہا جائے کہ اب تو میل ملاقات میں بھی نفع کا پہلو دیکھا جاتا ہے۔ خطوط کی محفل میں تفسیر عباس اپنے مخصوص انداز میں لکھے گئے تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر موجود ہیں۔ مبارک باد قبول فرمائیں اور آپ کی رائے سے ایک بار پھر اتفاق کرتے ہیں کہ محفل کے صفحات بڑھا کر بلیک لسٹ سے جان چھڑائی جائے۔ تفسیر عباس کے تبصرے میں ان کی ذاتی زندگی سے آگاہی ہوئی اچھا لگا، مگر نہ سسپنس کی طرح سارے دوست جو محفل میں شامل ہوتے ہیں وہ بھی سسپنس ہی بنے ہوئے ہیں۔ طاہر الدین خواتین کو کھین لگاتے نظر آئے بھائی میرے اس کے لیے ہمایوں سعید ہی کافی ہے آپ اپنی انرجی ضائع نہ کریں۔ عمران علی ناں اسٹاپ تبصرہ کرتے ہوئے مصروف پائے گئے ایسا کاجھوت یہاں بھی سرچڑھ کے بول رہا تھا۔ ساجدہ راجا ویلکم۔ محفل میں دوست نوک جھوک کرتے ہیں، تنقید نہیں۔ جواب دینے کے لیے ایک ماہ کا انتظار عجب کیفیت میں مبتلا رکھتا ہے۔ اس دور میں جہاں 8 روپے میں تین کھٹے بات ہو سکتی ہے وہاں شمارے کے معیار کے علاوہ یہ دوستوں کی محفل ہی ہے جو ہمیں خط لکھنے پر مجبور کرتی ہے (نوازش ہے آپ کی) حاجی عبدالحکیم صاحب! ہم نہ آپ کو بھولے ہیں اور نہ ہی آپ کو محفل سے جانے دیں گے۔ احسان سحر میا نوالی! بھئی کافی لمبی غیر حاضری کے بعد آئے ہیں؟ اپنے حکیم رضا شاہ اور خواجہ مدنی کو بھی ساتھ لیتے آنا تھا۔ بابر عباس کھاریاں! بہت افسوس ہوا آپ کے بارے میں پڑھ کر، آپ کی اسیری کے دوران آپ سے رابطہ کرنا چاہا تو تمام نمبر بند تھے اللہ کا شکر ہے کہ آپ کو رہائی نصیب ہوئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی، پروین اور امیر نواز کا ایک ساتھ غائب ہونا واقعی معنی خیز ہے۔ میڈم کا کردار ابھی تک اسرار میں ہی لپٹا ہوا ہے۔ مشکول میں شیخ حامد کی بوکلاہٹ مزہ دے رہی ہے۔ جولیا نا یقیناً شیخ حامد کے لیے ایک نیا ٹریپ ہے۔ دارا میجر عاطف کے ساتھ مل کر اچھی خاصی کامیابی حاصل کر چکا ہے جس کی مدد سے وہ شیخ حامد سے سو دے بازی کر سکتا ہے۔ ”راکھ کے پھول“ جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے آشکار کر رہی تھی۔ چیڈ جیسے محب وطن ایجنٹس تقریباً ہر دور میں رہے ہیں جو گناہ ہی رہ جاتے ہیں۔ سب سے اچھی بات ماضی کو بھول کر حال کو بہتر بنانے کا بیخام لگا۔ طاہر جاوید محفل کی ”غیر ضروری“ اتفاقات سے بھرپور رہی۔ دوسری شادی کو جس طرح معاشرتی جرم بنا دیا گیا ہے وہاں خفیہ شادیوں یا بے راہ ردی کا قاعدہ ہی ہوتا ہے۔ ارے! بچ کے کہیں بیگم ہی نہ پڑھ لے مرزا امجد بیگ سازشی کردار سے آشنا کراتے نظر آئے۔ حنیف کی خوش قسمتی کہ بیگ صاحب جیسا وکیل مل گیا ورنہ اس طرح پھنسنے والے اکثر ملزم جرم بے گناہی کی بیخست چڑھ جاتے ہیں۔ ”دور دروازہ“ جاگیر دارانہ ظلم و استبداد کی روایتی کہانی تھی تاہم انجام غیر روایتی ہوا۔ وڈیرالف خان اور وزیر خان خدا کی بے آواز لامٹی کا شکار ہو گئے۔ خالق داد اور نور خاتون کے علاوہ سائین بھی بامراد ہو گئی۔ ”مگن چکر“ غلام قادر کے مخصوص انداز میں لکھی گئی تحریر تھی۔ کیا یہی وہ غلام قادر ہیں جو اکثر جاسوسی میں سرورق کے رنگ لکھتے رہے ہیں اور کافی عرصہ سے غائب ہیں؟ (جی جناب

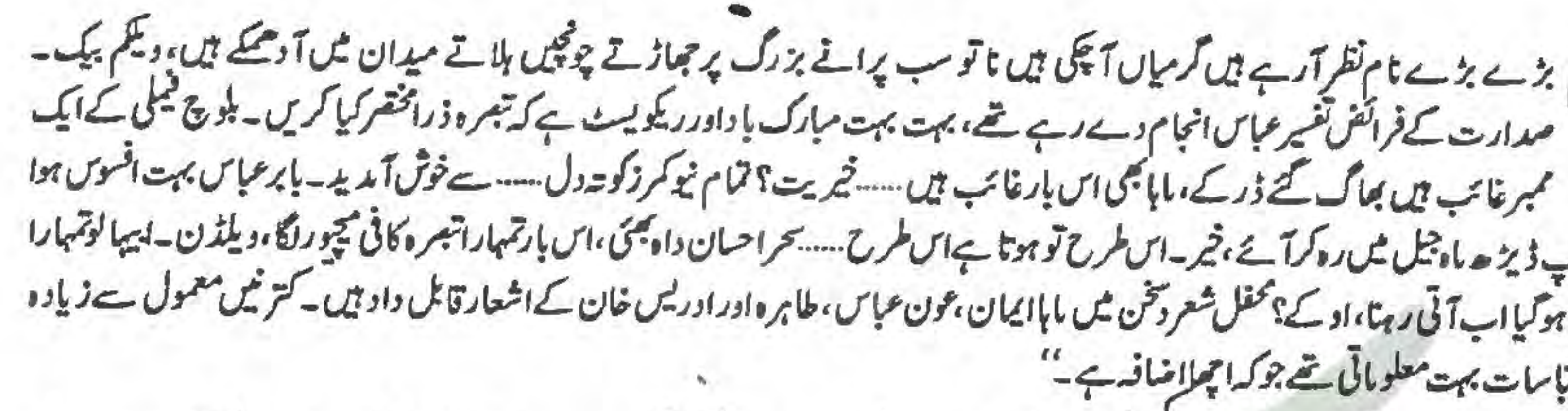


اور اب آپ ان کی کہانیاں اکثر پڑھا کریں گے) تنویر ریاض کی ”غلامی“ پڑھ کر اپنے معاشرے میں والدین اور اولاد کے درمیان پائے جانے والے تعلق پر فخر محسوس ہوا۔ مریم کے خان کی ”انتخاب“ کیونٹی کیشن کے غلط استعمال سے آگاہ کر رہی تھی جہاں انٹرنیٹ پر چیت اور چند فون کالز نے ابلی جوزف کو اتنا بے چین کر دیا کہ وہ اسے ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی۔ یہ تو خوش قسمتی تھی اس کی کہ جون مالکوا ایک شریف جوان تھا۔ ام رباب کی کترینیں کا بیہوشی کی طرح لا جواب انتخاب پڑھنے کو ملا۔“ (بھرپور تبصرے کا شکر یہ)

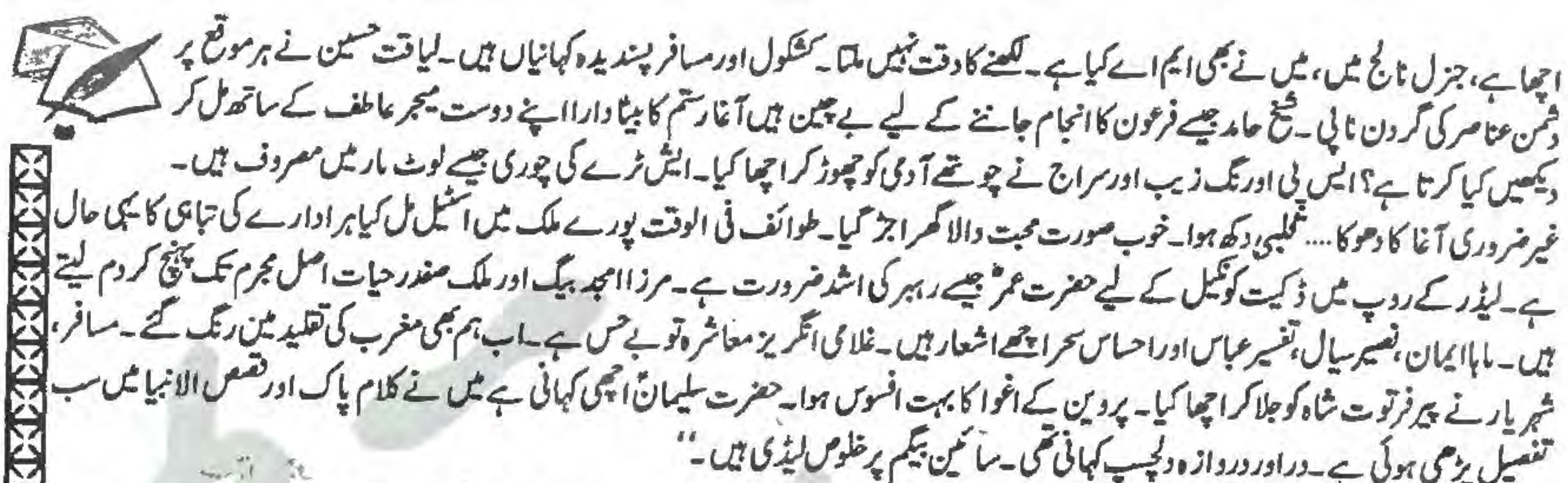
✽ این ایس آر مدثر، بلدیہ ٹاؤن کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ”سب سے پہلے تو تمام سسپنس اسٹاف اور قارئین و دوستوں کو ماہ صیام رمضان المبارک بہت بہت مبارک ہو۔ دعا ہے اللہ تبارک و تعالیٰ اس مبارک مہینے کے صدقے ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ ہمارے ملک کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ ہمیں اس مہینے کی برکتیں اور رحمتیں سسپنس کی توفیق عطا فرمائے۔ اس شہر کا قد میں قتل و غارت ختم ہو، آمین۔ سرورق سمندر کی موجوں سے دکھ لگ رہا تھا۔ دو شیزہ متاثر کن نہیں تھی جبکہ پس منظر میں گھوڑے کی ایڈیٹنگ نہایت بری لگی۔ اشتہارات سے صرف نظر کرتے ہوئے محفل میں پہنچے جہاں مدیر اعلیٰ کوہستان کے واقعے پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ اس مرتبہ تفسیر عباس بھائی بازی لے گئے مبارک ہو آپ کو۔ آپ کا تبصرہ لفاظی کا خوب صورت شاہکار تھا۔ ماہا ایمان کو آپ کا دیا ہوا جواب پسند آیا۔ راجا ثاقب بھائی آپ کے جذبے کو داد دیتا ہوں جو آپ مختصر تبصرہ کرتے ہیں۔ رجینی ٹیل کی ہر کہانی ایسی ہی ہوتی ہے جانے کیوں لوگ ان کی بولڈ کہانیاں پسند کرتے ہیں؟ حسین عباس بلوچ بھائی کیسے ہیں آپ اور آپ کے دوست؟ طاہرہ یاسین صاحبہ کیسی ہیں اب آپ کی والدہ؟ عمران حیدر بلوچ آپ کو ساگر مبارک ہو۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام قیدی دوستوں کو رہا کرے، آمین۔ قدرت اللہ نیازی کیسے ہیں جناب آپ؟ گیارہ سیکٹر میں مسلسل برف باری کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوئی پر کچھ پیش رفت ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ ان جوانوں کی شہادت قبول فرمائے۔ عمران علی ہماری دعا میں آپ کے ساتھ ہیں۔ حاجی صاحب محفل کے تمام دوستوں کے لیے دعا کیجیے گا۔ آپ ایک ماہ کے وقفے سے بھی محفل میں شریک ہو سکتے ہیں۔ 17 جون کو ہی بابر عباس بھائی کا فون آیا جس میں اپنے جیل جانے کا قصہ، دل پڑیر ستیا۔ وہ بھی عام پاکستانی کی طرح پولیس سے بدظن دکھائی دیے۔ ہمایوں تنویر خوش آمدید۔ آپ کا اس دفعہ شعر شاندار لگا۔ ہمایوں سعید اپنا انداز بدلو چھوڑے نہ جو۔ طاہرہ گزرا بلیک لسٹ میں نظر آئیں ہمت نہ ہاریں۔ جون کے شمارے میں حمیرا رضا کی انٹری ہوئی۔ محترمہ آپ کہاں رہی ہیں اتنے دنوں؟ روشنی رشید آپ تو بہت مصروف ہو گئیں، شادی تو نہیں ہوئی آپ کی؟ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی چراغ افغان شاندار کہانی ہے، سلطان بھلول بہادر بادشاہ گزرا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں پڑھ کر ایمان کو تقویت ملی جس واقعے کا ذکر آخر میں کیا جا رہا ہے وہ میں پڑھ چکا ہوں بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے انہیں شاندار معجزے عطا فرمائے (ارے کہانیوں پر اتنا سا تبصرہ!) محفل شعر و سخن میں ہمایوں تنویر، ماہا ایمان اور قدرت نیازی کے شعر اچھے لگے۔ کترینیں اس مرتبہ کافی سے زیادہ تھیں اور خوب تھیں۔ محترمہ غدار رسول صاحب گریا دھوپ کو میں نے جنوری یا فروری میں آپ سے گزارش کی تھی کہ سید منصور حلاج اور حجاج بن یوسف کے بارے میں لکھیے۔ یہ 7 واں مہینہ ہے ابھی تک میری درخواست پر عمل نہیں ہوا۔“ (آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے)

✽ عبد الرؤف عدم، راولپنڈی سے چلے آ رہے ہیں۔ ”لیجے جناب! معرفت جیسے جابر جاگیر دار کے قبضے سے اپنی ”فرست کی زمیں“ مشکل سے ”واگزار“ کراتے ہی ہم ”عالی جاہ شہنشاہ سسپنس“ کی سلطنت کی حدود میں قدم رنجرفر ماچکے ہیں۔ اب کوئی ہمارے بارے میں یوں اظہار خیال فرمائے کہ ”ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے“ تو ہمارے سر آنکھوں پر..... اور اگر کوئی یوں طنز فرمائے کہ ”لوٹ کے بدحوہ گھر آئے“ تو بھی ہمارے ناک ماتھے پر..... سرورق کی دو شیزہ پراک ”نگاہ درست“ ڈالی لیکن دو شیزہ کی نگاہوں کا مرکز کسی اور کو پایا..... تو ہمیں غصہ آیا..... لیکن ہم نے اپنے غصے پر قابو پایا اور جون ایلیا کے ”مشاعرہ“ میں جگہ بنائی..... مشاعرے کے بارے میں سچی اور کڑوی باتیں پڑھ کر مزہ آیا۔ پھر ہم نے قدم آگے بڑھایا..... تو اپنے سامنے ایک بارورق محفل کو پایا..... تفسیر عباس بابر، کرسی صدارت مبارک ہو بیٹیا، لیکن ذرا احتیاط سے، سنا ہے آج کل کوئی کرسی محفوظ اور مضبوط نہیں ہے۔ محمد قدرت اللہ نیازی، بیٹیا آپ نے یہ نہیں لکھا کہ نیازی کے آنے کے بعد سرورق کی حسینہ کی کیفیت کیا ہوئی؟ ساجدہ راجا، آپ کو ایسا کیوں لگا کہ آپ کو ”بوزمی ٹائپ“ سمجھا جائے گا..... ویسے آپ کی اس بات سے ہمیں اتفاق ہے کہ تنقید سے دوسروں کی شرمندہ نہیں کرنا چاہیے۔ حاجی عبدالحکیم صاحب، جانے کی باتیں جانے دیں۔ ایسا انصاری کا مسئلہ ہم نے پڑھا تھا، ہم سے جو ہوسکا ہم ضرور ان کی مدد کریں گے، اگر ابھی تک ان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکا تو ہمیں بتایا جائے (جی جناب مسئلہ ہنوز باقی ہے) دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھی گئی کہانی راکھ کے پھول بہت پسند آئی، لولیتا کا کردار بہت خوب صورت تھا۔ ایش ٹرے کی چوری میں تک ویلٹ نے آخر کار اپنی ذہانت کے باعث اپنا معاوضہ وصول کر ہی لیا۔ اپنے پسندیدہ مصنف طاہر جاوید محفل کی ”غیر ضروری“ کو پڑھنا بہت ضروری تھا اس لیے پڑھی اور واقعی مزہ آ گیا۔ بعض اوقات معمولی سا واقعہ بھی زندگی کا رخ بدل دیتا ہے۔ مرزا امجد بیگ نے سازشی کردار میں معاشرے کی ایک اہم برائی کو بے نقاب کیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی طوائف نے وقت ضائع کیا۔ مریم کے خان کی انتخاب بہت پسند آئی۔ مغرب میں جون مالکوا اور ایس جیسے معصوم اور محبت سے بھرپور کردار کم کم نظر آتے ہیں۔ غلامی میں دادا کی اپنے پوتے پوتیوں سے محبت لا جواب ہے۔ چشم کم دلچسپ اور مزے دار کہانی ثابت ہوئی۔ در اور دروازہ میں عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف سفر کی کوشش دکھائی گئی۔ اوسط درجے کی کہانی ہے۔“

✽ سعدیہ بخاری ضلع انک سے محفل میں شریک ہوئی ہیں۔ ”جولائی کا شمارہ بہت ہی لیٹ ملا۔ جولائی کے شمارے کا نائل کا بیگ گراؤ نہ بہت خوب صورت ہے لیکن حسینہ کی ناک مجھے پسند نہیں آئی البتہ آنکھیں اور بال بہت خوب صورت ہیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا، شاعروں اور مشاعروں پر تبصرہ کر رہے تھے۔ واقعی پرانے زمانے کے مشاعروں کی تو کیا بات ہے صحیح معنوں میں ادبی مشاعرے کہلاتے تھے۔ ادارے میں مدیرہ اعلیٰ جس واقعہ کا ذکر کر رہی تھیں اس کے انجام کا تو حال پتا نہیں چل سکا البتہ یہ بات خوش آئند ہے کہ اب میڈیا کی وجہ سے ایسے واقعات چھپے نہیں رہ سکتے۔ آپ محفل یا راں میں تو



✽ چوہدری احمد خان، راولپنڈی سے تمبرہ کر رہے ہیں ”محفل میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں (خوش آمدید) انشاء یہ میں جون ایلیا، معراج صاحب سدا حق اور دل کی بات کرتے ہیں۔ تفسیر عباس اوکاڑہ اول اچھا تمبرہ مگر لباً۔ راجا ثاقب، حسنین عباس، عمران حیدر، طاہرہ یاسمین سرگودھا کے رہے تھے۔ بھائی حسنین و عمران کس جرم میں کب تک جیل میں؟ اللہ آزادی عطا فرمائیں۔ قدرت اللہ نیازی صاحب آپ نے سعدیہ بخاری انک کو انے کا مشورہ دیا۔ سیرے ساتھ گلگت، سوات، شمالی علاقہ جات کے کام کرنے والے ساتھی با دام اور دیگر موعظات خوب کھلاتے ہیں۔ سعدیہ بخاری پتا تمہ کام کرنے والے انک کے ساتھیوں کے ہاتھ با دام بھیج دیں گے۔ دیگر ساتھیوں کے تمبرے ابھی تھے۔ ڈاکٹر ساجد صاحب آپ کا تاریخی مطالعہ



رمضان یا شاہگلشن اقبال کراچی سے محفل کو رونق بخش رہے ہیں "تازہ سسپنس کا سرورق سارے کا سارا محکین تھا، سمندر محکین، ریت محکین، دوشیزہ بھی محکین ہی لگ رہی تھی۔ سرورق جتنا محکین تھا پس ورق اتنا ہی میٹھا تھا۔ اس بار فہرست میں عنوانات کے حاشیے بہت خوب صورت تھے۔ اس دفعہ کا انشاء یہ پسند نہیں آیا۔ خطوط کی محفل میں اس عاجز کا خط بھوک چھرا رانی رودی کی نوکری کی شکم پری کے کام آیا جبکہ تفسیر عباس کا خط اول نمبر پر لگا تھا، کیا مبارک باد دوں؟ ویسے موصوف کا طویل تبصرہ قابلِ داد تھا، کیا خوب! (داد بھی دیتے رہے کرتے رہے بے داد بھی.....) (جعفر حسین بھوانہ صاحب میرا شکریہ ادا کرنے کا شکریہ۔ کھاریاں والے بابر عباس بھائی سیرانام پڑھ کر دیوتا کا منی کردار والا پاشا کیوں یاد آیا۔ شبت کردار کے حامل پاشا کیوں یاد نہیں آئے مثلاً مصطفیٰ کمال پاشا، انور کمال پاشا، غفار پاشا، جنرل پاشا وغیرہ، آپ کے خیالات ہی منی ہیں، اکیلے میں کیا کرتے ہو؟ دیگر تبصروں میں راجا تائب نواز تائب، طاہرہ یاسمین، جعفر حسین بھوانہ کے تبصرے اچھے لگے۔ اشعار کی محفل میں ہمایوں خولی کا انتخاب اچھا تھا، ماہا ایمان کا قطعہ بھی لا جواب تھا، کھاریاں والے بابر عباس کا چتاؤ بھی دل کو بھایا، قدرت اللہ نیازی کا شعر بھی پسند آیا۔ مجھ فقیر کا شعر غائب تھا۔ اناللہ۔ اور اب کہانیوں پر تبصرہ۔ کافی عرصہ بعد تک ویلوٹ ایئر ٹرے چوری کرنے آگیا، دوسری تمام غیر ملکی کہانیاں بہت خوب تھیں، خصوصاً محکین لاش بہت پسند آئی۔ دل دہلانے والی کہانی راکھ کے پھول نے بہت متاثر کیا۔ قسط وار کہانیاں کنگول اور مسافر کی اس دفعہ کی اقساط بہت ہی دینگ تھیں۔ اغوا، نل اور مار دھاڑ سے بھر پور قسطیں تھیں۔ سازشی کردار میں عدالتی کارروائی میں خوب لطف آیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ در اور دروازہ دگلش میں لگا دیتے۔ کترین سب کی سب پر لطف تھیں۔ آخر میں سیری جانب سے عملے کے تمام افراد کو سلام اور دعا میں خاص کر شمر عباس صاحب کو خصوصی سلام۔"

فیصلے فقیروں کے

ڈاکٹر ساجد امجد

وقت کے مانند آگے بڑھنا انسان کی سرشت سہی مگر کبھی کبھی پلٹنے کو بھی دل چاہتا ہے اور... بس وہی ایک لمحہ اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیتا ہے۔ ماضی میں ڈھلنے والے لمحوں کی یہی ایک خوبی ہے کہ وہ اپنے سحر سے نکلنے نہیں دیتے۔ یہ بھی ان لمحوں کی روداد ہے جب دہلی کی گلیوں میں خوف کے سائے منڈلا رہے تھے کیونکہ سلطان غیاث الدین نے بنگال سے اللہ کے ولی نظام الدینؒ کو دہلی چھوڑنے کا پیغام بھیجا تھا... اس موقع پر آپ نے وہ تاریخی جملہ کہا جو آج بھی محاورہ استعمال ہو رہا ہے... ”ہنوز دلی دور است پھر س ولی کی پیش گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی اور دلی بادشاہ سے ہمیشہ کے لیے دور ہو گئی۔ جب اس کا جانشین سلطان محمد تغلق تخت نشین ہوا تو علما اور مشائخ کے قتل عام سے بغداد اور مصر کا ہم پلہ ایک سو ستر سال پرانا شہر دہلی ویران ہو کر رہ گیا۔ اس کی ضد نے ہندوستان کی سبز مین کو خون میں نہلا دیا۔ دنیاوی تخت شاہی پر بار بار چہرے بدلنے میں اللہ کی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ سمجھنے والوں کے لیے بہت بڑی بات ہے۔ چند روزہ اقتدار میں اختیارات کا بے دریغ غلط استعمال... اور پھر بالا خروپی فانی زندگی... بس یہی ایک وہ نکتہ ہے جسے بشر بھلائے ہوئے ہے۔ عروج و زوال پر مشتمل شاہوں کا جاہ و جلال اور تاریخ کی نیرنگی۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

اور دیو اس کے مقابلے کی تاب نہیں لاسکا اور قلعہ بند ہو گیا۔
الغ خان نے عاجز آ کر ایک طرف نقب زنی کا حکم دیا، دوسری طرف حملہ شروع کر دیا۔ اب راجا کے پاس کوئی چارہ کار نہ تھا۔ قلعہ ہاتھ سے نکلتا ہوا معلوم ہوا تو اس نے روایتی تدبیر کی۔ لغ خان کی خدمت میں ہاتھی اور بیش بہا جواہرات بھیجے اور وعدہ کیا کہ جو رقیں اور ہدیے وغیرہ علاؤ الدین خلجی کے عہد حکومت میں دیا کرتا تھا وہ بہ دستور جاری رکھے گا۔ لغ خان نے ان شرائط کو منظور نہیں کیا اور محاصرہ جاری رکھتے ہوئے قلعہ فتح کرنے میں مشغول ہو گیا۔
محاصرہ طویل پکڑتا جا رہا تھا لیکن ایک مہینہ ہو گیا تھا اور دہلی سے کوئی ڈاک نہیں پہنچی تھی۔ یہ غیر معمولی بات تھی کیونکہ ہفتے میں دو مرتبہ ڈاک ضرور آتی تھی۔ لغ خان بادشاہ کی طرف سے ہدایت کا منتظر تھا، اب اسے دہلی کے حالات کی

دہلی کی سڑکوں پر دھوپ کی حکومت تھی۔ سورج زمین پر اتر آیا تھا۔ بھری دوپہر میں بازار انسانوں سے خالی تھے۔ پرندے پتوں میں، لوگ گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ آگ کے آسمان تلے تانبے کی زمین پر چلتے ہوئے دو سوار دہلی سے باہر نکل رہے تھے۔ ان میں سے ایک مشہور شاعر عبید تھا دوسرا اس کا ساتھی شیخ زادہ دمشق تھا۔ یہ دونوں اتنے غیر معروف نہیں تھے کہ کوئی انہیں دیکھتا اور یہ نہ پوچھتا کہ برستی آگ میں گھوڑے پر سوار کہاں کا ارادہ ہے۔ ان کی قسمت اچھی تھی۔ سڑک سنان تھی، کوئی انہیں دیکھنے والا نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے یہ وقت انہوں نے جان بوجھ کر منتخب کیا ہو۔
یہ وقت وہ تھا جب غیاث الدین تغلق کا بڑا بیٹا ملک نخر الدین جوٹا عرف لغ خان تلنگانہ کی مہم پر نکلا ہوا تھا۔ پرانے ارکان دولت اور ممتاز علاقائی امیر اس کے ساتھ تھے۔ حاکم ورنگل



فکر ستانے لگی تھی۔

عبید شاعر اور شیخ زادہ دمشقی دہلی سے نکل کر سیدھے اس کے پاس پہنچے تھے۔ یہاں پہنچ کر انہیں سب سے پہلی خبر یہ ملی تھی کہ دہلی سے ڈاک کا سلسلہ بند ہو گیا ہے اور الخ خان اس صورت حال سے سخت پریشان ہے۔ ان کے سازشی ذہنوں نے اسی وقت ایک سازش تیار کر لی۔

الخ خان کے لیے یہ دونوں اجنبی نہیں تھے۔ دونوں حضرت نظام الدین اولیا کے مرید تھے۔ الخ خان بھی حضرت کا عقیدت مند تھا۔ ان دونوں سے وہاں ملاقات کر چکا تھا۔ عبید کی شاعرانہ حیثیت کا بھی قائل تھا۔ اس نے جب سنا کہ وہ دونوں دہلی سے یہاں پہنچے ہیں تو اسے لامحالہ یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ ان سے ملاقات کی جائے تاکہ بادشاہ کی خیریت معلوم ہو۔

یہ دونوں تو چاہتے ہی یہ تھے کہ کسی طرح شہزادے کا قرب حاصل ہو جائے۔ اب پیاسے اور کنوئیں والا معاملہ تھا۔ کنواں خود پیاسوں کو بلارہا تھا۔ وہ دونوں ملازموں کی طرح حاضر ہو گئے۔

”تم دونوں دہلی سے یہاں آئے ہو۔ کیا بتا سکتے ہو ایسے کیا حالات ہوئے ہیں کہ دہلی سے رابطہ ہی ختم ہو گیا ہے۔ راستے میں وہ چوکیاں تو دیکھی ہوں گی جن کے ذریعے سرکاری ڈاک یہاں تک پہنچتی تھی؟“

”ہم نے چوکیوں پر تو غور نہیں کیا لیکن دہلی سے کئی سو میل دور پہنچنے کے بعد یہ خبر ضرور سنی تھی کہ.....“ یہاں تک کہنے کے بعد دونوں خاموش ہو گئے تھے۔

”کیا خبر سنی تھی، کیا ہوا..... تم بولتے کیوں نہیں؟ خاموش کیوں ہو؟“

”خبر یہ سنی تھی کہ آپ کے والد سلطان غیاث الدین تغلق کو چند امرا نے سازش کر کے قتل کر دیا ہے اور آپ کے چچا زاد بھائی فیروز خان کو تخت پر بٹھانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ آپ کے علم میں ہے کہ شہزادہ فیروز کی تنہا ہندو مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے ممکن ہے اس سازش میں کچھ ہندو راجا بھی شریک ہوں۔“ عبید شاعر نے تفصیل بتائی۔

”کیا تم یہ خبر پورے وثوق سے بیان کر رہے ہو؟“

”ہم نے تصدیق تو نہیں کی۔ ہم نے سوچا بھی تھا کہ دہلی واپس جا کر اس کی تصدیق کریں لیکن ہمیں ہمت نہیں ہوئی اور ہم آپ کی پناہ میں آ گئے۔“

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے کس کام سے دہلی چھوڑی تھی؟“

یہ سوال سن کر عبید شاعر تو کچھ دیر کے لیے لڑکھڑا گیا۔ لیکن شیخ زادہ دمشق نے حالات کو سنبھال لیا اور ایسا جواز پیش کیا کہ شہزادہ کو قاتل ہونا پڑا۔

”میں ایک رات اور ادو وظائف کے بعد حالت مراقبہ میں تھا کہ میں نے تخت شاہی کو خون میں تیرتے ہوئے دیکھا۔ عالم حویت سے باہر نکلتے ہی میں نے فیروز شاہ (الخ خان کا چچا زاد بھائی) کی سرگرمیوں پر نظر ڈالی تو مجھے یقین ہو گیا کہ میرا خواب جھوٹا نہیں۔ شہزادہ فیروز امرا سے ساز باز کر رہا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ میں بھی اس کا آنا جانا بڑھ گیا ہے۔ وہ سمجھ رہا ہے خواجہ نظام الدین کی دعاؤں سے اس کی مراد پوری ہو جائے گی۔“

”حضرت نظام الدین کو اس کے عزائم کا علم ہے؟“

”یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن وہ شہزادے سے خوش بہت ہیں۔“

”آگے سنا۔“

”مجھے یہ خواب دیکھ کر دہلی میں رہنے سے خوف محسوس ہونے لگا۔ میں نے اپنا خواب عبید کو سنایا۔ وہ بھی خوف زدہ ہو گیا۔ ہم دونوں نے طے کیا کہ آپ کی سرکار میں حاضر ہوں اور آپ کو مطلع کر دیں تاکہ آپ نقصان سے بچ جائیں۔“

ایک مہینے سے ڈاک نہیں آئی تھی لہذا الخ خان کو ان کی باتوں پر یقین آ گیا کہ دہلی میں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

”میں اس مہم سے فارغ ہوتے ہی لشکر لے کر دہلی کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ اس وقت تک تمہیں یہ کرنا ہے کہ ان باتوں کا علم لشکر میں کسی کو نہ ہونے پائے ورنہ لشکر میں بددلی پھیل جائے گی۔“

”شہزادہ مکرم! ایسی باتیں چھپنے والی نہیں ہوتیں۔ کوئی اور ذریعہ ان خبروں کو لشکر تک پہنچا دے گا۔“

”اس وقت تک تو میں ورنگل فتح کر چکا ہوں گا۔“

ان دونوں نے شہزادے کو مشورہ دیا کہ وہ محاصرہ اٹھا کر دہلی چلے جائیں اور وہاں کے حالات دیکھ کر کوئی قدم اٹھائیں۔ شہزادہ محاصرہ اٹھانے پر تیار نہیں تھا۔ وہ دونوں کئی دن برابر اس کے پاس آتے رہے اور اسے محاصرہ اٹھانے پر مجبور کرتے رہے۔ وہ کیوں ایسا کر رہے تھے، تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ کس کے کہنے پر کر رہے تھے اس کے شواہد بھی نہیں ملتے۔ شاید وہ اپنی سازشی فطرت سے مجبور تھے۔

جب ان کے اصرار کے باوجود شہزادہ محاصرہ اٹھانے پر تیار نہیں ہوا تو انہوں نے سوچا کوئی ایسی چال چلنی چاہیے جس سے لشکر میں افراتفری پیدا ہو جائے۔ اس مقصد کی تکمیل

کے لیے انہوں نے چار قدیم امرا کا انتخاب کیا۔ یہ چار وہ تھے جو غیاث الدین تغلق کی بادشاہت سے پہلے علاؤ الدین خلجی کے دربار سے وابستہ رہ چکے تھے۔ ان میں سے ایک ملک ٹکین تھا، اس کا تعلق اودھ سے تھا۔ دوسرا ملک تمر تھا۔ تیسرا ملک گل افغان اور چوتھا ملک کافور مہر دار۔

یہ چاروں اپنی اپنی فوج کے ساتھ شہزادے کی فوج میں شامل تھے۔ اگر یہ امرا کسی وقت شہزادے کا ساتھ چھوڑ دیتے تو شہزادے کے لیے جان بچانا مشکل ہو جاتا۔

سہولت یہ بھی تھی کہ ان چاروں کی وفاداری کو بے آسانی مشکوک بنایا جاسکتا تھا۔

عبید شاعر اور شیخ زادہ دمشقی نے یہ کہہ کر ان چاروں کو خلوت میں جمع کیا کہ وہ انہیں ایک خاص خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔

یہ امرا جمع ہو گئے تو سب سے پہلے ملک ٹکین نے بولنا شروع کیا۔

”وہ کون سے خطرات ہیں جن سے آپ حضرات ہمیں آگاہ کرنا چاہتے ہیں؟“

”شاید آپ کے علم میں اب تک نہ ہو کہ غیاث الدین تغلق قتل کیا جا چکا۔ فیروز تغلق نے تخت پر قبضہ کر لیا ہے۔“

”کیا تم یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہے ہو؟“

”نہیں، ہم نے راستے میں خبریں سنی ہیں۔“

”یہ خبریں غلط بھی تو ہو سکتی ہیں۔“

”یہ خبریں غلط ہو سکتی ہیں لیکن ان کے رد عمل میں شہزادے نے جو باتیں کی ہیں وہ غلط نہیں اور ان باتوں کا تعلق آپ چاروں سے ہے۔“

”غالباً یہی وہ خطرہ ہے جس سے آپ ہمیں آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔“ ملک ٹکین نے نیم طنز یہ انداز میں کہا۔

”شہزادے کا خیال ہے کہ علائی امرا بھی اس سازش میں شریک ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ آپ چاروں اور دیو کے خلاف بے دلی سے لڑ رہے ہیں۔ اسی لیے ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ شہزادے نے مجھے اعیانہ میں لے کر اس عزم کا بھی اظہار کیا کہ وہ آپ چاروں کو قتل کرادے گا اور محاصرہ اٹھا کر اپنے بھائی فیروز سے لڑنے کے لیے جائے گا۔ آپ کو اسی لیے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا کہ آپ علاؤ الدین خلجی کے دربار سے وابستہ رہ چکے ہیں اور تغلق خاندان کے وفادار نہیں۔ آپ اسے نقصان ہی پہنچاتے رہیں گے جس طرح اب نقصان پہنچا رہے ہیں۔ آپ لوگ اب اپنی فکر کریں۔ اس سے پہلے کہ الخ خان دہلی جائیں آپ لوگ دہلی پہنچ کر

تھے بادشاہ سے ربط و تعلق پیدا کریں۔“

یہ باتیں کچھ ایسی دردمندی سے کہی گئی تھیں کہ ان امرا کو یقین آ گیا البتہ ملک تمر کچھ تذبذب میں تھا۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔

”اگر یہ باتیں درست بھی ہیں تو آپ دونوں کو ہم سے کیا ہمدردی ہے جو بتانے چلے آئے؟“

”ہم دونوں مشہور زمانہ دلی حضرت نظام الدین کے صحبت یافتہ رہ چکے ہیں۔ ان کی خانقاہ میں رہ کر ہم نے یہی سیکھا ہے کہ انسانی ہمدردی ہی اصل انسانیت ہے۔ اسی جذبے نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم آپ کو خطرے سے آگاہ کر دیں۔“

ان دونوں کے چلے جانے کے بعد ان امرائے آپس میں مشورہ کیا۔

”شہزادہ الخ خان ہماری طرف سے شک میں مبتلا ہو گیا ہے۔ ان بادشاہوں کے شیشے دل میں جب شک کا بال آجائے تو کبھی ٹکنا نہیں۔ شہزادہ الخ خاں ہمیں قتل کرائے بغیر نہیں مانے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے منصوبے پر عمل کرے اپنے اپنے لشکر لے کر الگ ہو جاؤ۔“

”ہم یہاں سے نکل کر کہاں جائیں۔ ابھی دہلی کی طرف۔۔۔ جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔“

”ہمیں فی الحال چاہیے کہ اپنے اپنے علاقوں کی طرف چلے جائیں۔ وہاں بیٹھ کر حالات پر نظر رکھیں۔ جیسے حالات ہوں اسی کے مطابق عمل کریں۔“

”دوستو! ہم اس پر بھی سوچ لیں تو بہتر ہوگا کہ اگر الخ خاں اپنے بھائی کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا اور بادشاہ بن گیا تو ہمارا کیا ہوگا۔“

”ہم چاروں الخ خان کو بادشاہ نہیں بننے دیں گے۔ اگر دونوں بھائیوں میں لڑائی چھڑی تو ہم اپنے اپنے لشکر لے کر فیروز تغلق کی مدد کے لیے دہلی پہنچ جائیں گے۔“

یہ چاروں امیر رات کے اندھیرے میں اپنے اپنے لشکر لے کر الگ ہو گئے۔ ان کے الگ ہوتے ہی لشکر میں ایسی افراتفری پھیلی کہ عام سپاہیوں نے بھی بھاگ جانے ہی میں عافیت جانی۔

شہزادہ اس ناگہانی آفت سے گھبرا گیا۔ اب محاصرہ جاری رکھنے اور جنگ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شہزادے کے ساتھ ایک مختصر فوج رہ گئی تھی۔ اس فوج کو لے کر وہ دیو گڑھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس علاقے پر غیاث الدین کی حکمرانی تھی۔

اس کے دیو گڑھ پہنچتے ہی دہلی سے ڈاک پہنچی۔ ان

پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ

آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ

لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

شاہی کے سامنے ان سب کو زمین پر اوندھالنا دیا گیا۔ اس کے بعد کئی ہاتھی نمودار ہوئے جو ان بد نصیبوں کو کچلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ زمین قیدیوں کے خون سے سرخ ہو گئی۔ اس دردناک منظر کو دیکھ کر پورا میدان چیخوں سے گونج اٹھا۔

”میں ان بد بختوں کو یہ سزا دینے پر مجبور ہو گیا تھا کیونکہ ان لوگوں نے وہ کام کیا تھا کہ اگر یہ کامیاب ہو جاتے تو پورے ملک میں افراتفری پھیل چکی ہوتی۔ انہوں نے میرے قتل کی جھوٹی خبر اڑائی۔ جھوٹی خبر اڑانے والوں کی یہی سزا ہونی چاہیے۔“

سلطان غیاث الدین نے اپنے وزرا سے کہا اور اپنی نشست چھوڑ دی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے وزرا بھی قصر کی بالائی منزل سے نیچے اتر آئے۔

اگلے چار مہینوں میں الٰہ خان نے اپنی منتشر افواج کو جمع کیا۔ نئی بھرتیاں بھی کیں اور ایک لشکر عظیم لے کر دیوگرہ سے ورنگل پر حملہ آور ہونے کے لیے نکلا۔ پہلے بیدر کا قلعہ فتح کیا جو تلگانہ کی سرحد اور راجا ورنگل کے زیر حکومت تھا۔ راستے کے دیگر قلعے بھی فتح کرتا ہوا آگے بڑھا۔ ان قلعوں کی حفاظت کے لیے معتمد امر اور سرداروں کو چھوڑتا ہوا ورنگل پہنچ گیا۔ اس مرتبہ وہ اس جوش سے لڑا کہ بہت کم مدت میں ورنگل کا قلعہ فتح کر لیا۔ جوش انتقام میں بہت سے ہندوؤں کو تہ تیغ کیا اور رائے اور دیو حاکم ورنگل کو اس کے بیٹے اور بیوی سمیت گرفتار کر لیا۔ کوہ پیکر ہاتھی اور لاتعداد خزانہ بھی اس کے ہاتھ لگا۔

فتح نامہ دہلی پہنچا تو چچاغاں کی روشنی سے پورا شہر جگمگا اٹھا۔ کئی دن تک خوشیاں منائی جاتی رہیں۔

الٰہ خان نے ورنگل کا نام سلطان پور رکھا اور راجا ورنگل کو بہ حالت اسیری دہلی کی طرف بھیج دیا۔ خود سیر و سیاحت کرتا ہوا چاج نگر پہنچا اور وہاں کے راجا سے بھی بہ طور ہدیہ چالیس ہاتھی وصول کر کے باپ کی خدمت میں روانہ کر دیے۔

لکھنؤ اور سارگاؤں کے چند امرا دہلی پہنچے۔ انہیں وہاں کے حاکموں سے شکایات تھیں۔ یہ امرا سلطان غیاث الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے جوہر و ستم اور مسلمانوں کی بے بسی کی کیفیت اسے سنائی۔ سلطان ان کی گزارشات سے بہت متاثر ہوا۔ مسلمانوں کی حالت زار کا سن کر تو وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے ان امرا سے وعدہ کیا کہ وہ اس دور دراز کی مہم پر ضرور روانہ ہوگا اور مسلمانوں کو مظالم سے نجات دلائے گا۔

سلطان نے الٰہ خان کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ

مراسلات پر شاہی مہر ثبت تھی۔ بادشاہ کی صحت و سلامتی کی خبر ملتے ہی الٰہ خان پوری بات سمجھ گیا۔ یہ ایک سازش تھی جو اس کے خلاف کی گئی تھی۔ اب اسے ان سازشیوں کا قلع قمع کرنا تھا۔ شہزادہ الٰہ خان نے تمام حالات سلطان کی خدمت میں لکھ کر بھیج دیے۔

اس نے اپنی مختصر فوج سے کام لیا۔ ملک افغان اور ملک کافور گرفتار کر لیے گئے۔ عبید شاعر اور شیخ زادہ مشقی دہلی واپس نہیں جاسکتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ ان کی پناہ گاہ بن سکتی تھی لیکن حضرت نظام الدین ان دونوں سے ناراض تھے۔ شاید اسی لیے یہ دونوں جگہ جگہ حضرت نظام الدین کا نام لیتے پھر رہے تھے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ اس سازش میں حضرت نظام الدین بھی شریک ہیں۔ اس کی سزا تو انہیں ملنی ہی تھی۔ وہ پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر گھومتے پھر رہے تھے کہ گرفتار کر لیے گئے۔

ملک تنگین کو مرہٹواڑی کے ہندوؤں نے قتل کر دیا اور اس کی کھال الٰہ خان کے پاس بھیج دی۔ ملک تملنگانہ پہنچا اور مرنے والے امرا ہیوں کے قتل کر دیا گیا۔

دہلی سے سلطان کا فرمان موصول ہوا کہ تمام قیدیوں کو دہلی بھیج دیا جائے۔

ابھی یہ تینوں یعنی ملک افغان، عبید شاعر، ملک کافور اور ان کے چند ساتھی دہلی پہنچے نہیں تھے کہ ان کے خاندان کے افراد زنجیروں سے جکڑ دیے گئے۔

تمام حالات کی چھان بین کی گئی تو صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ شہزادہ فیروز حضرت نظام الدین کی خدمت میں مسلسل حاضری دیتا رہا ہے۔ اس کے سوا کوئی ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ اس نے فیروز شاہ کو حکم دیا کہ وہ آئندہ ولی کی خانقاہ میں قدم نہیں رکھے گا۔ شاہی خاندان کے دیگر افراد پر بھی پابندی عائد کر دی کہ کوئی شخص شیخ نظام الدین سے میل ملاپ نہ کرے۔

اعلان کیا گیا کہ قصر شاہی کے سامنے قیدیوں کو عبرت ناک سزا دی جائے گی۔ اعلان سنتے ہی پورا شہر اٹھ آیا۔ سب کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں کہ دیکھیے بادشاہ نے ان کے لیے کیا سزا تجویز کی ہے۔ تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ نقارے بجنے لگے۔ نقاروں کی گونج کے ساتھ ہی سلطان غیاث الدین تعلق جھروکے میں آگیا۔ اس کے وزرا بھی اس کے ساتھ تھے۔ سلطان کے پیٹھے ہی قیدیوں کو میدان میں لایا گیا جن کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ملک تمل، عبید شاعر، شیخ زادہ مشقی آگے تھے اور ان کے پیچھے ان کے اہل خاندان تھے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ قصر

نہایت تیز رفتاری کے ساتھ جیسا بیٹھا ہے اسی طرح اٹھ کر چلا آئے۔ الخ خان فوراً دہلی پہنچا اور باپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ سلطان نے الخ خان کو دہلی میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود لکھنؤ جاتے کا ارادہ اس پر ظاہر کیا۔

”الخ خان! تجھے عبید اور شیخ زادہ دمشق یاد ہے؟“

”سلطان معظم! میرا حافظہ انہیں کیسے فراموش کر سکتا ہے۔“

”پھر تجھے یہ بھی یاد ہوگا کہ ان دونوں کا تعلق شیخ کی خانقاہ سے تھا۔“

”انہوں نے یہی بتایا تھا بلکہ میں نے انہیں خانقاہ میں دیکھا بھی تھا۔“

”میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ انہیں شیخ کی حمایت حاصل نہیں تھی لیکن کسی فتنے سے بچنے کے لیے میں نے شیخ نظام پر ہاتھ نہیں ڈالا۔“

”آپ نے اچھا کیا۔“

”میں تجھے یہ بتا دینا چاہتا ہوں میرے بیٹے کہ میں بنگالہ کی طرف جا رہا ہوں۔ میری عدم موجودگی میں تو ان خانقاہ نشینوں سے ہوشیار رہنا۔ ان خانقاہ نشینوں نے عوام کو ورغلا کر اپنی طرف کر لیا ہے اور یہ جسارت اکثر کرتے رہتے ہیں کہ بادشاہوں کے تختے الٹ کر اپنی مرضی کے لوگ سامنے لائیں۔ میں تمہیں ہدایت کرتا ہوں کہ ان خانقاہوں میں قدم نہ رکھنا۔ خاص طور پر نظام الدین دہلی سے ہوشیار رہنا۔ میں ان کی قسمت کا فیصلہ بنگال سے واپس آنے کے بعد سناؤں گا فی الحال اس قصے کو یہیں دبا رہے دو۔“

اس نصیحت کے بعد سلطان غیاث الدین لشکر کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہو گیا۔



دہلی کی گلیوں میں خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔ ہر آنکھ دوسری آنکھ سے پوچھ رہی تھی کہ دیکھو اب کیا دیکھنے کو ملے۔ لوگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ایسا خوف تو کسی غنیم کی آمد پر بھی محسوس نہیں کیا گیا تھا۔

اس خوف کا باعث وہ پیغام بنا تھا جو سلطان غیاث الدین نے بنگال سے بھیجا تھا۔ پیغام لانے والے نے حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں حاضری دی تھی اور چند سطر پیغام آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

”میں بنگالہ سے دہلی پہنچوں تو آپ کو دہلی میں نہ دیکھوں۔ اب دہلی میں آپ رہیں گے یا میں رہوں گا۔“

حضرت نظام الدین اولیا نے اس خط کو پڑھ کر ایک

طرف رکھ دیا اور فرمایا ”ہنوز دلی دور است یعنی ابھی دلی دور ہے۔“

یہ پیغام حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں بھیجا گیا تھا لیکن دوسروں تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ اس کے ساتھ ہی آپ کا جواب بھی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔

”ہنوز دلی دور است“

اس پیغام سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بادشاہ دہلی آنے کے بعد سلطان المشائخ کو قتل کرادے گا یا پھر مجبور کرے گا کہ وہ دہلی چھوڑ کر چلے جائیں۔ حضرت کے جواب کے بھی چرچے ہو رہے تھے۔ آپ کے جواب سے معلوم ہو رہا تھا کہ آپ بادشاہ کو دہلی نہیں آنے دیں گے یا اسے دہلی آنا نصیب نہیں ہوگا۔

اس پیغام کی شہرت ہوتے ہی لوگوں نے خانقاہ نظامی کا رخ کرنا شروع کر دیا تھا تا کہ حقیقت معلوم ہو۔ شیخ کے مرید تصدیق کر رہے تھے کہ ایسا پیغام آیا ہے اور حضرت نے یہ جواب دیا ہے۔

پیغام بھیجنے والا اور پیغام وصول کرنے والا دونوں ہی اپنی اپنی مملکت کے بادشاہ تھے۔ غیاث الدین دنیاوی سلطنت کا بادشاہ تھا۔ حضرت نظام الدین اولیا روحانی سلطنت کے سلطان تھے۔ روحانی سلطنت کے حکمران کے اثرات سلطان غیاث الدین سے کہیں زیادہ تھے۔ بادشاہ کے ارد گرد موجود امرا اور فوجی سردار تک نظام المشائخ کے عقیدت مند تھے۔ عام لوگوں کی عقیدت کا تو کوئی حد و حساب ہی نہیں تھا۔

یہ تاثر عام ہو گیا تھا کہ بادشاہ دہلی میں قدم رکھتے ہی نظام الدین اولیا کو قتل کرادے گا۔ بے بسی یہ بھی کہ کوئی شخص بادشاہ کو اس کے ارادے سے باز رکھنے پر قادر نہیں تھا۔ چند نفوس ایسے بھی تھے جو بالکل مطمئن اور شاداں و فرحاں نظر آ رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ جب حضرت نے فرما دیا کہ دلی ابھی دور ہے تو سلطان، دلی سے دور ہی رہے گا اور حضرت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

یہ تمام خبریں الخ خان کو بھی مل رہی تھیں جو اس وقت دہلی میں غیاث الدین تعلق کی نیابت کر رہا تھا۔ الخ خان بھی اب سے کچھ دنوں پہلے تک خانقاہ میں حاضر ہوتا رہا تھا لیکن باپ کی نصیحت کے بعد اس نے وہاں جانا چھوڑ دیا تھا مگر جب دہلی میں ہلچل مچی اور اس پیغام کا شہرہ ہوا تو وہ ایک دن خانقاہ پہنچ گیا۔

”حضرت! میرے کانوں تک کچھ باتیں پہنچ رہی ہیں۔“

میں دریافت کرنے آیا ہوں کہ ان میں کتنی حقیقت ہے۔“

”تیرا اشارہ غالباً اسی پیغام کی جانب ہے جو تیرے باپ نے میرے پاس بھیجا ہے۔“

”جی بندہ پرور، میں اسی پیغام کے الفاظ سننا چاہتا ہوں۔“

نظام الدین اولیا نے بادشاہ کی تحریر اس کے سامنے رکھ دی۔ ”ہم فقیروں سے اسے اتنا ملال نہ جانے کیوں ہے کہ وہ ہمیں دہلی سے نکال دینا چاہتا ہے۔“

”ابا حضور کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ وہ دہلی تشریف لے آئیں تو میں ان کا دل آپ کی طرف سے صاف کر دوں گا۔“

”تو کیوں اتنا فکر مند ہوتا ہے۔ بادشاہت تو تیرے نام کر دی گئی ہے۔“

”سلطان معظم کی موجودگی میں؟“

”تقدیر میں کیا ہے تجھے کیا معلوم۔ بنگال سے دہلی بہت دور ہے۔ انتظار کر اور دیکھتا جا۔“

الخ خان محل میں واپس آیا تو ”ہنوز دلی دور است“ کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ان الفاظ کا مجھے کیا مطلب لینا چاہیے۔ کیا شیخ کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ زندہ سلامت دہلی تک نہیں پہنچ سکے گا؟ اگر یہ مطلب ہے تو مجھے چاہیے کہ میں شہر سے باہر نکل کر اس کا استقبال کروں اور ممکن ہو تو وہیں اس کے قیام کا بندوبست کر دوں اور یہ کوشش کروں کہ بادشاہ اور سلطان المشائخ کے درمیان صلح کا کوئی راستہ نکل آئے۔

الخ خاں کا دماغ ایک موجد کا دماغ تھا۔ نئی نئی باتیں سوچا کرتا تھا اور پھر ان پر عمل کرانے کے لیے بھند ہو جاتا تھا۔ اس موقع پر بھی ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اس نے مہندس کو بلوایا اور اس پر اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

”سلطان معظم لشکر سے الگ ہو کر تیزی کے ساتھ دار الخلافہ کی طرف آرہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں دہلی سے تین چار کوس کے فاصلے پر افغان پور کے قریب ایک چھوٹا سا کوٹھک تیار کیا جائے کہ سلطان رات کو وہاں قیام کریں اور دوسرے روز صبح کوشاہی شان و شوکت کے ساتھ شہر میں داخل ہوں۔“

”سلطان کو افغان پور تک پہنچنے میں کتنے دن لگیں گے؟“ مہندس نے پوچھا۔

”انہیں کتنے بھی دن لگیں۔ یہ محل تین دن میں تیار ہو جانا چاہیے۔“

مہندس نے مزدور لگا دیے اور کوٹھک کی تعمیر شروع

ہوئی۔ تیسرے دن الخ خان اس نوعمر کوٹھک کے معائنے کے لیے گیا۔ زمین کی سطح سے کچھ بلند حصے پر پوری عمارت کھڑی نظر آرہی تھی۔ الخ خان بڑی دیر تک اس عمارت کے مختلف حصوں کو دیکھتا رہا۔ اسے یہ بات بری طرح کھٹک رہی تھی کہ پوری عمارت لکڑی کے تختوں کی مدد سے تیار کی گئی تھی۔

”کیا تجھے اس عمارت کے لیے پتھروں سے کام نہیں لینا چاہیے تھا؟“

”شہزادہ حضور، میں مہندس ہوں۔ کس موقع پر کیا چیز بہتر ہے مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ لکڑی کے تختوں کو میں نے علم ہندسہ کے اعتبار سے اس طرح آپس میں جوڑا ہے کہ اگر اس پر ہاتھی بھی کودیں تو ان تختوں کو جنبش نہ ہو۔“

شہزادے نے زیادہ بحث مناسب نہیں سمجھی۔ وہ بحث کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے سامنے اپنے دور کا عظیم مہندس کھڑا تھا۔

دہلی میں جشن تھا۔ دف اور طبل بجائے جا رہے تھے کہ عصر کی نماز کے وقت بادشاہ کی آمد کا بگل بجا۔ کوٹھک سے کچھ فاصلے پر اس کے لشکر نے قیام کیا اور بادشاہ اپنے امراء، شہزادہ محمود اور شیخ زکریا ملتانی کے پوتے شیخ رکن الدین کے ہمراہ کوٹھک کی طرف بڑھا۔ شہزادہ الخ خان نے کوٹھک کے دروازے پر ان سب کا استقبال کیا اور انہیں لے کر اندر گیا۔ بادشاہ اس کوٹھک کو دیکھ کر خوش ہوا۔ الخ خان کے عزم و ہمت کی تعریف کرتا رہا۔ مہندس کو بھی داد دی کہ اس نے اتنی قلیل مدت میں تعمیر مکمل کی۔

بادشاہ نے الخ خان سے نئی عمارت کے بنوانے کا سبب پوچھا اور جب بیٹے کی خواہش معلوم ہوئی تو اس کا دل رکھنے کے لیے اسی محل میں مقیم ہو گیا۔

دوسرے روز الخ خان مع اپنے ارکان دولت کے بادشاہ کی قدم پوسی کے لیے آیا اور ضیافت کے لیے دسترخوان سجا دیا گیا۔

کھانے سے فراغت کے بعد حاضرین یہ سمجھ کر باہر آ گئے کہ بادشاہ اسی وقت دار الخلافہ جائے گا۔ الخ خاں بھی گھوڑوں، ہاتھیوں اور دوسرے لوازم شاہی کی ترتیب کے لیے باہر چلا آیا۔ اسی وقت بنگال سے آئے ہوئے ہاتھیوں کی نمائش، دوڑ کی شکل میں شروع کر دی گئی کہ بادشاہ جب کوٹھک سے باہر آئے گا تو یہ ہاتھی اس کے سامنے ملاحظہ کے لیے پیش کیے جائیں گے۔

ان ہاتھیوں کی بھاگ دوڑ اور دھمک سے زمین مل گئی یا نیچے دب گئی اور عمارت کی چھت زمین پر آ گئی۔ بادشاہ اور

شور مچا کہ کان بڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کدال اور نیچے منگوائے گئے اور ملبا ہٹایا جانے لگا۔ ملبا ہٹا تو معلوم ہوا تاخیر ہو چکی۔ بادشاہ اور شہزادہ محمود دونوں شہید ہو چکے تھے۔ خوشی کے شادیانوں نے ماتمی دھنوں کی صورت اختیار کر لی۔

شہزادہ محمود کی وفات کے بعد الخ خاں کے سوا کوئی تخت کا وارث نہیں تھا۔ الخ خاں، ابوالجہاد محمد شاہ تغلق کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

مورخوں کے لیے سلطان غیاث الدین کی موت کا واقعہ عقدہ لائیخل بنا رہا ہے۔ بعض لوگوں نے الخ خاں کو قصور وار ٹھہرایا ہے کہ اس نے بادشاہ کی جان لینے کی غرض سے اتنی کم مدت میں محل تعمیر کرایا اور قصد اباب کی جان لی۔ ایک مورخ حاجی محمد قدھاری نے بیان کیا ہے کہ آسمان سے بجلی گری اور چھت کو توڑتی ہوئی بادشاہ کے سر پر آگری۔ یہ بھی کہا جاتا ہے مہندس جس نے محل کی تعمیر کی وہ حضرت نظام الدین اولیا کا مرید تھا۔ اس نے اپنے مرشد کی جان بچانے کے لیے ایسا کمزور محل تعمیر کیا کہ بادشاہ دہلی تک نہ پہنچ سکے۔ عام لوگ بادشاہ کی موت کو اس فقرے کا نتیجہ سمجھتے رہے جو حضرت نظام الدین اولیا سے منسوب تھا یعنی ہنوز دلی دور است (ابھی دلی دور ہے)۔

حضرت نظام الدین اولیا کی دور بینی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ بادشاہ دہلی نہیں پہنچ سکے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس فقرے کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ سازشیں تیار ہو گئی ہوں۔

جب سلطان محمد تغلق دروازہ بدایوں میں داخل ہوا اور دولت خانے میں آیا تو امراؤ کا برہانھیوں پر سوار ہو کر سونے اور چاندی کے تنکوں سے بھرے ہوئے طشت اپنے سامنے رکھے ہوئے مٹھیاں بھر بھر کر کوچوں اور بازاروں میں پھینک رہے تھے۔ لوگوں نے سونے چاندی کے تنکوں سے اپنی پکڑیاں اور مٹھیاں بھر لیں۔ لوگ چلا چلا کر سلطان محمد کو دعائیں دے رہے تھے۔

سلطان محمد عجائب مخلوقات سے تھا۔ اس کے مزاج میں اجتماع ضدین پایا جاتا تھا۔ کبھی چاہتا تھا سکندر کی طرح ساتوں اقلیم فتح کر لے۔ کبھی یہ ارادہ کرتا کہ جن دانس اس کی اطاعت سے باہر نہ رہیں۔ کبھی یہ آرزو کرتا کہ سلطنت اور نبوت کو آپس میں ملا دے، مگر دشرعی احکام کو اپنے اختیار سے جاری کرے۔ دوسری طرف یہ حال تھا کہ صرف روزہ نماز

ہی پابندی تھا بلکہ اس دو مخالف ہی بڑی پابندی سے ادا کرتا تھا۔ ناجائز افعال، بے نوشی اور ان تمام چیزوں سے جن سے گناہ کا ارتکاب ہوتا، پرہیز کرتا تھا۔ اس کے مورخ ضیا الدین برنی نے اس کے متضاد کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا۔

”نشہ آور اشیاء میں سے کوئی بھی چیز اس نے کبھی نہیں چکھی۔ زنا کے قریب بھی نہیں پھٹکا۔ کسی طرح کا جوا نہیں کھیلا تھا۔ فسق و فجور کی مروجہ شکلوں سے احتراز واجتناب کرتا تھا۔ ان خوبیوں کے باوجود مسلمانوں اور عمدہ عقیدہ رکھنے والے مومنوں کا خون سزا دینے کے سلسلے میں پانی کی نہر کی طرح اپنے محل کے سامنے بہا جاتا تھا۔“

بادشاہوں سے منسوب سیر و شکار کے قصے تو سننے ہیں لیکن سلطان محمد تغلق انسانوں کا شکار کرتا تھا۔ ظلم و ستم میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ کوئی ہفتہ ایسا نہ جاتا کہ جس میں مشائخ و سادات، صوفی، قلندر، اہل قلم اور سپاہی اس کی سیاسی حکمت عملی کا شکار نہ ہوتے ہوں۔

اس کی فیاضی اور بخشش حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ اتنا دیتا کہ لینے والا حیرت میں رہ جاتا۔ کتنے ہی محتاج اس کی بخشش کے سبب امراء وقت میں شمار ہونے لگے تھے۔

ان فیاضیوں کے برعکس جب اس کے مظالم پر نظر جاتی تو وہ درندہ نظر آتا تھا جس کے محل کے نیچے انسانی لاشیں بڑی رہتی تھیں۔ وہ اسے رعب سلطانی کا ذریعہ سمجھتا تھا لیکن ظلم تو ظلم ہے۔ لوگ اس کی طرف سے متنفر ہوتے جا رہے تھے۔

اس کی طبیعت میں بے انتہا ضدھی۔ جو خیال ایک مرتبہ اس کے دل میں آ جاتا وہ اسی پر عمل کرتا۔ مشیروں کی مجال نہیں تھی کہ اس کی رائے سے اختلاف کرتے۔ حالت یہ ہو گئی کہ اس کے حکام عاجز آ گئے۔ اگر عوام کی نفرت کا خیال کر کے ان کے اجرا میں کچھ توقف اور سستی کرتے تو طرح طرح کی سزائیں بھگتنی پڑتی تھیں اور اگر جاری کرتے تو مخلوق برباد ہو جاتی تھی۔ وہ بھند تھا کہ اس کے احکامات پر عمل کیا جائے۔

اس کے ان مظالم کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر مضبوط علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ خزانہ خالی ہو گیا۔ اطراف کے علاقوں سے خراج آنا بند ہو گیا۔ اس نے دوستوں کو دشمن بنالیا۔

اقتدار پسند لوگ لپٹائی آنکھوں سے دہلی کی طرف دیکھنے لگے۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ دہلی کے عوام، امرا اور عہدے دار بادشاہ سے نالاں ہیں۔ وہ درویشوں اور صوفیوں کا قائل نہیں لہذا یہ طبقہ بھی اس کے خلاف ہو چکا ہے۔ اس وقت اگر کوئی طالع آزمائے لکھے اور علم بغاوت بلند

کرے تو یقیناً کامیابی ہوگی۔

ان طالع آزمائوں میں محمد تغلق کا چچا زاد بھائی بہاؤ الدین گر شاسپ بھی تھا۔

گر شاسپ دکن میں ولایت ساغر کا جاگیردار تھا۔ اسے یہ گمان تھا کہ وہ شاہی خاندان سے ہے۔ لوگ اس کا ضرور ساتھ دیں گے۔ صوفی اور مشائخ اس کی پشت پر تھے۔ یہ وہ دور تھا جب صوفیہ اور مشائخ کا عوام پر بے انتہا اثر تھا۔ بادشاہتوں کا دار و مدار بڑی حد تک ان مشائخ پر تھا۔ ہر تحریک کا آغاز خانقاہوں سے ہوتا تھا۔

گر شاسپ نے اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے قلعہ ساغر کو بہت مضبوط کر لیا اور لشکر کی تنظیم میں حد درجہ سرگرمی دکھانے لگا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی بڑے مقصد کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔ محمد تغلق کے مخبران تیاریوں کی اطلاع حضور شاہی میں پہنچا رہے تھے لیکن محمد تغلق کو اس کی طرف سے کسی بغاوت کا اندیشہ نہیں تھا۔ وہ ان خبروں کو نظر انداز کرتا رہا۔ محمد تغلق کی غفلت نے گر شاسپ کے حوصلوں کو ہوا دی۔ اس نے علم بغاوت بلند کیا اور دکن کے دیگر امرا کو ہم خیال بنا کر ملک کے بہت سے حصوں پر قبضہ کر لیا۔ جو امرا اس کی حکمت عملی پر نہ چلے انہیں وہاں سے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ یہ امر دہلی میں جمع ہوئے اور شکایات محمد تغلق تک پہنچا پیں۔

محمد تغلق کی آنکھیں کھلیں تو دکن میں حالات تباہی کے دہانے تک پہنچ چکے تھے۔ محمد تغلق نے اس بغاوت کو سختی سے چل دینے کے احکام جاری کیے۔ گجرات کے سہ سالار خواجہ جہاں کو خط لکھا کہ وہ گر شاسپ کے خلاف لشکر کشی کرے۔ دار السلطنت کے نامی امرا کو بھی گجرات کی طرف روانہ کیا۔

خواجہ جہاں نے لشکر آراستہ کیا اور گر شاسپ کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے سرگرم ہو گیا۔ گر شاسپ بھی اپنی فوج کے ساتھ مقابلے پر آ گیا۔ لڑائی شروع ہوئی تو گر شاسپ کا ایک فوجی سردار خضر بہرام، خواجہ جہاں سے آن ملا۔ گر شاسپ نے مقابلہ کیا لیکن خضر بہرام کی غداری نے اس کے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور اپنی جاگیر ساغر کے قلعے میں پناہ لے لی۔

خواجہ جہاں اس کا پیچھا کرتا ہوا پہنچا تو اس نے اپنے بیوی بچوں کو ساغر میں چھوڑا اور ایک ہندو راجا کے پاس کرناٹک چلا گیا۔ یہ راجا اس کا طرف دار تھا۔ یہاں گر شاسپ کی خواجہ جہاں سے دو جنگیں ہوئیں جن میں خواجہ جہاں کو شکست ہوئی لیکن تیسری مرتبہ وہ غالب آ گیا۔ یہاں

کا راجا گرفتار ہوا لیکن گر شاسپ فرار ہو کر بے جا پور کے راجا بلال دیو کے پاس پہنچ گیا۔ راجا کو معلوم تھا کہ شاہی افواج اس کا پیچھا کر رہی ہیں لہذا وہ ڈر گیا اور اس نے گر شاسپ کو پکڑ کر خواجہ جہاں کے پاس بھیج دیا۔

خواجہ جہاں نے گر شاسپ کو قیدی بنا کر بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔

محمد تغلق کے عہد حکومت کی یہ پہلی بغاوت تھی اور وہ بھی اس کے ایک رشتہ دار کی جانب سے۔ اس لیے وہ نہایت طیش میں تھا۔ کسی رعایت کی اس کی جانب سے توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس نے گر شاسپ کو اس حال میں اپنے سامنے طلب کیا کہ اس کے گلے میں طوق اور پیروں میں بیڑیاں تھیں۔

”میں نے تجھے ساغر کی صوبے داری تفویض کی۔ تجھے دیگر امرا کے مقابلے میں زیادہ عزت و مرتبہ دیا۔ تو نے میرے احسانات کا یہ بدلہ دیا کہ میرا بی باغی بن گیا۔ کیا تو یہ سمجھتا تھا کہ میری جگہ لے لے گا۔ تیری وجہ سے کتنی جانیں ضائع ہوئیں۔ کتنے مقابلے کرنے پڑے۔ کیا تو اپنی صفائی میں کچھ کہہ سکتا تھا۔“

گر شاسپ کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ بس اتنا کہہ سکا۔ ”میں لوگوں کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔“

”کون ہیں یہ لوگ؟“

”ایسے حضرات جو برگزیدہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے سیکڑوں ارادت مند ہیں اور وہ سب میرا ساتھ دینے کا عہد کر رہے تھے۔ ان برگزیدہ ہستیوں نے مجھے بادشاہت کی نوید سنائی تھی۔“

”وہ بھی تیری طرح ہمارے مجرم ہیں۔ تو ہمیں بتا کہ ان معزز ہستیوں کے نام کیا ہیں۔“

گر شاسپ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ نام بتائے یا نہیں۔ پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ ان نام نہاد علما اور مشائخ کے نام اسے بتا دینے چاہئیں جنہوں نے پیش گوئیاں کی تھیں کہ بادشاہت اسی کا مقدر بن چکی ہے۔ وہ بادشاہ بننے کے بجائے قیدی کی حیثیت سے بادشاہ کے سامنے کھڑا ہے۔ کچھ دیر میں قتل کے احکام بھی صادر ہو سکتے ہیں۔ اس نے جھکی ہوئی گردن اٹھائی اور ان دنیا دار علما و مشائخ کے نام بتا دیے جنہوں نے اسے درغلا یا تھا۔

شاہی قاضی مفتی کمال الدین قریب ہی تشریف فرما تھے۔ وہ ایک ایک نام لکھتے رہے۔ یہ وہ فہرست تھی جنہیں

اس سازش میں شریک مجرموں کی حیثیت سے طلب کرنا مقصود تھا۔

”باغی گرشاسپ نے جو نام بتائے ہیں انہیں گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کیا جائے اور گرشاسپ کو اس وقت تک قید میں رکھا جائے جب تک یہ حضرات میرے سامنے پیش نہ ہو جائیں۔“ محمد تعلق نے حکم دیا۔

گرشاسپ کے بیان کردہ دنیا دار علما اور جعلی مشائخ کو گرفتار کر لیا گیا۔ گرشاسپ نے ان کی شناخت بھی کر لی۔ اس کے بعد انہیں محمد تعلق کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس وقت دربار میں مفتی کمال الدین بھی موجود تھے اور مشہور مورخ ضیا الدین برنی بھی حاضر تھا۔

بادشاہ ان علما و مشائخ سے سوالات کرتا رہا اور یہ حضرات سخت خوف کے عالم میں جوابات دیتے رہے۔ ان کا جرم ثابت ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ بادشاہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے دربار میں جو قاضی اور مفتی تھے ان کے چہرے متغیر ہونے لگے ہیں۔ مورخ ضیا الدین برنی کے چہرے پر بھی ناگواری کے اثرات تھے۔ شاید اس لیے کہ یہ سب لوگ اس خیال سے خوف زدہ تھے کہ بادشاہ ایسے پابند شرع حضرات کو محض اس لیے سزا دینے پر تلا ہوا ہے کہ انہوں نے گرشاسپ کو بادشاہ کے خلاف ورغلا یا تھا۔

بادشاہ نے اپنے مقربین کے خیالات کو بھانپ لیا۔ اس نے مورخ ضیا الدین برنی کو مخاطب کیا۔ اپنا اور ان مشائخ کا موازنہ کیا۔

”تم بتاؤ کیا میں پابند شرع نہیں ہوں۔ پانچوں وقت کی نماز نہیں پڑھتا؟ مجھے کبھی کسی نے نشے کی حالت میں دیکھا؟“

سب نے گواہی دی کہ بادشاہ پابند شرع ہے۔

بادشاہ نے پھر سب کو مخاطب کیا۔ ”اب میں تم سب سے یہ سوال کرتا ہوں کہ مجھے زنا یا کسی ایسے ہی حرام فعل میں مبتلا دیکھا یا سنا ہے؟“

سب ہی نے اقرار کیا کہ بادشاہ سچ کہتا ہے۔ یہ کہنے کی مجال کسی کو بھی نہیں تھی کہ یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن وہ سزائیں دیتے وقت شرع کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔

(مورخ برنی نے اپنی اس کمزوری کا اپنی تاریخ میں خود اعتراف کیا ہے وہ لکھتا ہے ”ہم سلطان کے مقربوں میں تھے لیکن خلاف شرع سزائیں دینے کے سلسلے میں ہم لوگ سلطان کے سامنے حق بات نہیں کہتے تھے اور اسی میں اپنی سہولت سمجھتے تھے کہ اس کے سامنے سچ بات نہ کہیں)

”جب میرا اپنا کردار صالح ہے تو مجھے حق پہنچتا ہے کہ ان علما کو سزا دوں جو میرے خلاف ہونے والی بغاوت میں درپردہ شامل تھے۔ انہوں نے پابند شرع بادشاہ کے خلاف بغاوت کی ہے۔ ان کی سزا سزائے موت ہے تاکہ مفسدوں کو عبرت ہو۔ آئندہ کوئی ایسی جرأت نہ کر سکے۔“

ان سب کے قتل کا فرمان جاری کر دیا گیا۔

حکم ملنے کی دیر بھی کہ ان سب کو نہایت سفاکی سے قتل کر دیا گیا۔ لاشوں کی بے حرمتی کا کوئی اخلاقی اور شرعی جواز نہیں تھا لیکن ان لاشوں کو بادشاہ کے حکم کے مطابق محل کے سامنے پڑا رہنے دیا تاکہ آنے جانے والے اپنی ٹھوکروں سے انہیں پامال کریں اور عبرت حاصل کریں، بادشاہ کا خوف ان کے دلوں پر طاری ہو۔

بہاء الدین گرشاسپ کا انجام ان سے بھی برا ہوا۔ بادشاہ کے حکم پر اسے زمین پر اوندھا لٹایا گیا اور اس کی کھال کھینچی گئی اور اس کھال میں بھوسا بھرا کر تمام شہر میں گھمایا گیا۔ منادی کرنے والا یہ بھی کہتا جاتا تھا کہ حکومت کے باغیوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

بھس بھری کھال کو اس طرح گھمانے سے لوگوں کے دلوں میں نفرت نہیں بلکہ گرشاسپ کی طرف سے ہمدردی پیدا ہوئی جو بادشاہ کے لیے آئندہ کئی مصائب لے کر آئی۔ لوگ اس تماشے کو دیکھتے اور دل ہی دل میں بادشاہ کو برا بھلا کہتے تھے۔

جن مشائخ کو بادشاہ نے قتل کرایا تھا ان کے سیکڑوں نہیں ہزاروں ارادت مند تھے۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ یہ حضرات غلطی پر تھے یا درست تھے۔ ان سے جو سوال و جواب ہوئے تھے اس کے وہ عینی سامع بھی نہیں تھے۔ وہ تو بس یہ دیکھ رہے تھے کہ ظالم بادشاہ صرف ظالم نہیں بلکہ بے دین بھی ہے کہ ایسی متبرک ہستیوں کو اس نے قتل کر دیا اور لاشوں کی بے حرمتی کی۔ انہیں افسوس بھی تھا اور غصہ بھی لیکن بادشاہ کی طاقت کے سامنے سب بے بس تھے۔ یہ غصہ اندر ہی اندر پک رہا تھا۔

بادشاہ کو تو یہ چاہیے تھا کہ جن لوگوں کو اس نے قتل کرایا تھا ان کے جرائم کو آشکار کرے۔ اس کے برخلاف اس نے سزا کا راستہ اختیار کیا۔ جہاں سے کوئی آواز بلند ہوئی اس نے خون کی عیریاں بہا دیں۔ کتنے ہی گوشہ نشین بزرگوں کو تیغ کر دیا۔ یہ قتل محض اس جرم کی پاداش میں کیے گئے کہ اس کی اطلاعات کے مطابق لوگ اس کے خلاف صوفیوں اور ولیوں کی مدد حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے۔

اس نے کئی روحانی بزرگوں کو زبردستی اپنے دربار سے وابستہ کرنا چاہا تاکہ عام لوگوں سے ان کا رشتہ منقطع ہو جائے لیکن اس کوشش میں بھی اسے برائے نام کامیابی ہوئی۔ لوگوں نے اس کوشش کو بھی بادشاہ کے مظالم کی فہرست میں شامل کیا۔

اس نے اقتدار میں آتے ہی شاہان سابق کے قواعد و ضوابط منسوخ کر دیے۔ ہر روز نیا قانون اور نیا حکم جاری کرتا تھا۔ صوبوں کے والیوں اور اعمال کے نام فرمان جاری ہوتے رہتے تھے تاکہ اس کے احکام جاری ہوں۔ یہ قوانین گزشتہ قوانین اور عقل کے خلاف ہوتے تھے اس لیے عوام انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور حکام ان کے جاری کرنے سے عاجز ہو گئے تھے۔ ان کے اجرا میں کچھ توقف اور سستی کرتے تو طرح طرح کی سزائیں بھگتی پڑتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شورشیں بڑھنے لگیں۔

ایک قدم اس نے یہ اٹھالیا کہ دو آپہ کی تمام ولایت کے خراج کو دس گنا کر دیا۔ اس زیادتی سے عوام میں بغاوت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ لوگوں نے کاشت کاری سے ہاتھ اٹھالیا۔ کاشت کاری نہیں ہوئی تو دو تین سال تک برابر قحط پڑتا رہا۔ ہزاروں گھر برباد ہو گئے اور فوجی لشکر کا شیرازہ بکھر گیا۔

خزانہ خالی ہوا تو اس نے سونے اور چاندی کے سکوں کی جگہ تانبے اور پتیل کے سکے جاری کرنے کے احکام صادر کر دیے۔ خزانہ سونے چاندی کے سکوں سے معمور ہو گیا اور ملک میں تانبے کے سکے جاری ہو گئے۔ جعل سازی کرنے والوں کو عجیب سہولت مل گئی۔ یہاں کے ہندو بے حساب تانبا اور پتیل دار القرب میں لانے لگے اور ان سے لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں سکے ڈھلوا کر ان سے سامان اور ہتھیار خریدنے لگے اور پھر اس مال کو دوسرے ملکوں میں سونے کے سکوں کے عوض خریدنے لگے۔ سناروں نے شاہی سکے کی ہو بہو نقل کی اور اپنے گھروں میں سکے ڈھالنے لگے۔ تانبے کے سکوں کی اتنی کثرت ہو گئی کہ ان کی وقعت جاتی رہی۔ خرید و فروخت کا انتظام بکڑ گیا۔

اس بد انتظامی کو روکنے کے لیے بادشاہ کو حکم نافذ کرنا پڑا کہ تانبے کے سکے خزانے میں جمع کر دیے جائیں اور ان کے عوض سونے چاندی کے سکے لے لیے جائیں۔ بس پھر کیا تھا لوگ بوریوں میں بھر بھر کر تانبے کے سکے لانے لگے اور سونے کے سکے لے جانے لگے۔ خزانہ سونے کے سکوں سے خالی ہو گیا۔ تانبے اور پتیل کے سکے لڑھکتے پھرتے تھے۔

خزانے کی تباہی کا اثر انتظام سلطنت پر پڑنا لازمی تھا۔ ملکی بد انتظامی پر جیسے تیسے قابو پایا گیا تو دل میں ایک خیال یہ سایا کہ ایران و عراق کو فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کر لے۔ اس خیال کی پیدائش کا سبب ایران و خراسان کے وہ اراکین دولت تھے جو اپنے وطن سے بے زار ہو کر ہندوستان آئے اور دربار تعلق سے وابستہ ہو گئے۔ ان میں کچھ شہزادے بھی تھے جن سے محمد تعلق کی جلوت و خلوت میں ملاقاتیں رہتی تھیں۔

یہ شہزادے دیار غیر میں تھے اور بادشاہ کے رحم و کرم پر تھے۔ بادشاہ کے سامنے خوشامدانہ گفتگو نہ کرتے تو اور کیا کرتے۔ انہوں نے بادشاہ کی فیاضی اور بہادری کے قصیدے پڑھنے شروع کر دیے۔ رفتہ رفتہ اسے یقین دلادیا کہ ایران و توران کو سر کرنا نہایت آسان ہے۔ بادشاہ ذرا سی کوشش کرے تو یہ ممالک اس کی مٹھی میں ہوں گے۔ محمد تعلق نے ان افراد و شاہزادگان کو انعام و اکرام سے نوازا تا شروع کر دیا کہ وہ اس سے بد دل نہ ہوں اور ان کے مشوروں سے وہ تخیر ممالک کے لیے کوششیں کرتا رہے۔

اس مقصد کے لیے اس نے بے انتہا فوج جمع کی۔ تین لاکھ ستر ہزار فوج شاہی خزانے سے تنخواہ پاتی تھی۔ ان کے لیے بڑی تعداد میں ہتھیاروں کا بندوبست بھی کیا گیا۔ پہلے ہی سال دہلی کا خزانہ ختم ہو گیا۔ سپاہیوں کا حساب چکانا مشکل ہو گیا۔ لشکر میں منتشر ہو گئے۔

یہ منصوبہ بھی دھرا رہ گیا۔ سلطان تعلق کی اختراع پسندی نے اسے ایک اور راہ پر چلا دیا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ ماورالنہر اور خراسان پر حملوں سے قبل کوہ ہما چل کو جو چین اور ہندوستان کے درمیان واقع اور حائل ہے اس کی حدود میں آنا چاہیے تاکہ گھوڑوں کی درآمد اور لشکر کے سفر کا راستہ آسان ہو جائے۔ اس نے اپنے بھانجے خسرو ملک کی سرکردگی میں ایک لاکھ تجربہ کار سوار اور اراکین دولت کو اس مہم پر روانہ کیا۔

محمد تعلق نے اپنے بھانجے کو ہدایت کی تھی کہ پہلے ہما چل کو تخیر کرے، قلعے بنوائے، اس کی حفاظت کے لیے فوجیوں کا تعین کرے بعد ازاں چین کی حدود میں داخل ہو کر اس کی سرحد پر ایک قلعہ بنوائے اور وہیں رہے۔ وہاں پہنچ کر تمام تفصیلات سے بادشاہ کو آگاہ کرے اور بادشاہ کے عریضے کا انتظار کرے۔ عریضے کے جواب سے پہلے کوئی قدم نہ اٹھائے۔ جب دہلی سے ملک پہنچ جائے تو شہر میں قدم رکھنے اور ممالک چین کو اپنے قبضے میں لینے کی کوششیں کرے۔

یہ ہم اتنی خطرناک تھی کہ خسرو ملک دم سادھے اس کی ہدایات کو نہ رہا تھا۔ اس وقت جو اراکین دولت موجود تھے وہ بھی دم بخود تھے۔ آخر ایک امیر نے ہمت کی۔

”سلطان معظم! ہم میں سے کسی کو بھی یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ ہم آپ کے حکم سے سرمو تاج و کمریں اور ہم لڑائی سے بھاگنے والے بھی نہیں لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس مہم میں کامیابی کے امکانات نہیں۔ آج تک کسی بادشاہ نے چین پر قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی۔“

محمد تغلق نے اس امیر کی طرف دشمن کی نظر سے دیکھا۔ ”آپ لوگوں کا کیا مطلب ہے۔ جو کام کسی نے نہیں کیا وہ میں بھی نہ کروں۔ میں کسی بحث میں پڑے بغیر حکم دیتا ہوں کہ لشکر روانہ کیا جائے۔“

مزید بحث کرنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ خسرو ملک اور اس کے ساتھیوں نے کمر کسلی۔ ایک لاکھ سواروں پر مشتمل لشکر ایک عجیب و غریب مہم پر جارہا تھا۔ خوف کے سائے ساتھ چل رہے تھے لیکن یہ امید بھی تھی کہ شاید کامیابی مل جائے۔ یہ لشکر دہلی سے چل کر وہاں چل تک پہنچ گیا۔

خسرو ملک نے بادشاہ کی ہدایت پر عمل کیا۔ بعض مقامات پر قلعے بنوائے اور کچھ لشکر وہاں چھوڑ کر آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ چین کی سرحد پر پہنچ گیا۔ اس کے سامنے چین کی عظمت، جاہ و جلال، شہر کے قلعوں کی اونچائی، راستوں کی تنگی اس کے ارادوں کو توڑنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ رسد رسانی کی مشکلوں کا تصور کر کے خوف سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

اراکین دولت پہلے ہی بددلی کا شکار تھے خود خسرو ملک بھی بہ امر مجبوری اس مہم پر آیا تھا لہذا ان کے حوصلوں میں وہ طاقت نہیں تھی کہ ان پہاڑوں سے ٹکرایا جائے۔ تمام اراکین نے خسرو ملک کو مشورہ دیا کہ وہ لڑائی سے ہاتھ اٹھالے اور واپسی کا راستہ اختیار کرے۔ خسرو ملک صرف بادشاہ سے خائف تھا ورنہ چاہتا وہ بھی تھا کہ واپس چلا جائے۔ امرانے ذرا زور ڈالا تو وہ بھی تیار ہو گیا۔

مصیبت راستہ روکے کھڑی تھی۔ واپسی شروع ہوئی تھی کہ بارش شروع ہو گئی۔ یہ لوگ جن راستوں سے سرحد تک پہنچے تھے وہ بارش کی وجہ سے مٹ گئے۔ ان کی نشاندہی مشکل تھی۔ سرگرداں اور پریشان حال سپاہی راستے ٹھولتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ پہاڑی لوگوں کو بھی موقع ہاتھ آیا۔ یہ لوگ واپسی کے راستوں کی گھاٹیوں میں آگئے اور قتل و غارتگری شروع کر دی۔ ایک ہی دفعہ میں سارا لشکر ان

پہاڑیوں میں تلف ہو گیا۔ اتنے بڑے لشکر میں سے صرف دس سوار زندہ بچ چکے جو کسی نہ کسی طرح دہلی پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ ان دس کو بھی محمد تغلق نے بزدلی کا طعنہ دے کر قتل کر دیا۔

وہ ایسے بے نکتے منصوبے بناتا تھا کہ دوسروں میں انہیں عملی شکل دینے کی طاقت نہ ہوتی تھی اور منصوبے ادھر رہے رہ جاتے تھے۔

پے درپے ناکامیوں نے اس کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا کہ سارا ہندوستان اس کی شہنشاہیت سے منحرف ہو گیا ہے۔ خانقاہ نشیں بھی اس کے مخالف ہیں اور اس کے صوبہ دار اور عمال حکومت بھی اس کے منصوبوں کو پورا نہیں ہونے دیتے۔ اس کے سدباب کے لیے ایک انوکھا خیال اس کے دل میں آیا اور وہ یہ کہ دارالخلافہ دہلی سے کہیں اور منتقل کر دیا جائے۔ اس کے لیے کوئی ایسا علاقہ منتخب کیا جائے جو ان ملکوں کے نزدیک ہو جن پر بادشاہ کا قبضہ ہے تاکہ اچھے برے حالات کی خبر فوراً مل سکے۔

ایک وجہ یہ بھی تھی دہلی اور اس کے قرب و جوار میں دہلی بزرگوں کی کثرت تھی۔ اس کے وزرا اور عہدے داران بزرگوں سے میل ملاپ رکھتے تھے۔ وہ اپنے وزرا کو ان صوفیوں سے بھی بچانا چاہتا تھا۔ دارالخلافہ دہلی سے دور ہوگا تو ان صوفیہ کے اثرات بھی سلطنت پر کم سے کم پڑیں گے۔ ماضی قریب میں وہ اپنے والد اور نظام الدین اولیا کے درمیان ہونے والے نزاع کو ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ اب نہ اس کے والد اس دنیا میں تھے نہ نظام الدین اولیا رہے تھے لیکن ان کے خلیفہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی موجود تھے۔ محمد تغلق کو یہ خبریں بھی ملتی رہتی تھیں کہ شہزادہ فیروز تغلق کا ان بزرگ کے پاس آنا جانا ہے اور بھی بہت سے وزرا، امرا تھے جو ان بزرگوں کے پاس جاتے تھے اور اپنے حق میں دعائیں کراتے تھے۔ عام لوگ بھی بادشاہ سے زیادہ ان بزرگوں کے عقیدت مند تھے۔ دارالسلطنت کی منتقلی سے یہ سب دروازے بند ہو سکتے تھے۔

محمد تغلق جب اپنے خیال کو اپنے ذہن میں اچھی طرح پختہ کر چکا تو اپنے خیال کو اپنے عہدہ داروں پر ظاہر کیا۔ ان عہدہ داروں کو یہ تجویز عجیب ضرور لگی لیکن مخالفت کی ہمت کس کو تھی۔ ایک دو نے دے لفظوں میں اظہار کیا بھی تو جواب یہ ملا کہ ان سے صرف یہ پوچھا گیا ہے کہ مقام تجویز کریں۔ اس دو لوگ جواب کے بعد اس کے سوا کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ نئے دارالحکومت کے لیے نام

فیصلے فقیدوں نے

تجویز کریں۔ ان اراکین نے نئے دارالحکومت کے لیے راجستھان کے اجین کا نام پیش کیا۔ بادشاہ نے اجین کا نام سنتے ہی اسے مسترد کر دیا۔ ”اجین کا محل وقوع ایسا ہے کہ بہت جلد یہاں بھی وہی خرابیاں پیدا ہو جائیں گی جن کا سامنا مجھے دہلی میں رہ کر کرنا پڑ رہا ہے۔“

امرا دیکھ رہے تھے کہ بادشاہ کا رجحان دیوگڑھ کی طرف ہے لہذا انہوں نے اس کی خوشنودی کے لیے مشورہ دیا کہ مرکز سلطنت دیوگڑھ کو بنایا جائے۔ بادشاہ کو ان امرا کا مشورہ پسند آیا۔ اس کی پسندیدگی کے ساتھ ہی گویا یہ طے ہو گیا کہ اب دہلی دارالحکومت نہیں رہے گا۔

امرا اور درباری وطن سے بے وطن ہونے کو ہرگز تیار نہیں تھے لیکن بادشاہ کے حکم کے آگے مجبور تھے لہذا سب کے سب بے دلی کا شکار تھے۔

بادشاہ نے ضروری تیاریاں شروع کر دیں۔ احکامات جاری کیے کہ دہلی سے دیوگڑھ تک ہر منزل پر سرائے تعمیر کرائی جائیں۔

جب سرائے اور منزلیں تعمیر ہوئیں تو اس نے ایک ایسا حکم جاری کر دیا جس کی مثال نہ اس سے پہلے ملتی تھی نہ آئندہ ملنے کی امید تھی۔ اس نے حکم دیا کہ تمام شہری عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے اور جوان سب دیوگڑھ منتقل ہو جائیں۔ جو غریب ہوں اور جن کے پاس سفر خرچ نہ ہوں انہیں شاہی خزانے سے روپیہ دیا جائے۔

دیوگڑھ کا نام دولت آباد رکھا اور عظیم الشان عمارتیں بنوانا شروع کیں۔ خوب صورت باغ لگنا شروع ہو گئے۔ اس کے برعکس وہ دہلی جو رشک بغداد تھا، ویران اور سنسان ہو گیا۔ ابن بطوطہ کے بقول دہلی میں گیدڑوں اور کتوں کے سوا کوئی نظر نہ آتا تھا۔

یہ بیان مبالغہ آمیز بھی ہو تو بھی یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ دہلی کی رونق دولت آباد منتقل ہونے لگی تھی۔ صرف دارالخلافہ منتقل نہیں ہوا بلکہ بادشاہ نے تو آبادی کو منتقل ہونے کا حکم دے دیا تھا۔ ایک شہر اٹھ کر دوسرے شہر میں پہنچ گیا۔

دارالحکومت دہلی کو جو ایک سو ستر سال کی مدت میں آباد ہو کر جامع شہر کی حیثیت کو پہنچا تھا اور بغداد و مصر کا ہم پلہ بن گیا تھا، مع ان تمام قصبوں اور سراہوں کے جو اس کے قرب و جوار میں چار پانچ کوس کے اندر واقع تھے، ویران کر دیا گیا۔ یہاں کے رہنے والوں کو کثیر تعداد میں مع اہل و عیال، خاندانوں اور غلاموں اور کنیزوں کے روانہ کر دیا۔

وہ لوگ جو برسوں سے آباد و اجداد کے مکانات میں رہ رہے تھے، اپنے مکانات چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ انہیں زبردستی یہاں سے نکالا گیا۔ صدے اور سفر کی مشقت سے ان میں سے بہت سے دولت آباد پہنچنے سے پہلے ہی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جو پہنچ گئے وہ اس وقت تک مٹی بن کر جیتے رہے جب تک دہلی کو دوبارہ دارالسلطنت نہ بنالیا گیا اور وہ واپس اپنے شہر میں آئے لیکن یہ مدت بعد ہوا۔

محمد تغلق کے احکامات کی پوری طرح بجا آوری ہو رہی تھی۔ اس کے امرا اپنے بال بچوں کے لیے دولت آباد میں نئے مکانات بنوا رہے تھے لیکن ملتان کے حاکم ایبہ خاں نے بادشاہ کی اس تجویز کی مخالفت کی اور اس پر تیار نہیں ہوا کہ اپنے اہل و عیال کو دولت آباد بھیجے۔

سلطان غیاث الدین تغلق نے ایبہ خاں کو بھائی بنایا تھا۔ دونوں میں اتنی موانست تھی کہ غلی خاندان کے زوال کے بعد جب ایک موقع ایسا آیا تھا کہ غیاث الدین تغلق اور ایبہ خاں نے مل کر غلی خاندان کو حکمرانی سے محروم کر دیا تھا تو غیاث الدین نے ایبہ خاں کو پیشکش کی تھی کہ وہ بادشاہ بن جائے لیکن ایبہ خاں نے گوارا نہیں کیا تھا کہ وہ بادشاہ بنے۔ اس نے غیاث الدین کو تخت پر بٹھایا اور خود ملتان کی حاکمیت پر اکتفا کیا۔ محمد تغلق بھی اسے عم محترم (چچا) کہتا رہا تھا لیکن اب وہ سن رہا تھا کہ ایبہ خاں نے سرکشی اختیار کی ہے اور اپنے بال بچوں کو دولت آباد بھیجنے پر تیار نہیں ہے۔

ایبہ خاں محمد تغلق کے نئے نئے اقدامات سے پہلے ہی بدظن تھا۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ سلطان نے دہلی کی مرکزی حیثیت ختم کر کے دکن کے دیوگڑھ کو دولت آباد کا نام دیا ہے تو وہ اس وقت کو یاد کرنے لگا جب اس نے خود بادشاہ بننے کے بجائے غیاث الدین کو موقع دے دیا تھا۔

ایبہ خاں بادشاہ تو نہیں بن سکا تھا لیکن اتنا تو کر سکتا تھا کہ محمد تغلق کو بادشاہ تسلیم نہ کرے اور اس کے احکامات کو ٹھکرا دے۔ یہی وہ کر رہی رہا تھا۔

سلطان محمد تغلق نے علی نام کے ایک مغل کو ملتان بھیجے اور ایبہ خاں سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاہی فرمان تحریری طور پر بھی اس کے سپرد کیا اور زبانی ہدایات بھی دیں کہ وہ ایبہ خاں کو بتائے کہ اسے اپنے خاندان کے ساتھ سلطان تغلق سے ملاقات کرنی چاہیے اور اپنے خاندان کو دولت آباد منتقل کرنے میں دیر نہ لگائے۔

”سلطان محترم! مجھے اس فرمان کی تکمیل کے لیے کتنی سختی کی اجازت ہے؟“

اور اپنی فوج کو حملہ آور ہونے کا حکم دے دیا۔ جنگ شروع ہوتے ہی دونوں طرف کے سپاہی قتل ہونے لگے۔ ایبہ خان کے لیے یہ جنگ آخری جنگ تھی۔ شکست کا مطلب یہ تھا کہ وہ عرش سے فرش پر آجاتا۔ اس لیے وہ اور اس کے سپاہی جانوں کی پروا کیے بغیر لڑ رہے تھے۔ بہرام ایبہ اہل ملتان اور اپنی فوج کو یہ باور کرا چکا تھا کہ محمد تغلق مرتد ہو چکا ہے۔ اس لیے یہ جنگ کفر و اسلام کی جنگ بن گئی تھی۔ اس کے سپاہیوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

بہرام ایبہ کی نظریں چتر شاہی پر لگی ہوئی تھیں۔ جہاں سلطان اپنی فوجوں کی نگرانی کے لیے موجود تھا۔ ایبہ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح چتر شاہی تک پہنچ جائے لیکن سلطان کے فوجی اسے آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔

ایک مرتبہ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو چتر شاہی خالی پڑا تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ سلطان کہیں بھی نہیں تھا۔ کیا سلطان فرار ہو گیا؟ سلطان تغلق نے ایک چال چلی تھی۔ وہ اپنی فوج کے چند ہزار سپاہی لے کر الگ ہو گیا تھا۔

بہرام ایبہ نے چتر شاہی کو خالی دیکھا تو تیزی سے وہاں پہنچ گیا اور چیخ چیخ کر اعلان کرنے لگا کہ بادشاہ فرار ہو گیا ہے۔

شاہی فوجوں نے یہ اعلان سنا تو ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ اس کے برخلاف ملتان لشکر نے یہ سوچ کر تلواریں رکھ دیں کہ اب تو فتح ہو ہی چکی۔

اسی وقت سلطان تغلق اپنی فوج کے ساتھ چتر شاہی میں نمودار ہوا۔ بہرام ایبہ بری طرح بوکھلا گیا۔ سلطان کے سپاہیوں نے اس پر قابو پالیا اور اسے گرا کر سر کاٹ لیا اس کے سر کو نیزے پر بلند کیا تو ملتان لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ بھاگنے میں کامیاب ہو گئے لیکن بیشتر مارے گئے۔

ایبہ خان کے محل پر قبضہ کر لیا گیا۔ یہاں محمد تغلق نے عدالت لگائی۔ ایبہ خان کا داماد جس نے علی مغل کو قتل کرایا تھا، فرار ہو گیا تھا۔ وہ تو نہیں مل سکا لیکن قاضی شہر کو گرفتار کر کے محمد تغلق کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ سلطان تغلق کے خبر بتا چکے تھے کہ اہل شہر اور ایبہ خان کو بادشاہ کے خلاف بدظن کرنے میں قاضی کا ہاتھ ہے۔ اس لیے اصل مجرم وہی قرار پایا تھا۔

”تو نے میری بے دینی کا فتویٰ جاری کیا تھا۔ اب بتا تجھے کیا سزا دی جائے۔ تیرے نزدیک اسلام کی تعریف کیا ہے جس پر میں نہیں چلا اور تیرے نزدیک بے دین ٹھہرا۔“

یہ خبر جیسے ہی ایبہ خان تک پہنچی وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ اب محمد تغلق اپنی پوری طاقت کے ساتھ ملتان پر حملہ آور ہوگا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ مقابلے کی تیاری کی جائے۔ اس مقصد کے لیے اسے ملتان کے صوفیہ اور عوام کو بھی اپنے ساتھ ملانا تھا۔ قاضی شہر نے لوگوں کو درغلنا شروع کر دیا۔

”یاد رکھو، اگر محمد تغلق غالب آگیا تو وہ ملتان میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا کیونکہ تم لوگ صوفیہ اور مشائخ کے ماننے والے ہو جبکہ بادشاہ بے دین ہو چکا ہے۔ کتنے ہی مشائخ اس نے قتل کر دیے۔ کیا اب بھی تم اس کا ساتھ دو گے؟“

قاضی شہر شیخ رکن الدین ملتان کی خانقاہ میں بھی گیا اور ان سے مدد مانگی۔ آپ نے ان بکھیروں میں پڑنے سے انکار کر دیا۔

”یہ دو بادشاہوں کا جھگڑا ہے۔ ہم فقیروں کو اس میں مت کھیٹو۔“

”کیا آپ نہیں سمجھتے کہ بادشاہ بے دین ہو گیا ہے اور اس کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔“

”اس کی بے دینی کا کوئی ثبوت تمہارے پاس ہے؟“

”یہ ثبوت کیا کم ہے کہ اس نے صوفیہ اور علما کو قتل کرایا ہے۔“

”یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ وہ مشائخ کس پائے کے تھے۔ کتنے ہی صوفیہ دنیا داری اور رسوم پرستی میں مبتلا ہیں۔ ممکن ہے انہوں نے بادشاہ کے خلاف سازش کی ہو۔“

”ملتان پر قبضہ کرنے کے بعد اگر اس نے یہاں بھی قتل کا بازار گرم کیا؟ یاد رکھیے شیخ صاحب، آپ کی خانقاہ بھی محفوظ نہیں رہے گی۔“

”ہم خود اس کے پاس چل کر جائیں گے اور اسے مجبور کریں گے کہ وہ ملتان میں لوٹ مار نہ کرے۔“

”وہ فقر کی سفارش سننے کا عادی نہیں۔“

”اللہ مالک ہے۔ جو ہوگا اس وقت دیکھا جائے گا۔“

قاضی شہر ان کی طرف سے مایوس ہو کر لوٹ آیا۔ بغاوت کی خبر گرم ہوئی تو سلطان تغلق دولت آباد میں تھا۔ وہ وہاں سے دہلی آیا اور لشکر جمع کر کے ملتان پہنچ گیا۔ حاکم ملتان بہرام ایبہ بھی ایک بڑا لشکر لے کر میدان میں آگیا۔ سلطان نے ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر جائزہ لیا۔ ایبہ خان کا لشکر تعداد میں اس سے زیادہ تھا۔ اس نے اس تعداد کو دیکھ کر ایک خاص حکمت عملی تیار کر لی جس پر ایک خاص وقت عمل کرنا تھا۔ ایک بلند ٹیلے پر چتر شاہی نصب کیا

گئے۔ اس کے برعکس آپ نے مجھے بھی روکا ہوا ہے۔“

”یہاں رک کر تجھے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ لوگوں کے جذبات کیا ہیں۔ میں یہاں کا صوبے دار ہوں۔ لوگوں کے جذبات کے برخلاف محمد تغلق کے احکام کی پیروی نہیں کر سکتا۔“

”مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں آپ کو سمجھاؤں۔ اگر آپ نے دولت آباد پہنچنے میں تاخیر کی تو یہ آپ کے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔“

”تم ایک معمولی قاصد ہو کر مجھے دھمکانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”میں دھمکا نہیں رہا ہوں، سمجھا رہا ہوں۔“

”تو جس کا پیغامبر بن کر آیا ہے وہ بے دین ہے۔ اس پر تو مشائخ کے قتل کا مقدمہ چلنا چاہیے۔ میں نے اپنا مقدمہ قاضی کی عدالت میں بھیج دیا ہے۔ قاضی مجھے بتائے گا کہ بے دین بادشاہ کی اطاعت مجھ پر فرض ہے یا نہیں۔ اس کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کروں گا۔“

”سبحان اللہ! اب صوبے دار اپنے فیصلے قاضی کے مشورے سے کرنے لگے ہیں۔“

علی مغل مایوس ہو کر راستے سے ہٹ گیا۔ غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا کہ بادشاہ کا داماد اسے نظر آگیا جو اپنے مکان سے نکل کر دیوان خانے کی طرف جا رہا تھا۔ علی مغل اس کے نزدیک گیا اور سارا غصہ اس پر اتار دیا۔

”تم نے ابھی تک اپنے بچوں کو دولت آباد کیوں نہیں بھیجا۔ کیوں نمک حرامی پر تلے ہوئے ہو کہ بادشاہ کا حکم نہیں مانتے۔“

ایبہ کے داماد کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے آگ بگولا ہو کر کہا۔ ”مغل بچے تو گالیوں پر کیوں اتر آیا ہے۔“

”اس لیے کہ تم لوگ گالیوں کے لائق ہو۔ تم اور تمہارا نمک حرام سرگھروں میں آرام سے بیٹھے ہو اور بادشاہ کے فرمان کی تمہیں پروا نہیں۔“

”زبان سنبھال کر بات کرو ورنہ گدی سے زبان کھینچ لوں گا۔“

”اس سے پہلے میں تیرا دماغ درست کر دوں گا۔“

علی مغل نے کہا اور ایبہ کے داماد کے بال پکڑ لیے۔ اس نے بھی علی کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

دونوں میں لڑائی ہونے لگی۔ اس نے علی کو زمین پر شیخ دیا اور ایک ملتان سلاخدار نے جو قریب کھڑا تھا علی کا سر تن سے جدا کر دیا۔

”میں ایبہ خان کو اپنا چچا کہتا ہوں۔ میں تمہیں وہاں سختی کے لیے نہیں بھیج رہا ہوں۔ تمہیں پیغام پہنچانا ہے اور زبانی سمجھانا ہے۔ ایبہ خان کو یہ باور کرانا ہے کہ ابھی تو تم سمجھا رہے ہو لیکن بعد میں سختی بھی کی جاسکتی ہے۔“

پیغام رسانی کا یہ کام کسی پیشہ ور قاصد سے بھی لیا جاسکتا تھا لیکن محمد تغلق نے علی مغل کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ وہ مزاجاً تلخ تھا۔ نرم گفتاری کے ساتھ ساتھ اسے یہ سلیقہ بھی آتا تھا کہ شاہی فرامین پر زبردستی عمل کرائے۔

علی مغل ملتان پہنچا اور ایبہ خان سے ملاقات کی تو علی مغل کو محسوس ہوا کہ ایبہ خان کے رویے میں سرد مہری ہے۔ اس نے ملاقات تو کی لیکن کسی گفتگو سے گریز کرتے ہوئے جلد ہی اٹھ گیا اور اپنے محل کے مہمان خانے میں علی مغل کو ٹھہرا دیا۔

اب وہ انتظار میں تھا کہ کب ایبہ خان اسے طلب کرے۔ دن پردن گزرتے گئے۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ علی مغل محسوس کر رہا تھا کہ ایبہ خان جان بوجھ کر اسے طلب نہیں کر رہا ہے اور مصروفیت کا بہانہ کر رہا ہے۔

محل کی قید سے اکتا کر وہ باہر نکلا تا کہ گھوم پھر کر لوگوں کے تاثرات معلوم کرے۔ جب وہ بازاروں میں گھومنا لوگوں سے ملا تو اسے احساس ہوا کہ ملتان میں سلطان تغلق کے خلاف باغیانہ جذبات پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ اسے بے دین سمجھتے ہیں۔

ملتان ولیوں اور صوفیوں کا شہر تھا۔ یہ خبریں یہاں برابر پہنچتی رہی تھیں کہ محمد تغلق نے علما اور مشائخ کو قتل کرایا ہے۔ اس لیے لوگوں کے جذبات بھڑکے ہوئے تھے۔ ایک مہم تھی جو تغلق کے خلاف چل رہی تھی اور اسے سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ کئی لوگوں نے اسے بتایا کہ قاضی شہر کے بھی یہی خیالات ہیں اور اس نے ایبہ خان کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا ہے۔

علی مغل جان چکا تھا کہ ایبہ خان اس سے ملاقات کیوں نہیں کر رہا ہے۔ تغلق کے خلاف چلنے والی تحریک کا وہ بھی حصہ ہے اس لیے وہ اپنے لوگوں کو مجھ سے ناراضی کا تاثر دے رہا ہے۔

علی مغل ایک روز مہمان خانے سے نکل کر اس راستے میں کھڑا تھا جہاں سے ایبہ خان کو گزرتا تھا۔ کچھ دیر بعد ایبہ خان ادھر سے گزرا تو علی مغل اس کے راستے میں آگیا۔

”میں نے آپ کو سلطان کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اب تک تو آپ کو دولت آباد روانہ ہو جانا تھا لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ تو آپ، آپ کے اہل خانہ بھی دولت آباد نہیں

اور قحط سالی سے چھٹکارے کے لیے کمندیں پھینکنے لگا۔ کسانوں کو روپیہ دیا گیا کہ کنویں کھودیں اور مل چلائیں۔ بارش ہوئی نہیں تھی۔ زمین کی تہ میں بھی پانی کہاں تھا۔ پھر یہ ہوا کہ لوگوں کو روپیہ ملا تو بہت سوں نے اپنی ضروریات پوری کیں۔ شاہی جلال ایک مرتبہ پھر حرکت میں آیا۔ تلوار نیام سے باہر آئی۔ رعایا کی کاہلی اور سستی کو بہانہ بنا کر ہزاروں جانیں ختم کر دی گئیں۔ لوگوں نے بھی شکر بھیجا کہ بھوک سے مرنے کے بجائے تلوار سے قتل ہو گئے۔

قحط سالی نے سر نہیں جھکایا تھا کہ ملتان اس کے ہاتھ سے چلا گیا۔ شاہو افغان نامی ایک افغانی نے افغانوں کو جمع کیا اور ملتان کے نائب کو قتل کر کے ملتان پر قبضہ کر لیا۔

سلطان نے خشک سالی کی بد حالی کو طاق میں رکھا اور بیمار ماں مخدومہ جہاں کو خدا پر چھوڑ کر ملتان بجانے چل دیا۔ ابھی وہ راستے میں تھا کہ والدہ کی وفات کی خبر آگئی۔ امرانے لاکھ چاہا کہ وہ لشکر کی کمان کسی اور کے سپرد کر کے دہلی لوٹ جائے۔ اسے والدہ کی وفات کا صدمہ بھی بہت تھا لیکن اس نے واپسی کو را نہیں کی۔ ایک دن تعزیت کے لیے ٹھہرا اور پھر آگے روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ ملتان سے کئی منزل دور تھا کہ افغان شاہو نے اطاعت گزاری کی درخواست پیش کی۔

اظہار ندامت کیا اور بغاوت سے ہاتھ کھینچ کر اپنے افغانوں کے ساتھ افغانستان چلا گیا۔ (اس سے مراد موجودہ افغانستان نہیں بلکہ گجرات اور کھمبایت میں افغانوں کی آبادی تھی اس لیے اس علاقے کو افغانستان کہا جاتا تھا)

سلطان نے ملتان جانے کا ارادہ ترک کیا اور دہلی واپس آ گیا۔ اس وقت شہر میں قحط بہت بڑھ گیا تھا۔ سلطان نے زراعت کو فروغ دینے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ خشک سالی سے عاجز آئے ہوئے سلطان نے قتل و غارت گری کا وہ سماں باندھا کہ خدا کی پناہ۔ اس کے دل میں یہ وہم بیٹھ گیا تھا کہ لوگ جان بوجھ کر اس کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں لہذا جس کے بارے میں شکایت ملتی یا کوئی دشمنی میں بھی شکایت کر دیتا تو وہ اسے اس کے خاندان سمیت قتل کروا دیتا۔ اس نے بہت سے لوگوں کو مروا دیا۔

جب اس نے دیکھا کہ شہر میں غلے اور چارے کی کمی سے کسی صورت چھٹکارا نہیں ملتا تو اس نے حکم دیا کہ شہر کے دروازے کھول دیے جائیں جس کا جہاں جی چاہے چلا جائے۔ بہت سے لوگ بنگالہ کی طرف چلے گئے۔ بادشاہ خود بھی شہر سے نکلا اور دریائے گنگا کے کنارے قیام کیا اور حکم دیا کہ لوگ وہاں چھپر ڈال کر رہنے لگیں۔ اس جگہ کا نام ”سرگ

گری اور قتل عام سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ مالابار سے بغاوت کی خبر آگئی۔

سلطان کی سخت گیری کی وجہ سے جگہ جگہ بغاوت کی وبا پھوٹ پڑی تھی۔ اتنے امراض پیدا ہو گئے تھے کہ ایک کا علاج کرتا تو دوسرا مرض پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ ایک طرف بھاگتا تو دوسرا علاقہ ہاتھ سے نکل جاتا تھا۔ اس نے لکھنؤ کی بغاوت کو پس پشت ڈالا اور لشکر عظیم لے کر مالابار کی طرف دوڑ پڑا۔ تلنگانہ ہوتے ہوئے مالابار کا سفر کیا اور پہلے ورننگل پہنچا۔

ورنگل میں قدم رکھنے سے پہلے ہی یہاں کوئی بیماری پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے کئی امرا اور فوجی بیمار پڑ گئے۔ بہت سے ہلاک ہو گئے۔ وہ خود بھی بیمار پڑ گیا۔

وہ مالابار کی طرف چلا تھا لیکن ارادہ سفر ترک کیا اور دولت آباد آ گیا۔ یہاں اپنا علاج کراتا رہا پھر اس نے اچھے ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ پاکی میں سوار ہوا اور دہلی کی طرف چلنے کا حکم دیا۔

دولت آباد سے روانہ ہوتے ہوئے عام منادی کرادی کہ دہلی کے باشندوں میں سے جو چاہے دولت آباد میں رہے اور جس کی مرضی ہو وہ بادشاہ کے ساتھ چلا جائے۔

اس نے دہلی کی آبادی کو دولت آباد منتقل کرنے کے لیے کتنی بغاوتیں مول لی تھیں، کتنے قتل کرائے تھے، کتنے گھر اجاڑے تھے۔ اب وہ خود ہی کہہ رہا تھا، جس کا جی چاہے رہے جس کا جی چاہے دہلی چلا جائے۔

ایک ضدی بادشاہ نے ایک شہر ویران کر کے دوسرا آباد کیا تھا اب کہہ رہا تھا اسے ویران کر دو اور پہلا شہر پھر آباد کر لو۔ پورا شہر اٹھ کر بادشاہ کے ساتھ ہی روانہ ہو گیا۔

راستے میں پڑنے والے شہر ویران تھے۔ بارش بالکل نہیں ہوئی تھی۔ زمین کے ہونٹوں پر پیڑی جمی ہوئی تھی۔ زمین پر گھاس اور چوکیوں پر پیادے ناپید تھے۔ ہر طرف بھوک تھی، پیاس تھی انتشار تھا۔ وہ یہ سب کرشمے دیکھتا ہوا دہلی تک آ گیا۔ یہاں کا عالم اور بھی عبرت انگیز تھا۔ قحط کی ہمہ گیری نے دہلی کی ویرانی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ دولت آباد سے آنے والے کھائی سے نکلے تھے کنویں میں گر گئے۔ جو راستے کی تکلیفوں سے بچ گئے تھے، بھوک سے مرنے لگے۔

سترہ روپے کا ایک سیر غلہ! کس میں ہمت تھی جو خریدتا آدمی آدمی کو کھائے جاتا تھا۔ عام لوگ کہنے لگے تھے کہ یہ عذاب ہے جو بادشاہ کی بے دینی کے سبب مسلط ہوا ہے۔ زمین کی پیاس تو انسانی خون نے بجھادی، اب بارش کس لیے ہو۔ محمد تغلق نے چند دنوں کے لیے تلوار کو میان میں رکھا

لوگوں کا دشمن ہوں جو فقیری کے پردے میں فریب کاری کر رہے ہیں۔“

قاضی کو آس بند گئی تھی کہ اہل ملتان کے ساتھ شاید اس کی بھی جان بخشی ہوگئی ہے لیکن محمد تغلق نے اس کی غلط فہمی دور کر دی۔ وہ شیخ رکن الدین سے پوچھ رہے تھے۔

”حضرت، کیا آپ نے قاضی کی سفارش بھی کی ہے؟“

شیخ رکن الدین خاموش رہے اور سلطان کے بار بار پوچھنے کے باوجود بھی کچھ نہ بولے۔ سلطان کی حجت پوری ہوگئی تھی، اس نے حکم دیا کہ۔ ”قاضی کی کھال کھینچی جائے اور اس میں بھوسا بھرا کر پورے شہر میں اس کی تشہیر کی جائے۔“

اس فتنے پر قابو پانے کے بعد سلطان دہلی واپس آ گیا۔ دولت آباد نیا آباد ہوا تھا۔ وہ دہلی میں رہ کر دولت آباد کو آباد کرنے کے انتظامات کرتا رہا۔ اپنی والدہ مخدومہ جہاں کو امراء، افواج اور حرم و محلات کے ہمراہ دولت آباد بھیج دیا۔ اب دہلی میں کیا رکھا تھا۔ چاروں طرف جنگلی جانوروں کی آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔

سلطان مسلسل دو سال تک دہلی میں رہا۔ اس کے امرا اس کے ساتھ تھے حالانکہ ان سب کے اہل و عیال دولت آباد جا چکے تھے۔

وہ ابھی دہلی میں مقیم تھا کہ دو آبہ کے علاقے کے ہندوؤں نے محصولات کی زیادتی سے تنگ آ کر اپنے خرمون کو آگ لگا دی اور موبیشیوں کو لے کر جنگل کی طرف نکل گئے۔ یہ ایسی سرکشی تھی جو سلطان کو ایک آنکھ پسند نہ آئی۔ اس نے ضلع داروں کو حکم دیا کہ اس علاقے میں لوٹ مار کرو جو جہاں ملے اسے قتل کر ڈالو۔ شاہی عمال تو موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ حکم ملتے ہی ٹوٹ پڑے اور قتل و غارت گری کا ایسا طوفان چھایا کہ یہ زرخیز علاقہ ویران اور غیر آباد ہو گیا۔

اس کے عمال خون بہا رہے تھے کہ وہ شکار کے لیے برن (موجودہ بلند شہر) میں گیا۔ اس نے حکم دیا کہ سارا علاقہ لوٹ لیا جائے۔ ہندوؤں کے سر کاٹ کر لائے گئے اور برن کے قلعے کے کنکروں پر ان کو لٹکا دیا گیا۔

بنگالہ کے علاقے لکھنؤ کی کو اس کے باپ غیاث الدین نے فتح کر لیا تھا۔ وہاں کا حاکم بہرام خاں کو مقرر کیا تھا۔ بہرام خاں کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ملک فخر الدین نے بغاوت کا راستہ اختیار کیا۔

سلطانی فوج اس وقت قنوج کے علاقے کی غارت گری میں مشغول تھی۔ ابھی سلطان اس علاقے کی غارت

قاضی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بادشاہ کے بار بار پوچھنے کے باوجود وہ کچھ نہیں بولا۔

بادشاہ نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”میں نے آج تک کسی متقی پر ہیزگار کو قتل نہیں کرایا۔ جو لوگ میرے ہاتھ سے قتل ہوئے وہ دنیا دار صوفی تھے جو لوگوں کو گمراہ کر رہے تھے۔ تو ان کی سرپرستی کر رہا تھا۔ اب نہ تو بچے گا اور نہ وہ لوگ جو تیری آواز پر لبیک کہہ رہے تھے۔ میں ملتان کو لاشوں کا ڈھیر بنا دوں گا۔ یہاں ان تمام نام نہاد مشائخ کو قتل کر اؤں گا جو تیرے ہم خیال تھے۔ بد اعمال فقیروں کی کوئی خانقاہ باقی نہیں رہنے دوں گا۔ تو اپنی آنکھوں سے یہ مناظر دیکھے گا۔ اس کے بعد تیرا کٹنا ہوا سر ملتان کے بیرونی دروازے پر لٹکا دیا جائے گا۔“

قاضی کے پاس اب بھی بولنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اسی وقت کسی نے اطلاع دی کہ شیخ رکن الدین بارگاہ سلطانی میں حاضری کے طلب گار ہیں۔ بادشاہ نے بہ خوشی اجازت دے دی۔

شیخ رکن الدین، بہا الدین زکریا ملتانی کے پوتے تھے۔ ملتان ان کا وطن تھا اور محمد تغلق اس شہر کو قبرستان بنانے کا عہد کر رہا تھا لہذا وہ خلق خدا کی سفارش کے لیے سلطان کے پاس آئے تھے۔

شیخ رکن الدین داخل ہوئے تو اس حال میں کہ اپنا عمامہ ہاتھ میں پکڑے، ننگے سر، ننگے پاؤں، سلطان کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

”اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ میں تم سے اہل ملتان کی جان بخشی کی استدعا کرنے آیا ہوں۔ میرے آنے کی لاج رکھ لو۔ یہ نادان تھے جو تمہارے خلاف بغاوت پر اتر آئے۔ انہیں معاف کر دو۔ خلق خدا کا خون بہانے سے گریز کرو۔ دنیا کو دکھا دو کہ تم اہل اللہ کے دشمن نہیں ہو۔“

محمد تغلق کے مخبر بتا چکے تھے کہ شیخ رکن الدین کا اس بغاوت میں کوئی ہاتھ نہیں رہا بلکہ انہوں نے قاضی کی مخالفت کی تھی اور پھر وہ اس وقت اس جیلے میں آئے تھے کہ ان کا عمامہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ تغلق کو غیرت آئی۔ اس نے شیخ رکن الدین کا عمامہ ان کے ہاتھ سے لے کر ان کے سر پر رکھا اور نہایت عزت سے اپنے پاس بٹھایا۔

”میں عہد کر چکا تھا کہ ملتان کو قبرستان بنا دوں گا لیکن آپ کا قدم درمیان میں آ گیا۔ میں اپنا ارادہ سح کرتا ہوں۔ اب دنیا یہ دیکھ لے کہ میں مشائخ کا دشمن نہیں۔ صرف ان

وادی“ رکھ دیا۔

سرگ وادی میں اودھ سے غلہ آتا تھا اور کسی قدر ارزانی تھی۔

سلطان ان دنوں بہت مغلوب الغضب ہو گیا تھا۔ اس کی نازک مزاجی اتنی بڑھ گئی کہ اس سے نہایت قریب رہنے والے لوگ بھی خائف رہنے لگے کہ کس وقت سلطان کی طبع نازک میں تبدیلی آئے اور میری گردن اڑا دی جائے۔ سلطان قحط سالی سے پریشان تھا کہ اس کے علاقوں میں پے درپے چار بغاوتیں برپا ہوئیں۔ سلطان کے امیروں نے ان بغاوتوں کو فرو کر دیا لیکن وہ سوچتا ضرور تھا کہ لوگ اس سے منحرف کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔ ملک میں استحکام ختم ہو گیا ہے۔ ہر طرف بغاوتیں ہو رہی ہیں۔

مذہبی حلقوں کی مخالفت ختم کرنے کی تدبیر اس نے یہ نکالی کہ کسی طرح خلیفہ عباسی کے دربار سے پروانہ حکمرانی حاصل کر لیا جائے تاکہ مذہبی حلقے کی مخالفت ختم ہو اور ملک میں امن قائم ہو جائے۔ بغاوتوں کا زور ٹوٹے۔ مصر میں آل عباس کا خلیفہ تخت خلافت پر جلوہ گر تھا۔ سلطان نے خلیفہ کی غائبانہ بیعت کر لی۔ خلیفہ کی خدمت میں اپنی غائبانہ بیعت کا حال تحریر کیا اور شہر میں حکم دے دیا کہ خلیفہ کی طرف سے جواب آنے تک جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی موقوف رکھی جائیں۔ سکے میں اپنے نام کے بجائے خلیفہ کا نام ثبت کرایا۔ دو تین ماہ ہو گئے تھے۔ سلطان کے قاصد دربار خلافت میں عرضیاں لے کر جاتے رہے۔ آخر ایک دن نوید ملی کہ خلیفہ کا اپنی سلطان کے لیے اجازت نامہ لے کر دہلی کی حدود میں داخل ہوا ہے۔ سلطان نے امرا، علما اور مشائخ کو ساتھ لیا اور استقبال کے لیے نکلا اور پانچ چھ کوس جا کر اپنی کا استقبال کیا۔

اپنی خلیفہ کی جانب سے منشور حکومت اور خلعت اپنے ساتھ لایا تھا۔ سلطان نے جوتے اتار دیے اور منشور کو سر پر رکھ لیا۔ جلوس کی شکل میں دہلی تک آیا۔ راستے بھر سونا چاندی بچھا دیا ہوتا جا رہا تھا۔

پہلا جمعہ آیا تو خلیفہ کا نام منبر پر پڑھا گیا اور سونے چاندی کے سکوں سے بھرے ہوئے طباق بچھا دیے گئے۔ اس دن کے بعد سے جمعہ اور عیدین پڑھنے کی اجازت عطا کر دی۔ تمام شاہان دہلی کے نام جن میں اس کا باپ بھی شامل تھا خطبے سے نکلوا دیے جنہوں نے خلیفہ بغداد کی اجازت کے بغیر حکومت کی تھی۔

ان کاموں سے نمٹنے کے بعد اس نے ایک عاجزانہ

عریفہ اور ایک نفیس بے مثل موتی کہ اس جیسا دوسرا اس کے خزانے میں نہیں تھا اظہار تشکر کے طور پر خلیفہ کی خدمت میں بھیجا۔

خلیفہ کا منشور لانے والوں کے سامنے وہ ایسی تواضع سے پیش آیا تھا کہ کوئی غلام بھی اپنے مالک کے سامنے نہ جھکتا ہوگا۔

اس دن کے بعد سے سلطان کا یہ حال تھا کہ بیٹھنے اٹھنے، حکم دینے اور فرمائش کرنے میں خلیفہ کے نام کے سوا اور کچھ اس کی زبان پر نہ آتا تھا۔

ایک طرف یہ حال تھا، دوسری جانب یہ ماجرا کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا کہ کسی مسلمان کا سر نہ کاٹا جاتا ہو۔ ایک محکمہ خاص اسی کام کے لیے بنایا گیا تھا اور ظالم ترین لوگوں کو اس محکمے کا انتظام سپرد کیا تھا۔ سزا دی میں قتل کا سلسلہ اس حد تک دراز ہوا تھا کہ ملک میں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس سے بے زار نہ ہو گیا ہو۔ اس کے مورخ ضیا الدین برنی جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا، لکھتا ہے۔

”جان کے خوف سے جو جانے والی ہے، ہم اس سے ڈرتے تھے اور اسی میں اپنی سہولت سمجھتے تھے کہ اس کے سامنے سچ بات نہ کہیں اور خلاف شرع سزاؤں میں لالچ اور قرب و منزلت حاصل کرنے کے لیے اس کے ساتھ ہو جاتے تھے۔“ رمضان کے دن تھے۔ سلطان محمد، سلطان پور میں مقیم تھا۔ اس وقت کسی نیک گھڑی میں غالباً اس کے ضمیر نے اسے ملامت کی تھی۔ اس نے ضیا الدین برنی کو طلب کیا۔ بوڑھا مورخ ڈرتے ڈرتے حاضر ہوا کہ دیکھو کیا حکم صادر ہوتا ہے۔ سلطان پر نظر پڑی تو اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں تھے۔

سلطان نے کسی تمہید کے بغیر کہنا شروع کیا۔ ”تو دیکھ رہا ہے کہ کس کثرت سے فتنے اٹھ رہے ہیں۔ اکثر لوگ جو میرے دشمن ہیں، یہ مشہور کرتے پھر رہے ہیں کہ یہ فتنے سلطان کے کثرت سے قتل کی سزائیں دینے سے ہیں۔ تیرا کیا خیال ہے؟“

برنی کی روح کانپ گئی کہ کیا جواب دے۔ اگر کہتا ہے، ہاں تو اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں سلطان اپنا دشمن کہہ رہا ہے۔ انکار کرتا ہے تو جھوٹ کا مرتکب ہوتا ہے کیونکہ حقیقت میں ایسا ہی تھا، فتنے اس کی سخت گیری کی وجہ سے اٹھ رہے تھے۔

سلطان نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ اسے خاموش دیکھ کر خود ہی کہنا شروع کیا۔ ”مجھے ایسے لوگوں کی پروا نہیں،

فیصلے فقیدوں کے

میں سزائے موت دینے سے ہاتھ نہیں کھینچوں گا۔“ برنی حیران تھا کہ سلطان نے کیا صرف یہی کہنے کے لیے اسے بلایا تھا۔

کچھ دیر کے توقف کے بعد سلطان نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”تو نے تو تاریخ کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا ہے کہ بادشاہوں نے کن کن جرائم پر سزائے موت دی ہے؟“

برنی نے کہا۔ ”میں نے ایک تاریخ میں پڑھا ہے کہ کوئی بادشاہ سزاؤں کے بغیر حکومت نہیں کر سکتا۔ اگر اس نے رعایت کی تو فسق و فجور کا بازار گرم ہو جائے گا۔ رعایا کے دلوں سے خوف نکل جائے گا۔“

”میں نے تجھ سے یہ نہیں پوچھا۔ میں نے تو یہ پوچھا ہے کہ کن کن مواقع پر سزا دی جاسکتی ہے۔“

برنی نے ایک واقعے سے اپنی بات کو مکمل کیا۔ ”جشید کے ایک مقرب نے اس سے دریافت کیا، بادشاہوں کے لیے سزائے موت دینا کن کن جرموں میں مناسب ہے۔ جشید نے جواب دیا کہ سات جرموں میں سزائے موت دینا بر محل ہے۔ جوان سے بڑھے گا اور تجاوز کرے گا وہ پریشانی اور مصیبت میں پھنس جائے گا۔ اس ملک میں فتنے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ وہ سات جرم یہ ہیں۔

(1) ایک وہ جو دین حق سے پھر جائے۔
(2) وہ جو فرماں بردار لوگوں میں سے کسی کو قتل کر دے۔

(3) تیسرے وہ کہ اس کی بیوی موجود ہو اور پھر بھی کسی دوسرے شخص کی بیوی سے زنا کرے۔

(4) چوتھے وہ جو بادشاہ کے خلاف بغاوت کا ارادہ کر رہا ہو اور اس کا ارادہ محقق ہو جائے۔

(5) وہ جو بغاوت کا سرغنہ ہو۔

(6) وہ جو بادشاہ کی رعایا ہونے کے باوجود اس کے دشمن کا ساتھ دے۔

(7) ساتواں وہ جو بادشاہ کی نافرمانی کرے اور یہ نافرمانی ایسی ہو جس سے بادشاہ کی حکومت کو نقصان پہنچے لیکن اس کے علاوہ اور کوئی نافرمانی نہیں۔

”تو نے جو وجوہات بتائیں وہ میں نے سن لیں۔ اب تو مجھے یہ بتا کہ ان میں سے کس کس کے بارے میں حدیثیں موجود ہیں اور کتنی بادشاہوں کے احکام پر مبنی ہیں۔“ سلطان نے دریافت کیا۔

برنی نے وضاحت کی۔ ”ان میں سے تین ایسی ہیں

جن کے بارے میں احادیث موجود ہیں باقی چار سزائیں سلاطین اور حکومت کی بہتری سے تعلق رکھتی ہیں۔“

سلطان نے بڑے ذوق و شوق سے یہ وجوہات دریافت کی تھیں اور یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اب وہ بے جا قتل و غارت سے تائب ہو جائے گا لیکن سلطان تو مجموعہ ضدین تھا۔ اسی وقت منفی خصوصیات غالب آ گئیں۔

”وہ سزائیں جن کا ذکر جشید نے کیا ہے وہ قدیم زمانے کے لیے تھیں۔ میرے زمانے میں ایسے نافرمان لوگ پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کے لیے تحقیق کی ضرورت نہیں۔ میں انہیں محض گمان کی بنیاد پر سزائے موت دیتا ہوں اور اس وقت تک دیتا رہوں گا جب تک یا تو میں ختم ہو جاؤں یا لوگ ٹھیک ہو جائیں۔“

”آپ پوری دنیا کو کیسے ٹھیک کر سکتے ہیں؟“ ”دنیا کی آبادی کم تو کر سکتا ہوں۔ میں یہی کر رہا ہوں۔ تو دیکھ رہا ہے کہ دیوگیر، گجرات اور بھروچ میں کیسی آفت آئی ہوئی ہے۔ اگر میں یہاں کے تمام امیران کو ایک ہی دفعہ میں ختم کر دوں تو ہر طرف امن ہو جائے۔ کیا پھر بھی تو یہ کہے گا کہ یہ فتنے کثرت سے سزائے موت دینے کا نتیجہ ہیں؟ لہذا سزائیں دیتا رہوں گا۔“ سلطان نے ایسا ہی کیا۔

وہ اپنے معاملات درست کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ دیوگیر جب اس کے ہاتھ سے نکلا تو وہ تقریباً بایوس ہو گیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ضیا الدین برنی کو اپنے تخت کے سامنے طلب کیا۔

”میری حکومت مریض ہو گئی ہے اور اس کا مرض کسی علاج سے دور نہیں ہوتا۔ ایک طرف کے معاملات ٹھیک کرتا ہوں تو دوسری طرف پریشانی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اب تو مجھے بتا کہ قدیم زمانے کے بادشاہوں نے ایسے امراض حکومت کے متعلق کیا کہا ہے۔“

برنی نے عرض کیا۔ ”بعض سلاطین نے جب یہ دیکھا کہ رعایا کا اعتماد ان پر سے اٹھ گیا ہے اور تنفر پھیل گیا ہے تو ایسی صورت میں انہوں نے حکمرانی سے ہاتھ کھینچ کر بادشاہی کے فرائض اپنے بیٹوں میں سے سب سے لائق بیٹے کے سپرد کر دیے ہیں اور خود گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔“

سلطان نے کہا۔ ”مجھے یہ مشورہ پہلے مل جاتا تو بات دوسری تھی۔ اب تو میں لوگوں سے ناراض ہوں۔ اب میرا طریقہ علاج صرف کوار ہے۔ میں سزائے موت دیتا ہوں اور نکوار مارتا ہوں۔ جتنی لوگ مخالفت زیادہ کریں گے، میں

پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ
 ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
 ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
 ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔
 اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
 آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
 لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

”قتلغ خاں، کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ان فتنوں پر
 قابو نہیں پاسکتا؟“ سلطان نے برہم ہو کر کہا۔
 ”خاکم بدہن، میرا یہ مطلب نہیں لیکن اتنا ضرور ہے
 کہ آپ کا جانارعب شاہی کے خاتمے کا سبب بنے گا۔“
 سلطان نے اس کی درخواست قبول نہیں کی اور فوج کو
 آراستہ کیا۔ اپنے چچا زاد بھائی ملک فیروز کو اپنا نائب بنا کر
 دہلی میں چھوڑا اور خود دہلی سے کوچ کیا۔
 جب سلطان کوہ آ بھو پر جو کہ گجرات کی سرحد ہے، پہنچا
 تو اس نے ایک امیر کو نامزد کیا۔ باغی معمولی سے مقابلے کے
 بعد اس کے سامنے سے فرار ہو گئے اور دیوگیر کا راستہ لیا۔
 سلطان آ بھو سے بھروچ پہنچا اور نائب وزیر مملکت
 ملک قبول کو ان مفروروں کے تعاقب کے لیے بھیجا۔ ملک
 قبول دریائے نربدا کے کنارے پہنچا تھا کہ باغی نظر آ گئے۔
 ملک قبول نے ان میں سے اکثر کو قتل کیا۔ بہت تھوڑے تھے
 جو فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔
 سلطان کچھ عرصے تک بھروچ میں رہا اور بھروچ،
 کھنایت اور گجرات کے تمام علاقوں کا مال جو لوگوں کے پاس
 تھا، حاصل کر کے خزانے میں داخل کیا۔ جو لوگ فتنہ پردازی
 میں مشغول تھے ان کو قتل کرادیا۔ اس کے بعد ایک اور امیر کو
 دیوگیر روانہ کیا۔ یہاں جتنے باغی تھے ان سب کو قتل کرادیا۔
 اس کی تلوار دیوگیر میں چل رہی تھی۔ اس کے ایک
 غلام طغی نے سرکشی دکھائی اور بھروچ کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان
 خود اس وقت دیوگیر میں تھا۔ اس خبر کو سنتے ہی بھروچ آ گیا۔
 سلطان کی آمد کی خبر سنتے ہی طغی کھنایت بھاگ گیا۔ سلطان
 نے بھی زبردستی عبور کیا اور کھنایت پہنچ گیا طغی اس بار سادل کی
 طرف بھاگا۔ سلطان اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں بھی آ گیا۔
 یہاں طغی کی فوج نے مقابلہ کیا۔ اس کے سپاہی شکست
 کھا کر قریب کے جنگلوں میں چھپ گئے۔ طغی تو بھاگ گیا
 لیکن اس کے لشکر کے تقریباً پانچ سو جنگجو زندہ گرفتار ہوئے مگر
 زندہ رہ نہ سکے۔ سب کے سب قتل کر دیے گئے۔
 بہت بعد میں معلوم ہوا طغی ٹھٹھہ کی طرف بھاگ گیا
 ہے۔
 سلطان طغی کا پیچھا کرتے ہوئے ٹھٹھہ بھی چلا جاتا
 لیکن ایک روز فتنے نے اس کا دامن پکڑ لیا۔ وہ باغی جو دیوگیر
 میں شکست کھا چکے تھے ایک جگہ جمع ہو گئے۔ ان کی سرداری
 حسن کاگو کر رہا تھا۔ ان باغیوں نے سلطان کے مقرر کردہ
 عاملوں کو قتل کیا اور حسن کاگو سلطان علاء الدین کا خطاب اختیار
 کر کے تخت نشین ہو گیا۔

سزائے موت اتنی ہی زیادہ دوں گا۔“
 اس کی اس ضد نے ہندوستان کو خون میں نہلا دیا۔
 اسے اپنے امیروں میں وہی امر پسند تھے جو اسی کی طرح قتل
 و غارت گری کا بازار گرم کیے ہوئے تھے لہذا بڑے پیمانے
 پر تبدیلیاں کرتا رہتا تھا۔ جس امیر کے بارے میں معلوم ہوتا
 کہ وہ رعایت سے کام لے رہا ہے اسے معزول کر کے اپنا
 دشمن بنا لیتا اور اس کی جگہ کسی ظالم امیر کو مقرر کر دیتا۔ نتیجے میں
 رعایا بریکشت ہو جاتی اور بغاوت اٹھ کھڑی ہوتی۔
 قتلغ خاں کو جو سلطان کا استاد بھی تھا، دیوگیر سے طلب
 کر لیا۔ دیوگیر کے باشندے قتلغ خاں کے چلے آنے سے
 کبیدہ خاطر تھے۔ یہاں کے باشندے قتلغ خاں سے بہت
 خوش تھے کیونکہ وہ ظالم نہیں تھا۔ وہاں کے خزانے کو دھارا گیر
 نامی شہر میں محفوظ کر دیا گیا۔
 عزیز خمار کو مالوہ کا حاکم بنا کر بھیجا اور یہ نصیحت کی کہ تم
 جس کسی کو فتنہ انگیز دیکھو اس کو فوراً قتل (قتل) کر دینا۔
 عزیز خمار جیسے ہی ولایت دھار میں پہنچا اس نے محض
 اندیشوں کو سامنے رکھتے ہوئے 80 سے زیادہ امرا کو قتل کرا
 دیا۔ یہ خبر جیسے ہی سلطان کو ملی اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔
 اسے ایسے ہی حاکموں کی ضرورت تھی۔ اس نے عزیز خمار کی
 طرف خاص خلعت روانہ کی۔
 اسی طرح چند دوسرے لوگوں کو کہ جو ذلیل قسم کے
 آدمیوں میں سے تھے سلطان نے اپنے تقرب کا شرف بخشا
 اور ان کے مراتب اکثر امرا سے بلند کر دیے۔ ایک گویے کو
 ولایت گجرات ملتان اور بدایوں سپرد کر دیں۔ مالی کے لڑکے
 کو دیوان وزارت پر مقرر کر دیا اور فیروز حجام، مکا باور چچی،
 لدھا مالی وغیرہ کو اپنی قربت سے ممتاز کیا۔ بڑے بڑے
 عہدے اور علاقے ان کے سپرد کر دیے۔
 اس کے ان اذیل لٹیروں کی موجودگی نے ہر جگہ کے
 امیروں کو چراغ پا کر دیا۔ نئے نئے فتنے جنم لینے لگے۔
 سلطان نے کم تر درجے کے لوگوں کو بڑے عہدے اس لیے
 دیے تھے کہ وہ ہمیشہ اس کے احسان مند رہیں گے اور اس
 سے منحرف نہیں ہوں گے لیکن وہ اتنی بات نہ جان سکا کہ ان
 معمولی لوگوں سے سلطنت کے کام انجام نہیں پاسکتے۔
 ان فتنوں اور لوٹ مار کو روکنے کے لیے قتلغ خاں
 بادشاہ کے حضور پیش ہوا۔
 عرض کیا۔ ”میں حضور کی بدولت اتنی فوج اور ہمت
 رکھتا ہوں کہ آپ مجھے اجازت دیں تو ان فتنوں کو اکیلا ختم
 کر سکتا ہوں۔“

سلطان نے اس فتنے سے نمٹنے کے لیے ملک فیروز، احمد ایاز اور دوسرے امیروں کو ان کے لشکر سمیت دہلی سے طلب کر لیا۔

لشکر آگئے تھے لیکن یہ خبریں بھی برابر پہنچ رہی تھیں کہ حسن کا گونے بے شمار فوج جمع کر لی ہے۔ اب اس سے مقابلہ آسان نہیں۔ اس نے ان لشکروں کو دیوگیر کی طرف بھیجنا موقوف کر دیا اور یہ طے کیا کہ گجرات کے انتظامات سے فارغ ہونے کے بعد وہ خود حسن کا گونے سے مقابلے کے لیے روانہ ہوگا۔

گجرات میں اسے دو سال متواتر قیام کرنا پڑ گیا۔ لشکر کی تنظیم نو کرتا رہا۔ پھر اس نے موجودہ جونا گڑھ کا قلعہ مع مضافات قبضے میں لے لیا۔ اس نواح کے سارے مقدم اور راجا مطیع ہو گئے۔

وہ تین برساتیں گجرات میں گزار چکا تھا۔ تیسری برسات ہوئی تو وہ کاٹھیاواڑ کے علاقے موضع گوندل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہاں سے اسے باغی طغی کو قتل کرنے کے لیے جانا تھا جو ٹھٹھہ کی طرف بھاگ گیا تھا۔ یہاں اسے اطلاع ملی کہ دہلی میں ملک کبیر کا انتقال ہو گیا۔ دہلی میں اس وقت تک ملک فیروز ہی موجود تھا لیکن سلطان کو اس پر پورا بھروسہ نہیں تھا۔ وہ نصیر الدین چراغ دہلوی سے بیعت تھا۔ نصیر الدین چراغ دہلوی سے سلطان کے تعلقات ٹھیک نہیں تھے۔ دیگر مشائخ بھی سلطان سے خوش نہیں تھے۔ اسے یہ خبریں ملتی رہتی تھیں کہ ملک فیروز کو تخت نشین کرنے کے لیے سازشیں کی جا رہی ہیں۔ نصیر الدین چراغ دہلوی ملک فیروز کے حق میں ہیں۔ سلطان کو خدشہ ہوا کہ ملک کبیر کے انتقال کے بعد ملک فیروز تخت پر نہ بیٹھ جائے۔ اس نے لشکر سے احمد ایاز اور ملک مقبول، نائب وزیر ممالک کو دارالحکومت دہلی کے معاملات درست کرنے کے لیے دہلی بھیجا اور دہلی سے بعض امرا اور مشائخ و علما کو گوندل طلب کیا۔ ان میں ملک فیروز اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی بھی تھے۔ سلطان چاہتا تھا کہ یہ دونوں اس کے ہمراہ رہیں تاکہ بغاوت کا خطرہ مل جائے۔ یہ دونوں اس کی نظروں کے سامنے رہیں۔

دہلی سے جو امرا آئے ان کے ساتھ ان کے لشکر بھی تھے۔ اس طرح سلطان کے پاس بہت بڑی جمعیت ہو گئی اور لشکر بھی مستعد ہو گیا۔ ملتان، اچھ اور سیوستان سے کشتیاں بھی آ گئیں۔

سلطان بخار میں مبتلا تھا۔ اس لیے سفر کچھ دن کے لیے روک دیا گیا۔

ملک کبیر کے انتقال کے بعد قتلخ کے لیے میدان صاف ہو گیا تھا۔ یہ موقع تھا جب ملک فیروز کو تخت نشین کیا جاسکتا تھا دہلی کے امرا، مشائخ اور مولوی سب محمد تغلق سے نالاں اور ملک فیروز کے حق میں تھے۔ نصیر الدین چراغ دہلوی، ملک فیروز کو بادشاہت کی خوش خبری دے چکے تھے لیکن ملک فیروز طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں بغاوت کے الزام میں قتل نہ کر دیا جائے۔ قتلخ خاں نے موقع دیکھا تو شیخ نصیر الدین کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

”یا شیخ! اس وقت سلطان ہزاروں میل دور ہے۔ ملک کبیر کے انتقال کے باعث دہلی کا نظام بگڑا ہوا ہے۔ اگر اس وقت ملک فیروز کو تخت نشین کر دیا جاتا ہے تو علما اور مشائخ سب ہمارا ساتھ دیں گے۔“

”بادشاہتیں صرف علما اور مشائخ کے کہہ دینے سے نہیں ملا کرتیں۔ سلطان کے امرا اور لشکر اب بھی سلطان کا ساتھ دے گا۔“ شیخ نصیر الدین نے فرمایا۔

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میرا ذاتی لشکر سب انتظام سنبھال لے گا۔“

شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے۔ پھر آپ نے گردن اوپر اٹھائی اور فرمایا۔

”ابھی وقت نہیں آیا۔ پردہ غیب میں ابھی کچھ ہونا باقی ہے۔ ملک فیروز کے قدم ابھی تخت سے کچھ فاصلے پر ہیں۔ انتظار کرو۔“

انتظار فیصلہ اور اس پر عمل درآمد قتلخ خاں کے اکیلے کے بس میں نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ آیا اور کوئی اور تدبیر سوچنے لگا۔

وہ کچھ اور سوچتا لیکن اس سے پہلے احمد ایاز اور ملک مقبول دہلی میں داخل ہوئے۔ ان کے آنے کے بعد یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ قتلخ خاں کوئی قدم اٹھاتا۔ اس کے بعد تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان امرا کو سلطان نے اپنے پاس طلب کر لیا جن پر قتلخ خاں اثر انداز ہو سکتا تھا۔ ان امرا کے چلے جانے کے بعد قتلخ خاں کسی سے مدد نہیں لے سکتا تھا۔

قتلخ خاں بیمار پڑ گیا اور اس کی حالت روز بہ روز تشویش ناک ہوتی چلی گئی۔ ملک فیروز کی تخت نشینی کا معاملہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

سلطان ابھی تک کاٹھیاواڑ میں تھا۔ اسے یہ خبریں برابر پہنچ رہی تھیں کہ ملک فیروز کو تخت نشین کرانے کی کوششیں کی

جاری ہیں۔ وہ ایسے تمام لوگوں کو دہلی سے دور کر دینا چاہتا تھا جو اس کے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔ اس نے ملک فیروز اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کو بھی اپنے حضور طلب کر لیا۔

جب سلطان پہلی مرتبہ دہلی سے جا رہا تھا اس وقت بھی اس نے شیخ نصیر الدین کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا تھا لیکن اس وقت آپ نے انکار کر دیا تھا مگر اب انکار ممکن نہیں تھا کیونکہ ملک فیروز کو بھی ان کے ساتھ ہی طلب کیا گیا تھا۔ اگر آپ نہ جاتے تو ملک فیروز کو اکیلے جانا پڑتا اور آپ اس موقع پر اس کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔

رخصت ہونے سے پہلے یہ دونوں قتلخ خاں کی عبادت کے لیے گئے۔ قتلخ خاں آخری سانسیں لے رہا تھا لیکن اس عالم میں بھی اسے یہ افسوس تھا کہ وہ محمد تغلق کی جگہ ملک فیروز کو بادشاہ نہ بنا سکا۔

”میری خواہش تھی کہ مشائخ کے دشمن محمد تغلق کی جگہ ملک فیروز کو حکومت سونپ دی جائے کیونکہ یہ شہزادہ مشائخ کا بے حد احترام کرتا ہے لیکن میری بیماری نے مجھے مجبور کر دیا۔“

”آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔ آسمانی فیصلوں کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ ملک فیروز کی قسمت میں بادشاہت لکھی جا چکی ہے۔“

”کاش! میں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا۔“

شاہی محافظ آگئے تھے جن کے ہمراہ ان دونوں کو کاٹھیا واڑ جانا تھا اور پھر بادشاہ کے ہمراہ سندھ کی طرف۔ دونوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ انہیں قیدی بنا کر لے جایا جا رہا ہے یا بادشاہ محض اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ ملک فیروز نے تو اپنے اندیشے کا یہاں تک اظہار کر دیا تھا کہ شاید بادشاہ اسے قتل کر دے گا البتہ شیخ نصیر الدین نہایت مطمئن تھے۔ وہ ملک فیروز کو آمادہ کرتے چلے جا رہے تھے کہ جب بادشاہ بننے کا وقت آئے تو وہ کوئی عذر نہ کرے۔

ایک جگہ پہنچ کر ملک فیروز نے حضرت شیخ سے دریافت کیا۔ ”کیا آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ بادشاہ میری ولی عہدی کا اعلان کرے گا؟“

”وہ اب سے دو سال پہلے تیری ولی عہدی کا عندیہ دے چکا ہے۔ اس کا گواہ مورخ ضیا الدین برنی ہے۔ میں نے خود اس سے معلوم کیا تھا۔“

”میرے لیے تو یہ کہا جاتا رہا ہے کہ میری نھیاں ہندو مذہب سے تعلق رکھتی ہے اس لیے میری بادشاہت کی مخالفت کی جائے گی۔“

”ایسا ہونا ممکن تھا لیکن محمد تغلق کی سزاؤں نے سب کو

انداز بیاں اور

☆ مرد اپنی پوری زندگی میں پانچ سال تک فیڈر کے ساتھ سوتا ہے۔

☆ 5 سال سے 10 سال تک کھلونوں کے ساتھ۔

☆ 10 سے 15 سال کی عمر تک کتابوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

☆ 15 سے 20 سال کی عمر تک خوابوں کے ساتھ۔

☆ 20 سے 30 سال کی عمر میں بیوی کے ساتھ۔

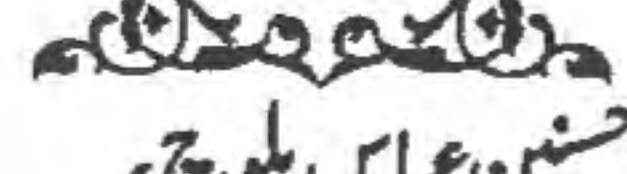
☆ 30 سے 40 سال کی عمر میں جمل جائے اس کے ساتھ۔

☆ 40 سے 50 سال کی عمر میں دوا کے ساتھ۔

☆ 60 سے 70 سال کی عمر میں بند کھڑکیوں کے ساتھ سوتا ہے۔



ڈاکٹر یونس بٹ کی کتاب..... سے انتخاب



مرسلہ: حسنین عباس بلوچ،

ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

اس سے برگشتہ کر دیا ہے۔ طبقہ مشائخ بھی اس سے خوش نہیں اس لیے مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم ایک ایسے قیدی ہو جسے بادشاہ بنانے کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔“

سلطان محمد تغلق گوندل سے چل پڑا اور دریا کے کنارے آ گیا۔ لشکر اور ہاتھیوں کے ساتھ دریا کو عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچا۔

یہاں پہنچ کر اس کی طاقت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ چغتائی مغلوں کے پانچ ہزار منگول التون بہادر تائی سردار کی ماتحتی میں سلطان کی خدمت میں پہنچ گئے۔ یہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ سلطان نے اس کمک کو کیوں طلب کیا ہے جبکہ اس کے پاس ایک عظیم لشکر پہلے سے موجود تھا۔

سلطان تغلق اس لشکر کے آجانے کے بعد ٹھٹھہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب ٹھٹھہ میں کوس رہ گیا تو عاشورہ (محرم) کا دن تھا۔ اس دن اس نے روزہ رکھا اور تمام کام ترک کر دیے۔ دوپہر تک ضروری احکام بھی جاری کرتا رہا لیکن دوپہر کے بعد خاموشی طاری ہو گئی۔ روزے کی وجہ سے لوگ اس سے بات کرتے ہوئے بھی ڈر رہے تھے۔

شاہی باورچی خانے میں سلطان کے افطار کے لیے خور و نوش کے سامان کی تیاری کی جا رہی تھی۔ اس سامان میں ایک خاص قسم کی مچھلی بھی تھی جو سلطان کو بہت پسند تھی۔ افطار سے کچھ پہلے اسے خبر ملی کہ دہلی سے شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی اور ملک فیروز لشکر میں پہنچ چکے ہیں۔ حکم برداروں نے اطلاع دینے کے بعد یہ بھی جاننا چاہا تھا کہ ان دونوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ افطار کا وقت قریب تھا اس لیے سلطان نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ صرف اتنا کہا کہ دونوں کا فیصلہ افطار کے بعد کروں گا۔ یہ اطلاع جب باہر آئی تو ملک فیروز کو یقین ہو گیا کہ سلطان ان سے خوش نہیں۔

”یا شیخ! سلطان نے میرے قتل کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”میں اس کا چچا زاد بھائی ہوں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ افطار کے لیے مجھے اپنے خیمے میں بلاتا۔ اس کے برعکس اس نے یہ کہلوایا کہ وہ ہم دونوں کا فیصلہ افطار کے بعد کرے گا۔ اس کا فیصلہ لوگوں کو قتل کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔“

”بے شک! تم نے ٹھیک کہا لیکن آدمی سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے۔ سلطان نے جو بھی سوچا ہو، وہ ہوگا نہیں۔ مغرب کی نماز کی تیاری کرو۔ روزہ تو مجھے بھی افطار کرنا ہے۔“

سلطان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ کھڑے ہونے کی طاقت بھی باقی نہیں رہی۔ نماز زیادہ ضروری تھی۔ سلطان کے خیمے میں چند حکیموں کے سوا کوئی نہیں رہا۔ سب لوگ نماز میں مشغول ہو گئے۔

نماز سے فراغت کے بعد لوگوں کو سلطان کی فکر ہوئی۔ معلوم ہوا افطار میں سلطان نے مچھلی کھائی تھی۔ اس کے بعد اس کی حالت بگڑ گئی۔ ملک فیروز اور چند علما خیمے کے اندر گئے۔ سلطان نیم غنودگی کے عالم میں تھا۔ قریب کھڑے ہوئے حکیموں کے چہروں پر تشویش کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔

یہ خبر لشکر میں پھیلی تو طرح طرح کی چیمگیاں شروع ہو گئیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ علما اور مشائخ محمد تغلق کے خلاف ہو گئے تھے لہذا اسے ایک سازش کے تحت زہر دے دیا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ زہر اس مچھلی میں ہو جو سلطان نے بڑے شوق سے کھائی تھی۔

ملک فیروز سلطان کے سرہانے بیٹھ گیا۔ شاہی حکیم نئی دوائیں تجویز کر رہے تھے لیکن محمد تغلق پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔

رات بہت ہو گئی تھی سلطان تغلق بے ہوشی کے عالم میں آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ ملک فیروز کچھ دیر پہلے کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ محمد تغلق نے کس یقین کے ساتھ کہا تھا کہ وہ ان دونوں (یعنی ملک فیروز اور شیخ نصیر الدین چراغ) کا فیصلہ افطار کے بعد کرے گا۔ مرشد شیخ نصیر الدین نے فرمایا تھا۔ ”سلطان نے جو کچھ سوچا ہے وہ ہوگا نہیں۔“

واقعی ایسا ہو رہا ہے۔ افطار کے بعد سلطان کو اتنی فرصت ہی نہ مل سکی کہ وہ فیصلہ کرتا۔ فیروز نے سوچا، سلطان کا فیصلہ میرے قتل کے سوا کیا ہو سکتا تھا لیکن اب سلطان یہ فیصلہ نہیں سن سکتا۔ اب سلطان کسی علاج سے صحت یاب نہیں ہو سکتا۔ اس نے جو سوچا ہے وہ نہیں ہو سکتا۔ اب کا تب تقدیر کا فیصلہ یہ ہے کہ سلطان میرے ہاتھ میں ہے۔ میں چاہوں تو وقت سے پہلے اسے مار دوں لیکن نہیں، سلطان صرف بادشاہ نہیں میرا خون بھی ہے۔ اس کی حیار داری کرنا میرا فرض ہے۔ ممکن ہے وہ صحت یاب ہو کر اپنا فیصلہ تبدیل کر دے۔

لشکر میں سراپکی پھیلی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ ان کی عورتیں اور بچے دہلی سے ہزار کوس کے فاصلے پر صحرا میں قیام کیے ہوئے تھے۔ انہیں یہ فکر لاحق تھی کہ اگر سلطان نے وفات پائی تو ان کی ہلاکت اور بربادی یقینی ہے۔ لشکر کے لوگ مال اور عورتوں کے لالچ میں آپس میں لڑ پڑیں گے۔

بھاگنے کے لیے راستے کا علم بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود بہت سے لوگ بھاگنے بھی لگے تھے۔ ملک فیروز محمد تغلق کی حیار داری میں دن رات ایک کر رہا تھا۔ محمد تغلق کبھی کبھی آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھ لیتا تھا لیکن بولنے کا یا رانہیں تھا یا شرمندگی اسے بولنے نہیں دیتی تھی۔ لشکر میں ہر روز کہلوایا جاتا تھا کہ سلطان تیزی سے صحت یاب ہو رہا ہے۔

علما اور مشائخ ملک فیروز سے اصرار کر رہے تھے کہ وہ اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دے لیکن بادشاہ کی زندگی میں تخت نشینی کا اعلان بغاوت کے مترادف تھا۔ وہ انکار کرتا رہا۔ 21 محرم 751ھ کو سلطان محمد تغلق نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں کھولیں۔ فیروز تغلق کی طرف دیکھا اور اسے نام لے کر پکارا۔ پھر یہ اشعار اس کی زبان پر جاری ہوئے۔

بسیار دریں جہاں حمیدیم
بسیار نعیم جو ناز ویدیم
اسیان بلند بر نعیم
ترکان گراں بہا خریدیم
کردیم بے نشاط و آخر
چوں قامت ماہ نو خمیدیم

(اس دنیا میں ہم بہت گل گشت کرتے رہے۔ ہم نے بہت سی نعمتوں اور نازوں سے لطف اٹھایا۔ بڑے بڑے اونچے گھوڑوں پر بیٹھے اور بڑے بڑے قیمتی ترک غلام خریدے۔ ہم نے بہت مزے اڑائے لیکن آخر کار نئے چاند کی طرح ہم جھک کر رہ گئے)

اس کے بعد سلطان نے اپنی وصیت کا ذکر کیا۔ ”میں نے تین آدمیوں کو اپنی ولی عہدی کے لیے منتخب کیا تھا۔ ایک ملک مقبول جو اب اس دنیا میں نہیں رہا دوسرا احمد ایاز۔ وہ اب ستر سال سے اوپر کا ہو گیا۔ گھوڑے تک پر نہیں بیٹھ سکتا۔ تیسرے تم ہو۔ سب کو بلا لاؤ تاکہ میں تمہارا نام تحریر کرادوں۔“

ملک فیروز خیمے سے باہر آیا کہ امرا کو جمع کر سکے۔ خیمے میں واپس آیا تو سلطان کی روح نفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

علما، مشائخ اور امراء جمع ہوئے تو سلطان جاچکا تھا۔

سلطان کی وفات کی خبر چھپائی جانی تھی لیکن آہ وزاری کا ایسا شور مچا کہ کوئی یہ دیکھ ہی نہیں سکا کہ کون باہر نکلا اور کس نے یہ خبر لشکر تک پہنچادی۔ لشکر سے شور کی آوازیں بلند ہوئیں۔

فیصلے فیصلوں سے

وہ رات لشکر میں قیامت کی رات تھی۔ ہر شخص کو اپنے لٹ جانے کا خوف تھا۔ انہیں تو اتر سے یہ خبریں مل رہی تھیں کہ مغلوں کے جو پانچ ہزار سوار التون بہادر کے ہمراہ آئے تھے وہ لشکر میں لوٹ مار کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ وہ مال غنیمت کے لالچ میں آئے تھے اور یہاں کسی سے جنگ نہ ہو سکی۔ وہ چاہتے تھے خزانہ لوٹ لیں اور عورتوں کو اٹھا کر لے جائیں۔ بادشاہ کی وفات ہو چکی تھی۔ نیا بادشاہ مقرر نہیں ہوا تھا۔ وہ اب کسی کے حکم کے پابند نہیں تھے۔

لشکر کے سپاہیوں پر رات بھر خوف طاری رہا۔ ہتھیار سنبھالے آگے پیچھے دوڑتے رہے۔ آپس میں بھی لوگ ایک دوسرے سے خوف زدہ تھے۔ رات کے سناٹے میں کسی عورت یا بچے کی چیخ بلند ہو جاتی تھی جو دور لگے امرا کے خیموں تک پہنچتی تھی۔

تخت نشینی کا مسئلہ ابھی طے نہیں ہوا تھا کہ لشکر کی حالت بد سے بدتر ہونے لگی۔ ملک فیروز نے تمام امرا کو جمع کیا اور مشورہ چاہا کہ لشکر کے خطرات کس طرح دور کیے جائیں۔ سب کی رائے یہی تھی کہ مغلوں کی فوج کو اسلامی لشکر سے دور ہٹا دیا جائے۔

ان امرا کی موجودگی ہی میں ملک فیروز نے مغلوں کے سردار التون بہادر کو طلب کیا۔

”جیسا کہ آپ کو معلوم ہے سلطان محمد تغلق نے وفات پائی ہے۔ سلطان نے اپنی مدد کے لیے آپ کو بلایا تھا۔ اب نہ وہ سلطان رہا نہ وہ ممکنہ جنگ جس میں آپ کو شریک ہونا تھا لہذا اب آپ کو اجازت ہے کہ جلد از جلد اپنے وطن کو روانہ ہو جائیں۔ لشکر سلطانی اب دہلی کی طرف واپس ہوگا۔ آپ لشکر کی روانگی سے قبل اپنے لوگوں کو لے کر لشکر سلطانی سے دور ہو جائیں تاکہ کوئی بد نظمی نہ ہو۔“

ملک فیروز نے التون بہادر اور اس کے امیروں کو خلعت و انعامات سے نوازا۔

مغلوں کا سردار اپنی فوج کو لے کر چل دیا۔ محمد تغلق کا ایک غلام نوروز کرگن اس گفتگو کو سن کر رہا تھا۔ اس کے دل میں بے ایمانی آ گئی۔ وہ اپنے خاندان کے افراد کے ہمراہ مغلوں کے پاس چلا گیا جو شاہی لشکر سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گئے تھے اور اپنے وطن جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس نے اپنے متوسلین کو تو لشکر میں چھوڑا اور خود مغلوں کے سردار التون بہادر کے خیمے میں پہنچ گیا۔

”التون بہادر، تم میرے آقا سلطان محمد کے پاس آئے تھے تو کیا تمہیں یہ توقع نہیں تھی کہ بہت سا مال غنیمت

تمہارے ہاتھ آئے گا؟“
”یہی توقع ہمیں یہاں کھینچ لائی تھی لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ سلطان وفات پا گیا۔“ التون نے کہا۔
”تو کیا دروازہ کا سفر طے کر کے یونہی خالی ہاتھ چلے جاؤ گے؟“

”ملک فیروز نے ہمیں انعام و اکرام سے نوازا ہے۔ ہم اس کے شکر گزار ہیں۔“
”تمہیں معمولی سی رقم دے کر خود پورے خزانے پر قابض ہے۔“

”یہ اس کا حق ہے۔ وہ سلطان کا جانشین ہے۔“
”یہ خزانہ تمہیں بھی مل سکتا ہے۔ اگر مجھے تمہاری طرف سے انعام کی توقع ہو تو میں تمہیں راہ سمجھاؤں۔“
”وہ کس طرح؟“

”بادشاہ کی اچانک موت سے شاہی لشکر پریشان ہے۔ سب کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے ہیں۔ ابھی تک کوئی تخت پر نہیں بیٹھا ہے اس لیے بدظمی ہی بدظمی ہے۔ میری اطلاع کے مطابق کل لشکر روانہ ہوگا۔ اس بے ترتیب لشکر پر اگر حملہ کر دیا جائے تو خزانہ اور لشکر میں شامل عورتوں پر بہ آسانی قبضہ کیا جاسکتا ہے۔“

مغل تو پہلے ہی یہ ارادہ کر رہے تھے لیکن ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ نوروز ان کے ساتھ مل گیا اور ترغیب دی تو ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔

اگلے دن شاہی لشکر سیوستان کی جانب روانہ ہوا۔ لشکر کا ہر گروہ کسی سردار کی رہنمائی کے بغیر بے ترتیبی سے چل رہا تھا۔ گھر پہنچنے کی جلدی نے سب کو حواس باختہ کیا ہوا تھا۔

یہ غافل لشکر ابھی بہ مشکل دو کوس چلا ہوگا کہ مغل سامنے آگئے اور ٹھٹھہ کے مفند پیچھے سے۔ مغلوں اور مفندوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ بہت سی عورتیں اٹھالی گئیں۔ مال و اسباب میں سے جو جس کے ہاتھ لگا لوٹ لیا۔

لشکریوں نے اس دن کو بڑے خوف و ہراس سے گزارا اور دوسرے دن نہایت احتیاط سے فوج کو ترتیب دے کر سفر شروع کیا۔ جیسے تیسے دریا کے کنارے پہنچے لیکن اس طرح کہ آنکھیں آسمان کو تک رہی تھیں۔

اب یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر لشکر کے لوگ بھاگ کھڑے ہوئے تو اونٹوں پر لدنا شاہی خزانہ غیر محفوظ ہو جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ لشکر کے لوگ خود خزانہ لوٹ لیتے۔

علماء و مشائخ سر جوڑے بیٹھے تھے۔ سب کی رائے یہ تھی کہ ملک فیروز کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا جائے۔ جب

مغلوں کو معلوم ہوگا کہ نیا بادشاہ منتخب ہو گیا ہے تو وہ لوٹ مار سے باز آجائیں گے۔ لشکر بھی کسی کا حکم ماننے کا پابند ہوگا۔ یہاں کئی ایسے معتبر راوی موجود تھے جو بتا رہے تھے کہ سلطان نے اپنے چچا کے بیٹے ملک فیروز کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ مورخ ضیا الدین برنی کو بلا یا گیا۔ اس نے بھی گواہی دی۔

طے یہ ہوا کہ ایک وفد ملک فیروز کے پاس جائے اور اسے بادشاہت کے لیے مجبور کرے۔

مخدوم زادہ عباسی، شیخ الشیوخ مصری، شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی اور دوسرے علماء و مشائخ، امرا و ملوک اور معتبر لوگ اور ہر طبقے کے سردار شاہی درگاہ میں گئے۔ ملک فیروز ان اکابرین کو دیکھ کر اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”حضرات! اس بندہ ناچیز کو طلب کر لیا ہوتا۔“
”بات ایسی ہی تھی کہ ہمیں آنا پڑا۔“

”مجھ سے جو خدمت ممکن ہوئی کروں گا۔“
تمام لوگوں نے ملک فیروز کے مرشد شیخ نصیر کی طرف دیکھا۔ اشارہ یہ تھا کہ وہ گفتگو کا آغاز کریں۔ ملک فیروز ان کی بات نہیں ٹال سکے گا۔

”بے شک! آسانی فیصلوں کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔“ شیخ نے کہا۔ ”آسمانوں پر فیصلہ ہو چکا کہ سلطان محمد تغلق کا چچا زاد، ولی عہد اور وہی ملک فیروز، رجب سالار کا بیٹا تخت شاہی پر جلوہ افروز ہو۔“

”یا مرشد! میں نے تو دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ حجاز و زیارت حرمین شریفین کے لیے نکلوں گا۔“

”اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے لیکن اب تقاضائے وقت یہ ہے کہ بے کسوں کی فریادری کر اور تخت سلطنت پر بیٹھ جا۔“ تمام امرا و ملوک نے بہ یک آواز کہا۔ ”سلطان کے کوئی بیٹا نہیں۔ لشکر گاہ میں اور نہ دار الحکومت دہلی میں کوئی شخص ایسا ہے جو بادشاہی کے لائق ہو۔ اگر تو آج تخت پر نہیں بیٹھے گا تو کل کو یہ مغل اور ٹھٹھہ کے لوگ ہم میں سے کسی ایک کو بھی سلامت نہیں چھوڑیں گے۔“

فیروز تغلق، علماء و مشائخ کا بے حد احترام کرتا تھا۔ ان کے حکم کو ٹال نہ سکا۔ 24 ویں محرم 752ھ بمطابق 1351ء کو تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔

سلطان فیروز نے لشکر کو باقاعدہ ترتیب دیا اور دوسرے ہی روز سفر شروع کر دیا۔ اب لشکر میں ایک نیا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ مغل سوار لوٹ مار کے لیے آتے تو مارے جاتے یا گرفتار ہو جاتے۔ رفتہ رفتہ ان کی مزاحمت ختم ہو گئی اور وہ اپنے وطن کی طرف لوٹ گئے۔

ٹھٹھہ کے مفندوں نے بھی پیچھا کرنا چھوڑ دیا۔ لشکر بہ آسانی سیوستان پہنچ گیا جہاں سلطان نے چند روز قیام کیا۔ سیوستان سے روانہ ہونے کے بعد وہ بھکر پہنچا۔ یہاں کے لوگوں پر نوازشیں کیں، مزارات کی زیارت کی۔ اچھ سے آگے بڑھا تھا کہ اسے احمد ایاز کے علم بغاوت بلند کرنے کی خبر ملی۔ سلطان محمد تغلق نے احمد ایاز کو اپنا نائب بنا کر دہلی میں چھوڑا تھا۔ یہ وہی احمد ایاز تھا جس نے وہ محل تیار کیا تھا جس کے نیچے دب کر غیاث الدین تغلق ہلاک ہوا تھا۔

احمد ایاز نے جب سنا کہ محمد تغلق کا ٹھٹھہ کے قریب انتقال ہو گیا ہے تو اس نے تخت پر قبضہ کر لیا اور لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے ایک چھ سات سال کے لڑکے کو لوگوں کے سامنے پیش کر کے یہ کہہ دیا کہ یہ سلطان محمد تغلق کا بیٹا ہے جبکہ سلطان محمد تغلق کا کوئی بیٹا تھا ہی نہیں۔

احمد ایاز کی بغاوت کا سن کر بعض امرا فکر مند ہو گئے تھے لیکن سلطان فیروز، احمد ایاز کے اس اقدام پر ہنسنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے امرا کو سمجھا رہا تھا۔

”احمد ایاز کا پیشہ فن تعمیر ہے وہ میدان جنگ کا مرد نہیں۔ اس نے کبھی کمان ہاتھ میں نہیں پکڑی، کبھی بد مزاج گھوڑے پر سوار نہیں ہوا۔ مجھے اس شخص کے خلاف لشکر اور تیاری کی کیا ضرورت۔ نہ اس میں اتنا دم خم ہے کہ مقابلے پر آئے۔ میں جیسے ہی شہر کے قریب پہنچوں گا وہ دوسرے دروازے سے نکل جائے گا۔ مجھے تو افسوس یہ ہے کہ اس نے اس بڑھاپے میں ایسی خیانت کا کام کیا۔“

سلطان فیروز مستقیم مزاج نہیں تھا۔ وہ اب بھی اپنے امرا سے کہہ چکا تھا کہ بڑھاپے میں آدمی کا دماغ چل جاتا ہے۔ احمد ایاز بھی سٹھیا گیا ہے۔ وہ اگر مجھ سے معافی کا طلب گار ہوگا تو میں اسے ضرور معاف کر دوں گا۔

وہ دیوال پور پہنچ چکا تھا۔ اب وہ دہلی کے قریب تھا اس لیے خبریں بڑی تیزی سے آرہی تھیں۔ خبریں پہنچ رہی تھیں کہ اس نے رذیلوں اور غلاموں کو اپنے اعوان و انصار میں شامل کر لیا ہے۔ قصبات کے گنواروں کو بلالیا ہے اور ان پر مشتمل لشکر تیار کر لیا ہے۔ خزانے کی رقم بڑی بے دردی سے خرچ کر رہا ہے۔ شہر کے لوگ ڈر کے مارے احمد ایاز کا دم بھرتے ہیں لیکن دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے ہیں کہ کب سلطان فیروز دہلی پہنچتا ہے اور کب انہیں اس عذاب سے نجات ملتی ہے۔

سلطان فیروز حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر کے مزار کی زیارت کے لیے اجودھن گیا۔ وہ ٹھٹھہ سے یہاں تک برابر یہ

تاثر دیتا چلا آ رہا تھا کہ سلطان محمد تغلق کے برعکس وہ بزرگان دین کا احترام کرتا ہے۔ موجودہ علماء و مشائخ کو اس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس نے اپنے مرشد سے یہی وعدہ کیا تھا کہ بادشاہ بننے کے بعد وہ مشائخ کا احترام کرتا رہے گا۔

سلطان فیروز منزل بہ منزل آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ جب اس کا فتح مند لشکر فتح آباد کے قریب پہنچا تو ملک مقبول جو دہلی کا وزیر الممالک تھا اپنے خاندان سمیت درگاہ سلطانی میں حاضر ہو گیا۔ سلطان نے اسے خلعت فاخرہ سے نوازا۔

ملک مقبول کے چلے آنے کے بعد سلطان فیروز کی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ ملک مقبول کے چلے آنے کے بعد احمد ایاز پر سخت گھبراہٹ طاری ہوئی۔ سلطان فیروز ہانسی تک پہنچ گیا تھا کہ احمد ایاز نے سید جلال ترمذی، مولانا نجم الدین اور داؤد خانہ وغیرہ کو اپنا اپنی بنا کر بادشاہ کی خدمت بھیجا۔

احمد ایاز نے پیغام بھیجا تھا۔ ”حکومت کو آج بھی سلطان محمد تغلق کے خاندان سے تعلق ہے کیونکہ اس کا چھ سالہ بیٹا تخت پر بیٹھا ہے۔ اگر آپ حکمرانی چھوڑ کر سلطنت، محمد تغلق کے ولی عہد کے ہاتھ میں دے دیں اور خود صرف نائب کی حیثیت سے فرائض انجام دیں تو میں راہ سے ہٹ جانے کو تیار ہوں۔ میں تو صرف خاندان تغلق کی حفاظت کا فریضہ انجام دے رہا ہوں۔“

سلطان فیروز شاہ اس پیغام کو پڑھ کر فکر مند ہو گیا۔ اس نے تمام اراکین سلطنت کو جمع کیا اور ان سے پوچھا۔ ”آپ لوگ ہمیشہ مرحوم بادشاہ کے قریب رہے ہیں۔ میرے علم میں تو نہیں۔ آپ لوگ بتائیں کہ بادشاہ نے اپنا کوئی بیٹا چھوڑا ہے؟“

تمام امرا نے یک زبان ہو کر نفی میں جواب دیا۔ ”بادشاہ کے کوئی بیٹا نہیں۔ اگر کوئی بیٹا ہوتا تو بادشاہ آپ کے نام کی وصیت نہ کرتا یا پھر یہ دعویٰ بادشاہ کی بہن کی طرف سے آتا۔ یہ احمد ایاز دعویٰ کرنے والا کون ہوتا ہے۔“

ان کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد سلطان نے علماء کو طلب کیا تا کہ ان سے بھی مشورہ کرے اور پوچھے کہ شرع کی رو سے اسے اب کیا کرنا چاہیے؟

اس مجلس میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی، مولانا کمال الدین سمانہ اور مولانا شمس الدین جیسے مشہور علماء و مشائخ موجود تھے۔

”آپ لوگ مجھے بتائیں کہ ولی عہد کا یہ مسئلہ کس طرح طے ہو؟“

دنیا

کاشغری



تجسس نے ہمیشہ دریافت کے مراحل طے کرتے ہوئے کائنات کو تسخیر کرنے کا عمل جاری رکھا ہے۔ شوق کے اس سفر میں جستجو اسے بھی آگے بڑھاتی رہی اور بالآخر اسے ایسی منزل پہ لا چھوڑا جس نے اس پر سوچ کے نئے دروا کر دیے۔ کائنات کا یہ روپ دیکھ کر اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

پرخطر راستوں پر مشتمل موت کے جزیرے میں زندگی کی جولانیاں

موبی اس چھوٹی سی چٹان کے سب سے اوپری حصے پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کا بنا ہوا نیزہ اور اس سرد موسم میں اس کے جسم پر ریڈیو اور برقیاتی ریمپچ کی کھال سے بنا ہوا گرم ترین لباس تھا۔ اس چھوٹی سی چٹان کے سامنے دور تک برف کا ایک وسیع میدان پھیلا ہوا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے لوگوں کے ساتھ اس میدان میں سفر کر سکے گا اور کسی ایسی جگہ پہنچ سکے گا جہاں کوئی آبادی نہ ہو۔ موبی کا پورا نام موبی ای کی جا تھا اور وہ اپنے چھوٹے سے قبیلے کا سردار

ذلت اس کے نصیب میں لکھی ہوئی تھی۔ کھلے دربار میں اس سے خاک بوسی کرائی گئی۔ اس نے خاک آلود چہرہ اوپر اٹھایا تو سلطان نے اسے ملامت کی۔

”تجھ سے یہ کیا حرکت سرزد ہوئی۔ نمک کا حق ادا نہ کیا اور اپنے ولی نعمتوں کو پیٹھ دکھائی۔“

احمد ایاز نے جواب دیا۔ ”جب تک میرا اقبال میرے ساتھ تھا میں ولی نعمتوں کے مزاج کے مطابق کام کرتا رہا۔ میرا نصیب مجھ سے پھر گیا تھا کہ مجھ سے ایسی حرکت سرزد ہوئی کہ بدنامی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اب میں معافی کا طلب گار ہوں۔“

سلطان فیروز نے اس سے تو کچھ نہیں کہا ہانسی کے کوتوال کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ احمد ایاز کو کسی جگہ لے جا کر قید کر دیا جائے۔

یہ بھی فرمایا۔ ”مجھے اس بوڑھے سے شرم آتی ہے۔ نہیں معلوم کسی مسکین مظلوم کی بددعا اس کے حق میں مقبول ہوگئی کہ اس نے دیدہ و دانستہ خود اپنی مرضی سے خود کو اس مصیبت میں مبتلا کر لیا۔“

سلطان نے اس کے ایک ساتھی ملک غیاث الدین کو جلاوطن کر کے سرہند بھیج دیا اور دوسرے شیخ زادہ بسطامی کو ہندوستان سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

چوں تیرہ شور مرد را روزگار

ہمہ آں کند کش نیا بد بہ کار

(جب آدمی کا زمانہ تاریک ہو جاتا ہے تو وہی کرتا ہے جو اس کے کام نہیں آتا)

یہ معمولی کانٹے بٹانے کے بعد سلطان فیروز شاہ تغلق دہلی میں داخل ہوا اور اورنگ خسروی پر جلوہ افروز ہوا۔

سلطان کے دارالحکومت میں داخل ہونے کے پہلے ہی دن فتنہ ختم ہو گیا۔ کوئی ایک قتل کرائے بغیر، ایک قطرہ خون بہائے بغیر، کسی خاندان کو تباہ کیے بغیر یہ بغاوت جڑ سے اکھڑ گئی۔ یہ اس کی حکومت کے لیے اچھا شگون سمجھا گیا۔

لوگ جب سلطان محمد تغلق کی قتل و غارت گری کا موازنہ سلطان فیروز سے کرتے تھے تو انہیں حیرت ہوتی تھی کہ موجودہ

سلطان نے باغیوں کا بھی خون بہانا مناسب نہ سمجھا۔ ان باغیوں کے اہل خاندان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

ان لوگوں نے بھی امرا کے اقوال کی تصدیق کی البتہ مولانا کمال الدین سامہ نے اس بحث سے قطع نظر کہ سلطان محمد تغلق کے کوئی بیٹا تھا یا نہیں، اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ فرمایا۔

”وہ جس کے ہاتھوں کام کا آغاز ہوا وہی اس کام کو انجام دے تو بہت ٹھیک ہے۔“

سلطان فیروز کا اندیشہ دور ہو گیا۔ اگر تخت پر بیٹھنے والا بچہ واقعی سلطان تغلق کا بیٹا تھا تو بھی علما کا فتویٰ سلطان فیروز کو مل گیا۔ اس نے کام کا آغاز کیا ہے وہی اس کو انجام دے گا۔ اس فتوے کے بعد سلطان فیروز نے احمد ایاز کے قاصدوں کو گرفتار کر لیا۔

سلطان تغلق کا کوئی بیٹا تھا یا وہ لاولد تھا۔ یہ مسئلہ مورخوں کے نزدیک اب بھی اختلافی رہا ہے۔ مولف تاریخ فرشتہ نے علما کی گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ لاولد نہیں تھا بلکہ جسے تخت پر بٹھایا گیا تھا وہ واقعی سلطان محمد تغلق کا بیٹا تھا۔ تاریخ فیروز شاہی کے مولف ضیا الدین برنی نے اس لڑکے کو مجہول النسب لکھا ہے بلکہ یہ تک لکھا کہ یہ کسی کی حرام کی اولاد تھا۔

اب سلطان کو ہانسی سے دارالحکومت دہلی کی طرف روانہ ہونا تھا۔ اس نے لشکر آراستہ کیا اور روانہ ہوا۔ وہ ابھی راستے میں تھا کہ شیخ زادہ بسطامی، تھوسودھل، حسام ادھنگ وغیرہ جو احمد ایاز کے اعوان و انصار ہو گئے تھے اپنے سروں کو ننگا کر کے اور پگڑیاں گلوں میں لپیٹ کر سلطان کے سامنے حاضر ہو گئے۔

یہ وہ لوگ تھے جن کے دم سے احمد ایاز کی حکومت چل رہی تھی۔ جب انہوں نے ساتھ چھوڑ دیا اور لشکر جو قصابات کے گنواروں پر مشتمل تھا، منتشر ہو گیا تو احمد ایاز بے آسرا ہو گیا۔

سلطان فیروز دہلی کے قریب پہنچ گیا تھا اور اب احمد ایاز میں مقابلے کی تاب نہیں تھی۔ اس نے اشرف الملک خلجی اور ملک حسین مرزا کو اپنے گناہوں کو معاف کرانے کے لیے بادشاہ کے پاس بھیجا۔ سلطان نے اس کے جرم کو معاف کر دیا لیکن اس شرط پر کہ وہ خود سلطان کے سامنے حاضر ہو اور اپنے گناہوں کی معافی طلب کرے۔ احمد ایاز کے لیے اب فرار کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔

اس نے بھی پگڑی گردن میں لپیٹی اور اپنے منڈے ہوئے سر کو ننگا کر کے درگاہ سلطانی میں حاضر ہو گیا۔ ابھی مزید

تاریخ فیروز شاہی، ضیا الدین برنی، تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ، طبقات اکبری، خواجہ نظام

الدین احمد، تاریخ مبارک شاہی، یحییٰ بن احمد سرہندی، آئینہ حقیقت، نما، اکبر شاہ خان

ماخذات

تھا۔ اس کا سردار باپ سیل پھلی کے شکار کے دوران میں بخ بستہ سمندر میں گر گیا تھا اور اس سے پہلے کہ اسے پانی سے نکالا جاتا وہ منجمد ہو کر مر چکا تھا۔

موبی صرف بیس برس کی عمر میں اپنے قبیلے کا سردار بن گیا تھا۔ اب وہ پینتیس برس کا تھا اور ان برسوں میں اس نے اپنے چھوٹے سے قبیلے کو قدرتی آفات اور دشمنوں سے کامیابی سے محفوظ رکھا تھا۔ اس علاقے میں سوائے شکار کے اور کچھ نہیں تھا۔ واحد جانور جسے پالا جاسکتا تھا وہ رینڈیزر تھا۔ لیکن مزید خوراک اور لباس کے لیے انہیں سیل اور برفانی ریچھ کا شکار بھی کرنا پڑتا تھا۔

کئی ہزار سال پہلے جب ان کے آبا و اجداد اس علاقے میں آئے ہوں گے تو اس وقت جگہ کی کمی نہیں تھی۔ لیکن جگہ کم پڑنے لگی قبیلوں کی زمین کے حصول پر لڑائی ہونے لگی۔ طاقتور قبیلے موقع پا کر کمزور قبیلوں کو جگہ سے بے دخل کر دیتے تھے۔ لیکن کمزور ہونے کے باوجود قبیلے اپنی جگہ کی حفاظت کے لیے جان توڑ کوشش کرتے تھے اور اکثر بڑے قبیلے کو بھی اتنا جانی نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ اس لیے بڑی لڑائیاں کم ہی ہوتی تھیں۔

موبی کے قبیلے میں اس دور کے مطابق تمام کام مل جل کر کیے جاتے اور شکار میں برابر کا حصہ ہوتا تھا۔ کھال سے لباس اور دوسری اشیاء بنتی تھیں جبکہ چربی سے آگ جلائی جاتی تھی۔ حرارت حاصل کرنے کے لیے ان کے پاس برفانی ریچھ، سیل اور رینڈیزر کی گرم ترین کھالوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ سال کے چھ مہینے ان کے علاقے میں سوائے برف کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

موبی کا قبیلہ خشکی کے ساتھ ہی ایک سمندری کٹاؤ پر آباد تھا جہاں سال کے بارہ مہینے برف جمی رہتی تھی لیکن وہ یہاں صدیوں سے آباد تھے اس لیے انہیں کو معلوم تھا کہ زمین کہاں ہے اور سمندر کہاں؟ کٹاؤ کے چاروں طرف بلند چٹانیں تھیں جو کسی دشمن سے ان کی حفاظت کرتی تھیں۔ اس جگہ آنے کے لیے ایک چھوٹا سا راستہ تھا جس کی حفاظت دو آدمی بھی کر سکتے تھے۔ ان کے پاس لکڑی، ہڈی اور پتھر سے بنے اوزار اور ہتھیار تھے۔ بنیادی طور پر وہ جنگجو نہیں تھے صرف اپنا دفاع کرتے تھے۔

آس پاس آباد کئی قبیلے موبی کے علاقے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ سمندر پاس ہونے کی وجہ سے انہیں یہاں شکار کی بہتات تھی۔ دوسرے قبائل کی دلی خواہش تھی کہ کسی طرح یہ جگہ ان کے ہاتھ آجائے۔ لیکن اس جگہ کی دفاعی پوزیشن ایسی

تھی کہ یہاں حملہ کرنا نہایت دشوار تھا۔ موبی اور اس کے ساتھی بھی بے خبر نہیں تھے۔ موبی دشمنوں کی طرف سے بھی غافل نہیں رہتا تھا۔ اس کا قبیلہ چھوٹا تھا۔ افراد کی کل تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں تھی۔ موبی کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کرنے والے مردوں کی تعداد پچاس سے زیادہ نہیں تھی۔ ان کے مقابلے میں دوسرے قبیلوں میں لڑنے والے جوان مردوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

جب موبی سردار بنا تو کٹاؤ میں آنے والا راستہ کسی قدر چوڑا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کی مدد سے پتھر تلاش کر کے اس راستے کو پتھروں سے بھر کر چھوٹا اور دشوار گزار کر دیا۔ ڈھلان کے اندر والے حصے سے سب سے بلند پہاڑی تک ایک سیدھی دار راستہ بنا کر سب سے اوپر ایک چوکی بنا دی تھی جہاں ہمہ وقت ایک آدمی آس پاس نظر رکھتا تھا کٹاؤ میں آنے والے راستے پر بھی ہمہ وقت دو پہریدار مستعد رہتے تھے۔ موبی کے سردار بننے کے بعد ایک قبیلے نے شرارت کی تھی۔ جو کٹاؤ سے چند میل دور جنوب میں آباد تھا۔ اسے شکار کے لیے سمندر تک جانے کے لیے دوسرے قبیلوں کے علاقے سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس لیے انہوں نے سوچا کہ اگر وہ موبی کے قبیلے کی جگہ پر قبضہ کر لے تو ان کی مشکل آسان ہو جائے گی۔ ایک رات انہوں نے خاموشی سے حملہ کیا اور جیسے ہی وہ کٹاؤ کے پاس پہنچے انہیں معلوم ہوا کہ موبی اور اس کے ساتھی دفاع کے لیے تیار تھے۔ موبی کے پہریداروں نے تاریکی کے باوجود حملہ کرنے والوں کی حرکت پہلے ہی محسوس کر لی تھی جیسے ہی حملہ آوروں نے کٹاؤ میں داخل ہونے کی کوشش کی ان پر پتھروں کی بارش ہو گئی۔ ابھی حملہ کرنے والے اس مصیبت سے نہیں سنبھلے تھے کہ موبی اور اس کے باقی ساتھیوں نے حملہ کر دیا۔ اس غیر متوقع مدافعت سے گھبرا گئے اور اپنے چھ ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ موبی کے آدمیوں کا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد کسی قبیلے کو ہمت نہیں ہوئی تھی کہ ان کے علاقے پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا۔

موبی جانتا تھا کہ جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی قبیلہ پھر حملہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ اسی وجہ سے پریشان تھا۔ یہ پریشانی اس کی بیوی امشی نے محسوس کر لی۔ ایک رات جب وہ سونے کے لیے اپنے برف سے بنے مکان میں آیا تو امشی نے اس سے پوچھ لیا۔ ”میرے آقا تم کیوں پریشان ہو؟“ موبی نے اپنی حسین اور وفا شعار بیوی کی طرف دیکھا۔ ”مجھے ڈر ہے جلد کوئی نہ کوئی قبیلہ ہم پر چڑھ دوڑے گا“

اور یہاں سب سے چھوٹا قبیلہ ہمارا ہی ہے۔“

”لیکن مجھے یقین ہے جتنے بہادر مرد اس قبیلے میں ہیں کسی اور قبیلے میں نہیں ہوں گے۔“

”مجھے بھی اپنے ساتھیوں کی بہادری پر شک نہیں ہے لیکن دشمن زیادہ ہوں تو ہم کب تک ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔“

”پھر ہم ایک محفوظ جگہ پر ہیں۔“ امشی نے اپنے محبوب شوہر کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش جاری رکھی۔ ”اگر دشمن زیادہ ہوں تو تب بھی ہم اسے روک سکتے ہیں۔“

امشی کی نسلی کے باوجود موبی پریشان رہا تھا۔ جب وہ شام میں سورج کو افق پر غائب ہوتے دیکھتا تو اسے آسمان پر سرخ رنگ کی لہریں دکھائی دیتی تھیں اور وہ ڈر جاتا تھا۔ اس کی یہ کیفیت اس کے نائب ہارا کی نے بھی محسوس کر لی۔

”آقا تم مجھے پریشان لگ رہے ہو؟“

”ہاں میں پریشان ہوں۔“ موبی نے تسلیم کر لیا۔ ہارا کی صرف اس کا نائب ہی نہیں بلکہ بہترین دوست بھی تھا۔ اس لیے موبی نے بلا جھجک اسے اپنی پریشانی کی وجہ بتادی۔ ہارا کی نے بھی اسے تقریباً امشی کے الفاظ میں نسلی دی۔

”میرے دوست اور آقا، ہم نے پچھلی بار حملہ آوروں کے ساتھ جو کیا تھا اسے دیکھتے ہوئے اب کوئی ہماری طرف آنے کا سوچے گا بھی نہیں۔“

”لیکن مجھے لگتا ہے کہ شور کوئی قبیلہ ہمارے خلاف سازش کر رہا ہے۔ مجھے یقین ہے ان کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔“

”میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔“

طے پایا کہ شکار پر اب آدھے جوان مرد جائیں گے اور آدھے ہر وقت کٹاؤ میں موجود رہا کریں گے۔ ورنہ اس سے پہلے سوائے پہریداروں کے تقریباً سارے ہی جوان مرد شکار پر جاتے تھے۔ سرد موسم کی وجہ سے ان کی خوراک زیادہ تھی۔ موبی نے پہریداروں کے ساتھ اپنے آدمیوں کے دس دس کے دو گشتی دستے بنا دیے تھے جو دن اور رات میں باری باری کٹاؤ کے آس پاس کے میدانوں میں گشت کرتے تھے۔ اس کا مقصد شور کوئی اور ان جیسے بدنیت قبیلوں کو بتانا تھا کہ وہ غافل نہیں ہیں۔

اس کے بعد موبی کسی قدر مطمئن ہو گیا۔ موسم سرما کی آمد قریب تھی اور شدید سردی آنے سے پہلے وہ اتنا گوشت چربی اور کھالیں جمع کر لیتے تھے جس سے سرما کے دوران میں گزارا ہو سکے۔ افراد کی قوت کم ہونے سے شکار کی رفتار بھی اتنی تیز نہیں رہی تھی پھر بھی اسے امید تھی کہ وہ سرما گزارنے کے لائق سامان جمع کر لیں گے۔ آخری دنوں میں موبی نے

حفاظت پر مامور افراد میں کمی کر کے ان کو بھی شکار پر بھیج دیا تھا۔ اب کٹاؤ کی حفاظت پر بیس سے زیادہ افراد موجود نہیں تھے ہارا کی سربراہی میں ان میں خود موبی بھی شامل تھا۔

اس رات سب معمول کے مطابق تھا۔ خود سونے کے لیے جانے سے پہلے موبی نے کٹاؤ کے داخلی حصے اور اوپر پہاڑی پر موجود پہریدار کو دیکھا، وہ سب مستعد تھے۔ اس کے باوجود رات کو شور کوئی قبیلے کے حملہ آور کیسے کٹاؤ میں گھس آئے وہ نہیں جان سکا تھا۔ وہ سو رہا تھا کہ باہر ہونے والے شور نے اسے بیدار کیا اور پھر وہ اپنے ہتھیار سنبھال کر باہر آیا۔ داخلی حصے سے شور کرتے حملہ آور داخل ہو کر مکانات میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ اس کے قبیلے کے لوگ مدافعت کر رہے تھے۔ موبی اپنا لکڑی کا نیزہ اور ہڈی سے بنی ہوئی کلہاڑی لے کر حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے پہلے ہی حملے میں دو افراد کو مار گرایا۔ اس کی آمد سے اس کے آدمیوں کا حوصلہ بڑھا تھا۔

موبی نے اندازہ لگایا کہ حملہ آوروں کی تعداد ساٹھ سے زیادہ تھی۔ جبکہ اس کے ساتھ لڑنے والے مشکل سے بیس تھے۔ ان میں تقریباً سارے ہی جوان آدمی تھے۔ چند بوڑھے بھی تھے۔ جب کہ حملہ آور سارے ہی جوان اور جنگجو تھے اور ان کا مقابلہ کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ اب تک انہوں نے کئی افراد کو مار ڈالا تھا۔ مرنے والوں میں بوڑھے اور بچے نظر آ رہے تھے۔ موبی کو ان کی فکر نہیں تھی وہ تو باقی افراد کو بچانا چاہتا تھا۔

اچانک اس نے چلا چلا کر عورتوں سے کہنا شروع کر دیا کہ وہ اپنے بچوں کو لے کر ساحل کی طرف بھاگ جائیں۔ اس کی آواز سن کر عورتیں اپنے چھوٹے بچوں کو لے کر مکانات سے نکلیں اور ساحل کی طرف بھاگنے لگیں۔ انہیں بھاگتے دیکھ کر حملہ آوروں کی توجہ ان کی طرف ہوئی۔ اس کا فائدہ اٹھا کر موبی اور اس کے ساتھی ایک جگہ جمع ہو کر حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے جوش و خروش کے سامنے حملہ آور اچانک ہی وہاں سے بھاگ نکلے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کٹاؤ ان سے خالی ہو گیا۔

موبی کے آدمی ان کے پیچھے جانا چاہتے تھے لیکن اس نے انہیں روک دیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ کٹاؤ کے داخلی دروازے کی حفاظت کریں۔ پھر وہ چربی کی مشعلوں میں نقصان کا اندازہ کرنے لگا۔ اس کا دل رکنے لگا کہ صرف مکانات سے باہر کوئی پچاس لاشیں پڑی تھیں اور ان میں کئی اس کے جنگجو ساتھیوں کی تھیں۔ لیکن بیشتر مرنے والے بوڑھے اور بچے تھے۔ حملہ آوروں نے انہیں بے دریغ قتل کیا

تھا۔ اس کے قبیلے کی نصف آبادی مرچکی تھی جو بچے تھے ان میں بھی کئی زخمی تھے۔ اب موبی کے پاس دس آدمی بھی نہیں بچے تھے جو حملہ آوروں سے لڑ سکتے اس لیے وہ چاہتا تھا کہ اس کے شکار پر گئے آدمی واپس آجائیں۔ کچھ دیر بعد انکشاف ہوا کہ حملہ آوروں نے درجن سے بھی زیادہ جوان عورتوں اور لڑکیوں کو پہلے ہی الگ کر لیا تھا اور جاتے ہوئے انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے، یہ مرنے والوں سے بھی بڑا نقصان تھا۔ اس کی بقا کی ضامن یہی عورتیں تھیں جو بچے پیدا کر سکتیں۔ صبح سے پہلے شکار پر جانے والے واپس آگئے اور ان کے لیے بھی یہ سب نہایت اندوہناک تھا۔ اپنے پیاروں کی لاشوں کو دیکھ کر وہ جوش انتقام سے بے تاب ہو گئے تھے۔ وہ شاید شور کوئی قبیلے کی طرف دوڑ جاتے لیکن موبی نے یہ مشکل انہیں باز رکھتے ہوئے کہا۔

”اگر تم لوگ اس طرف گئے اور مارے گئے تو پھر اس قبیلے کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ ہم فنا ہو جائیں گے۔“

”تب ہم کیا کریں؟“ ہارا کی چلا کر بولا۔

موبی مشعلوں کی روشنی میں اپنے ساتھیوں کے چہرے دیکھتا رہا اور پھر اس نے کہا۔ ”ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔ وہ کل پھر حملہ کریں گے اور اس بار ہم انہیں نہیں روک سکیں گے۔ اس لیے یہاں سے جانا ضروری ہے۔“

”ہم چلے جائیں لیکن کہاں؟“ امشی نے کہا۔

”یہ میں نہیں جانتا تھا لیکن ہمیں یہاں سے جانا ہو گا۔ خوراک اور اپنا سارا سامان تیار کرلو۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ یہ سنتے ہی اس کے ساتھی حرکت میں آگئے تھے۔ انہوں نے تاج گاڑیوں میں ریڈیٹر جوتے اور ان پر سامان بار کیا۔ مرنے والوں کی لاشیں برف میں دفن کر دی گئیں۔ ویسے سمندر ہی ان کو خوراک اور دوسری چیزیں مہیا کرتا تھا اس لیے وہ خود کو سمندر کی امانت سمجھتے تھے اور مرنے کے بعد یہ امانت سمندر کو لوٹا دی جاتی تھی۔ اب اتنے مردوں کو سمندر تک لے جانا ممکن نہیں تھا اس لیے انہیں یہیں کٹاؤ میں برف کھود کر دفن کیا جانے لگا۔ صبح تک وہ ان سارے کاموں سے فارغ ہو گئے تھے اور اب روانگی کے لیے سردار کے حکم کے منتظر تھے۔

”ٹھیک ہے ہم مغرب کی طرف جائیں گے۔“ ہارا کی نے بلا توقف کہا۔ ان میں سردار کے حکم سے سرتابی کی کسی میں مجال نہیں تھی۔ صبح ہوتے ہی روانہ ہو گئے۔ ان میں سے کئی زخمی تھے انہیں سکیج میں ڈال لیا اور باقی افراد پیدل چل رہے تھے۔ خود موبی بھی پیدل تھا اگرچہ اس کے بازو میں بھی لڑائی کے دوران میں زخم آیا تھا۔ امشی نے اس کے بازو پر ایک پرانی کھال لپیٹ دی تھی۔ وہ کپڑے سے واقف ہی نہیں تھے۔ ذرا دیر بعد وہ کٹاؤ والی جگہ سے دور نکل گئے تھے۔ ان کے پاس خوراک کا محدود ذخیرہ تھا کیونکہ تاج میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ ساری خوراک لے جاسکتے۔ موبی سمیت ان میں سے کسی کو علم نہیں تھا کہ ان کی منزل کہاں ہے۔

وہ چوبیس گھنٹے تک سفر کرتے رہے تھے۔ خوش قسمتی سے ان کے پاس آگ محفوظ رہی تھی ورنہ اگر کسی وجہ سے کوئی قبیلہ آگ سے محروم ہو جاتا تو دوسرے قبیلے والے بہت بڑی قیمت کے عوض آگ دیتے تھے اور یہ قیمت دو جوان کنواری لڑکیاں ہوتی تھیں۔ چوبیس گھنٹے بعد جب انہیں اطمینان ہوا کہ وہ دشمن کی پہنچ سے دور نکل آئے ہیں تب انہوں نے رکنے اور آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔

تھکن کے باوجود موبی کو نیند نہیں آرہی تھی۔ امشی بھی جاگ رہی تھی البتہ اس کے دونوں بچے سو گئے تھے۔ امشی نے کہا۔ ”میرے آقا کیا سوچ رہے ہیں؟“

”میں سوچ رہا ہوں کہ شور کوئی حملہ آور کٹاؤ میں داخل کیسے ہوئے جبکہ پہریدار موجود تھے۔ انہوں نے سب کو خبردار کیوں نہیں کیا؟“

پہریداروں کے پاس سیل کی کھوکھلی ہڈی سے بنی ایسی سیٹی تھی جس کی آواز ایک میل تک آسانی سے سنی جاسکتی تھی لیکن ان میں سے کسی نے سیٹی بجا کر انہیں خبردار نہیں کیا تھا۔ موبی کے سوال پر امشی بھی چونک گئی۔ ”ہاں..... آپ نے ان سے پوچھا میرے آقا؟“

موبی نے گہری سانس لی۔ ”وہ بتانے کے لیے زندہ نہیں رہے تھے، دونوں پہریدار اپنی جگہوں پر مردہ پائے گئے اور عجیب بات ہے، اوپر چوکی کا نگران بھی اپنی چوکی میں مردہ پڑا تھا۔ اسے کس نے مارا اور جب اس نے حملہ آوروں کو دیکھ لیا تو اس نے سیٹی کیوں نہیں بجائی؟“

امشی اتنی ذہین نہیں تھی کہ اس قسم کے معاملات پر سوچ سکتی موبی سردار اور دوسرے معاملات دیکھنے اور باتوں لوگوں کی حفاظت کے خیال سے تفتیش نہیں کر سکا تھا کہ پہریداروں نے اپنا فرض کیوں انجام نہیں دیا اور خاموشی

سے اپنی جگہوں پر کیوں مارے گئے تھے؟ مگر اب وہ سوچ رہا تھا، یہ بہت اہم سوال تھا۔ صرف پہریداروں کی غفلت سے اتنا نقصان ہوا تھا۔ اگر وہ بروقت خبردار کر دیتے تو موبی کا نصف قبیلہ یوں ختم نہ ہوتا اور شاید انہیں اپنی جگہ بھی چھوڑ کر نہیں نکلنا پڑتا۔ صبح موبی باہر آیا، ہارا کی اور دوسرے لوگ روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔ موبی نے انہیں صرف ایک رات کے لیے رکنے کی اجازت دی تھی۔ افسوسناک خبر یہ تھی کہ کل رات ان کے دوشدید زخمی ہونے والے ساتھی بھی ختم ہو گئے تھے۔ یہ بھی جنگجو جوان تھے۔ موبی کے لیے یہ بہت بڑا نقصان تھا، اس کی نصف سپاہ موت کے گھاٹ اتر چکی تھی اور اب اس کے پاس مشکل سے دو درجن جوان تھے اگر راستے میں کوئی ان پر حملہ کر دیتا تو وہ مزاحمت نہیں کر سکتے تھے۔

اس دن بھی وہ مغرب کی طرف سفر کرتے رہے۔ ان کے سامنے دور تک برف سے ڈھکا ہوا ہموار میدان تھا جس میں کہیں کہیں برف کے ٹیلے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ پھر آنے والے دنوں میں بھی اس منظر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس دوران میں سرما سخت ہوتا جا رہا تھا۔ آنے والے ایک ہفتے میں ان کے مزید سات افراد فنا کے گھاٹ اتر گئے تھے۔ ان میں پانچ بوڑھے اور دو بچے شامل تھے۔ وہ سردی برداشت نہیں کر سکے تھے۔ موبی سرد موسم کی شدتوں سے بخوبی واقف تھا۔ اور انہیں اس وقت سے پہلے کوئی ایسی جگہ تلاش کرنی ہوگی جہاں وہ باقاعدہ گھر بنا کر رہ سکیں ورنہ ان میں سے کوئی زندہ نہیں بچتا۔ اس سارے علاقے میں سرما کے دوران میں شدید برفانی طوفان آتے تھے اور درجہ حرارت بہت نیچے چلا جاتا تھا۔ اپنی بستی میں وہ سردی کے پانچ مہینے گھروں میں رہ کر اور سو کر گزارتے تھے باہر نکلنے کی ہمت کوئی نہیں کرتا تھا۔ وہ پانچ مہینے شروع ہونے میں کچھ وقت تھا۔

سفر کے دوسرے ہفتے میں موسم مزید اتنا خراب ہو گیا تھا کہ دو دن تک ایک طوفان نے ان کا راستہ روک رکھا۔ اس طوفان اور سردی نے مزید چار ضعیف لوگوں کی جان لے لی۔ اب ان کی تعداد پچاس سے زیادہ نہیں تھی۔ ان میں بچپیں جوان مرد، بارہ عورتیں اور ایک درجن سے زیادہ مختلف عمروں کے بچے تھے۔ جن سے سردی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ سفر کے پندرہویں دن تین بچے اچانک ہی بیمار ہوئے اور چند گھنٹوں میں زندگی کی بازی ہار گئے۔ ان کی اموات نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہارا کی نے موبی سے کہا۔ ”آقا ہمیں اب سمت بدل لینی چاہیے ہمیں جنوب کی طرف جانا چاہیے، جہاں امید ہے کہ اچھا موسم ملے گا۔“

موبی نے انکار کیا۔ ”جنوب کی طرف ہمیں اچھے موسم سے زیادہ دشمن ملیں گے۔ ہم جس کی سرزمین میں داخل ہوں گے وہ ہمارا دشمن بن جائے گا۔ ہمیں مغرب کی ہی طرف جانا ہوگا وہیں ہمیں کوئی ایسی سرزمین ملے گی جو کسی کی نہیں ہوگی۔ صرف ہماری ہوگی۔“

”مغرب کی طرف آج تک کوئی نہیں گیا ہے۔“ ہارا کی بولا۔

”اسی لیے تو میں اس طرف جا رہا ہوں۔“ موبی نے اس کی طرف دیکھا۔ ”ہماری عافیت اسی میں ہے کہ اس طرف بڑھتے رہیں۔“

”ہمارے بچے مر رہے ہیں۔“ ہارا کی اس بار کسی قدر تلخی سے بولا۔

”میرے بھی بچے ہیں اور ممکن ہے وہ بھی مر جائیں۔“ موبی نے آہستہ سے کہا۔ ”لیکن میں وہی کروں گا جو قبیلے کے لیے بہتر ہوگا۔“

”ہمیں جنوب کی طرف جانا چاہیے۔“ ہارا کی نے کہا۔ ”یہ صرف میرا نہیں دوسرے لوگوں کا بھی خیال ہے۔“

”مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔“ اس بار موبی کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”اگر کوئی جانا چاہتا ہے تو چلا جائے لیکن قبیلہ اسی طرف سفر کرے گا۔“

ہارا کی اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ وہ اس روز بھی اسی سمت میں سفر کرتے رہے مگر موبی نے محسوس کیا کہ دوسرے بہت سارے لوگ اب مغرب کی طرف جانے پر متفق نہیں تھے، وہ جنوب کی طرف جانا چاہتے تھے۔ وہ موسم کی سختی سے گھبرا رہے تھے جب کہ موبی کے خیال میں جنوب میں ان کا واسطہ انسانوں سے پڑے گا اور یہ اچھی بات نہیں ہوگی۔ انسان بھی اپنی حد میں مداخلت پسند نہیں کرتا ہے اس لیے لڑائی ہوگی اور ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ کسی سے لڑ سکتے۔ ان کے پاس خوراک ختم ہوتی جا رہی تھی اور اب بس چند ہفتوں کی خوراک باقی رہ گئی تھی۔ راستے میں کہیں شکار نہیں ملا تھا ویسے بھی وہ اجنبی جگہوں پر شکار نہیں کھیلتے تھے۔ وہ صرف جانی پہنچانی جگہوں پر شکار کرتے تھے جہاں کے خطرات کے بارے میں وہ پوری طرح جانتے ہوں۔

آنے والے چند دن ان کے لیے مزید سختی لے کر آئے، دو بچے اور ایک جوان سردی کی نذر ہو گئے۔ باقیوں کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ سردی ناقابل برداشت حد تک آ پہنچی تھی اور اس سردی کے دوران وہ اپنے گھروں میں محدود ہو کر رہ جاتے تھے لیکن یہاں وہ کھلے آسمان تلے سفر کرنے پر

پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپ کو تمام ڈائجسٹ

ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ

آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ

لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

”آگے سفر بہت مشکل ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے ہم مر جائیں لیکن بچ گئے تو کسی ایسی جگہ تک ضرور پہنچ جائیں گے جہاں پھر ہمیں کسی کا خوف نہیں ہوگا۔“

”میں سمجھتا ہوں سردار۔“ کاتکی نے کہا۔ ”میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا چاہے زندگی ہو یا موت۔“

ان کے پاس اب دو بیج اور تھوڑی سے خوراک تھی بیج کھینچنے کے لیے چار ریڈیز تھے لیکن ان کی اپنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ بڑی مشکل سے بیج کھینچ رہے تھے۔ چھوٹے بچوں کو اضافی کھالوں میں لپیٹ کر بیج میں بٹھایا گیا تھا اور ذرا بڑے ان کے ساتھ ہی پیدل چل رہے تھے۔ انہیں سفر کرتے ہوئے تین ہفتے ہو چکے تھے اور موسم اب مستقل سردی

رہنے لگا تھا۔ اکثر گہرے بادل چھائے رہتے تھے اور دھوپ بہت کم دکھائی دیتی تھی۔ چوتھے ہفتے انہوں نے محسوس کیا کہ وہ سمندر کی طرف جا رہے تھے کیونکہ یہاں برف میں ایک مسلسل ہموار ڈھلان آگئی تھی۔ ان کا اندازہ درست نکلا جب ایک شام انہیں تاحہ نگاہ پھیلا سمندر دکھائی دیا۔ اس کے کنارے برف جی تھی لیکن سمندر کا پانی ابھی جما نہیں

تھا۔ جب گرماء عروج پر ہوتا تو کٹاؤ کے ساتھ سمندر پر جی برف بھی پگھل جاتی۔ یہاں تک پہنچ کر ان کا مغرب کی طرف سفر ختم کیا تھا۔ کاتکی نے پوچھا۔

”سردار، اب ہم کس طرف جائیں؟“

اب دو سمتیں رہ گئی تھیں ایک جنوب اور دوسری شمال۔ جنوب کی طرف جانے میں وہی مسئلہ تھا، انہیں انسانوں سے واسطہ پڑتا اور ان کی بقا خطرے میں پڑ جاتی۔ ویسے بھی لوگ ہی کتنے تھے۔ اب ان کے کسی سے لڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دوسری طرف شمال تھا۔ اگر وہ شمال کی طرف بڑھتے تو انہیں پہلے سے زیادہ شدید موسم سے واسطہ پڑتا۔ جبکہ یہاں کا موسم بھی کم اذیت ناک نہیں رہا تھا۔ گرم ترین ملبوسات میں بھی وہ ٹھہرتے رہے تھے۔ بڑوں سے زیادہ بچوں کی حالت خراب تھی۔ موبی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ کاتکی اور عورتیں منتظر تھیں کہ موبی کوئی فیصلہ کرے۔ اس نے کہا۔

”ابھی شام ہو رہی ہے ہم یہیں رکھتے ہیں اور آرام کرتے ہیں۔“

”وہ سب ہی آرام کی ضرورت محسوس کر رہے تھے کیونکہ بائیس دن سے مسلسل سفر میں تھے۔ موبی اور کاتکی نے برف کھود کر گڑھا بنایا اور اس میں اپنے خیمے لگائے۔ پھر وہ سب ان میں گھس کر اور گرم کھالوں میں لپٹ کر سو گئے۔ ان

کے سفر بہت مشکل ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے ہم مر جائیں لیکن بچ گئے تو کسی ایسی جگہ تک ضرور پہنچ جائیں گے جہاں پھر ہمیں کسی کا خوف نہیں ہوگا۔“

”میں سمجھتا ہوں سردار۔“ کاتکی نے کہا۔ ”میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا چاہے زندگی ہو یا موت۔“

ان کے پاس اب دو بیج اور تھوڑی سے خوراک تھی بیج کھینچنے کے لیے چار ریڈیز تھے لیکن ان کی اپنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ بڑی مشکل سے بیج کھینچ رہے تھے۔ چھوٹے بچوں کو اضافی کھالوں میں لپیٹ کر بیج میں بٹھایا گیا تھا اور ذرا بڑے ان کے ساتھ ہی پیدل چل رہے تھے۔ انہیں سفر کرتے ہوئے تین ہفتے ہو چکے تھے اور موسم اب مستقل سردی رہنے لگا تھا۔ اکثر گہرے بادل چھائے رہتے تھے اور دھوپ بہت کم دکھائی دیتی تھی۔ چوتھے ہفتے انہوں نے محسوس کیا کہ وہ سمندر کی طرف جا رہے تھے کیونکہ یہاں برف میں ایک مسلسل ہموار ڈھلان آگئی تھی۔ ان کا اندازہ درست نکلا جب ایک شام انہیں تاحہ نگاہ پھیلا سمندر دکھائی دیا۔ اس کے کنارے برف جی تھی لیکن سمندر کا پانی ابھی جما نہیں

تھا۔ جب گرماء عروج پر ہوتا تو کٹاؤ کے ساتھ سمندر پر جی برف بھی پگھل جاتی۔ یہاں تک پہنچ کر ان کا مغرب کی طرف سفر ختم کیا تھا۔ کاتکی نے پوچھا۔

”محبور تھے۔ ایک طرف ان کے افراد ایک ایک کر کے سردی کا شکار ہو رہے تھے دوسری طرف موبی نے محسوس کیا کہ اس کے لوگ اب مغرب کی طرف سفر کرنا نہیں چاہتے اور ہمارا کی کے خیالات وہ سن ہی چکا تھا۔

ایک شام وہ ر کے تو ہمارا کی اور قبیلے کے دوسرے مرد موبی کے پاس آئے۔ ہمارا کی ان کی نمائندگی کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”سردار، یہ تم سے درخواست کرنے آئے ہیں۔“

”کیسی درخواست؟“

”اب ہم مغرب کی طرف سفر جاری نہیں رکھنا چاہتے۔ ایک آدمی نے کہا۔

”اس طرح ہم سب سردی سے مر جائیں گے۔“

دوسرا بولا اور پھر سب ہی بولنے لگے۔ موبی بولنے کے بجائے ان کے خاموش ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ ان سب کی آوازیں خاموش ہو گئیں تو موبی کھڑا ہو گیا۔

”میرے ساتھیو ہمیں مغرب کی طرف ہی جانا ہے۔ اس طرف سختی ہے اور سردی بھی ہے لیکن جنوب میں یقینی موت ہوگی۔“

”یہاں بھی تو ہم مر رہے ہیں۔“

”ہاں، پر بچے ہوئے بھی ہیں۔ جنوب میں بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔“

”ہم اب مزید یہ سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔“ ہمارا کی ضدی لہجے میں بولا۔ باقی اس کے حامی نظر آ رہے تھے۔ موبی نے باری باری ان سب کی طرف دیکھا اور بولا۔

”ٹھیک ہے جو مغرب کی طرف سفر نہیں کرنا چاہتا وہ جنوب کی طرف چلا جائے۔“

موبی نے محسوس کیا کہ قبیلے کے جوان لوگ اس سفر کے خلاف ہو گئے تھے اور وہ ان سے نہیں لڑ سکتا تھا یہ اس کے دست و بازو تھے۔ کوئی خود سے نہیں لڑ سکتا۔ اس لیے موبی نے بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگلے دن آدھے سے زیادہ افراد مغرب کے بجائے جنوب کی طرف سفر کرنے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے اپنی سیکیں اور سامان بھی الگ کر لیا تھا۔ موبی کے ساتھ مشکل سے ایک درجن لوگ رہ گئے تھے۔ ان میں دو بچے اور دو جوان عورتیں بھی شامل تھیں جن کا اب کوئی اور نہیں تھا۔ چار موبی اور اس کے بیوی بچے تھے اور ایک اس کا وفادار ساتھی اس کی بیوی اور تین بچے تھے۔ کاتکی اس کا ساتھ چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ جنوب کی طرف جانے والے تقریباً تمام ہی جوان مرد اور عورتیں تھیں۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد موبی نے کاتکی سے کہا۔

والا تیز دھارا برف کو کاٹ رہا تھا اور اسے اوپر اٹھا رہا تھا۔ اسی وجہ سے یہاں برف ہلکی تھی۔ ڈھلان کے اوپری حصے تک پہنچ کر وہ برف پر بیٹھ گیا اور پھر پھسلتا ہوا دوسری طرف جانے لگا۔ اس طرح سفر آسان تھا اور برف پر بھی بوجھ کم پڑ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد وہ ڈھلان سے اتر کر دوسری طرف جا پہنچا۔ اب نیچے ٹھوس برف تھی اور یہاں سے دوسری طرف نظر آنے والی پہاڑیاں نمایاں اور قریب نظر آرہی تھیں۔

موبی نے تجربہ کر لیا تھا، اس دریا کو آسانی سے عبور کیا جا سکتا تھا۔ اس نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ اندھیرا ہونے سے پہلے واپس پہنچ کر اگلی صبح عورتوں اور بچوں کو لے کر اس طرف سفر کریں گے۔ ان پہاڑوں کو دیکھ کر ہی اس کے اندر سے کسی نے کہا تھا کہ یہاں آج تک کسی انسان نے قدم نہیں رکھا۔ یہ جگہ ان کے لیے محفوظ ہوگی۔ وہ واپس پہنچا تو کاتکی اسے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اس نے کہا۔

”کیا ہم اس دریا کو پار کر سکتے ہیں؟“
”بہت آسانی سے لیکن ہمیں سارا سامان یہیں چھوڑنا ہوگا۔ سلیج بھی اور دوسرا بھاری سامان بھی۔“
”جانور.....؟“

”ان کو کاٹ کر ان کا گوشت کھال میں بھر کر برف پر کھینچ کر لے جائیں گے۔“ موبی نے حل تجویز کیا۔ ”دوسری طرف بھی ہمیں خوراک کی ضرورت ہوگی۔“
انہوں نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ لیکن وہ شام سے پہلے واپس نہیں پہنچ سکے تھے۔ وہ ساحل تک آئے تو موبی نے کاتکی کو اشارے سے روک دیا۔ انہوں نے سلیج بھی روک دی تھی پھر موبی نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے کسی مرد کے بولنے کی آواز آئی ہے۔“

”یہاں کوئی مرد کہاں؟“
آؤ دیکھتے ہیں۔“ موبی نے کہا اور سلیج وہیں چھوڑ کر وہ برف پر ریگتے ہوئے اپنے خیموں کی طرف بڑھے۔ یہ خیمے ایک پیالے نما جگہ تھے۔ جب انہوں نے جھانک کر دیکھا تو عورتوں اور بچوں کو کچھ مردوں کے گھیرے میں دیکھا۔ وہ برف پر سہمے بیٹھے تھے۔ موبی نے غور سے انہیں دیکھا اور نیم تاریکی میں بھی پہچان لیا۔

”یہ ہارا کی اور اس کے ساتھ جانے والے ہیں۔“
وہ واقعی ہارا کی اور اس کے ساتھ جنوب کی طرف جانے والے مرد تھے مگر وہ تو اچھے خاصے لوگ تھے اب صرف پانچ مرد نظر آرہے تھے۔ ان کی حالت بھی بتا رہی تھی کہ وہ کسی بڑی مشکل سے گزر کر آئے ہیں۔ اچانک ہارا کی

آگے آیا اور اس نے امشی کو بازو سے پکڑ کر زبردستی اٹھایا۔ وہ چیخ رہی تھی اور مزاحمت کر رہی تھی۔ ہارا کی اس کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ باقی مرد کھڑے خاموشی سے دیکھ رہے تھے یعنی وہ اس کے ساتھ تھے۔ موبی کا خون رگوں میں لاوا بن گیا، اس کے حلق سے غراہٹ نکلی اور وہ اوپر سے گویا اڑ کر ہارا کی پر جا گرا۔ اس نے نیزے سے ضرب لگانے کی کوشش کی لیکن اس کی غراہٹ سے ہوشیار ہارا کی بچ گیا۔ البتہ وہ دھکے سے نیچے جا گرا۔ موبی نے امشی کو اٹھا کر اپنے پیچھے کر لیا۔ ہارا کی اٹھا لیکن موبی نے اسے لٹکا کر

”رک جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔“
”ہم نہیں، تم مارے جاؤ گے۔“ ہارا کی زہریلے لہجے میں بولا۔ ”یہ میرے ساتھی ہیں۔“
”باقی لوگ کہاں ہیں؟“ موبی نے نیزہ سامنے کر لیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔

”وہ سب مارے گئے۔ راستے میں کچھ لوگوں نے ہم پر حملہ کیا تھا۔ صرف ہم پانچ بچ کر آئے ہیں۔“
”ان سب کی موت کے ذمے دار تم ہو۔“
”صرف ان کی موت کے نہیں۔“ کاتکی بولا۔ ”مجھے یقین ہے شور کوئیوں کے ساتھ بھی ہارا کی تھا اور اس کی مدد سے انہوں نے ہم پر حملہ کیا تھا۔“

موبی نے چونک کر ہارا کی کی طرف دیکھا۔ ”کیا یہ سچ ہے؟“
وہ مسکرایا۔ ”ہاں سچ ہے کیونکہ شور کوئی سردار نے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری موت کے بعد سرداری مجھے ملے گی اور تمہاری بیوی بھی میرے قبضے میں ہوگی لیکن تم بچ گئے اور ہمیں وہاں سے نکال لے گئے ورنہ اگلی رات وہ دوبارہ حملہ کرتے۔“
”تم غدار.....!“ موبی نے دانت پیسے اور باقی چار مردوں کی طرف دیکھا۔ ”تم بھی اس کے ساتھ شامل ہو؟“

”ہاں یہ میرے ساتھ ہیں۔ اب ہمیں عورتوں کی ضرورت ہے۔ دیکھ کیا رہے ہو ان دونوں کو مار ڈالو اس کے بعد سب ہمارا ہوگا۔ یہ چار عورتیں ہیں جو ہمارے لیے کافی ہوں گی۔“

موبی اور کاتکی عورتوں اور بچوں کے سامنے دفاعی پوزیشن میں آگئے تھے۔ ہارا کی اور اس کے چاروں ساتھی اپنے ہتھیار سنبھالے ان پر حملہ کرنے کی فکر میں تھے۔ وہ موبی اور کاتکی سے ڈر رہے تھے کیونکہ دونوں ہی بہترین جنگجو تھے۔ موبی نے اچانک کہا۔ ”تم کیوں اس کی باتوں میں آگئے؟ یہ غدار ہے اور اس نے پورا قبیلہ ختم کر دیا ہے۔“

وہ چاروں رک گئے، ان کے چہروں پر تذبذب کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ موبی نے پھر کہا۔ ”تمہارے گھروں اور قبیلے کی بربادی کا ذمے دار یہی شخص ہے۔“
”یہ کیوں کرتا ہے۔ اسے مار دو پھر یہ عورتیں تمہاری ہوں گی۔“

”جھوٹ۔“ موبی غرایا۔ ”جب تک میرا نیزہ اور کلہاڑی ایک ایک آدمی کا خون نہیں چاٹ لیں گے کوئی مجھ پر قابو نہیں پاسکے گا۔ آؤ تم میں سے کون مرنا چاہتا ہے۔“
ہارا کی کے آدمی اسے دیکھ رہے تھے پھر ان میں سے دو پیچھے ہٹ گئے اور بولے۔ ”اس لڑائی سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے، ہارا کی خود لڑے۔“

موبی، ہارا کی کی طرف مڑا۔ ”دوسروں کو مروانے کے بجائے خود کیوں مقابلہ نہیں کرتے؟“
”ہاں ہاں تم لڑو۔“ باقی دو بھی پیچھے ہٹ گئے۔ ”سردار ہماری تم سے کوئی لڑائی نہیں ہے۔“

ہارا کی ابھی تک سینہ تانے مسکرا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے کچھ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور اس کے ساتھی ہی سب کچھ کر گزریں گے مگر جب اس کے ساتھی پیچھے ہٹ گئے تو اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور سینہ ڈھلک گیا۔ ہارا کی بھی بہترین لڑاکا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ موبی کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ یک دم وہ مڑا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے جاتے ہی اس کے ساتھی بھی اس کے پیچھے بھاگے تھے۔ کاتکی نے سکون کا سانس لیا ورنہ وہ جانتا تھا کہ دو آدمی پانچ آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ دوسری طرف موبی سوچ رہا تھا کہ یہ ہارا کی تھا جس نے غداری کی اور جانے کس طرح پھریداروں کو خاموشی سے قتل کر دیا جس کے بعد شور کوئی جنگجو کٹاؤ میں کھس آئے۔ موبی کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ ہارا کی اس کا اور قبیلے کا اتنا بڑا دشمن نکلے گا وہ تو اسے اپنا سب سے مخلص ساتھی سمجھتا تھا۔

”کاتکی ہمیں عورتوں اور بچوں کو لے کر ابھی جانا ہوگا۔“
”وہ بھاگ گئے ہیں۔“ کاتکی متفق نہیں تھا۔ ”ہمیں صبح جانا چاہیے۔“

”نہیں، ہارا کی کے ساتھی ڈر کر بھاگے ہیں لیکن اگر اس نے انہیں اکسایا تو وہ دوبارہ حملہ کرنے آئیں گے۔ ان کے لیے عورتیں سب سے اہم ہیں، وہ اکیلے رہ گئے ہیں۔ اس لیے عورت حاصل کرنے کے لیے جان بھی لڑا سکتے ہیں۔“
بات کاتکی کی سمجھ میں آگئی تھی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو سردار ہمیں فوری یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

انہوں نے خیمے اکھاڑے اور ان کو سلیج پر بار کیا۔ چھوٹے بچوں کو بٹھایا اور بڑے بچے ماؤں سمیت پیدل چلنے لگے۔ موبی اور کاتکی بھی پیدل تھے۔ مگر اس بار ان کی رفتار ست تھی۔ سمندر پر آتے آتے تاریکی مکمل طور پر چھا گئی تھی۔ موبی کے خیال میں اچھا ہی ہوا تھا کیونکہ اگر ہارا کی اور اس کے ساتھی ان کے تعاقب میں آتے تو ذرا سی روشنی میں ان کے دیکھ لیے جانے کا امکان موجود تھا۔ اب اس تاریکی میں وہ آسانی سے انہیں تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ سمندر کی سطح ہموار تھی اور رات کے وقت برف سخت ہو جاتی ہے، اس کے ٹوٹنے کا امکان بہت کم تھا۔ کسی کے ٹھوکر کھانے کا خدشہ کم تھا۔ کاتکی پریشان تھا اس نے موبی سے پوچھا۔

”سردار تمہیں یقین ہے وہ ہمارے پیچھے آئیں گے؟“
”پورا یقین ہے شاید وہ اس وقت ہمارے پیچھے ہی ہوں۔ یہ تاریکی ہمارے لیے اچھی ہے، وہ ہمیں دیکھ نہیں سکیں گے۔ عورتوں اور بچوں کو سمجھا دو کہ کوئی آواز نہ نکالے یہاں ہلکی سی آواز بھی دور تک سنائی دے گی اور وہ آواز سے ہمارا پیچھا کر سکتے ہیں۔“

موبی اور کاتکی نے عورتوں اور بچوں کو سمجھا دیا تھا کہ انہیں خاموش رہنا ہے ورنہ دشمن ان کی آواز سن کر پیچھے آسکتا ہے۔ وہ سہم کر خاموش ہو گئے تھے۔ اب ان کی رفتار ست تھی کیونکہ بچوں کا ساتھ تھا اور سلیج پر سامان اور چھوٹے بچے تھے۔ سلیج بھی معمولی رفتار سے چل رہی تھیں۔ موبی سوچ رہا تھا کہ اگر ہارا کی اور اس کے ساتھیوں نے ان کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کر لیا تو ان کے لیے تعاقب کرنا زیادہ دشوار نہیں ہوگا۔ ہارا کی اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ مغرب کی طرف جا رہے تھے تب ہی وہ اپنے چار آدمیوں کو ساتھ لے کر ان کے پیچھے یہاں تک آنے میں کامیاب رہا تھا۔ اگر وہ اسی طرح پیچھے پڑا رہتا تو یہ سمندر عبور کرنا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ فی الحال یہ تاریکی پردہ تھی لیکن اگلی صبح کی روشنی میں وہ انہیں کو بہ آسانی تلاش کر سکتے تھے۔

اب موبی پچھتا رہا تھا کہ اس نے اسی وقت موقع سے فائدہ اٹھا کر ہارا کی کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیا تھا جب سب اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اس وقت کوئی مداخلت کرتا۔ ہارا کی کا فتنہ ختم ہو جاتا تو باقی چار افراد کو قابو کرنا اتنا مشکل نہ ہوتا۔ مگر نہیں، عورتوں کی وجہ سے مستقل جھگڑا رہتا کیونکہ باقی دو عورتیں بھی ان کی بیویاں بن گئی تھیں اور ان میں اپنی عورت سے دست بردار ہونے کی نسبت مر جانا زیادہ آسان سمجھا جاتا تھا۔ ابھی ان کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ سفر کرتے رہیں اور جلد از جلد یہ سمندر عبور کر کے

”ہمیں اب تک دریا تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔“

”نہیں میرا خیال ہے دریا ابھی دور ہے کیونکہ دن میں ہم نے سیلج پر بہت تیز سفر کیا تھا اور ابھی ہم پیدل ہیں اور رفتار بھی سست ہے۔ شاید ہم صبح کے قریب دریا تک پہنچ سکیں اور میں

مونی نے سامنے دیکھا، دریا کا ابھار نمایاں ہو رہا

موبی مڑا تو اسے ہمارا کی اور اس کے ساتھ ہی اپنی طرف دوڑتے نظر آئے۔ اس کا اندازہ درست تھا، وہ بدستور ان کے تعاقب میں تھے۔ انہیں دیکھتے ہی موبی نے کاتکی اور

ہارا کی اور اس کے ساتھی ریڈیئرز سے ذرا دور تھے اس لیے انہیں برف تڑخنے کا پتا نہیں چل سکا۔ انہیں اس وقت پتا چلا جب وہ خاصے اوپر آچکے تھے۔ ریڈیئرز اب ذرا نیچے تھے۔ موبی نے ڈھلان کے دوسری طرف برف پر لیٹتے ہوئے پھسلنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے دوبارہ سیٹی بجائی تاکہ ریڈیئرز اسے غائب دیکھ کر رک نہ جائیں۔ اس کے کانوں میں اب برف تڑخنے کی مہیب آوازیں آنے لگی تھیں۔ اس کی رفتار رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی۔ نیچے امشی اور دوسرے لوگ کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ اس نے کاتکی کو حکم دیا تھا کہ وہ دوسری طرف اترتے ہی خشکی کی طرف روانہ ہو جائیں۔ مگر وہ اس کے لیے فکر مند تھے اس لیے آگے نہیں گئے۔ موبی کی رفتار بڑھی تو وہ گھومنے لگا اور اسی گھومنے کے دوران میں اس نے دیکھا برف اب اس طرف سے بھی تڑخنا شروع ہو گئی تھی۔ ریڈیئرز اوپری ڈھلان پر نمودار



آدم خور لکڑ بھکا

نجم موہی

دنیا دو طرح کے انسانوں سے بھری پڑی ہے، ایک شکار ہونے والے ... دوسرے شکار کرنے والے ... اور زندگی کا حاصل مسلسل پیکار ... ایسے میں پانسا کسسی بھی وقت پلٹ سکتا ہے ... اس نے بھی بازی کچھ اس انداز سے اپنے حق میں پلٹی کہ تمام چالیں دھری کی دھری رہ گئیں ... اور یہ ثابت ہو گیا کہ کسی پر اعتبار کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لیا جائے کہ کہیں وہ ہمارے اعتماد کا خون تو نہیں کر دے گا۔

شکار اور شکاری کے مابین کھیلے جانے والا دلچسپ کھیل

ہرج ہے۔ اگر شیر نہ ملا تو میں کسی دوسرے درندے سے ہی کام چلا لوں گا۔ چنانچہ شکاری بننے کی غرض سے میں نے نشانہ بازی کی مشق شروع کر دی تھی۔

ایک روز میں ... اپنے گھر کے سامنے میدان میں نشانہ بازی کر رہا تھا۔ میرا ٹارگٹ ایک بڑا سا پتھر تھا۔ میرا نوکر قریب ہی کھڑا تھا۔ کافی دیر تک میں پتھر کو گولی مارنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسی دوران میرا نوکر جا کر اس پتھر پر بیٹھ گیا۔ ”اے احمق! یہ کیا کر رہے ہو؟ اس پتھر پر کیوں بیٹھ گئے ہو؟“ میں نے چیخ کر کہا۔

لڑکپن سے بعض ڈائجسٹوں میں شکاریات کے قصے پڑھ کر میری طبیعت نہایت شکار پسندانہ ہو گئی تھی اور مجھے بھی شکاری بننے کا شوق چرایا تھا۔ حالانکہ میرے ایک دوست نے مجھے سمجھایا تھا کہ ان ڈائجسٹوں کے قصوں کے مطابق جم کاربٹ، کینتھ اینڈرسن اور دیگر میسوں مشہور اور غیر مشہور شکاری اتنے شیردوں کو ہلاک کر چکے ہیں جتنے شاید ہندوستان کے جنگلوں میں موجود بھی نہ تھے۔ اس لیے تم اب کون سے شیر کو شکار کرو گے؟

اس پر میں نے یہی کہا تھا کہ آخر قسمت آزمائی میں کیا

بھی موسم اچھا نہیں تھا۔ چاروں طرف برف تھی اور دور سے نظر آنے والے پہاڑ بھی برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ لیکن زندہ بچنے اور دشوار گزار محلے عبور کرنے کے باعث ان کے حوصلے جوان تھے۔ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے۔ رات کو کسی ایسی جگہ پڑاؤ ڈال لیتے تھے جہاں وہ شمال سے آنے والی سرد ہواؤں سے محفوظ رہ سکیں۔ وہ ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے ہوئے رات گزار دیتے تھے۔ بچوں کو وہ درمیان میں رکھتے تھے کیونکہ وہ سردی سے زیادہ متاثر ہو سکتے تھے۔

اس سرزمین پر وارد ہونے کے اگلے دن انہوں نے ایک ریڈیزیر کاٹا اور اس کے خون اور کچے گوشت سے اپنی بھوک مٹائی۔ وہ اس کا گوشت ایک ہفتے تک کھاتے رہے۔ اس دوران میں ان کا سفر دشوار گزار ساحلوں اور ان کے ساتھ پہاڑوں میں جاری رہا۔ دوسرے ہفتے انہوں نے دوسرا ریڈیزیر بھی کاٹ کر کھانا شروع کر دیا۔ راستے میں ان کے لیے برف میں دبئی گھاس مل جاتی تھی۔ اس سے ان کی توانائی برقرار رہتی تھی۔ چوتھے ہفتے جب وہ آخری ریڈیزیر بھی کاٹ چکے اور اس کے گوشت سے پیٹ بھر رہے تھے کہ انہیں پہلی بار کوئی درخت دکھائی دیا۔ موہی سمیت ان میں سے کسی نے اس سے پہلے درخت نہیں دیکھا تھا۔ ان کے آباد اجداد ان کا ذکر کرتے تھے۔ وہ جنوب سے آئے تھے جہاں سبزے اور درختوں کی بہتات تھی۔ جنوب سے آنے والے دریا گرام میں اپنے ساتھ لکڑی بہا کر لاتے تھے اور وہ اسی لکڑی سے مختلف چیزیں بناتے تھے۔ لکڑی کس چیز سے نکلتی ہے وہ پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ سرما کی وجہ سے درخت ٹنڈ منڈ ہو رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر موسم بھی بہتر لگنے لگا تھا۔ وہ چلتے رہے۔ راستے میں اب جاہ جاد درخت مل رہے تھے۔ اس وقت وہ ایک ایسے پہاڑ پر چڑھ رہے تھے جس کی ڈھلان برف سے ڈھکی ہوئی تھی اور وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کے دوسری طرف کیا ہے۔ بالآخر وہ پہاڑ کے اوپر پہنچ گئے اور جب موہی نے دوسری طرف دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس طرف تاحند نگاہ پھیلی زمین پر بے حد گھٹا اور سبز جنگل تھا جس سے بھاپ کے بادل اٹھ رہے تھے۔ اس کی فضاؤں میں پرندے اڑ رہے تھے اور زمین پر مختلف اقسام کے جانور بھاگتے دوڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ موہی نے مڑ کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

”نئی دنیا میں خوش آمدید ساتھیو۔“

ہزاروں سال سے انسانوں کے وجود کو ترستی یہ دنیا اب غیر آباد نہیں رہی تھی۔

ہوئے اور پھر تیزی سے نیچے آنے لگے۔ خطرے کے احساس نے ان کی رفتار کو کہیں زیادہ تیز کر دیا تھا۔ وہ عملاً برف کے ٹوٹے ٹکڑوں پر قدم رکھتے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ موہی جانتا تھا کہ وہ پانی میں بھی گر گئے تو پھر کچھ اثر نہیں ہوگا۔ ان کی موٹی کھال اور بال انہیں سردی سے بچاتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس کے پاس سے گزر گئے۔ اب دریا کا آخری حصہ کچھ ہی دور تھا۔ ایک ایک موہی کے نیچے برف ملی اور اس کا ٹکڑا باقی برف سے الگ ہوا لیکن وہ اچھل کر اس سے ہوتا ہوا دوبارہ ہموار برف پر جا گرا۔ جب دریا کے کنارے آخری حصہ بھی ٹوٹ کر سمندر میں گرا تو یہ کاتکی تھا جس نے موہی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچ لیا تھا ورنہ وہ بھی سمندر میں جا گرتا۔ کاتکی اسے کھینچتے ہوئے کنارے سے دور لے گیا اور پھر امشی اور اس کے بچے آ کر اس سے چٹ گئے۔ امشی رو رہی تھی۔

موہی کچھ دیر لیٹا رہا پھر چونک کر اٹھا۔ ”ہارا کی اور اس کے ساتھی کہاں ہیں؟“ کاتکی نے دور سمندر میں تیرتے چند رنگوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ رہے اور ان میں سے کوئی نہیں بچے گا۔“ کاتکی ٹھیک کہہ رہا تھا کیونکہ ان کے چاروں طرف برف کی بلند تھی وہ پانی سے اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے اور ذرا دیر بعد سرد ترین پانی ان کی جان لے لیتا اور ایسا ہی ہوا بھی۔ کچھ دیر تک پانی پر ہاتھ پاؤں مارتے رہنے کے بعد ہارا کی اور اس کے ساتھی سمندر میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئے تھے۔ موہی اور کاتکی ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس دیے۔ وہ خوش تھے ان کی عورتیں اور بچے بھی خوش تھے اور وہ ایک دوسرے سے لپٹے جا رہے تھے۔ ان کے ریڈیزیر بھی بچ گئے تھے آگے یہی ان کی خوراک کے کام آتے۔ ان کی بیج اور دوسرا سامان ضائع ہو گیا تھا لیکن ان کے ہتھیار ان کے پاس تھے۔

وہ ابھی تک سمندر پر تھے۔ موہی نے دور پہاڑوں کی طرف دیکھا اور کاتکی سے کہا۔ ”ہمیں ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرنا پڑے گا۔“

کاتکی اس کا مطلب سمجھ گیا۔ ”یعنی جنوب کی طرف؟“ ”ہاں بہتر موسم اب جنوب میں ملے گا اور مجھے یقین ہے اس زمین پر آنے والے پہلے انسان ہم ہی ہیں۔“ کاتکی نے موہی کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”ہم اسے آباد کریں گے۔“

انہوں نے ریڈیزیر زسنبھالے اور خشکی کی طرف روانہ ہو گئے۔ موہی نے پہلی بار خشکی پر قدم رکھا تو اس کا جسم سنسناتا اٹھا ایسا لگا جیسے اس نئی دنیا نے اسے خوش آمدید کہا ہو۔ اس طرف

خدارا © خدارا شوگر مریض ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہتا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبہ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0308-6627979

0547-521787

آپ

شوگر

سے ایک نامعقول عورت نے خاصی بلند آواز میں اپنی ساتھی عورت سے کہا۔ ”ارے.....! ایسے ہوتے ہیں شکاری؟“ بد بخت کہیں کی۔

چوپال کے اندر ہی میرے اور میرے ڈرائیور کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس موقع پر تقریبی قصبے سے ایک فوٹو گرافر کو بھی بلوایا گیا تھا۔ وہ ایک نہایت باہمت فوٹو گرافر تھا اس کی بلند ہمتی کا ثبوت یہ تھا کہ وہ پینتیس ایم ایم کے کیمرے میں ایک سو بیس ایم ایم کا رول ڈالنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر گپ شپ کا دور چلا اور اسی دوران مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس محفل میں ایک ریٹائرڈ شکاری بھی موجود ہے، وہ اپنی زندگی کے خطرناک ترین شکار کا واقعہ سنار ہاتھا۔

”ایک مرتبہ میں ایک شیر کے شکار پر گیا۔ جب شیر سے میرا آمنہ سامنا ہوا تو اچانک اس نے مجھ پر چھلانگ لگائی اور مجھے کھا گیا۔“

”کھا گیا.....؟“ تمام سامعین نے حیرت سے دہرایا۔ ”مگر آپ تو زندہ ہیں۔“

اس شکاری نے ایک سرد آہ بھر کے اپنے سراپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کوئی زندگی ہے؟“

گپ شپ کا دور ختم ہوا تو آرام کی غرض سے ہمیں ہماری قیام گاہ تک پہنچا دیا گیا۔ یہ کچی اینٹوں سے تعمیر شدہ ایک عالی شان مکان تھا۔ اس میں ایک معمولی سی خامی تھی اور وہ یہ کہ اس کی چھت نہیں تھی۔ اس سلسلے میں میرا وہ تمبو کام آیا جو میں احتیاطاً ساتھ لے آیا تھا۔ مکان کی چار دیواری میں ہم نے تمبول لگالیا۔

اگلے دن علی الصبح شکار پر جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں یعنی میں نے اپنے نئے شیونگ سیٹ سے شیو بنایا، صاف سحرے کلف لگے کپڑے پہنے اور کلون لگایا۔ بالوں کو ہیز کریم سے چمکایا۔ میرے ڈرائیور نے بھی پچھلی عید پر بنوائی ہوئی استری شدہ شلوار قمیص زیب تن کی، بالوں میں بڑے سلیقے سے کٹھنسی کی اور گلے میں ریشمی رومال ڈالا۔ اس کے علاوہ ہم نے اسلحے کے ٹرک کو بھی عمدگی سے آراستہ کیا۔ اس پر جھنڈیاں اور بینرز وغیرہ آراستہ کیے جن پر نہایت دلورہ انگیز قسم کے نعرے درج تھے، مثلاً۔

”لگڑ بھگا۔ ہمارا قومی دشمن!“

”کرش دی لگڑ بھگا۔“

”ہم لگڑ بھگے سے انتقام لیں گے۔“

بندوقیں، آٹھ شارٹ گنز اور اعشاریہ چار پانچ کے دو ریولور، اپنا بستر، خیمہ، مچان کا سامان، ہانکا گرانے کے لیے اپنے ذاتی ٹین کنسٹر اور ڈھول لدوا دیے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے احتیاطاً چار موٹے موٹے ڈنڈے بھی رکھ لیے تھے۔ ممکن تھا کہ ہم کے دوران میں اسلحہ جواب دے جاتا اور درندے کے ساتھ دست بہ دست یا یوں کہنا چاہیے کہ دست بہ پنچ لڑائی کی نوبت آ جاتی۔

میں نے تو اس مہم کے لیے ایک توپ بھی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے لیے میری لائسنس کی درخواست مسترد ہو گئی تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ بھٹیوں کی توپ غائب کروائی جائے لیکن دیسی نکامیری فرمائش سن کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ اب یہ میرا ہی دل گردہ تھا کہ اس کے باوجود میں نے اپنا ارادہ ترک نہیں کیا تھا اور درندے کے شکار پر نکل کھڑا ہوا۔

میری بیوی نے نذر نیاز اور صدقہ وغیرہ اتروا کر اور میرے دونوں بازوؤں پر امام ضامن باندھ کر آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ مجھے الوداع کہا۔ بچوں نے احتیاطاً میرے ساتھ گروپ فوٹو بھی بنوا لیے کہ معلوم نہیں اب اس مہم سے واپس بھی آئیں یا نہیں۔ ایسی مہمات سے تو بعض اوقات انسان مردہ حالت میں بھی واپس نہیں آتا۔

بہر حال تمام گھردالوں کی دعائیں لے کر اور اپنی وصیت انہیں زبانی طور پر سنا کر میں اپنے ڈرائیور کے ساتھ نگر پورہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ نگر پورہ کی ویلفیئر کمیٹی کو میں نے بذریعہ ٹیلی گرام اپنی آمد کے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔

سفر صرف تین گھنٹے کا تھا لیکن بے حد دشوار گزار تھا کیونکہ پچھلے دنوں تین چار منٹ بارش ہو گئی تھی، جس کے باعث روڈ ڈیپارٹمنٹ کی بنائی ہوئی سڑک پوری کی پوری پانی میں تحلیل ہو گئی تھی اور راستے کا پتا چلانا بے حد دشوار ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ ایک گھنٹا سفر کرنے کے بعد ہم واپس وہیں پہنچ گئے جہاں سے گزر چکے تھے۔ بہر حال جوں توں کر کے ہم نگر پورہ کی حدود میں داخل ہو ہی گئے۔ ویلفیئر کمیٹی کے ارکان گاؤں سے باہر ہی ہمیں ریسو کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ توپیں گاؤں میں دستیاب نہیں تھیں اس لیے مجبوراً ہمیں اکیس ڈھولوں کی سلائی دی گئی۔

استقبالیہ رسوم پوری ہونے کے بعد ہمیں گاؤں کے دوسرے معززین سے متعارف کرانے کی غرض سے چوپال میں لے جایا گیا۔ وہاں سب لوگ حتیٰ کہ گاؤں کا چودھری بھی جو کہ عشرت چودھری سے کافی مختلف تھا، بے حد عزت و احترام سے پیش آیا۔ البتہ حاضرین میں، پچھلی صف میں

”جناب! یہی تو سب سے محفوظ جگہ ہے۔“ نوکر نے جواب دیا۔

میں نے اس نوکر کو فوراً ملازمت سے برخاست کر دیا۔ کم بخت ہمیشہ ہی میری نشانے بازی کے بارے میں طنز و مزاح کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میری مشق کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے اور ایک ہفتے کے بعد بالآخر میں ایک ایسی گولی چلانے میں کامیاب ہو گیا جو اس پتھر کو چھوٹی ہوئی نکل گئی۔

اس واقعے سے میری شہرت جلد ہی دور دور تک پھیل گئی اور مختلف جنگلوں کے قریب آباد بستیوں سے مجھے باقاعدہ چھپے ہوئے دعوت نامے موصول ہونے لگے جو کچھ اس قسم کے ہوتے تھے۔

مکرمی جناب ٹم ٹم جنگلی صاحب! ہمارے علاقے کے ایک بدکردار قسم کے لگڑ بھگے کو اتفاق سے مردم خوری کی عادت پڑ گئی ہے، اس کی وارداتیں دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہیں۔ حتیٰ کہ اب تو وہ ناشتے میں بھی انسانی جانیں نوش کرتا ہے۔ پہلے تو اس نے چند ایسے لوگوں کو لقمہ بنایا جن سے ہم خود جان چھڑانا چاہتے تھے چنانچہ ہم خاموش رہے مگر پچھلے دنوں اس نے چند ایسی لڑکیوں کو بھی نوالہ بنالیا جن پر ہم میں سے کئی نوجوانوں نے آنکھ رکھی ہوئی تھی۔

اب معاملہ برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔ غضب خدا کا کہ اس حرام خور لگڑ بھگے کے وزن میں کم از کم سو پونڈ کا اضافہ ہو گیا ہے جسے کم کرنے کے لیے علاقے میں جاگنگ اور مختلف ورزشیں کرتا رہتا ہے اور ہم بے بسی سے اسے دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔

بستی والوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ اس ناخبر کو آپ کی گولی کا نشانہ بنوانے کے لیے باقاعدہ اہتمام کیا جائے اور اس سلسلے میں باقاعدہ ایک دس روزہ پروگرام ترتیب دیا جائے۔ اس سارے پروگرام کے روح رواں آپ ہوں گے۔ جلد از جلد ہمیں تاریخ سے مطلع فرمائیں کہ آپ کب تشریف لا سکتے ہیں تاکہ ہم باقاعدہ پروگرام کے پوسٹر چھپوا کر بستی میں آویزاں کر سکیں۔

ابالیان نگر پورہ اس قسم کے دعوت نامے اور بھی کئی بستیوں سے موصول ہوئے لیکن میں نے بہر حال نگر پورہ ہی کو اپنی پہلی مہم کے لیے منتخب کیا۔

اگلے ہفتے میں نے ایک ٹرک منگوا کر اس میں اپنا تمام اسلحہ یعنی پندرہ عدد دور مار رائفلیں، چھ عدد ڈبل بیرل

”اے لکڑ بھگے ہم تجھ کو نہیں چھوڑیں گے، وغیرہ وغیرہ۔“

ہانکا کرنے والی پارٹی بھی ہمارے ہمراہ تھی جوڑک کے آگے آگے ڈھول، کنسترو وغیرہ بجاتی چل رہی تھی۔ ٹرک میں ڈرائیور کے ساتھ ہی مابدولت بہ نفس نفیس گلے میں پچاسوں ہار پہنے بیٹھے تھے۔ بغل میں دور مار رائل دلی ہوئی تھی۔ غرضیکہ ایسا بڑا جلال منظر تھا کہ لکڑ بھگا دیکھ لیتا تو بوکھلا کر خود ہی میری رائل کے سامنے آ جاتا۔

ہانکا کرتے کرتے ہم لوگوں نے جنگل کا وسیع حصہ عبور کر لیا لیکن لکڑ بھگا کہیں سے برآمد نہ ہوا۔ آخر ایک مقام ایسا آیا جہاں سے ٹرک نہیں گزر سکتا تھا، البتہ ہانکا کرنے والے قطار باندھ کے گزر سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے انہیں آگے روانہ کر دیا کہ اگر لکڑ بھگا کہیں نظر آئے تو اسے گھیر گھار کر یہیں لے آئیں۔ میں اس کی تلاش میں کہاں مارا مارا پھروں گا۔

میں ٹرک سے اتر کر ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور بھی میرے پاس ہی آن بیٹھا۔ باتیں چمڑکیں اور اس نے مجھے بتایا کہ میرے پاس ملازمت کرنے سے پہلے وہ ڈائجسٹوں کی دنیا کے ہی نہیں بلکہ حقیقتاً کئی مشہور عالم شکاریوں کے پاس ملازم رہ چکا ہے۔ یعنی وہی اپنے جم کاربٹ، کینتھ اینڈرسن اور ہف ہنٹر وغیرہ۔ میرے ملازم نے بتایا کہ کئی مرتبہ اس نے خود اپنی جان خطرے میں ڈال کر ان مشہور زمانہ شکاریوں کی جان بچائی تھی۔

عین اس وقت جبکہ وہ اسی قسم کا کوئی واقعہ سن رہا تھا، کسی نے عقب سے میرا کندھا تھپتھپایا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ رائل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی اور میں تھر تھر کانپنے لگا۔ دراصل لکڑ بھگا میرے پیچھے کھڑا مونچوں پر تاؤ دے رہا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ پھر خیال آیا کہ اسی ڈرائیور کو جو کئی مرتبہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر جم کاربٹ اور..... کینتھ اینڈرسن وغیرہ کی جانیں بچا چکا تھا، حکم دوں کہ میری رائل اٹھا کر مجھے پکڑا دے لیکن میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ اپنا تھرٹین کی رفتار سے بستی کی طرف دوڑ رہا تھا۔ مایوس ہو کر میں نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیں اور موت کا انتظار کرنے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے لکڑ بھگے نے اپنے پنجے سے دوبارہ میرا کندھا تھپتھپایا اور مشفقانہ لہجے میں بولا۔ ”میاں شکاری! ذرا آنکھیں تو کھولو۔ میں تم سے مذاکرات کرنے آیا ہوں۔“

میری کچھ ڈھارس بندھی اور میں نے مڑ کر اس کی

طرف دیکھا۔ وہ آلتی پالتی مار کر مزے سے گھاس پر بیٹھ کر اور تھوڑی سی گھاس نوچ کر..... چبانے لگا۔ میری معلومات کے مطابق تو وہ آدم خور لکڑ بھگا تھا۔ اسے گھاس کھاتے دیکھ کر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ اپنی اس حرکت کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”آج کل میرے جسم پر پروٹین کی زیادتی ہو گئی ہے۔ کلوروفل بالکل ختم ہو گیا ہے جس کی وجہ سے دانت درد کرنے لگے ہیں چنانچہ بھی بھی میں تھوڑی سی گھاس کھا لیتا ہوں..... ہاں تو ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ تم مجھے شکار کرنے کے لیے آئے ہو؟“

میری شکار یا نہ جرات کسی حد تک بحال ہو گئی اور میں نے دل کڑا کر کے اپنے لہجے کو بارعب بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے سچ سنا ہے۔“

”لیکن میرا قصور کیا ہے؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

”تم اتنی انسانی جانوں کو لقمہ بنا چکے ہو، یہ جرم کیا کم ہے؟“ میں نے اپنے لہجے کے ارتعاش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”جن انسانوں کو میں نے کھایا ہے.....“ لکڑ بھگے نے فلسفیوں کی طرح کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ”وہ بڑے ہی گناہ گار قسم کے انسان تھے۔ زمین کے سینے پر بوجھ تھے۔ میں نے معاشرے کو ان کے شر سے نجات دلائی ہے۔“

”تم کون ہوتے ہو گناہوں کی سزا دینے والے؟ اور پھر ان دو تین لڑکیوں کا کیا گناہ تھا جنہیں مردوں کے ساتھ ساتھ تم نے ہلاک کر دیا؟“

”ان میں سے ایک تو عنقریب ایک نہایت بدقتض شخص کے ساتھ گھر سے فرار ہونے والی تھی جس کے بعد شاید وہ موت سے بدتر زندگی گزارتی۔ ایک شادی شدہ تھی مگر اس نے اپنے شوہر کی زندگی جہنم بنا رکھی تھی اور اس کی وفادار بھی نہیں تھی اور تیسری بھی بڑی حرافہ تھی۔ اس کی بدولت کئی گھر اجڑ چکے تھے۔“ لکڑ بھگے نے بتایا۔

”بہت خوب۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”گو یا تم صرف پیش بین ہی نہیں ہو بلکہ تم نے معاشرے کی تطہیر کا بھی ٹھیکہ لے رکھا ہے۔“

”مجھ پر طنز کرنے کی کوشش مت کرو۔“ لکڑ بھگا خفگی سے بولا۔ ”میں اس معاملے میں بے حد حساس ہوں کیونکہ میں یہ سب کچھ اس لیے نہیں کر رہا کہ میری تصویریں اخباروں میں چھپیں۔ میرے اعزاز میں تقریبات منعقد ہوں اور لوگ

میرے منہ پر میری تعریفیں کریں جبکہ تم مجھے شکار کرنے محض اس لیے آئے ہو کہ لوگوں پر تمہاری دھماک بیٹھے۔ اخباروں، رسالوں میں تمہارے انٹرویو چھپیں۔ بولو یہی بات ہے نا؟ جھوٹ بولنے کی کوشش مت کرنا ورنہ میں تمہارا بھی خون پی جاؤں گا۔“ اس نے اپنے نوکیلے دانتوں کی نمائش کی۔

میں کانپ اٹھا اور میں نے فوراً ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔“

”مجھے تمہاری جوانی پر ترس آتا ہے۔“ لکڑ بھگے نے نارمل ہوتے ہوئے کہا۔ ”کیا عمر ہوگی بھلا تمہاری؟“

”یہی کوئی بیس سال کے قریب۔“ میں نے بتایا۔

”تو پھر تم نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے؟“ لکڑ بھگا منہ بنا کر بولا۔ ”ابھی تو نہیں آتا، رتی اور ماشے کے حساب سے بکتے دیکھنا ہے۔ دودھ، گھی کو عطر کے طور پر استعمال ہوتے دیکھنا ہے۔ ابھی سے موت کے منہ میں چھلانگ لگانے کیوں آگئے ہو؟“

”بس جی..... غلطی ہو گئی۔ شہرت حاصل کرنے کے لیے میں مرا جا رہا ہوں۔“ میں نے ٹانگوں کی کپکپاہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”خیر..... میں تمہارا شوق پورا کر سکتا ہوں۔“ لکڑ بھگا کچھ سوچ کر بولا۔ ”میری تجویز غور سے سنو۔“

میں ہمہ تن گوش ہو گیا تو لکڑ بھگے نے میرے پیکٹ میں سے گولڈ لیف کی ایک سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔ ”ایسا کرو کہ کل اسی وقت اور اسی جگہ آ جاؤ، اپنے ساتھ ان احمقوں کا جم غفیر لے کر مت آنا جو اس وقت ہانکا کرنے کے سلسلے میں دور کہیں دھکے کھا رہے ہیں۔ تم اپنے ساتھ صرف ایک فوٹو گرافر کو لے کر آ جانا۔ یہاں پہنچ کر تم ایک ہوائی فائر کر دینا اور پھر جھاڑیوں میں تلاش شروع کر دینا اور شور مچا دینا کہ لکڑ بھگے کو یقیناً گولی لگی ہے۔ میں یہیں کسی جھاڑی میں آرام سے آنکھیں بند کر کے لیٹا ہوا تمہیں مل جاؤں گا۔ تم فوٹو گرافر کو یہی بتانا کہ میں تمہاری گولی سے مرا ہوں، تم جلدی سے میری لاش پر ٹانگ رکھ کر ایک تصویر کھینچا لینا اور جلد از جلد واپس چلے جانا۔ شہر جا کر تم اس تصویر کو دنیا بھر کے اخباروں، رسالوں میں چھپواتے پھرنا۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ تمہارا شوق پورا ہو جائے گا اور میرا مشن جاری رہے گا۔ اگر تمہیں یہ تجویز منظور نہیں تو پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

”مجھے بالکل منظور ہے لکڑ بھگا صاحب!“ میں نے مٹکیا کر کہا۔

”بس تو پھر اب میں چلتا ہوں۔ تمہارے وہ ہانکا

کرنے والے واپس آ جائیں تو تم سب لوگ واپس چلے جانا۔ خواخواہ ہلکان ہوتے پھر رہے ہو۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ مجھ جیسے ذہین و رندے ہانکے وغیرہ جیسی فرسودہ حرکتوں سے متاثر ہو سکیں۔“ یہ کہہ کر لکڑ بھگا اطمینان سے ٹھٹھا ہوا ایک طرف کوروانہ ہو گیا۔ ہانکا کرنے والے بے نیل و مرام واپس آئے تو ایک دوسرے کو تسلیاں دیتے ہوئے ہم گاؤں کی طرف چل دیے۔ شکر ہے کہ ڈرائیور قیام گاہ پر بھی موجود نہیں تھا بلکہ سامان لے کر فوچر ہو چکا تھا ورنہ اس کی زبانی بستی والوں کو معلوم ہو جاتا کہ میری لکڑ بھگے سے ملاقات ہوئی تھی۔ اگلے دن حسب پروگرام میں نے صرف فوٹو گرافر کو ساتھ لیا، بستی والوں کو تسلی دی کہ آج لکڑ بھگا یقینی طور پر جہنم رسید ہو جائے گا اور پھر میں جنگل کے اس حصے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں گزشتہ روز لکڑ بھگے سے ملاقات ہوئی تھی وہاں پہنچ کر میں نے فوٹو گرافر کے سامنے پوری پوری شکاریوں والی ایکٹنگ کی، یعنی زمین پر بیٹھوں کے نشان ڈھونڈے، ناک اونچی کر کے ہوا میں سونکھا پھر یونہی ایک طرف کو گولی داغ دی۔

کافی دیر تک ادھر ادھر تلاش کرنے کے بعد بالآخر لکڑ بھگا حسب وعدہ مجھے ایک جھاڑی میں لیٹا ہوا نظر آ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے آنکھ ماری اور جلدی سے دوبارہ دم سادھ لیا۔ میں نے فاتحانہ نعرہ لگا کر فوٹو گرافر کو اپنی طرف متوجہ کیا اور لکڑ بھگے کے جسم پر پاؤں رکھ کر تصویر کھینچانے کے لیے جلدی سے پوز بنالیا۔ میرے ایک ہاتھ میں رائل تھی۔ جیسے ہی فوٹو گرافر نے تصویر بنائی ویسے ہی میں نے رائل سیدھی کر کے دو گولیاں لکڑ بھگے کی کھوپڑی میں اتا دیں۔ پھر فوراً ہی چھلانگ لگا کر میں ایک طرف ہٹ گیا۔

لکڑ بھگا بہ مشکل دو تین سیکنڈ تڑپا ہوگا پھر سچ مچ ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور ان آنکھوں کی گہرائیوں سے گویا یہ شکوہ جھلک رہا تھا۔ ”آخر تم مجھادے کی خلاف ورزی کیے بغیر باز نہیں آئے۔ میں نے غلطی کی جو تم پر بھروسہ کیا.....“ مجھے اس شکوے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ بھلا میں ایسا سنہری موقع کیونکر ہاتھ سے جانے دیتا؟ ایک آدم خور لکڑ بھگا آنکھیں بند کیے میرے پاؤں تلے پڑا تھا اور میں اسے زندہ چھوڑ دیتا؟

باقی رہی معاہدے والی بات۔ تو آخر میں ایک انسان تھا..... اشرف المخلوقات..... میں کوئی لکڑ بھگے کی طرح بے وقوف تھوڑا ہی تھا۔ زبانی کیا تحریری معاہدے بھی توڑ دینا ہمارا روز کا معمول ہے۔

ہمارا روز کا معمول ہے۔

اسرار اور تحریک کے پردے
میں لپٹا ایک منفرد
طویل سلسلہ

کشکول

انوار صدیقی

تیرھویں قسط

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش رہا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبیہی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑالے جاتی ہیں۔ جہاں چرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ ساز یوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

***** گزشتہ اقساط کا خلاصہ *****

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیر سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پک بھگتے نہیں دی تھی، شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو مذہبی تعلیم کا زیور سے آراستہ تھا۔ باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ اس نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعا میں لیں فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی مکی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پر تاب بھوجن کو برہنہ حالت میں کوئی پر اسرار گل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک نیو ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سونیاں بھوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کر کے باوجود خدا کا نام لے کر نیو سے سونیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ گل خان داپسی کے لیے رکشہ لینے جاتا ہے تو جب ایک ناپرنا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ ناپرنا کے اسرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھو لاری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ دھکتا ہے۔ ناپرنا خود چھو لاری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں غرق تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چمکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں ناپرنا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چمکی کا ذرہ بھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر ناپرنا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چمکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لا شعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتے ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہاں ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو کوئی اندر جانے ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دو چار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر آ جاتا ہے اور یوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سینہ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرا ملازمت پر رکھ لیا جاتا ہے۔ سینہ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سینہ عثمان کا رو باری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈر ورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کر کے ان کو اشاروں پر چلاتا تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے انڈر ورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد و ماہرین اور سیام فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اشارے کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جا

تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روہی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روہی کو اغوا کر کے اس کی خراب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ دوسرے خائفین کو بھی زیر کرنے کی خاطر سازشوں کے جال بچا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کرتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آ جاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیر عتاب آ جاتا ہے۔ وہ دل برداشتہ ہو کر خودکشی کا ارادہ کرتا ہے جب شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر یو یو الوار کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ شیخ حامد کے تعلقات مرکز تک تھے جس کی وجہ سے پولیس کے کچھ اعلیٰ آفیسران بھی اپنی روایتی مجبوری کے تحت اس کے راستے میں آنے کی غلطی نہیں کرتے تھے۔ ایماء ار آئی جی عظیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈر ایس پی سراج سے جو شیخ حامد کو خوش فہمی کا شکار ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی عظیم احمد کے حوالے کر دیا ہے۔ سراج ایماء ار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آ جانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی مہتاب بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آ چکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قاپو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کر لیتا ہے۔ شیخ حامد کے غمگین الماس کو بے آبرو کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب مہتاب بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ اسپیکر دلائل جس کے پاس مہتاب بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زرخیز ڈی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے معاملے کو دلائل سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہو جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنالیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کر لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پر تاب جوشن جو سٹفل کا ماہر تھا، اپنے نیپو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں پھر بھی وہ باز آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روہی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ قام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہو جاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکرٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک ہنگے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو ہنگے ملتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھا جس نے آگ لگنے کی واردات میں ملوث پاکر لودھی کو معطل کر دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روہی کے ایجنٹ ہاشم اور ذوالشیخ حامد کے اہم ترین آدمی ”بلیک ٹائیگر“ کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ ”بلیک ٹائیگر“ کی موت شیخ حامد کے لیے ایک جھکا ثابت ہوتی ہے۔ سراج جولیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذات خود متاثر ہو چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سیٹھ عثمان (جو سراج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے سابق بڑی اور پولیس کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا بھگتتے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فرنیچر کا کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ امداد سے ملاقات کے بعد جب جگا اپنے ایک مخصوص ٹھکانے پر واپس آتا ہے تو ایک شخص کو دیکھ کر چونکتا ہے جو اس کمرے تک آ گیا تھا جہاں کسی دوسرے غیر متعلق شخص کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ جگا اور اس نووارد کے درمیان معمولی جھڑپ ہوتی ہے پھر چند اہم انکشاف رونما ہوتے ہیں۔ سیاہ قام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ لیاقت حسین کی بروقت کارروائی سے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا البتہ سراج معمولی زخمی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حامد نے کنول سے شادی کے بعد دونوں کو اہوں اور نکاح خواہ کے قتل کے احکامات جاری کر دیے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کمرے کے ذریعے محفوظ کر لی گئی تھی۔ لیاقت حسین فرحین کے رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت ستا تا ہے اور تنگ مزاجان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ جگا کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کسی بیوہ کے کہنے پر کی تھی۔ جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی کوشش میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔

اب آپ جذبات و احساسات ملاحظہ فرمائیے

شبنم کا ذہن اس وقت بھی ان لوگوں کے بارے میں وہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ کھانے پینے کے سلسلے الجھ رہا تھا جنہوں نے اسے اغوا کیا تھا۔

اڑتا لیس گھنٹے گزر جانے کے باوجود ابھی تک اسے خاموشی سے اسے کھانا اور ناشاد دیتے پھر خاموشی ہی سے برتن

کشکول

اٹھا کر واپس چلے جاتے تھے۔ کنول کی تصویر شناخت کرانے کے بعد اس سے کسی قسم کی باز پرس بھی دوبارہ نہیں کی گئی تھی۔ سب سے زیادہ فکر اسے موبائل کی کمی جسے تفتیش کرنے والے کے بیان کے مطابق کسی خفیہ ڈیوائس کے ذریعے جلا دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ بگ باس کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ غلط ہاتھوں میں پھنس چکی ہے۔

وہ غلط ہاتھ کس کے تھے؟ یہ سوال اسے ذہنی طور پر اس وقت بھی الجھا رہا تھا۔ افضل خان کو ایک جرم کی پاداش میں جو طویل سزا بھگتنی پڑی تھی وہ بھی اس کے علم میں تھی، اس حقیقت کا بھی اسے علم تھا کہ میڈم کو اغوا کرنے کی پلاننگ میں افضل خان نے کوئی جھول نہیں رہے دیا تھا لیکن پولیس کی ریڈ کے بعد اسی کو قربانی کا بکرا بھی بننا پڑا تھا۔ بگ باس اپنا دامن بچانے کی خاطر کسی بھی کارندے کو قربان گاہ پر چڑھانے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ تو کیا وہ بھی کسی ایسی ہی پتھویشن کا شکار ہو گئی تھی؟

کنول کے بارے میں کچے جانے والے سوالات کی روشنی میں ابھی تک وہ یہی نتیجہ اخذ کر چکی تھی کہ بگ باس شاید ابھی تک اس کے ملازمت چھوڑ دینے کی غلطی کو خلق کے نیچے نہیں اتار سکا تھا۔ ممکن ہے وہ استعفیٰ دینے کے بعد کسی پلاننگ کے تحت کہیں روپوش ہو گئی ہو اور بگ باس کو اس بات کا شبہ ہو کہ بحیثیت خاتون ورکر ہونے کے شبنم بھی کسی طرح کنول کے استعفیٰ کے راز سے واقف ہوگی۔ یہ خیال وقت کے ساتھ ساتھ شبنم کے ذہن میں جڑ پکڑتا جا رہا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور اغوا کرنے والے کوئی اور ہوتے تو اس کے ساتھ اس قدر شرافت کا سلوک بھی نہ کرتے۔ اس کا ذہن ہمہ وقت اس خیال کے تانے بانے سلجھانے میں الجھا رہتا۔ اب بھی وہ ان ہی زاویوں پر غور کر رہی تھی جب دروازے پر آہٹ ہوئی۔ پہلے ایک شخص اس کے لیے کھانے کی ٹرے لیے اندر آیا اس کے بعد حسب معمول ایک گن مین بھی سامنے آ گیا۔ وہ خاموشی سے دونوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتی رہی، کھانے کی ٹرے میز پر رکھنے والا اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے بعد چپ چاپ واپس لوٹ گیا، اس کے ساتھ ہی گن مین بھی جانے کے ارادہ سے گھوما تھا جب شبنم نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ اس نے پلٹ کر شبنم کو خشک نظروں سے دیکھا۔

”مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ شبنم نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

”سوری میڈم! مجھے آپ کے ساتھ کسی قسم کے سوالات جوابات کی اجازت نہیں ہے۔“ اس نے کھردرے

لہجے میں جواب دیا۔

”مجھے یہاں لانے والے کون لوگ ہیں؟“ اس نے گن مین کو گھورا۔

”وہی..... جنہوں نے مجھے آپ کی نگرانی پر متعین کیا ہے۔“

”وہ کب آئیں گے؟“

”ان کی مرضی پر منحصر ہے۔“ اس بار بھی سپاٹ لہجے میں جواب ملا۔ ”میں ملازم ہوں، صرف اپنی ڈیوٹی کا پابند ہوں۔“

”کیا تم میرا کوئی پیغام بھی ان کو نہیں پہنچا سکتے؟“

”پیغام کیا ہے.....؟“

”میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ تمہارے لیے ایک ملازم کی حیثیت سے اتنا ہی جانتا کافی ہے۔“ شبنم نے تملاکر کہا۔ ”ان کی کوئی کال آئے تو میرا پیغام ضرور دے دینا۔“ گن مین نے اسے تیز نظروں سے دیکھا پھر منہ پھیر کر باہر چلا گیا۔ شبنم اس کے جانے کے بعد کھانے میں مشغول ہو گئی، خود کو زندہ رکھنے کی خاطر کھانے کو زہر مار کر اس کی مجبوری بھی تھی۔ کھانے کے بعد وہ آرام کرنے کی خاطر بستر پر دراز ہو گئی۔ اس کی سوچوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا پھر ذہنی ورزش کرتے کرتے اس کی آنکھ بھی لگ گئی۔ دوبارہ اس کی آنکھ کسی آہٹ پر ہی کھلی تھی۔ وہ جڑ بڑا کر اٹھی تو وہی شخص اس کے سامنے موجود تھا جس نے اس سے کنول کی تصویر شناخت کرائی تھی۔

شبنم اپنے بے ترتیب لباس کو ٹھیک کرتی ہوئی اٹھی، دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالنے کے بعد اسے اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا اس وقت شام کے ساڑھے چار کا عمل تھا۔ اس نے آنے والے کو بہت غور سے دیکھا پھر خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ گفتگو کا آغاز کرنے سے پیشتر یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ اس کا تعلق کس پارٹی سے ہے۔

”تمہارا پیغام مجھے ملا تھا۔“ آنے والے نے دو چار منٹ کی خاموشی سے بعد سپاٹ لہجے میں گفتگو کی ابتدا کی۔

”کیا تمہیں یہاں کسی قسم کی تکلیف پیش آرہی ہے.....؟“

”مجھے کتنے دنوں تک یہاں رکھنا مقصود ہے؟“

”اس کا آسان جواب میں نے پہلی ملاقات میں دے دیا تھا۔“ اس نے بہ دستور سرد لہجے میں کہا۔ ”ہماری طرف سے کوئی رعایت تمہاری زبان کھولنے سے مشروط ہے۔ ہمیں کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔ تم اطمینان سے کوئی آخری فیصلہ کر سکتی ہو۔“

”جگ باس کو اگر اطلاع ہوگئی تو تمہارا انجام بھی تمہاری توقع کے خلاف ہوگا۔“

”ہم بھی اسی خراب انجام کے انتظار میں ہیں۔“ بے پروائی سے جواب ملا۔ ”ویسے اسے اطلاع ہوگئی ہے لیکن..... تم کہاں ہو؟ کس حال میں ہو؟ یہ جاننے کے لیے اس کے کھوجی کتے ہر طرف ابھی تک صرف بوسوگھتے پھر رہے ہیں۔“

”کیا تمہارا تعلق کسی سرکاری ایجنسی سے ہے؟“

”مطلب کی بات کرو..... تم نے کیوں اور کیا کہنے کے لیے ہمیں پیغام بھیجا تھا؟“

”کیا تم ہی حرف آخر ہو؟“ شبیم نے اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”تمہاری طرح میں بھی محتاط رہنا پسند کروں گی۔“

”میں سمجھا نہیں.....؟“

”تم نے بڑا کوئی آدمی، جس کا چہرہ میرے لیے اجنبی بھی نہ ہو۔ اس کے سامنے آنے کے بعد ہی میں کوئی آخری فیصلہ کر سکتی ہوں۔“

”اگر ہم تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیں تو.....؟“

”پھر شاید میری موت کے بعد فرشتے ہی میری زبان کھلوا سکیں گے۔“ وہ شانے اچکا کر بولی۔

”غلط گمان ہے تمہارا.....“ اس کو مخاطب کرنے والے نے بل کھا کر کہا۔ ”ادھر سے صرف ایک اشارے کی دیر ہے، اس کے بعد ہمیں بھی زبان کھلوانے کے ہزاروں نسخے معلوم ہیں۔“

”یہ تمہاری ذاتی سوچ ہے۔“ شبیم نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔

”اور کچھ کہنا چاہو گی؟“

”کہنے کے لیے بہت کچھ ہے میرے پاس لیکن اس کی ایک ہی شرط ہے..... کوئی ایسا شخص جس کو میں جانتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے..... ہم تمہاری یہ بات اوپر تک پہنچا دیں گے لیکن ایک بات ابھی سے سن لو۔“ جواب میں بے حد سنجیدگی سے کہا گیا۔ ”اس کے سامنے آنے کے بعد بھی تم نے زبان نہ کھولی تو پھر تمہارے پاس زندگی کی بھیک مانگنے کا بھی کوئی جواز باقی نہیں بچے گا۔“

”مجھے منظور ہے.....“ شبیم نے ٹھوس انداز میں جواب دیا تو آنے والا اسے ٹھوٹی نظروں سے دیکھنے کے بعد

الٹے قدموں واپس چلا گیا۔

شبیم کا ذہن پھر مختلف سوالات کے جواب تلاش کرنے لگا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر آئندہ آنے والا ایجنسی کا کوئی قابل اعتماد آدمی ثابت ہوا تو وہ زبان کھولنے میں دیر نہیں کرے گی۔ وہ جس سچویشن میں تھی، اس میں اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اعصاب کو پرسکون رکھنے کی خاطر اس نے اٹھ کر مختصر کمرے میں چہل قدمی شروع کر دی۔ بار بار اس کے ذہن میں وہ منظر گھوم رہا تھا جب اسے اغوا کرنے والوں نے بڑی جرات اور دلیری کا مظاہرہ کیا تھا لیکن انہوں نے صرف اسے کیوں اغوا کیا؟ افضل خان کو کس لیے چھوڑ دیا گیا؟ کیا انہیں افضل خان سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا یا..... اسے بعد میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا؟ خاصی دیر تک مختلف دسو سے اس کے ذہن میں ابھرتے ڈوبتے رہے۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اس کی توقع کے خلاف ہی تھا۔ اسی وجہ سے اس نے محتاط روی کے تقاضوں کے پیش نظر کسی واقف کار کے سامنے زبان کھولنے کی شرط عائد کی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس وقت وہ کس کی دسترس میں تھی؟ تقریباً نصف شب گزرنے کے بعد جب نیند کا خیار اس کے پپوٹوں کو بوجھل کر رہا تھا اس وقت دروازے کے قفل کھلنے کی مانوس آواز نے اس کے ڈوبتے ذہن کو بیدار کر دیا۔ وہ لباس درست کرتے ہوئے اٹھ بیٹھی پھر دروازہ کھلنے کے بعد جو فرد اندر داخل ہوا اس کو ایک نظر دیکھتے ہی اس کے پورے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

آنے والا ایس پی اورنگ زیب کے سوا کوئی اور نہیں تھا جس کے بارے میں وہ بہت کچھ سن چکی تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ جگ باس بھی اس کے تباد لے کی کوشش میں ناکام ہو چکا تھا۔ وہ نڈر اور بے خوف افسر تھا، نہ ہوتا تو جگ باس کے سامنے وہ بھی دوسرے افسروں کی طرح سر ہینڈ کرنے میں دیر نہ کرتا۔

شبیم دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی اٹھی۔ اورنگ زیب کی آنکھوں کی سرخی اس بات کی غمازی کرتی نظر آ رہی تھی کہ اس وقت وہ اچھے موڈ میں نہیں ہے۔ ایک لمحے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

”مجھے بلا کر تم نے اپنی مشکلات میں کی نہیں..... اور اضافہ کر لیا ہے۔“ اورنگ زیب نے ٹھوس لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

”یہ آپ کا خیال ہے آفسر میرا نہیں۔“ شبیم نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ”شاید آپ کے

سامنے آجانے سے میری بہت ساری مشکلات حل ہو جائیں گی۔“

”کس لیے یاد کیا تھا؟“

”مجھے اس طرح یہاں لانے کا کیا مقصد تھا؟“

”تمہارے پاس کو صرف اتنا یقین دلانا کہ تمہیں کسی ایجنسی نے نہیں بلکہ اس کے کسی چوٹ کھائے ہوئے دشمنوں نے اغوا کیا ہے۔“

”کیا اسے اس کا یقین آ گیا ہوگا؟“

”نہ آیا ہو تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ میرے زبان کھول دینے کے بعد قانون میری ہر طرح حفاظت کرے گا؟“ شبیم نے اس بار سلجھے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ اورنگ زیب نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، کچھ دیر وہ شبیم کو اپنے تجربوں اور مشاہدوں کی کسوٹی پر تولتا رہا پھر قدرے نرم لہجے میں بولا۔

”پہلے تمہیں ہمارے سوالوں کا جواب دینا ہوگا..... تیار ہو؟“

”ہاں..... میں کم از کم آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔“

”گڈ..... ویسے بائی دی وے، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم مجھ پر اندھا اعتماد کیوں کر رہی ہو؟ جبکہ ابھی تک تم نے کسی کو سیدھے منہ جواب نہیں دیا؟“

”یہ اس لیے ہے کہ میں آپ کے بارے میں بہت کچھ سن چکی ہوں۔“

”پھر یہ بھی ضرور جانتی ہوگی کہ تمہارا جگ باس اور اس کے شکاری کتے دن رات میری موت کے انتظار میں گھات لگائے بیٹھے ہیں۔“

”اس کا علم نہ ہوتا تو شاید میں زبان کھولنے پر آمادگی کا اقرار بھی نہ کرتی۔“

”بیٹھو.....“ جواب میں اورنگ زیب نے کمرے میں رکھی واحد کرسی کی سمت اشارہ کیا۔ شبیم ایک لمبے کوچکپائی پھر خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ ابھی میں تمہارے جگ باس کے علاقے سے ہی واپس آ رہا ہوں۔“

اورنگ زیب نے اسے مختصر آجملہ آدروں اور شیخ حامد کے حفاظتی دستے کے افراد کے درمیان ہونے والی فائرنگ اور چاروں قیدیوں کی گرفتاری اور رہائی کے بارے میں بتایا پھر کچھ توقف سے دریافت کیا۔ ”تم اس بارے میں کیا کہو گی؟“

”میں بھی جن حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچی

کاشکول

ہوں اس کا ہر لمحہ ایک جوا ہی تھا۔“ شبیم نے سرد آہ بھر کر بڑے دل شکستہ لہجے میں کہا۔ ”جوے میں ہمارا اور جیت دونوں کا فنی فنی چانس ہوتا ہے۔ رسک تو لینا پڑتا ہے لیکن یہ بھی بے باکی سے بتا دوں کہ آپ کا ڈی آئی جی جگ باس کے ہاتھوں بکا ہوا ہے۔“

”کیا تم جانتی ہو کہ افضل خان کس قماش کا آدمی ہے اور اس کا ماضی کیا تھا؟“ اورنگ زیب نے ڈی آئی جی والی بات کو نظر انداز کر کے سوال کیا۔

”جی ہاں.....“

”پھر۔ تم اپنا فلیٹ چھوڑ کر اس کے اپارٹمنٹ میں کیوں شفٹ ہوئی تھیں؟“

”اسے بھی میری زندگی کا ایک جوا سمجھ لیں۔ ویسے اس میں جگ باس کے حکم کا دخل بھی تھا، میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔“

”کنول میری معلومات کے مطابق تم سے زیادہ خوبصورت اور حسین تھی، پھر وہ استعفیٰ دے کر کس طرح آزاد ہو گئی؟“ اورنگ زیب نے چہیتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ اس کی نظریں شبیم کا ایکس رے کرنے میں مصروف تھیں۔

”شاید اس لیے کہ کنول کی کوئی کمزوری باس کے ہاتھ نہیں آ سکتی تھی۔“ وہ روانی میں کہہ گئی۔ غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب اورنگ زیب نے سرسراتے لہجے میں کہا تھا۔

”آئی سی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری کوئی کمزوری ایسی ہے جو تمہیں جگ باس کے ہر حکم پر عمل کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔“

”ایسا ہی سمجھ لیں۔“ شبیم نے نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس نے میری لاعلمی میں کچھ مواد ضرور جمع کر لیا ہے لیکن میرا کردار اب بھی بے داغ ہے۔“

”تم نے افضل خان کو دوست بنا کر جو پروگرام مرتب کرنے کی کوشش کی تھی کیا اس کی خبر اسے بھی تھی؟“

”آپ نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ آپ کی ذہانت کی دلیل ہے۔“ شبیم نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا پھر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے جو کچھ سوچا تھا ابھی تک اس کا علم کسی اور کو نہیں ہے۔ البتہ ایک ہستی ہے جس کو میں نے اشارتاً یہ عندیہ ضرور دیا تھا کہ میرے لیے دلدل سے نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے..... بغاوت۔“

”وہ ہستی کس کی ہے؟“

”سوری..... میں اس کا نام فی الحال نہیں لے سکتی ورنہ اس کے لیے بھی بہت ساری مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔“

شبیم نے دلی زبان میں کہا۔

اورنگ زیب کچھ دیر خاموش کھڑا شبیم کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر کچھ سوچ کر اس نے جیب سے موبائل نکال کر کسی کے نمبر پر کال کی ساتھ ہی لائن کلیکٹ ہونے پر اسپیکر بھی آن کر دیا۔

”ہیلو.....“ دوسری طرف سے ایک زنانی آواز ابھری، شبیم اسے سن کر چوٹی تھئی۔

”میں ایس بی اورنگ زیب بول رہا ہوں۔ کیا میڈم روٹی سے بات کر سکتا ہوں؟“

”بول رہی ہوں.....“ دوسری جانب سے حیرت کا اظہار کیا گیا، اس وقت آپ نے کیسے کال کیا؟ سراج صاحب کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”مجھے اس وقت آپ سے ایک دوسرے موضوع پر کچھ اہم بات کرنی ہے۔“

”فرمائیے.....“

”کیا آپ شبیم نامی کسی خاتون سے واقف ہیں؟“

اورنگ زیب نے شبیم کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”اچھی طرح جانتی ہوں لیکن میری معلومات کے مطابق کسی وجہ سے اسے بھی انڈر گراؤنڈ کر دیا گیا ہے۔“

دوسری طرف سے معنی خیز انداز میں جواب ملا۔ ”بہ ظاہر اس کے اغوا کا ڈراما ضرور اسٹج کیا گیا ہے لیکن اسی طرح افضل خان کے ساتھ بھی ایک لمبا کھیل کھیلا گیا تھا، مسٹر سراج کو بھی اس کی تفصیل معلوم ہے۔“

”اگر اغوا کی کارروائی ڈراما تھی تو افضل خان کو کیوں زخمی حالت میں چھوڑ دیا گیا؟“

”ممکن ہے اس میں بھی کوئی مصلحت ہو دیے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ افضل خان اب اس اپارٹمنٹ میں نہیں ہے۔ اپنا سامان سمیٹ کر وہ فوری طور پر اپارٹمنٹ سے شفٹ ہو کر کہیں اور چلا گیا ہے۔ اگر یہ سب کچھ پلاننگ سے نہ ہوتا تو پھر آپ اس کے صرف زخمی ہونے اور ہوش میں آنے کے فوراً بعد اپارٹمنٹ سے شفٹ ہو جانے کو کس خانے میں فٹ کریں گے؟“

”آپ نے جوئی معلومات فراہم کی ہیں اس کے لیے شکر گزار ہوں لیکن اس وقت میں نے آپ کو کسی اور مقصد سے زحمت دی ہے۔“

”اگر میں آپ کے کسی کام آسکی تو مجھے خوشی ہوگی۔“

”کیا شبیم پر اعتبار کیا جاسکتا ہے؟“ اورنگ زیب نے

ایک ایک لفظ پر زور دے کر بے حد سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”پہلا مرحلہ تو اسے تلاش کرنا یا باز یاب کرنا ہے۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے..... میں نے صرف اعتبار کرنے کے سلسلے میں آپ کی ذاتی رائے معلوم کی تھی۔“

”مجھے نہیں معلوم کہ آپ کس پس منظر میں یہ سوال کر رہے ہیں۔ بہر حال، میں اتنا جانتی ہوں کہ اگر آپ کا قانون اس کے ساتھ رعایت کرنے کے علاوہ اس کی مدد کرے تو وہ بے حد کارآمد ثابت ہو سکتی ہے، بشرطیکہ آپ اسے زندہ باز یاب کر سکیں۔“

”شکریہ.....“ اورنگ زیب نے مختصر جواب دینے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا پھر شبیم کو مخاطب کر کے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”میڈم نے آپ کو ہمارے تعاون کا مستحق قرار دیا ہے۔“

”کیا اب بھی میں اپنے آپ کو قیدی ہی سمجھوں؟“

شبیم نے سکون کا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، آپ کی حیثیت اب بدل گئی ہے لیکن میں فیصلے کا اختیار بھی آپ کو ہی دے رہا ہوں۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”آپ اگر چاہیں تو جس طرح سے ہم آپ کو لائے ہیں اسی طرح خوب صورتی سے فرار ہونے کا موقع بھی فراہم کر سکتے ہیں، ہم سے دوستی نبھانی آپ کو مشکل میں بھی ڈال سکتی ہے اس لیے کہ میں نے اب اس پار یا اس پار کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”میں آپ کے ساتھ مل کر کام کرنے کو ترجیح دوں گی۔“ شبیم نے اورنگ زیب کو یقین دلایا۔ ”فرار کا ڈراما آپ کے بگ باس کو ہضم بھی نہیں ہوگا۔“

”کسی آخری نتیجے پر پہنچنے میں جلدی نہ کریں۔ اطمینان سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ میں کل کسی وقت دوبارہ آؤں گا پھر آپ سے اطمینان سے تفصیلی بات ہوگی۔“

اورنگ زیب نے دوستانہ انداز میں کہا پھر اٹھنے قدموں واپس جانے لگا تو شبیم نے اسے روک کر کہا۔

”کیا آپ میرے لیے کسی موبائل کا بندوبست کر سکتے ہیں جس کی سم ان رجسٹرڈ ہو۔“

”کل صبح آپ کی یہ فرمائش پوری ہو جائے گی لیکن..... میڈم کو جو غلط فہمی ہے اسے دور کرنے کی غلطی نہ کیجیے گا، اس وقت ہمیں پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔“

”میں اس کی اہمیت کو سمجھتی ہوں۔“ شبیم نے اقرار کیا

پھر اورنگ زیب کے جانے کے بعد اس نے سکون کا لمبا سانس لیا۔ اب وہ اس مختصر سے کمرے کو اپنے لیے سب سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ سمجھ رہی تھی۔

پولیس موبائل کی پچھلی نشست پر لیاقت حسین کو تین مسلح سپاہیوں نے دبوچ رکھا تھا جبکہ چوتھا جو تین فیتوں والا حوالدار تھا اس نے چار افراد کے قاتل کو حراست میں لینے کے بعد موچھوں کو تاؤ دینا شروع کر دیا تھا۔ دین کے چلتے ہی اس کی زبان بھی مغضبات اگلنے لگی، وہ گالیاں بکتے وقت کبھی ٹھوکروں اور کبھی رائفل کے بٹ سے بھی لیاقت حسین کو مارنے میں مشغول تھا، باقی تین سپاہی بھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہاتھ چلانے لگتے لیکن لیاقت حسین نے کوئی احتجاج نہیں کیا، البتہ ایک بار اس نے جی کڑا کر کہ یہ ضرور پوچھا تھا۔

”تم لوگوں نے مجھے کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟ کہاں لے جا رہے ہو؟“

”یہ تو عادی قاتل دکھائی دیتا ہے استاد۔“ ایک سپاہی نے لیاقت حسین کو نفرت سے ٹھوکا مارتے ہوئے حوالدار سے کہا۔ ”حرامی جرم کی نوعیت پوچھ رہا ہے۔“

”ہم تمہیں تمہاری بہادری کا انعام دینے کے لیے ساتھ لائے ہیں۔“ حوالدار نے لیاقت حسین کو ایک غلیظ گالی دیتے ہوئے رائفل کے بٹ سے مارا تو الماس چپ نہ رہ سکی۔

”کیا تم لوگوں کو احساس نہیں ہے کہ دین میں ایک خاتون بھی موجود ہے۔“ تھانے پہنچنے تک سکون سے نہیں بیٹھ سکتے؟“

”آپ خاتون ہیں اسی لیے تو ابھی تک آپ کی مالش شروع نہیں کی۔“ حوالدار نے موچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے الماس کو کمینہ نظروں سے دیکھا۔ ”یہ کام تھانہ انچارج ضرور کرے گا تو پھر آپ کو بھی سکون.....“

”ٹھٹ اپ.....“ الماس ضبط نہ کر سکی تو پھر کر بولی۔

”تھانے پہنچنے کے بعد تم سب کی پیٹیاں بھی اتر سکتی ہیں۔ بہتر ہے کہ اب خاموش رہو۔“

”ہماری پیٹی کے بجائے اپنے لباس کی خیر منائیں بی بی۔“ حوالدار نے تمللا کر جواب دیا۔ ”ایسی گیڈر بھکیاں ہم پہنے بھی.....“

”منہ بند رکھو اپنا.....“ لیاقت حسین پھر گیا۔ حوالدار کو تھرا آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اب اگر تمہاری گندی زبان سے ایک لفظ بھی..... بھی تبت..... اب.....“

تینوں سپاہیوں کے علاوہ حوالدار بھی لیاقت حسین پر اچانک قہر بن کر ٹوٹا، وہ جملہ مکمل کرنے کے بجائے کراہنے لگا۔ الماس خون کا گھونٹ پی کر خاموش رہی۔ دس منٹ بعد موبائل تھانے کے احاطے میں داخل ہو کر رکی تو لیاقت حسین کو بہ دستور ٹھوکریں مار کر نیچے اتارا گیا، الماس ہونٹ چبائی نیچے اتری تو ایک مسلح سپاہی اس کے قریب پہنچ گیا۔ حوالدار اس وقت بھی سینہ تانے آگے آگے چلنے لگا۔ لیاقت حسین کا لباس تقریباً تار تار ہو رہا تھا، اسے دھکے مار مار کر عمارت کے اندر لایا گیا، دو سپاہیوں نے اسے گدی پر ہاتھ مارتے ہوئے تھانہ انچارج کے کمرے میں دھکا دیا، ان کے ساتھ حوالدار بھی تھا لیکن جب الماس نے کمرے میں قدم رکھا تو وہ سب ہی ششدر رہ گئے، دو پھولوں والا سب انسپکٹر الماس کو دیکھ کر اس طرح بوکھلا کر اٹھا جیسے اسے موت کا فرشتہ نظر آ گیا ہو۔

”مم..... میڈم، آ..... آپ؟“ اس نے الماس کو دیکھ کر ہکلاتے ہوئے کہا۔

الماس نے جواب دینے کے بجائے خاموشی سے کرسی پر بیٹھ کر پرس سے موبائل نکالا پھر اس نے مصلحتاً شوہر کے بجائے اورنگ زیب کو فون کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ سب انسپکٹر کے اشارے پر حوالدار اور اس کے تینوں ساتھی خاموشی سے سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گئے۔ لیاقت حسین الماس کے پیچھے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کی حالت غیر ہی ہو رہی تھی۔ چہرے اور جسم کے دوسرے حصوں سے خون کی لکیریں بھی نمایاں طور پر نظر آرہی تھیں۔ سب انسپکٹر دوبارہ سیٹ کے قریب چلا گیا لیکن اس نے بیٹھنے کی جسارت نہیں کی تھی۔

”ہیلو.....“ موبائل پر دوسری جانب سے اورنگ زیب کی آواز سنائی دی۔ ”سراج تو خیریت سے ہے؟“

”میں اس وقت آپ سے اپنی خیریت کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“ الماس نے سنجیدگی اور جھلاہٹ کے ملے جلے انداز میں جواب دیا۔ ”اس وقت گھر سے نہیں..... آپ کے علاقے کے ایک پولیس اسٹیشن سے بات کر رہی ہوں۔“

”خیریت.....؟“

جواب میں الماس نے مختصر الفاظ میں اورنگ زیب کو اپنے اغوا کیے جانے اور لیاقت حسین کے ہاتھوں دشمنوں کے موت کے گھاٹ اترنے کی اطلاع دے کر کہا۔ ”آپ کتنی دیر میں آسکتے ہیں۔“

”زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں۔“ اورنگ زیب

پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپ کو تمام ڈائجسٹ
ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

مرنے والے پولیس کو پہلے سے مطلوب ہوں گے۔“
الماس جانے کے لیے تیار ہوئی تو لیاقت حسین نے
اٹھ کر بڑی عاجزی سے کہا۔
”صاحب کو میرے بارے میں کچھ نہ بتائیے گا۔ وہ
بلاوجہ پریشان ہوں گے۔“
”نہیں بتاؤں گی.....“ الماس نے لیاقت حسین کو تسلی
دی پھر وہ اورنگ زیب کے ساتھ قدم اٹھاتی باہر آ کر اورنگ
زیب کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ روانہ ہونے سے قبل اس نے
اورنگ زیب کو بتا دیا کہ اس کی کار شاہنگ سینئر ہی پر کھڑی
ہوگی۔

”ڈونٹ وری..... میں اسے ابھی منگا لیتا ہوں۔“
الماس چلی گئی تو اورنگ زیب قدم اٹھاتا ایس ایچ او
کے کمرے میں آ گیا۔ سب انسپکٹر ہاتھ باندھے اس کے
سامنے کھڑا تھا، اورنگ زیب نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر
فون اٹھا کر کچھ متعلقہ محکموں کے لوگوں کو ضروری ہدایات
دینے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے لیاقت حسین کی
طرف دیکھا جو اس وقت سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔
”تم نے ایک بار پھر جواں مردی کا ثبوت دے کر مسز
سراج کو دشمنوں سے بچا لیا۔“

”آپ کن دشمنوں کی بات کر رہے ہیں صاحب۔“
لیاقت حسین نے بہ دستور حیرت سے کہا۔ ”میں تو بیگم صاحب
کے انتظار میں کھڑا تھا جب پولیس والوں نے نہ جانے کب
اور کیوں ہم دونوں کو موبائل میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ بلاوجہ
میری درگت بھی بنا دی..... یہ سب کیوں ہوا صاحب؟“
”کبھی کبھی ہم بھی غلطی کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن اب
میں آگیا ہوں تو سب سے باز پرس بھی کر لوں گا۔“ اورنگ
زیب نے لیاقت حسین کی ذہنی کیفیت کے پیش نظر اسے تسلی
دی پھر سب انسپکٹر کو دیکھ کر خشک لہجے میں بولا۔ ”آپ فوری
طور پر اسے ساتھ لے جا کر مرہم پٹی کرائیں اور اس کے
لباس کا بندوبست بھی کریں۔ بی، کوئٹہ۔“

سب انسپکٹر نے لیاقت حسین کے ساتھ فوری طور پر
وہاں سے نکل جانے میں ہی خیریت سمجھی تھی۔ اورنگ زیب
اس کے جانے کے بعد پھر کچھ لوگوں کو ضروری کال کرنے
لگا۔ تین گھنٹے میں وہ اس وقت تک سکون سے نہیں بیٹھا جب
تک اسے پولیس کے مختلف ذریعوں سے باقاعدہ رپورٹ
نہیں مل گئی کہ چاروں مرنے والے پولیس کو تین سال سے
مطلوب تھے۔ ان کی فائلیں بھی سرد خانوں سے نکلوا کر
تھیں۔ ان حقائق کی روشنی میں اس نے اپنی موجودگی میں

نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
”میں نے ابھی سراج کو اطلاع نہیں دی۔ آپ بھی
انہیں نہ بتائیں ورنہ وہ پریشان ہوں گے۔“ الماس نے
تیزی سے کہا پھر دوسری طرف سے جواب سن کر موبائل آف
کر کے ہونٹ چبانے لگی۔

”آئی ایم اسٹریٹجی سوری میڈم۔“ سب انسپکٹر نے
معذرت طلب کرنے والے انداز میں کہا۔ ”آپ اگر براہ
راست بھی تھانے کو اطلاع دے دیتیں تو یہ زحمت نہ ہوتی۔“
الماس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے لیاقت حسین
کی فکر تھی جس کے ہاتھوں سے چار آدمی قتل ہو چکے تھے۔
اسی جرم میں اسے زد و کوب بھی کیا گیا تھا۔ اس نے گھوم کر
لیاقت حسین کو دیکھا پھر بڑی اپنائیت سے بولی۔ ”تم
پریشان نہ ہو، میں نے ایس پی صاحب کو اطلاع کر دی ہے،
وہ آکر سب ٹھیک کر دیں گے۔ تم پر قتل کا کوئی مقدمہ نہیں بن
سکتا اس لیے کہ جو لوگ مارے گئے وہ یقیناً اشتہاری مجرم ہی
ثابت ہوں گے۔“

”کس کا قتل ہو گیا؟“ لیاقت حسین نے بڑی
معصومیت اور حیرت سے دریافت کیا۔ ”میں تو ابھی تک یہ
سوچ رہا ہوں کہ پولیس والے ہمیں کس جرم میں یہاں تک
گھسیٹ لائے۔ انہوں نے آپ کی شان میں بھی.....“
”ایسے موقعوں پر پولیس کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے لیکن تم
کسی بات کا غم نہ کرو۔“ الماس نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔
لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کے
چہرے پر طاری تاثرات اس بات کی ترجمانی کر رہے تھے
کہ وہ ابھی تک صورت حال کی اصل نوعیت سے بالکل بے
خبر رہا تھا۔

دس منٹ بعد اورنگ زیب تقریباً دوڑتا ہوا تھانے
میں داخل ہوا تو پورے عملے میں کھلبلی مچ گئی۔ سب انسپکٹر
کے کمرے میں پہنچ کر اس نے الماس کے بعد لیاقت حسین کو
دیکھا تو اس کی پیشانی پر بے شمار سلوٹیں ابھرنے لگیں۔ اس
نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے الماس کو مخاطب کیا۔
”میں آپ کو گھر جانے کا مشورہ دوں گا۔ میرا ڈرائیور
آپ کو ڈراپ کر دے گا۔“

”اس کا کیا بنے گا؟“ الماس نے اٹھتے ہوئے
انگریزی میں لیاقت حسین کے بارے میں دریافت کیا۔
”یہ میری ذمہ داری ہے۔ آپ گھر پہنچیں، میں
اسے اپنے ساتھ لے کر ہی آؤں گا۔“ اورنگ زیب نے کہا۔
”کچھ رسی کارروائی ضروری ہے لیکن مجھے بھی یقین ہے کہ

ضروری دستاویز تیار کر ایں لیکن ان میں لیاقت حسین یا الماس کا ذکر درمیان میں نہیں آنے دیا، فائرنگ کے سلسلے میں اس نے یہی جواز بنایا تھا کہ پولیس نے بروقت موقع واردات پر پہنچ کر سچویشن کنٹرول کرنے کی کوشش کی تو مطلوبہ مجرموں نے فائر کھول دیا اور پولیس کی جوابی فائرنگ کے نتیجے میں چار مجرم کام آگئے، باقی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے جن کی سرگرمی سے تلاش کا سلسلہ جاری ہے۔ اس تمام کارروائی سے فارغ ہو کر وہ لیاقت حسین کو ساتھ لے کر سراج کی طرف روانہ ہو گیا۔ سب انسپکٹر نے اسے مطلع کر دیا تھا کہ سراج کی گاڑی کو شاہینک سینٹر سے اٹھا کر اس کے مکان پر پہنچا دیا گیا تھا۔ راستے میں اس نے کسی خیال سے لیاقت حسین سے دریافت کیا۔

”تمہارا پستول اس وقت کہاں ہے جو سراج صاحب نے دیا تھا؟“

”اس وقت بھی میری کمر کی بیلٹ میں موجود ہے صاحب۔“ لیاقت حسین نے سادگی سے جواب دیا۔ ”صبح ناشتے کے بعد سے رات کو سوتے وقت تک یہ میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔“

اورنگ زیب نے ایک لمحے کو سوچا کہ پستول نکلوا کر اس کے میگزین میں موجود گولیاں شمار کر لیں پھر اس نے یہ کام سراج کے لیے چھوڑ دیا، وہ لیاقت حسین کی یادداشت کو بار بار کریدنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے پولیس کے عملے پر ضرور غصہ آ رہا تھا جنہوں نے لیاقت حسین کو حراست میں لینے کے باوجود اس کی جامعہ تلاشی ضروری نہیں سمجھی تھی۔ اس قسم کی خوش فہمیاں اکثر پولیس والوں کے لیے موت کا سبب بھی ثابت ہوتی تھیں۔

شیخ حامد اس وقت دفتر سے واپسی کے بعد لباس تبدیل کرنے میں مصروف تھا جب موبائل گنگنانے لگا۔ اس نے ایک اچٹی ہوئی نظرفون اسکرین پر ڈالی۔ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ اس کی طرف توجہ بھی نہ دیتا۔ گھر واپسی کے بعد اہم لوازمات کے ساتھ شام کی چائے لیے بغیر وہ کسی سے بات کرنے کا عادی نہیں تھا، یہ خاصی پرانی عادت تھی لیکن اس وقت کنول کے نمبر دیکھ کر اس نے فوری طور پر موبائل اٹھا کر آن کرتے ہوئے کان سے لگایا۔

”اس وقت کیسے فون کیا؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیا اب مجھے بھی بات کرنے کی خاطر آپ سے

وقت لینا پڑے گا؟“ کنول نے شکوہ کیا۔

”کیسی بات کر رہی ہو جان من۔“ شیخ حامد نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”دراصل میں نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا۔“

”آپ شاید شام کے ناشتے کی بات کر رہے ہیں؟“

”میرا خیال ہے کہ تمہاری طرف بھی اس وقت شام ہی ہوگی؟“ اس نے کنول کو پیار سے چھیڑنے کی خاطر سوال کیا۔

”میں وقت کی نہیں ناشتے کی بات کر رہی ہوں۔“

کنول نے سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ ”میں نے تو صبح سے ناشتا نہیں کیا اور اس وقت تک کچھ نہیں کھاؤں پیوگی جب تک آپ نہیں آئیں گے۔“

”ایسا مت کرو ڈارلنگ۔“ شیخ حامد نے اسے ریشہ خطنی ہو جانے والے انداز میں منانے کی کوشش کی۔ ”ناشتا پانی سے منہ موڑ لو گی تو وہ خوب صورت اور حسین فیکر خراب ہو جائے گا جس نے مجھے تمہارا دیوانہ بنا دیا ہے۔“

”خالی خولی باتیں.....“ شکوہ کیا گیا۔ ”مجھ سے پوچھیں، میرے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ آپ دو روز سے غائب ہیں، میں ایک ایک پل کانتوں پر لوٹ رہی ہوں اور اماں کی باتیں الگ سن رہی ہوں۔“

”کیا مطلب؟.....“ وہ چونکا۔ ”اماں کس قسم کی باتیں کر رہی ہیں؟“

”انہوں نے میری ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر شادی کی اجازت دیدی تھی لیکن ماں، ماں ہوتی ہے۔“ کنول نے وضاحت کی۔ ”کیا انہیں احساس نہ ہوگا کہ آپ نے دو روز سے پلٹ کر صورت بھی نہیں دکھائی۔ وعدہ کر کے بھی نہیں آئے۔“

”میں نے تمہیں حالات کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ تمہارے بغیر میں بھی بے چین ہوں لیکن کچھ حرام زادے بلا وجہ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ تم شبنم سے واقف ہو؟“

”ہاں..... صرف نام کی حد تک۔“

”اسے بھی کسی نے اغوا کر لیا ہے؟“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”کون لوگ ہو سکتے ہیں؟“

”تم فکر نہ کرو۔ میرے شکاری کتے ہر سمت ان کی بو سوجھتے پھر رہے ہیں۔ میرے دشمنوں کو پھاڑ کھانے میں دیر بھی نہیں لگا میں گے، تم صرف اپنی صحت اور تندرستی کا خیال رکھو میری جان.....“

”آپ خود کب آئیں گے؟“

”آج یا کل کسی وقت بھی ضرور آؤں گا لیکن ایک شرط

کشکول

زیب میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے الماس کو اپنی گاڑی میں فوراً ہی گھر روانہ کر دیا پھر کاغذی خانہ پوری کرنے کے بعد وہ لیاقت حسین کو بھی اپنی گاڑی میں بٹھا کر ڈی ایس پی سراج کی رہائش گاہ کی طرف چلا گیا۔ ”نمبر ٹو نے بات مکمل کرنے کے بعد سنجیدگی سے کہا۔“ مجھے یاد ہے باس..... آپ نے کہا تھا کہ ناکامی کی صورت میں آپ کو شکل دکھانے کے بجائے خود بھی سیاہ فام جشی کی طرح زہریلا کپسول کھا کر اپنا قصہ پاک کر لوں۔“

”ایک منٹ.....“ شیخ حامد تیزی سے بولا۔ ”الماس کے اغوا کے سلسلے میں ایس پی کے ختم نے کیا لکھا ہے؟“

”یہ بھی اہم نکتہ ہے باس۔“ نمبر ٹو نے کہا۔ ”میں نے اطلاع نکلوائی ہے اس کے مطابق الماس یا لیاقت حسین کا نام کہیں نہیں آیا۔ شاہینک مرکز پر ہونے والی فائرنگ کو ممکنہ ڈکیتی کا رنگ دے کر نمٹا دیا گیا ہے، جس میں پولیس نے اپنی کارکردگی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے بعد ہمارے چار آدمیوں کو بھی ڈاکو ظاہر کیا جو فائرنگ میں کام آگئے تھے۔“

”لیاقت..... حسین۔“ شیخ حامد نے بڑی جھارت سے لیاقت حسین کو دانت کر کر اکر تین حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ شاید چوتھا یا پانچواں موقع ہے جب اس ختم پلید نے میرا رستہ کاٹا ہے۔“ اس جملے کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ شیخ حامد کو یہ بھی یاد آ گیا کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ لودھی نے بھی اسے خوش کرنے کی خاطر ذاتی طور پر لیاقت حسین کو اٹھوایا تھا، اس کے آدمیوں نے لیاقت حسین کو ایک خفیہ ٹھکانے پر لے جا کر زنجیروں میں جکڑ دیا تھا لیکن بعد میں خود لودھی نے بھی بڑی حیرت سے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ لیاقت حسین زنجیروں کو توڑے بغیر حیرت انگیز طریقے سے اس کی بندشوں سے نکل کر فرار ہو گیا تھا۔ نگرانی کرنے والے بھی ششدر رہ گئے تھے، جو دو آدمی اس کی زبان کھلوانے پر تعینات تھے وہ بعد میں مردہ پائے گئے تھے۔ لودھی کی بیان کردہ وہ ناقابل یقین کہانی اس وقت شیخ حامد کے ذہن میں کسی ٹیپ شدہ کہانی کی طرح گونج رہی تھی۔ وہ اس قسم کی پراسرار طلسماتی، مانوق الفطرت اور ماورائے عقل کہانیوں پر یقین نہیں رکھتا تھا لیکن لیاقت حسین کے بارے میں ملنے والی شہادتیں اور سنائی جانے والی تفصیلات اب اس کے دماغ میں پچھل سی جا رہی تھیں۔

”میرے لیے کوئی آخری حکم باس؟“

”فی الحال زہریلے کپسول کو حفاظت سے اپنے پاس ہی رکھو۔“ شیخ حامد نے سرسرا تے لہجے میں کہا۔ ”لیاقت حسین کے

پر.....“

”وہ کیا.....؟“

”تم اپنی خوراک اور پھل فروٹ سے خفا نہیں ہوگی۔“

کنول سے بات ختم کر کے اس نے لاؤنج میں آ کر ناشتا کیا پھر اس نے شام کے اخبارات کی طرف نظر ڈالنے کی کوشش کی مگر جب دوسرے موبائل کی مخصوص آواز ابھری۔ شیخ حامد نے پلٹ کر دیکھا، نمبر ٹو کی کال تھی، اس کے چہرے پر ایک دم ہی زلزلے جیسی کیفیت طاری ہو گئی۔

”جگا کہاں مرا ہوا ہے کرائے کا ٹٹو۔ کچھ اتا پتا چلا اس کا.....“ وہ موبائل آن کرتے ہی گر جئے لگا۔

”میرے آدمی اس کی.....“

”بکواس بند کرو۔ صبح تک کوئی سراج نہ ملے تو خود اپنی خبر بھی نہ دینا۔ زہریلا کپسول پاک کر لیتا، مجھے ٹکسوں کی نہیں، کارآمد لوگوں کی ضرورت ہے۔“

”میں نے زہریلا کپسول اس وقت بھی ہتھیلی پر رکھا ہوا ہے باس۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلی بار آپ نے کیا شرط رکھی تھی۔“

”لن ترانیاں نہیں..... کھل کر بات کرو..... کیا بکواس کرنا چاہتے ہو؟“

”میرے چار آدمیوں نے آج دوپہر مسز سراج..... الماس بیگم کو ساحلی علاقے کے قریب والے بڑے شاہینک مرکز سے اغوا کر لیا تھا۔ اسے پلازا سے باہر بھی لے آئے تھے لیکن وین میں بٹھانے سے پیشتر ہی لیاقت حسین نے درمیان میں آکر بازی کا رخ پلٹ دیا۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو۔“ شیخ حامد حلق کے بل چیخا۔

”کیا تمہارے جنگلی سوراں ایک پر قابو نہیں پاسکے؟“

”سمجھ میں نہیں آتا باس..... وہ انسان نہیں بلکہ کوئی عفریت ہی ہے جو چار آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر خود صرف ان لوگوں کے ہاتھوں معمولی زخمی ہوا۔“

”الماس کا کیا بنا.....؟“

”فائرنگ کے بعد وہاں بھگدڑ مچ گئی تھی، کسی نے پولیس کو بھی اطلاع کر دی ہوگی، موبائل الماس اور لیاقت حسین کو تھانے لے گئی۔ ہمارے مردہ آدمیوں کو بھی بعد میں اٹھوایا۔“

”اس وقت وہ کہاں ہے؟“ شیخ حامد نے ہاتھ ملتے ہوئے الماس کے بارے میں سوال کیا۔

”اس کے تھانے پہنچنے کے کچھ دیر بعد ایس پی اورنگ

سلسلے میں تم کیا کر سکتے ہو؟ میرا مطلب ہے اس کے وجود کو اس طرح مٹا دو جیسے وہ کبھی ماں کے پیٹ سے باہر ہی نہیں آیا تھا۔“

”آپ نے پہلے کہا ہوتا تو الماس بیگم کو قابو کرنے سے پہلے ہم اسی کو.....“

”شرمندگی مٹانے کی حماقت نہ کرو..... میں تمہیں دو روز کا موقع دے رہا ہوں۔“

”آپ نے سیٹھ رستم علی کے بارے میں کچھ ہدایتیں دی تھیں۔“ بات جاری رکھی گئی۔ ”میری تفصیلی معلومات کے مطابق آپ کے بچکے پر ہونے والے حملے میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے..... وہ ایک بزدل اور خوفزدہ بزنس مین ہے جو شیشے کے گھر میں بیٹھ کر کسی کی طرف ہتھ مارنے یا اچھالنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہے۔“

”پھر..... اور کون اپنی موت کو دعوت دے رہا ہے.....؟“ شیخ حامد نے جھلا کر دریافت کیا۔

”ہو سکتا ہے جگا کے سامنے آنے کے بعد کچھ ڈانڈے آپس میں مل جائیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”پہلے حملے میں..... جو لاشیں پولیس کے ہاتھ لگی تھیں، ان میں سے دو ولد الحراموں کا تعلق اسی کے گروہ سے معلوم ہوتا ہے۔“

”امکانات اور غور کا وقت اب میرے پاس نہیں ہے۔“ اس بار شیخ حامد نے بے حد قہر آلود لہجے میں کہا۔ ”جو بھی مشکوک آدمی تمہاری لسٹ پر آئے اسے بھون کر رکھ دو..... میری طرف سے کھلی اجازت ہے، نمبروں پر لیاقت حسین کا نام ضروری ہے۔“

شیخ حامد نے نمبر نو سے بات ختم کر کے چائے کے دو لے لیے گھونٹ حلق سے نیچے اتارے پھر اس نے گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے ڈی آئی جی کراہنر آغا منظور کے نمبر ڈائل کیے۔ تیسری گھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی۔

”اس وقت کیسے یاد کیا جناب.....“

”کیوں؟..... کیا اب تم جیسے سفارشیوں کو بھی فون کرنے کی خاطر پہلے سے وقت لینا ضروری ہے؟“ شیخ حامد نے بڑی رعوت سے کہا۔

”آپ غلط سمجھ شیخ صاحب۔“ ڈی آئی جی نے اس کے لہجے کی تلخی محسوس کرتے ہوئے بات بنانے کی کوشش کی۔

”میں بس ایک دو منٹ میں اٹھنے والا تھا۔ آج آپ کو فون کرنے کا پروگرام بھی تھا۔“

”کوئی خاص خبر.....؟“

”آپ نے شبیہ کو باز یاب کرنے کی جو ذمہ داری سونپی تھی اسی کے سلسلے میں کچھ عرض کرنا تھا۔“

”کوئی سراغ ملا.....؟“

”ابھی تک نہیں لیکن میں مایوس بھی نہیں ہوں۔ میرے سادہ لباس والے دن رات مشتبہ افراد کے ٹھکانوں پر سن گن لینے میں مصروف ہیں۔ اگر وہ اسی شہر میں ہوئی تو میرے تجربے کا رکھو جی اسے ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔“

”اگر..... مگر سے کام نہیں چلے گا آئی جی۔“ شیخ حامد نے اس کا نام بگاڑتے ہوئے اپنے غصے کا اظہار کیا۔ ”مجھے کوشش نہیں..... نتیجہ چاہیے اور وہ بھی شبیہ کی شکل میں.....“

”میں جانتا ہوں.....“

”سنا ہے تمہارے نئے ایس پی نے آج ساحلی علاقے کے شاپنگ سینٹر سے کچھ لاشیں بھی بھری ہیں۔“ شیخ حامد نے الفاظ چباتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا قصہ تھا؟“

”اب تک مجھے جو معلومات ملی ہیں اس کے مطابق کچھ دہشت گردوں نے شاپنگ سینٹر پر بڑے پیمانے پر ڈاکا مارنے کا پروگرام بنایا تھا، وہ کسی حد تک کامیاب ہو گئے تھے لیکن بروقت ایک پولیس موبائل وہاں پہنچ گئی۔ پھر فائرنگ کے تبادلے میں چار ڈاکو کام آگئے۔ پولیس ریکارڈ کے مطابق وہ پہلے سے مطلوب مجرم کی فہرست میں شامل تھے۔“

”حقیقت سنا رہے ہو یا یہ تمہارے نئے ایس پی کی من گھڑت کہانی ہے؟“

”میں..... میں سمجھا نہیں؟“ ڈی آئی جی نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”آپ نے کیا سنا ہے؟“

”میں نے سنا ہے کہ جس وقت فائرنگ کا تبادلہ ہوا اس وقت شاپنگ سینٹر میں سراج کی الماس بیگم بھی موجود تھیں۔ دوسری اطلاع کے مطابق الماس بیگم اور ان کی کار چلانے والے ڈرائیور کو پولیس موبائل میں لوڈ کر کے تھانے بھی لے جایا گیا تھا۔ اس کے بعد تمہارے نئے ایس پی نے تھانے پہنچ کر اپنا رنگ جمانے کی کوشش شروع کی۔“ شیخ حامد نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی اسی شہر میں کاروبار کرتا ہوں آغا صاحب۔ اس لیے کاروباری سینٹروں کے اتار چڑھاؤ کی خبر رکھنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔“

”میں نے ایسی کوئی بات نہیں سنی لیکن اب آپ نے کہا ہے تو اس کی تفتیش بھی ضرور کروں گا۔“

”نہ کرو، جب بھی میرا کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس وقت دو باتیں کہنی تھیں..... شبیہ کے اغوا کو نظر انداز مت کرنا اور..... یہ بھی نہ بھولنا کہ میں کاروباری میدان کے ایک

ایک چپے کی خبر رکھتا ہوں اور تمہارے ان افسروں کی بھی جو میری خاص لسٹ پر موجود ہیں۔“ سلسلہ منقطع کرنے کے بعد وہ اٹھ کر لاؤنج میں ٹھہرنے لگا۔ اس کے ذہن میں بیک وقت کئی مسائل الجھ رہے تھے۔ شبیہ کی بازیابی میں ناکامی، الماس کا دوبارہ ہاتھ میں آکر نکل جانا اور..... لیاقت حسین جس نے دونوں مرتبہ الماس کے اغوا کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ میڈم روبی کے سلسلے میں بھی اس کے آڑے آچکا تھا۔

بے در پے رونما ہونے والے حالات کی روشنی میں اب وہ لیاقت حسین کی دخل اندازی کو محض اتفاق نہیں سمجھ سکتا تھا۔

حسب وعدہ شبیہ کو اگلی صبح ایک موبائل فون فراہم کر دیا گیا تھا۔ اورنگ زیب کی ملاقات کے بعد سے اس کی نگرانی کرنے والے اس کے ساتھ بہت مہذب انداز میں پیش آرہے تھے۔ موبائل مل جانے کے بعد شبیہ نے فوری طور پر میڈم روبی سے بات کرنا چاہی تھی لیکن پھر اس نے اورنگ زیب کی ہدایت پر ایسا نہیں کیا، اس نے واضح طور پر منع کیا تھا کہ میڈم کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہیے کہ شبیہ کہاں اور کون ہاتھوں میں ہے۔ میڈم سے بات ہوتی تو وہ شبیہ کو اس کی گمشدگی کے بارے میں ضرور کریدتی اس لیے بہتر تھا کہ اس سے فی الحال کوئی رابطہ نہ کیا جائے۔ میڈم کے بعد اس کے ذہن میں افضل خان کا تصور ابھرا، اس نے اورنگ زیب کو یہ بات کھل کر نہیں بتائی تھی کہ وہ افضل خان کے ساتھ نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہونے سے پیشتر ہی ایک مشترکہ لائحہ عمل طے کر چکی تھی۔ اسی خیال کے پیش نظر وہ افضل خان کے بارے میں غور کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ بگ باس کے ذہن میں شبیہ کے اغوا کے بعد کچھ شبہات ضرور ابھرے ہوں گے، شبیہ بگ باس کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو رہی تھی اس لیے وہ اسے یکسر نظر انداز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس ضمن میں اس نے افضل خان سے بھی باز پرس ضرور کی ہوگی، ہو سکتا ہے اسے کوئی سزا بھی دی ہو۔ اغوا کے امکانات کے کچھ خدشات کے پیش نظر ممکن ہے افضل خان کو تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا ہو۔ خاصی دیر تک وہ مختلف زاویوں سے سوچتی رہی پھر اس نے ڈرتے ڈرتے افضل خان کے نمبر پینج کیے۔ دوسری جانب سے چوتھی گھنٹی کے بعد کال ریسیو کی گئی۔ آواز افضل خان ہی کی تھی۔

”میں شبیہ بول رہی ہوں۔ تم خیریت سے تو ہو؟“

”تم خود کہاں ہو؟“ افضل خان نے شبیہ کی آواز سن کر بے چینی کا اظہار کیا۔ ”تمہیں اغوا کرنے والے کون تھے؟ کہاں رکھا گیا ہے تمہیں؟“

”مجھے ابھی تک اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا۔“ شبیہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ”انہوں نے اپنی زبان پر تالے ڈال رکھے ہیں۔ فی الحال میرے ساتھ کوئی سختی بھی نہیں ہوئی۔“

”تمہارا موبائل نمبر کس طرح بدل گیا؟“ افضل خان نے ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے معلوم کیا۔

”وہ..... اغوا کرنے والوں نے میری سم نکال لی ہے۔“ شبیہ نے بات بتانے کی کوشش کی۔ ”میری درخواست پر نئے نمبر کی سم دی گئی ہے۔“

”اس وقت تمہارے پاس اور کون ہے؟“ افضل خان کا لہجہ محتاط ہو گیا۔

”کوئی بھی نہیں..... میں صرف تمہاری خیریت معلوم کرنا چاہتی ہوں۔“ شبیہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن دوسری جانب سے سلسلہ فوراً ہی منقطع کر دیا گیا۔ اس نے فوری طور پر دوبارہ نمبر ملانے کی غلطی نہیں کی۔ اس نے سوچا، ممکن ہے کچھ لوگ افضل خان کی نگرانی کر رہے ہوں جن کے خوف سے لائن کاٹ دی گئی ہو۔ اس شبہ کے ساتھ ہی اسے اپنی جلد بازی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ بگ باس افضل خان سے خوش نہیں تھا، اس کے اغوا کے بعد بگ باس کے کچھ کارندے افضل خان کی نگرانی پر ضرور تعینات ہوں گے۔ وہ ان ہی باتوں پر غور کر رہی تھی جب اس کا موبائل واہیریت کرنے لگا۔ اسکرین پر نیا نمبر دیکھ کر اس نے کال ریسیو نہ کرنے کا ارادہ کیا پھر یہ سوچ کر کہ شاید اورنگ زیب نے اسے کال کیا ہو اس نے کچھ تذبذب کے بعد موبائل آن کر لیا۔ مختصر اُ کہا۔

”ہیلو.....“

”تم اس وقت خیریت سے تو ہو؟“ اجنبی لہجے نے سوال کیا۔

”تم کون ہو.....؟“ اس نے محتاط لہجے میں دریافت کیا۔

”دوست ہی سمجھو.....“ سپاٹ آواز میں جواب ملا۔ ”تمہیں کہاں رکھا گیا ہے؟ صرف اتنا بتا دو ہم تمہیں ہر قیمت پر باز یاب کر لیں گے۔“

شبیہ نے لائن کاٹ دی، اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، اس کا شبہ درست ثابت ہوا۔ جو لوگ افضل خان کی خفیہ نگرانی پر تعینات تھے انہیں شاید افضل خان کے موبائل

”میں شبیہ بول رہی ہوں۔ تم خیریت سے تو ہو؟“

سے وہ آخری نمبر بھی ضرور مل گیا ہوگا جس پر بات کی گئی تھی اور اب وہ اس سے پتا دریافت کر رہے تھے، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی غلطی کا ازالہ کس طرح کرے۔ موبائل پر دوبارہ واٹس ایپشن ہوئی تو اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔ وہی نمبر دوبارہ روشن اسکرین پر چمک رہا تھا۔ اس نے ہمت کر کے موبائل آن کر لیا۔

”کون پریشان کر رہا ہے؟“ اس بار اس نے جھلا کر اپنے غصے کا اظہار کیا۔

”اب لائن ڈسکنکٹ نہ کرنا ورنہ افضل خان کی زندگی کی ضمانت بھی ختم ہو جائے گی۔“ دوسری جانب سے تنبیہی لہجے میں وارننگ دی گئی۔ ”سیدھی طرح بتا دو کہ تم کہاں ہو.....“

”کوئی جواب نہ دینا م..... میری.....“ دوسری جانب سے افضل خان کی مدہم آواز ابھری پھر شاید جو لوگ قریب کھڑے تھے انہوں نے اسے قابو کر لیا تھا، مدہم مدہم آوازیں بھی ابھریں پھر دوبارہ سخت لہجے میں کہا گیا۔ ”ہم تم تک نہیں گئے پھر تم افضل خان کے حلق سے نکلنے والی موت کی آخری کراہ بھی سن لو گی۔“

شبیم نے جواب دینے کے بجائے لائن منقطع کرنے کے ساتھ ہی موبائل بھی آف کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے پر جا کر تین بار جلدی جلدی دستک دی تو پہرا دینے والا سامنے آ گیا۔

”کیا کام ہے میڈم.....؟“ اس نے شبیم کی بوکھلاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”مجھے فوری طور پر اورنگ زیب صاحب کو ایک اہم پیغام دینا ہے۔ ان کا موبائل نمبر کیا ہے؟“ شبیم نے بڑی عجلت میں کہا۔ جواب میں دروازہ کھولنے والے نے اسے نمبر بتانے کے بجائے جیب سے اپنا موبائل نکال کر ایک دو بٹن دبا کر اسے شبیم کی طرف بڑھا دیا۔

”کیا بات ہے؟ اس وقت کیسے فون کیا؟“ دوسری جانب سے اورنگ زیب کی مانوس آواز ابھری۔

”میں شبیم بول رہی ہوں۔“ شبیم نے تیزی سے کہا پھر ایک ہی سانس میں سب کچھ کہتی چلی گئی۔

”پریشان مت ہو..... لیکن اب دوبارہ سوچ سمجھ کر ہی کسی واقف کار کو فون کرنا۔“

”وہ..... وہ افضل خان کو.....“

”کچھ نہیں ہوگا.....“ اس کی بات کاٹ کر کہا گیا۔ ”وہ میرے ہی آدمی تھے۔“

”اوہ.....“ شبیم نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔

دوسری جانب سے رابطہ ختم ہو گیا تھا اس لیے اس نے موبائل واپس کیا پھر کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اگر ایس پی اورنگ زیب نے افضل خان کی نگرانی کا خیال نہ رکھا ہوتا تو شاید وہ ایک ہم خیال ساتھی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتی۔

”کس کی کال تھی؟“ سراج نے اورنگ زیب کے چہرے کے تاثرات کو بدلتے دیکھ کر سوال کیا۔

”ایک سادہ لباس والے کا فون تھا۔“ اورنگ زیب نے کہا پھر کسی اور کا نمبر شیخ کرنے لگا۔ دوسری جانب سے رابطہ ہونے پر اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے وہی پینتھر سے بات کرنی ہے۔“

”بول رہا ہوں۔“ کچھ توقف سے جواب ملا۔

”تین آدمیوں کے بارے میں تم نے اب تک کچھ نہ کچھ تو معلوم کر لیا ہوگا؟“

”معاف کیجیے گا صاحب، میں آپ کی آواز نہیں پہچان سکا تھا لیکن آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“ دوسری جانب سے کہا گیا۔ ”تینوں میں صرف ایک میرا پرانا واقف کار تھا۔ اس کا نام راجو ہے، اسی کی وجہ سے میں شیخ گیا لیکن اب وہ میری تلاش میں ہیں۔ اس نے مجھے اپنے ساتھیوں سے بھی دور رہنے کا اشارہ دیا ہے۔“

”تمہیں یہ بات کس نے بتائی.....؟“

”خود راجو نے کہا ہے صاحب۔ وہ بھی اب فرعون سے خوش نہیں ہے۔ آپ کے لیے ایک اہم اطلاع اور بھی ہے۔ کیا آپ لیاقت حسین نامی کسی بندے سے واقف ہیں؟“

”اطلاع کیا ہے.....؟“ اورنگ زیب نے کسمسا کر سوال کیا۔

”راجو کی اطلاع کے مطابق فرعون نے اس بندے کے لیے ”شوٹ ایٹ ساٹ“ کا حکم جاری کیا ہے۔“

”ایک کام کر سکتے ہو؟“

”آپ صرف حکم دیں صاحب۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔“

”راجو اور اس کے دونوں ساتھیوں کا گھٹ پیک بنا کر فرعون کے گھر کے قریب کہیں ڈال دو۔“ اورنگ زیب نے تحارت سے کہا۔

”کل تک کام ہو جائے گا صاحب..... ایک اجازت میں بھی چاہوں گا۔ کیا کسی فوری ضرورت پر میں آپ کے نمبر

پر کال کر سکتا ہوں؟“

”اوہ..... لیکن صرف ایمر جنسی کے موقعوں پر.....“ اورنگ زیب نے رابطہ منقطع کر دیا پھر اس نے سراج کو وہی پینتھر کی تفصیل بتائی تو سراج نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”ہمیں ہر قیمت پر لیاقت حسین کو پروٹیکشن دینا ہوگی۔ ایک صورت تو یہ ممکن ہے کہ اسے فوری طور پر خفیہ طریقے سے فرحین کے پاس بھیج دیا جائے۔“

”ایک صورت اور بھی ہے.....“ اورنگ زیب معنی خیز انداز میں بولا۔ ”ہم آکٹوپس سے لیاقت حسین کے معاملے میں بارکیننگ بھی کر سکتے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں.....؟“ سراج نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”تمہاری وقتی بیماری کی وجہ سے میں نے تمہیں کچھ باتیں نہیں بتائی تھیں۔“ اورنگ زیب نے اسے مختصر کنول اور شبیم کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ”کنول اس وقت آکٹوپس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ سودا کرنے پر مجبور ہو ہی جائے گا۔“

”مگر آپ کے لیے خطرات بڑھ جائیں گے۔“

”خطرات سے کھیلتا ہمارے فرائض منصبی میں بھی شامل ہے۔“ اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”آکٹوپس کو نیچا دکھانے کی خاطر میں اسے اس قدر بے بس اور لاچار کر دوں گا کہ وہ خود اپنے آپ کو گولی مارنے پر مجبور ہو جائے گا۔“

”شبیم کے سلسلے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟“ سراج نے کسمسا کر سوال کیا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ بھی ہمارے کام آ سکتی ہے۔“

”ہاں..... یہی بات تمہاری میڈم روبی نے بھی بڑے یقین سے کہی تھی۔ میں نے شبیم کو آزمانے کی خاطر اسے آزاد کرنے کی پیشکش بھی کی تھی لیکن وہ ہماری ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہے۔“

”کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم لیاقت حسین کو صرف گھر کی چار دیواری تک محدود کر دیں۔“ سراج نے پھر لیاقت حسین کا ذکر چھیڑا تو اورنگ زیب نے پہلو بدل کر بے حد سنجیدگی سے کہا۔

اختیار کرنے سے رسک کم ہو جائے گا۔“

الماس کے آجانے سے اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جوس کی ٹریے لے آئی تھی۔

”کیا گفتگو ہو رہی تھی جو میرے آتے ہی آپ دونوں گم مگم ہو گئے؟“ الماس نے اورنگ زیب سے دریافت کیا۔ ”میں سراج سے کہہ رہا تھا کہ خدا نخواستہ اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو ہمیں اتنی خدمت کرنے والی بھابی شاید دوبارہ نہ ملتی۔“

”پھر.....“ الماس نے سراج کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ نے کیا جواب دیا؟“

”سراج کچھ نہ کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن آپ آ گئیں اس لیے ان کے دل کا حال معلوم نہیں ہو سکا۔“ اورنگ زیب نے جوس کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

”افسر چاہے بھائی ہی ہو لیکن افسری ہوتا ہے۔“ سراج نے شرارتا کہا۔ ”مجھے بھی افسر کا کہنا تو بہر حال ماننا پڑا۔“

کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں پھر اورنگ زیب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”مجھے اس وقت آکٹوپس کے خلاف ایک محاذ کو مضبوط کرنے کی خاطر اس وقت کسی سے ملنا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ میں بھی کل ڈیوٹی جوائن کر لوں۔“ سراج نے کہا۔ ”بستر پر پڑے پڑے تو ہاتھ پیر بھی نہیں کھلیں گے۔“

”تم الماس سے مشورہ کر لو۔ جیسا یہ مشورہ دیں ویسا ہی کرو۔“ اورنگ زیب نے اس بار دوستانہ انداز میں کہا پھر بڑی محبت سے الماس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

سراج نے الماس کو لیاقت حسین کو درپیش خطرے کے بارے میں بتایا پھر وہ سنجیدگی سے اس کے بارے میں حفاظتی تدابیر پر غور کرنے لگا۔

لیاقت حسین اس وقت کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کے بعد اٹھا تھا، وہ اندر سراج کے پاس جانے کو سوچ رہا تھا جب اس کے موبائل پر کھنٹی بجی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی تو فرحین کا نمبر دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ گاؤں جانے کے بعد سے وہ اس کی پہلی کال تھی۔ لیاقت حسین نے کئی بار اسے فون کرنے کا سوچا تھا لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا تھا، فرحین اپنی عزیزہ کی موت کی خبر سن کر گئی تھی، اس موقع پر لیاقت حسین نے اسے خود سے کال کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

چنانچہ اس وقت جب فرحین نے اس سے رابطہ کیا تو وہ خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔

”فرحین..... جان جگر!“ اس نے موبائل آن کر کے بڑے پیار سے کہا۔ ”سب خیریت تو ہے؟“

”اندر گھر میں اس وقت بھی پرسادینے والی عورتیں بیٹھی ہیں۔ میں تجھ سے بات کرنے کی خاطر موقع نکال کر باہر کنویں کے قریب آگئی ہوں۔“ فرحین نے اسے اپنی مجبوری سے آگاہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارے سراج صاحب کیسے ہیں؟“

”اب خطرے کی کوئی بات نہیں، ہو سکتا ہے کہ ایک دو دن میں ڈیوٹی بھی جوائن کر لیں۔ تو سنا، وہاں میرے بارے میں کسی نے پوچھا تو نہیں؟“

”کیسی باتیں کر رہا ہے..... سب ہی بار بار تجھے یاد کرتے ہیں۔ اماں بھی روز تیری خیریت معلوم کرتی رہتی ہے..... البتہ بابا.....“

”کیا ہوا بابا کو.....؟“ لیاقت حسین باپ کے حوالے پر تڑپ اٹھا۔ ”اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”بھلا چنگا ہے لیکن کچھ پریشان پریشان رہتا ہے۔“ فرحین نے جواب دیا۔ ”میں نے اماں کو کئی بار ٹھونکنے کی کوشش کی مگر اس نے بات ٹال دی، کل رات تیری شاہ پری سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اب تو بڑی گوری چٹی ہو گئی ہے۔ شادی کے بعد بڑا رنگ روپ نکال رہی ہے۔“

”تو ابھی بابا کی بات کر رہی تھی پھر یہ شاہ پری درمیان میں کہاں سے آگئی؟“ لیاقت حسین نے جھلا کر پوچھا۔ اسے شاہ پری سے کوئی بیر نہیں تھا لیکن اسی کی وجہ سے باپ کی حویلی چھوڑنی پڑی تھی اس لیے وہ اس کا ذکر سننا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

”شاہ پری کے نام پر مرچیں کیوں چبانے لگا؟“ فرحین نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”اب تو خیر سے وہ کچھ دنوں میں ماں بھی بننے والی ہے اور اسی نے تو مجھے تیرے بابا کی پریشانی کی وجہ بھی بتائی ہے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ اس کا نام کسی کو نہ معلوم ہو۔“

”کیا پریشانی ہے بابا کو.....؟“ لیاقت حسین نے تڑپ کر دریافت کیا۔

”شاہ پری بتا رہی تھی کہ شہر میں کسی بڑی کاروباری پارٹی سے پانچ چھ لاکھ کی رقم کے سلسلے میں کچھ بات خراب ہو گئی ہے۔“ فرحین نے بات جاری رکھی۔ ”تیرے بابا کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟ تو چپ کیوں ہوئی.....؟“ لیاقت حسین نے فرحین کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

پانچ چھ لاکھ روپے کی خاطر کاروباری تعلقات متاثر ہونے کی بات بروہ خود بھی چونکا تھا۔ اس کے ذہن میں سیٹھ عثمان کی وہ گفتگو گونجنے لگی جو اس نے اتفاقاً سن لی تھی، ماربل کے آئٹم کی سپلائی کے سلسلے میں وہ بات ابھی تک اس کے دماغ میں محفوظ تھی۔ اس نے سراج سے بھی اس سلسلے میں مدد چاہی تھی لیکن بات مکمل نہیں ہو سکی تھی، اس وقت فرحین نے وہی ذکر چھیڑا تو اس کا بے چین ہو جانا قدرتی بات تھی۔

”مجھ سے ایک وعدہ کر لیاقت..... تو جذباتی نہیں ہوگا۔“ فرحین کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں غلط سوچ رہی ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ شاہ پری کو یہ بات بھی کسی طرح معلوم ہو گئی ہے کہ تو کہاں کام کر رہا ہے۔ شاید اسی لیے اس نے وہ بات میرے کان میں ڈالی ہے۔ خاص طور پر یہ بھی کہا تھا کہ میں اس سلسلے میں کسی کے سامنے بھی سوچ سمجھ کر زبان کھولوں ورنہ بابا کی رازداری کا بھرم بھی ٹوٹ سکتا ہے۔“ فرحین نے دبی زبان میں بات جاری رکھی۔ ”میرا خیال ہے کہ تو معاملے کی تہ تک پہنچ گیا ہوگا۔ پر ایک بات کا دھیان رکھنا، اگر میرا نام بیچ میں آ گیا تو اماں بھی مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔ شاہ پری بھی شکوہ کرے گی، اس کی بات سے اندازہ ہو رہا ہے کہ شاید کاروبار والی بات بابا اور ہمارے صاحب کے بیچ ہوئی ہوگی۔“

”میں سمجھ رہا ہوں، تو فکر نہ کر۔“ لیاقت حسین نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں کل کسی وقت تجھ سے بات کروں گا۔“

”اپنی بات نہیں کرے گا۔“ فرحین نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔ ”میرے بغیر تیرا گزارا کیسے ہو رہا ہے؟“

”حساب کتاب جمع کر رہا ہوں میری دلبر۔“ لیاقت حسین نے سرد آہ بھری۔ ”تو آئے گی تو سارا جمع خرچ برابر کر دوں گا۔“

”بیگم صاحب اور صاحب کیسے ہیں۔ ان سے میرا سلام کہنا۔“

”میں ابھی تک سراج صاحب کی طرف ہوں۔ ادھر گیا تو تیرا سلام بھی پہنچا دوں گا۔“

دوسری طرف کوئی آگیا تھا اس لیے فرحین نے کل بات کا یاد دل کر رابطہ منقطع کر دیا۔ لیاقت حسین کے ذہن میں پانچ لاکھ کی رقم اور سیٹھ عثمان کی فون والی گفتگو گونجنے لگی۔ اسے اس بات پر بھی تعجب تھا کہ شاہ پری کو اس بات کا علم کس

طرح ہوا کہ شہر میں وہ کس کے پاس ملازم ہے؟ اس سلسلے میں اس کا شبہ گل خان کی گھر والی زرینہ کی طرف گیا جو کسی زمانے میں شاہ پری کے ساتھ ایک ہی مدرسے میں دینی تعلیم حاصل کرنے جاتی تھی۔ بہر حال، وہ کتنی حل ہو گئی تھی جو لیاقت کے ذہن میں ابھی جارہی تھی۔

وہ سرحدی علاقے کا کوئی سنسان و ویران پہاڑی سلسلہ تھا جہاں فلک بوس پہاڑیاں نہ جانے کب سے سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ اس وقت سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، اس کی تپش سے پہاڑوں پر کہیں کہیں جی برف پگھل رہی تھی۔ دور دور تک کسی انسان کا سایہ تک نظر نہیں آرہا تھا جب سنگلاخ پہاڑ کے عمودی شکل کے تنگ غار سے ایک ہیولا نکل کر سامنے آگیا۔ پہلی نظر میں وہ کوئی غلیظ اور جنگلی چوپایا ہی محسوس ہوا تھا لیکن غار سے کچھ دور آنے کے بعد جب وہ پیروں پر کھڑا ہوا تو اس کی شکل واضح ہو گئی۔

وہ ایک درمیانہ قد کا دبلا پتلا انسان تھا، جس کے جسم پر اس وقت میلی پچی لنگوٹی کے سوا کوئی لباس نہیں تھا، اس کے سر کے لمبے بال میل میں چکٹے ہوئے دونوں شانوں پر بکھرے نظر آرہے تھے۔ ڈاڑھی جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھی ہوئی تھی۔ گرد کی تہوں نے اس کی جلد کی اصلی رنگت بھی چھپا رکھی تھی لیکن اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں جن سے وہ قرب و جوار کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ اس کی ظاہری حالت دیکھنے کے بعد ایسا ہی لگتا تھا جیسے وہ ایک طویل عرصہ کے بعد کھلے آسمان کے نیچے غار سے نکل آیا ہو۔ چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد اس نے سر اٹھا کر آسمان کی سمت دیکھا، اس کی خون آلود نظریں پوری طرح کھلی تھیں۔ وہ تپتے سورج کو خاصی دیر گنگنی باندھے دیکھتا رہا پھر اس نے وحشیانہ آواز میں پوری قوت سے ”الکھ نرنجن“ کا نعرہ بلند کیا پھر ”جے بھیروی“ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے، آنکھیں بند کر لیں۔ مدھم آواز میں کچھ بدبانے لگا۔

اس کی جلد کی رنگت میل پچیل کے نیچے چھپ کر رہ گئی تھی لیکن اس وقت وہ خود کو بے حد تروتازہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تادیر وہ اسی انداز میں بدبانتا رہا پھر اس نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں، اس کی آنکھوں میں اب سرخی کے علاوہ ایسی چمک بھی نظر آرہی تھی جیسے اس نے کڑی آزمائشوں سے گزر کر کوئی بڑی کامیابی حاصل کر لی ہو۔ وہ ان چاروں طرف پھیلی سر بلند پہاڑیوں کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس کی نظروں میں بڑی حقیر ہوں۔ اس کے

ساکت ہونٹوں پر بھی اب بڑی پراسرار اور خوفناک مسکراہٹ ابھر رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر تپتے سورج کی سمت دیکھ کر ”الکھ نرنجن“ اور ”جے بھیروی“ کے نعرے بلند کیے پھر وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا انہی پہاڑی راستوں پر چلنے لگا جہاں غار سے باہر نکلا تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ راستے اس کے دیکھے بھالے ہوں۔

وہ بڑے انہماک سے بلندیوں کی طرف جا رہا تھا جب سیاہ بادلوں کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا۔ پھر موٹی موٹی بوندیں برستا شروع ہو گئیں۔ ان بوندوں نے اس کے میل کو اتار دیا شروع کیا تو اس کی حالت عجیب ہو گئی۔ جسم پر سیاہی کے درمیان کہیں کہیں سفیدی جھلکنے لگی۔ وہ ان باتوں سے بے پروا قدم اٹھاتا رہا۔ بارش کے موٹے موٹے قطرے اس کے جسم کی غلاطت کو دھو رہے، اس کے بدن پر جا بجا میل چھٹ جانے کے سبب جلد کی اصل رنگت ابھر رہی۔ وہ اپنی دھن میں مست قدم اٹھاتا ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں دو سنگلاخ چٹانوں کے بیچ ایک دراڑ نظر آرہی تھی۔ اس نے نظریں گھما کر ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا پھر آڑا ہو کر اس دراڑ میں پھنستا پھنستا دوسری طرف نکل گیا جہاں کچھ خود در پہاڑی درخت بھی نظر آرہے تھے۔ وہ ایک ایسے ہی درخت کے نیچے کچھ دیر سستانے کے خیال سے چاروں خانے چت لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں موند لیں لیکن چہرے پر ٹھکن کے کوئی تاثرات نہیں تھے۔

بارش کچھ دیر برس چکی تو سیاہ بادلوں کا ٹکڑا انضا میں تحلیل ہو گیا۔ سورج کی تپش پتھروں کو دوبارہ گرمانے لگی لیکن وہ بہ دستور آنکھیں بند کیے دنیا و مافیہا سے بے خبر نظر آرہا تھا۔ تب ہی ایک نسوانی آواز اس کے کانوں میں مندر کی گھنٹیوں کی طرح جھنجھکتائی ہوئی ابھری..... ”مہاراج کب تک سوئے رہو گے.....؟“

چٹان پر لیٹے ہوئے شخص نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے قریب ہی ایک سدری بیٹھی اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی، اس نے جو ساری باندھ رکھی تھی وہ بھیگ کر اس کے جسم کے نشیب و فراز سے لپٹ گئی تھی، باریک کپڑے سے اس کا کندن جسم آنکھ بھولی کر رہا تھا، اس کے سینے پر ایک تنگ انگلی تھی۔ ننگے بازو اور عریاں شکم نے اس کی جوانی کو اور بھرپور بنا دیا تھا۔ آنکھوں میں کا جل کی ڈوری سجائے وہ چٹان پر دراز شخص کو بڑے پریم اور خمار آلود نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سراپا حسن و جمال تھی، ایسی جوالا کھی جو کھیت کھلیان بنانے اور آبادی کو ویران بنانے کی قوت رکھتی تھی۔

اس وقت اس بے ہنگم لنگوٹی باندھے شخص کو بڑی عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی رس چمکاتی نظروں میں پیاری پیاری بھرا تھا۔ اس کی گنگنائی آوازیں کرچٹان پر لیٹے ہوئے شخص نے آنکھیں کھول دیں۔

”تو..... کون ہے تو.....؟“ اس نے حقارت سے خوب رو اور نیم عریاں لڑکی کو سر سے پاؤں تک گھورا۔

”میں تمہاری داسی، تمہاری کیول، تمہاری پجارن ہوں مہاراج۔“ وہ ہاتھ باندھ کر بولی۔ ”دیوی کی آگیا یہی ہے کہ میں تمہارے چرنوں میں رہوں۔ تمہاری سیوا کروں، تم کو جیون میں بھی نراش نہ کروں..... تمہارا من بہلاؤں۔“

”کس دیوی کی بات کر رہی ہے.....؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، اس کے تیور اب بھی بدلے ہوئے تھے۔

”مہاراج.....“ پجارن نے ہاتھ باندھ کر معصومیت سے سوال کیا۔ ”کیا تمہارا شہ نام پر تاب بھوش نہیں ہے؟“

”تیرا کیا نام ہے؟“

”داسی کو مدھو کہتے ہیں۔“ وہ لجا کر بولی تو اور سندر لگنے لگی۔

”کس دیوی نے تجھے..... مجھے دان کیا ہے؟“

پر تاب نے مدھو کو بڑے دھیان سے دیکھا۔

”کالی دیوی نے مہاراج.....“

”مدھو کے مطلب جانتی ہے؟“ کالی کا سن کر پر تاب نے مدھو کے چمکتے جسم کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔

”جانتی ہوں مہاراج.....“ مدھو کا روپ اس جواب کے ساتھ ہی اور نکھرا تھا۔ وہ کھسک کر پر تاب کے اور قریب آگئی۔

”میرے بارے میں کیا بتایا ہے مہان دیوی نے.....؟“

”تم نے دیوی کے کارن جو جاپ کیا تھا اس میں تم پھیل ہو گئے ہو۔ تمہاری شگتی اب اپدم پار ہو گئی ہے۔“

پر تاب نے اپنے میلے چیلے ہاتھ بڑھا کر مدھو کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اس کے بالوں کو چومتے ہوئے بولا۔

”جانتی ہے میں نے یہ جاپ کس کارن کیا تھا؟“

اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”تو..... تو چپ کیوں ہو گئی؟“ کہتے کہتے رک گئی؟“

”م..... میں نہیں مہاراج۔“ وہ تلملا کر معصومیت سے بولی۔ ”دیوی نے کہا تھا کہ وہ سلا بھی کسی شگتی کے بل پر تمہارے آڑے آگیا تھا۔“

”اب اس کی شگتی اس کے کسی کام نہیں آئے گی۔“ پر تاب سینہ ٹھونک کر بولا۔ ”مجھ سے نظریں چار کرے گا تو اس کی میاں مر جائے گی۔ جلا کر جسم کر دوں گا اس بچ ذات کو..... دیوی کی دان کی ہوئی شگتی بھی میری سہائتا کرے گی۔“

”بھوش میں کیا لکھا ہے؟ میں نہیں جانتی مہاراج پر تو اتنا اوش سمجھتی ہوں کہ جسے دیوی کا آشیر باد پراپت ہو جائے وہ امر ہو جاتا ہے۔“ مدھو نے بڑی لگاؤ سے کہا۔ پھر دوبارہ پر تاب کی چماتی پر سر رکھ کر کسمسا نے لگی۔ اس کی خود سپردگی کا انداز بھی بڑا جنونی تھا۔ شاید دیوی کی آگیا کا پالن کرنے کی خاطر وہ مست ہو رہی تھی ورنہ بھول کر بھی اس گند سے لٹھڑے پر تاب کے قریب جانا بھی گوارا نہ کرتی۔

”کیا تو دیکھ سکتی ہے کہ اس سے وہ سلا کہاں ہے؟“

پر تاب نے مدھو کے کول گالوں کو چومتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں مہاراج..... میں کیول ایک پجارن ہوں۔“ مدھو نے مدھ برسائی نظروں سے پر تاب کو دیکھا۔

”تم مجھے اپنے چرنوں میں سوئکار کر لو۔ یہ بھی میرے لیے بڑے مان کی بات ہوگی..... دیوی کی بھی یہی آگیا ہے۔“

”تو کیا اس مسئلے کو اپنی سندر تا کے جال میں پھانسنے کی خاطر کوئی روپ بھی نہیں بدل سکتی؟“ پر تاب نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”روپ اوش بدل سکتی ہوں مہاراج۔ اپنے تن کی آگنی سے پکھلا بھی سکتی ہوں لیکن کوئی سراپ (سزا) نہیں دے سکتی۔“

”میرے لیے یہی کافی ہے۔“ پر تاب کے غلیظ ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی، خلاؤں میں جھانکتا ہوا بولا۔

”میں نے یہی کہا تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کے پاؤں اوش رپٹ جائیں گے پھر جو شگتی اس کی پچھاڑی پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے وہ بھی روٹھ جائے گی۔ اس دن دجے (جیت) میری ہوگی۔“

”مہاراج.....“ مدھو نے پر تاب کے گلے میں بائیں ڈال کر مچلتے ہوئے کہا۔ ”تم جاپ کے منتر پڑھتے پڑھتے تھک گئے ہو گے مہاراج.....“

”سچہ دیر ستا لو، میں اپنے

شریر کی گرمی سے تمہیں تھک تھک کر سلا دوں گی۔ آنکھیں موند کر مدھو کی چماتی پر سر رکھ کر کچھ دیر آرام کر لو۔ مجھے بھی اپنی سیوا کا موقع دو مہاراج..... تمہاری سیوا کرنے سے میری بھگتی بھی ہو جائے گی۔“

مدھو کی گرم گرم سانسیں، اس کے کول شریر کی چھیڑ چھاڑ پر تاب کو لہجہ رہی تھی۔ گرماری تھی..... وہ کچھ دیر اس کے ساتھ دھینکا مشتی کرتا رہا پھر تھک ہار کر دیکتے الاڈ میں گم ہوتا چلا گیا۔

سیٹھ رستم علی اس وقت بہت خوش تھا۔ دو منٹ پیشتر اسے جس نئے ٹینڈر کی منظوری کی اطلاع ملی تھی وہ اس کی توقع کے خلاف ہی تھی، اسے اس بات کی حیرت بھی تھی کہ وہ ٹینڈر حامد ایسوسی ایشن کے بجائے اس کی فرم کو کس طرح مل گیا جبکہ شیخ حامد نے اس کے مقابلے پر کم بولی لگائی تھی۔

ٹینڈر کی منظوری کے سلسلے میں دو فریقین کے درمیان دو پیسے کا فرق بھی مجموعی طور پر لاکھوں میں ہوتا ہے۔ یہ بات ٹینڈر پاس کرنے والی اتھارٹی کو بھی معلوم تھی کہ شیخ حامد نے پانچ سے کم کا ٹینڈر بھرا تھا اس لیے اصولی طور پر ٹینڈر اسی کے نام کھانا چاہیے تھا۔ وہ دوسری بار اس منظوری کے حکم نامے کو پڑھ رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔ رستم علی نے ریسپونڈ اٹھا کر کان سے لگایا۔

”مجھے یقین ہے کہ اس وقت تم ٹینڈر اپنے نام منظور ہونے کی خوشی میں مگن ہو گے؟“

”کون بول رہا ہے.....؟“ رستم علی نے چونکتے ہوئے سوال کیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے.....؟“ اس کے سوال کو نظر انداز کر کے کہا گیا۔ ”کیا تم اس کام کو مکمل کر سکو گے؟“

”نہ کر سکا تو ضمانت کی جمع شدہ رقم بھی ڈوب جائے گی۔“ رستم علی نے کسمسا کر کہا۔ ”یہ بات تمام کاروباری پارٹیوں کے علم میں ہے۔“

”آدھا کام مکمل ہونے کے بعد اگر کوئی حادثہ قدرتی طور پر رونما ہو جائے تو منافع کے بجائے تمہیں خسارہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں بھی ابھی سے غور کر لینا۔“

”میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو اور فون کرنے کا کیا مقصد ہے لیکن اگر تم اندر کے کوئی آدمی ہو تو یہ بات تمہیں بھی معلوم ہوگی کہ ٹینڈر میں جو رقم میں نے بھری تھی وہ کسی دوسری پارٹی سے پانچ پیسے زیادہ تھی۔“ رستم علی نے وضاحت کر کے اپنی پوزیشن صاف کرنی چاہی۔

”ہم اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتے ہیں سیٹھ۔“ اس بار بھی خشک اور سرد لہجے میں جواب ملا۔ ”ٹینڈر پاس کرنا متعلقہ محکمے کے اختیار کی بات ہے جسے کوئی چیلنج نہیں کر سکتا..... عام طور سے اس رعایت کا اختیار استعمال نہیں کیا جاتا مگر..... متعلقہ افسر کی جیب خاص میں کوئی وزنی لفافہ پھینچ جائے تو پھر.....“

”فضول بات مت کرو۔“ رستم علی جھلا گیا۔ ”ہمارا تعلق جس کیونٹی سے ہے وہ رشوت کا کاروبار بھی نہیں کرتی۔“

”وقت کے ساتھ ساتھ ہوا بھی رخ بدل دیتی ہے۔“ کسی بڑی رقم کی خاطر تو انسان.....“

”مطلب کی بات کرو.....“ رستم علی تلملا کر بولا۔

”میں نہیں سمجھ سکا کہ تم کیا چاہتے ہو اور کون ہو.....؟“ دوسری ”تمہیں دو بائیں یاد دلانا چاہتا ہوں.....“ دوسری جانب سے بولنے والا بھڑک اٹھا۔ ”پچھلی بار میں نے تمہارے جوان بیٹے اور خوب صورت بھوکا حوالہ دیا تھا تو تم نے کہا تھا کہ جب انسان مرنے اور مارنے کی ٹھان لے تو وہ اپنے ساتھ دوسرے کو بھی ختم کر دینے سے دریغ نہیں کرتا۔“

”تم شاید نشے میں ہو.....؟“ رستم علی تلملا اٹھا۔ ”تم نے غالباً نشے میں دھت ہو کر کچھ فرضی بائیں سوچ لی ہیں۔ جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ میں نے دارا اور روشا کو کبھی درمیان میں لانے کی غلطی نہیں کی۔“

دوسری طرف سے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا گیا، رستم علی فون رکھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دوسری طرف سے معنی خیز لہجے میں کہا گیا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس روز تمہارے کمرے سے تمہارے بیٹے نے کال ریسپونڈ ہوگی۔ اتفاق ہے کہ میں اس وقت دونوں آوازوں کے فرق کو نہیں محسوس کر سکا تھا۔ تم نے اپنی پوزیشن واضح کر دی سیٹھ۔ اب تمہارے جوان بیٹے ہی کو آخری فیصلہ کرنا پڑے گا..... بائی.....“

رستم علی جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ سلسلہ منقطع کر دیا گیا جس کے بعد رستم کا سکون بھی ٹینڈر ملنے کی خوشی کے ساتھ ہی ضائع ہو گیا۔ بات کی تہ تک پہنچنے کے بعد اس نے جھپٹ کر انٹر کام اٹھالیا اور دارا کے نمبر پر انگلی جمادی۔

”بیس ڈیڈ.....“ دوسری جانب سے دارا کی آواز ابھری۔

”میرے آفس میں آؤ..... اٹ ازار جنٹ.....“ رستم علی نے اپنی بات مکمل کر کے ریسپونڈ کر دیا۔ اس کے چہرے پر ابھرنے والے تفکرات لمحہ بہ لمحہ گہرے ہمد سے بچنے فون

”میرے آفس میں آؤ..... اٹ ازار جنٹ.....“ رستم

علی نے اپنی بات مکمل کر کے ریسپونڈ کر دیا۔ اس کے چہرے

پر ابھرنے والے تفکرات لمحہ بہ لمحہ گہرے ہمد سے بچنے فون

”میرے آفس میں آؤ..... اٹ ازار جنٹ.....“ رستم

علی نے اپنی بات مکمل کر کے ریسپونڈ کر دیا۔ اس کے چہرے

پر ابھرنے والے تفکرات لمحہ بہ لمحہ گہرے ہمد سے بچنے فون

”میرے آفس میں آؤ..... اٹ ازار جنٹ.....“ رستم

علی نے اپنی بات مکمل کر کے ریسپونڈ کر دیا۔ اس کے چہرے

پر ابھرنے والے تفکرات لمحہ بہ لمحہ گہرے ہمد سے بچنے فون

”میرے آفس میں آؤ..... اٹ ازار جنٹ.....“ رستم

علی نے اپنی بات مکمل کر کے ریسپونڈ کر دیا۔ اس کے چہرے

پر ابھرنے والے تفکرات لمحہ بہ لمحہ گہرے ہمد سے بچنے فون

”میرے آفس میں آؤ..... اٹ ازار جنٹ.....“ رستم

علی نے اپنی بات مکمل کر کے ریسپونڈ کر دیا۔ اس کے چہرے

پر ابھرنے والے تفکرات لمحہ بہ لمحہ گہرے ہمد سے بچنے فون

”میرے آفس میں آؤ..... اٹ ازار جنٹ.....“ رستم

علی نے اپنی بات مکمل کر کے ریسپونڈ کر دیا۔ اس کے چہرے

پر ابھرنے والے تفکرات لمحہ بہ لمحہ گہرے ہمد سے بچنے فون

کرنے والے کے آخری جملوں نے اس کا سکون غارت کر دیا تھا۔ دو منٹ بعد دارا کمرے میں داخل ہوا تو اس نے بھی باپ کی کیفیت کو محسوس کر لیا۔ میز پر اس کے سامنے بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”کیا بات ہے ڈیڈ۔ آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟“

رستم علی نے خود کو سنبھالتے ہوئے بیٹے سے پوچھا۔

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ نئی کالونی کی شاہراہ اور اس کے اندرونی راستوں کی تعمیر کا ٹینڈر ہماری فرم کو مل گیا ہے.....؟“

”اوہ نو.....“ دارا نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”اٹ از اے گریٹ نیوز فارمی۔“

”میں اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اتنے بڑے پروجیکٹ کے لیے ہمیں کچھ نیا اسٹاف بھی.....“

”یو ڈونٹ وری ڈیڈ.....“ دارا نے پر جوش انداز میں کہا۔ ”میں سارا انتظام کر لوں گا۔ جو ورکنگ پیپر تیار کیا گیا تھا اس کی روشنی میں اس پروجیکٹ کی کامیابی تکمیل کے بعد ہمیں کروڑوں کا منافع ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک اہم بات اور بھی ہے۔“ دارا نے پہلو بدل کر قدرے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہمیں یہ ٹینڈر حامد ایسوسی ایٹس کے مقابلے پر ملا ہے۔ اس لیے میں اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کرنے پر بے حد خوش ہوں۔“

”اسی چیلنج کی خوشی میں ایک آخری فیصلہ میں نے بھی کیا ہے۔“ سیڈھ رستم علی نے دارا کو سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم روشنا کو لے کر فوری طور پر لندن چلے جاؤ۔“

”لیکن.....“

”پوری بات سنے بغیر درمیان میں بولنا کاروباری اصول کے خلاف ہے۔“ رستم علی نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ”لندن آفس کے کچھ معاملات الجھ گئے ہیں۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کا وہاں ہونا ضروری ہے۔“

”آئی سی۔“ دارا نے کچھ توقف سے جواب دیا۔

”ایک مشورہ میں بھی دوں گا۔“

”کہو.....“

”آپ کی طبیعت پچھلے دنوں خراب تھی۔ ماں کو بھی اسی کی پریشانی تھی، ایسی صورت میں اگر آپ ماں کو لے کر چلے جائیں تو یہ تبدیلی آپ دونوں کی صحت کے لیے زیادہ مفید ہوگی۔“

”تم میری فکر مت کرو۔ میں اب بالکل نارمل ہوں۔“

”سوری ڈیڈ.....“ دارا نے کسمسا کر قدرے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”کچھ معاملات ایسے ہیں کہ وقتی طور پر میں بھی دو چار مہینے تک باہر نہیں جاسکتا۔“

”کوئی خاص وجہ.....؟“ رستم علی نے بیٹے کو ٹوٹتی نظروں سے دیکھا۔

”کچھ ذاتی معاملات ہیں۔“

”ایسی کیا بات ہے جو تم مجھے نہیں بتا سکتے؟“

”مم..... میں، ان باتوں کو زبان پر نہیں لانا چاہتا۔“

”روشنا کا کوئی معاملہ ہے؟“

”نہیں.....“

”پھر..... اور کیا مجبوری ہے؟“

”سوری ڈیڈ.....“ دارا نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”کچھ ایسی ہی بات ہے کہ میں آپ اور ماں کو چھوڑ کر باہر نہیں جاسکتا۔“

رستم علی نے دارا کا جواب سن کر خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ دیر وہ دارا کے چہرے پر نظر جمائے بیٹھے رہے پھر سنبھل کر سنجیدگی سے کہا۔ ”کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں بھی تمہارے ساتھ ڈسکس نہیں کروں گا لیکن تمہارے نہ جانے کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ میں ٹینڈر کی آفر سے ایک ہفتے کے اندر اندر اس پر عمل کرنے سے معذوری کا اظہار کر دوں جیسا کہ میرے اختیار میں ہے۔“

”لیکن آپ ایسا.....“

”ضروری نہیں کہ میں تمہاری کسی بات کا جواب دوں.....“ رستم علی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

”آئی سی.....“ دارا نے کسمسا کر زبان کھولنے کی کوشش کی۔ ”ڈیڈ۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری آفر کے مقابلے میں حامد ایسوسی ایٹس کی آفر پانچ پیسے کم تھی۔ اصولی طور پر ٹینڈر بھی اسی پارٹی کے حق میں کھلنا چاہیے تھا لیکن..... میں نے ذاتی کوشش کر کے ایسا نہیں ہونے دیا۔ اب اگر ہم پیچھے ہٹے تو دوسری پارٹی اسے ہماری بزدلی ہی کہے گی۔“

بیٹے کا جواب سننے کے بعد رستم علی کے لیے آخری نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں تھا..... کچھ دیر قبل فون کرنے والے کا آخری جملہ رستم علی کے ذہن میں صدائے بازگشت بن کر گونجتا رہا۔ دارا کے جواب نے یہ معما بھی حل کر دیا تھا کہ دو روز قبل اسی نے کال کرنے والے سے بات کی ہوگی۔

”ڈیڈ.....“ دارا نے باپ کے ذہن میں ہونے والی

کھٹکھٹ محسوس کرتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ ”اگر میری کسی بات سے آپ کو دکھ پہنچا ہو تو آئی ایم سوری لیکن میرا خیال ہے کہ ایک شخص کی خاموشی کسی دوسرے شخص کو بہت ساری غلط فہمیوں کا شکار کر دیتی ہے اور.....“

اسی وقت انٹرکام کا بزر بولا تو سیڈھ رستم علی نے ریسیور اٹھا کر بیزاری سے کہا۔

”میں اس وقت مصروف ہوں، مجھے دوبارہ ڈسٹرب.....“

”سر.....“ آفس سیکریٹری نے رستم علی کا جملہ مکمل ہونے سے پیشتر تیزی سے کہا۔ ”ایس پی مسٹر اورنگ زیب میرے آفس میں موجود ہیں۔ وہ آپ سے فوری ملنا چاہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے..... دو منٹ بعد انہیں میرے کمرے میں بھیج دینا.....“ سیڈھ رستم علی نے پر خیال انداز میں کہا پھر دارا کو مخاطب کر کے بولا۔ ”تم اپنے آفس میں جاؤ..... کوئی پولیس ایس پی کسی کام کے سلسلے میں مجھ سے ملنے آیا ہے۔“

دارا نے باپ سے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر اپنا ارادہ ترک کر کے اٹھا اور خاموشی سے چلا گیا۔ دو منٹ بعد ہی ایس پی اورنگ زیب سادہ لباس میں رستم علی کے سامنے موجود تھا۔ رسی جملوں کے بعد اورنگ زیب نے محتاط انداز میں اصل مقصد پر گفتگو شروع کی۔

”میں یہاں ایک خاص مقصد کے لیے آیا ہوں۔ یہ بھی بتا دوں کہ فی الحال یہ دوستانہ اور قطعی نجی ملاقات ہے جو آپ کے تعاون نہ کرنے کے بعد سرکاری صورت بھی اختیار کر سکتی ہے۔“

”آفسیر، میں آپ کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنے پر آمادہ ہوں لیکن قبل از وقت کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔“ رستم علی نے اپنی حیثیت کے مد نظر کھل کر جواب دیا۔ ”اس لیے کہ کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو بہت زیادہ پرسنل ہوتی ہیں۔ شاید آپ بھی اپنی کسی پرسنل بات کو ظاہر کرنا پسند نہیں کریں گے۔“

”میں آپ سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔“ اورنگ زیب نے بہ دستور سنجیدگی سے بات جاری رکھی۔ ”میں جس مقصد کے پیش نظر اس وقت آپ کے پاس آیا ہوں وہ یقیناً آپ کا بالکل پرسنل معاملہ ہے لیکن اس کی نوعیت اس روز سے آڈیشنل صورت اختیار کر چکی ہے جس روز اسپتال سے واپسی کے وقت مجھ کو اور میرے ایک ساتھی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کو..... ایک دھماکے کے ذریعے ہمیشہ کے لیے ختم

کرنے کی کوشش کی تھی۔“

اورنگ زیب کو اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی۔ اسپتال کا نام درمیان میں آنے کے بعد رستم علی کے چہرے پر نظر آنے والا وقتی سکون بھی اندرونی ہلچل بن کر ظاہر ہونا شروع ہو گیا..... اورنگ زیب نے لوہا گرم دیکھ کر دوسری ضرب لگائی۔ ”مسٹر رستم علی۔ آپ اسپتال کے ٹرسٹی بھی ہیں۔ بڑے ڈاکٹر نے آپ کو غالباً ہمارے وہاں وزٹ کرنے کے بارے میں ضرور آگاہ کیا ہوگا۔ ہمیں آپ کی حیثیت اور شرافت کا خیال نہ ہوتا تو ہم آپ کی ملازمتہ گلابو سے مل کر اس کا بیان بھی ریکارڈ کر سکتے تھے۔“

رستم علی گم سم بیٹھا اورنگ زیب کو کچھ دیر دیکھتا رہا پھر تھکے تھکے انداز میں بولا۔

”آپ کیا جاننا چاہتے ہیں آفسیر؟“

”گلابو پر کوئی کس نے چلائی تھی؟ میں اس کا نام جاننا پسند کروں گا۔“

”اس کا نام خود مجھے بھی نہیں معلوم۔“ رستم علی نے کسمسا کر جواب دیا۔ ”وہ میرے لیے بھی اجنبی ہی تھا۔“

”میری ذاتی معلومات کی روشنی میں آپ نے اپنے تحفظ کے لیے گارڈز کا ایک دستہ بھی تعینات کر رکھا ہے۔ پھر مجرم کس طرح ان سب کو ڈانچ دے کر آپ کی خواب گاہ تک پہنچ گیا اور..... ملازمتہ گلابو اس وقت آپ کی خواب گاہ میں کیا کر رہی تھی؟“

رستم علی نے دبی زبان میں حادثے کی مختصر تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”گوئی چلانے والا میرے ایک گارڈ کو بے ہوش کر کے اس کی وردی پہن کر بنگلے کے عقبی راستے سے داخل ہوا پھر..... اس نے میری خواب گاہ تک پہنچنے کی خاطر گلابو کو ڈرا دھمکا کر اپنے اشاروں پر چلنے کے لیے مجبور کر دیا تھا..... میری وائف نے گلابو کی آواز سننے کے بعد ہی بیڈروم کا دروازہ کھولا تھا۔ اس وقت میں سو رہا تھا۔ میری مسز نے مجھے بعد میں آواز دے کر بیدار کیا تھا۔“

”آئی سی..... لیکن آنے والے نے جو یقیناً کسی خاص مقصد کے بغیر نہ آیا ہوگا، اس نے گلابو کو کیوں زخمی کیا؟“

”وہ..... وہ..... دراصل وہ خوف زدہ کرنے کا ایک نفسیاتی حربہ تھا۔“

”پھر.....“ اورنگ زیب نے رستم علی کی بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے دوستانہ لہجے میں دریافت کیا۔ ”گارڈ کے لباس میں آنے والا یقیناً کوئی عادی اور پیشہ ور مجرم رہا ہوگا۔ وہ آپ سے کیا چاہتا تھا؟“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپ کو تمام ڈائجسٹ
ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

”وہ..... وہ..... وہ جس مقصد سے آیا تھا اس کے پورا
ہونے کے بعد ہی اس نے مجھے اور میری وائف کو زندہ چھوڑ
دیا تھا۔“
”آپ نے اس کی باقاعدہ رپورٹ ملحقہ تھانے میں
کیوں نہیں کی؟“

”اپنی عزت..... شہرت اور بدنامی کے ڈر سے۔“
رستم علی نے کسی ہارے ہوئے جواری کے انداز میں مدہم
آواز میں جواب دیا۔ ”اس رات جو کچھ ہوا اس کی اطلاع
میرے بیٹے اور بہو کو بھی نہیں ہے..... میں نے جان بوجھ کر
انہیں کچھ نہیں بتایا اس لیے کہ جوان خون جلدی اشتعال میں
آجاتا ہے۔ بات پھلتی یا طول اختیار کرتی تو مجرم جوابی
کارروائی بھی کر سکتا تھا۔“

”میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔“ اورنگ زیب نے
بہ دستور نرم انداز میں سوال کیا۔ ”مجرم یا مجرموں نے آپ
سے کتنی رقم اینٹھ لی۔ میرا ذاتی اندازہ ایک کروڑ سے کم بھی
نہیں ہے اور..... کیا آپ اتنی بڑی رقم نقدی کی صورت میں
گھر میں رکھتے ہیں؟“

”پلیز مسٹر اورنگ زیب۔“ اس بار رستم علی نے ہاتھ
جوڑ لیے۔ ”میں آپ سے ذاتی درخواست کروں گا کہ جو
بات جہاں دفن ہو گئی ہے اسے وہیں تک دفن رہنے دیں۔
زیادہ نہ کریدیں۔ پلیز۔“

”مجھے شرمندہ نہ کریں رستم علی صاحب۔“ اورنگ
زیب نے اسے تسلی دی۔ ”میں آپ سے پہلے ہی وعدہ کر
چکا ہوں کہ تعاون کرنے کی صورت میں بات صرف میری
ذات تک محدود رہے گی۔ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔
بس ایک آخری سوال اشارے کی صورت میں اور کروں گا
اس کے بعد آپ کا قیمتی وقت برباد نہیں کروں گا۔“

رستم نے جواب دینے کے بجائے حسرت بھری
نظروں سے اورنگ زیب کو دیکھا۔ اورنگ زیب نے پہلو
بدل کر ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”اس شہر میں میرا ذاتی دشمن بھی
صرف ایک ہے..... شیخ حامد، جسے میں آکٹوپس کے نام سے
یاد کرتا ہوں۔ اسی نے سیٹھ عثمان جیسے شریف کاروباری
انسان کو بھی اپنے معاملے میں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ
مجرم جو آپ کی خواب گاہ تک پہنچ گیا تھا..... کیا وہ اسی
آکٹوپس کے اشارے پر نہیں چل رہا تھا؟“

سیٹھ رستم نے جواب میں نظریں جھکا لیں تو اورنگ
زیب نے جیب سے اپنا وڈیو کیم کارڈ نکال کر اس کے سامنے
ڈال دیا۔ جانے کے ارادے سے اٹھ کر بڑی ٹھوس آواز میں

بولے۔ ”اس پر میرے وہ نمبر بھی درج ہیں جس پر آپ کسی
وقت بھی مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ جاتے جاتے یہ بھی عرض
کردوں کہ اب آپ کی حفاظت کی فتنے داری بھی ایک واقف
کار کی حیثیت سے مجھ پر فرض ہوگی۔“

سیٹھ رستم نے جواب میں کچھ نہیں کہا، خاموشی سے
اورنگ زیب کو رخصت کرنے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا
لیکن اس کی نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ اورنگ زیب کی شخصیت
سے نہ صرف متاثر ہوا تھا بلکہ اس کا احسان مند بھی تھا۔
اورنگ زیب نے رخصتی مصافحہ گرم جوشی سے کیا پھر کچھ سوچ
کر دبی زبان میں بولا۔ ”آپ کو میرا ذاتی مشورہ ہے کہ ان
معاملات سے دارا کو بالکل ہی الگ رکھیں تو مناسب ہوگا۔“
”بہت بہت شکریہ مسٹر اورنگ زیب لیکن اس وقت
آپ نے مجھے خدمت کا کوئی موقع نہیں دیا۔ کم از کم چائے
ہی.....“

”ڈیوڑھی..... کبھی موقع ملا تو ڈنر بھی آپ کے ساتھ
ضرور کروں گا۔“ اورنگ زیب نے دوبارہ رستم علی کا ہاتھ گرم
جوشی سے دبایا پھر پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے باہر
نکل گیا۔

لیاقت حسین کے ذہن میں فرحین کی موبائل پر کی ہوئی
باتیں اس وقت بھی ہلچل مچا رہی تھیں۔
کل تک وہ شاہ پری کے نام سے الجھتا تھا۔ اسی سے
شادی نہ کرنے کے سبب اسے باپ کی شفقت اور اپنی حویلی
سے محروم ہونا پڑا تھا لیکن آج اسی شاہ پری کی وجہ سے پانچ
لاکھ کی رقم کا وہ معاملہ ہو گیا تھا جس نے اسے پریشان کر
رکھا تھا۔ فرحین نے کہا تھا ”بابا کے پاس پیسوں کی کمی نہیں
ہے لیکن اسے دوسرے کی غلطی کی وجہ سے اپنی کاروباری
ساکھ خراب ہو جانے کا غم ضرور لاحق ہے۔“ لیاقت حسین
باپ کی اس مشکل کو حل کرنے کا متنی تھا۔ اس نے ابھی تک
سیٹھ عثمان کو اپنے والد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔
اپنی اصلیت اور حیثیت کا اظہار کر کے وہ باپ کو شرمندہ نہیں
کرنا چاہتا تھا۔ سیٹھ عثمان بھی ملازمت دیتے وقت ضرور سوال
کرتے کہ جب وہ اتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے تو اسے
ملازمت کی کیا ضرورت ہے؟ ویسے بھی وہ اپنا مستقبل بنانے
کی خاطر خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا ارادہ لے کر گھر سے
نکلا تھا لیکن اس وقت وہی ایک خاموشی اس کے لیے سوہان
روح بن گئی تھی۔

لیاقت حسین کو یقین تھا کہ اپنی موجودہ حیثیت میں اگر

وہ سیٹھ عثمان کو حقیقت سے آگاہ کر دیتا تو اس کے باپ اور عثمان کے درمیان پیدا ہونے والی ایک غلط فہمی دور ہو سکتی تھی لیکن وہ اس کے سوا کوئی اور راستہ اختیار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سراج کا وسیلہ بھی اس کے کام آ سکتا تھا۔ مگر اسے یہ بھی منظور نہیں تھا۔ وہ کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا تھا جس سے اس کے باپ اور سیٹھ عثمان کے درمیان پیدا ہونے والی وقتی بد مزگی بھی دور ہو جائے اور اس کی انا کو کوئی ٹھیس بھی نہ پہنچے۔

فرحین نے گفتگو کے دوران اس شبے کا اظہار بھی کیا تھا کہ شاید شاہ پری کو کسی طرح اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ لیاقت حسین کہاں ملازمت کر رہا ہے لیکن اس نے کھل کر اقرار نہیں کیا تھا۔ لیاقت حسین کے ذہن میں اس صورت حال کو حل کرنے کے مختلف طریقے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ جب اس کے ذہن میں ایک مانوس آواز ابھری جو کسی غیر کی نہیں اس کی اپنی ہی آواز تھی۔

”کب تک عقلی گھوڑے دوڑاتے رہو گے؟ صورت حال نے جو پیچیدہ صورت اختیار کر لی ہے اسے حل کرنا تمہارے لیے جو بے شیر لانے سے کم بھی نہیں ہے۔“

”میں نے بھی مایوس ہونا نہیں سیکھا۔“ لیاقت حسین نے دل ہی دل میں اپنے ہمزاد سے کہا۔ ”انسان اگر ہمت سے کام لے۔ خدا پر بھروسہ رکھے تو وہ ناممکن کو بھی ممکن بنا دیتا ہے۔“

”یہ بات ہے تو پھر پریشان کیوں ہو رہے ہو؟..... سب کچھ اسی پر چھوڑ دو۔ اب تک جو ہوتا رہا وہ بھی اسی خدا کو منظور تھا۔ آئندہ جو ہوگا وہ بھی اسی کی مرضی کے عین مطابق ہوگا۔“

”جانتا ہوں لیکن..... انسان کو اس کی مرضی کے پیش نظر سوچنے اور سمجھنے کا اختیار بھی ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوتے۔“

”کل کیا ہوگا.....؟ کیا ہونے والا ہے یہ تم نہیں جانتے۔ میں بھی ایک حد تک تمہیں چوڑا کر سکتا ہوں۔ زبان کھولنے کا اختیار میرے پاس بھی نہیں ہے۔“

”ہاں..... میں نے پڑھا ہے کہ ہمزاد انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ مر بھی جاتا ہے مگر..... میں عام کتابی باتوں پر ایمان نہیں رکھتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب من گھڑت باتیں اور فرسودہ کہانیاں ہوں۔ جو صورت حال میرے ساتھ پیش آتی رہی ہے میں اس سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔“

”پھر.....؟ تم اس وقت کس سے باتیں کر رہے ہو؟“

”میں اسے دل و دماغ کی جنگ اور کشمکش کا نام دوں گا۔“

”اور وہ باتیں جو حادثاتی طور پر تمہارے ساتھ پیش آچکی ہیں لیکن بعد میں دوسروں کی تصدیق کے باوجود تمہیں یاد نہیں آتیں، ان کے بارے میں کیا کہو گے۔“

”میں اسے غیبی امداد کہوں گا۔ اس کا ذکر مقدس کتابوں میں بھی ہے اور جب اللہ کی مدد شامل حال ہو تو ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔“

”اس معاملے میں‘ میں کوئی وضاحت نہیں کروں گا بہر حال، دو باتوں کا خیال رکھنا۔ جو خطرات انسان کو درپیش ہوں اس کی حفاظت بھی خداوند کریم کے اختیار میں ہے۔ آنے والے دنوں میں تمہاری کوئی آزمائش بھی ہو سکتی ہے۔ ذہن اور آنکھوں کو کھلا رکھنا۔“

”تم کن باتوں کی نشاندہی کر رہے ہو؟“ لیاقت حسین نے دوبار اس جملے کو دل ہی دل میں دہرایا مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا پھر..... اندر سے سراج کا بلاوہ آ گیا۔ وہ ملازم کے ساتھ اندر چلا گیا۔ سراج کو ایزی چیئر پر بیٹھا دیکھ کر اسے خوشی ہوئی تھی۔

”بیٹھو لیاقت حسین۔“ سراج نے اسے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت مجھے تم سے ایک اہم اور ضروری بات کرنی ہے۔“

”آپ کی کوئی بات یا حکم میرے لیے غیر اہم نہیں ہوتا۔“

”ایس بی صاحب کو اطلاع ملی ہے کہ ہمارے کچھ مشترکہ دشمن تمہیں بھی نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں اس لیے تم بغیر میری اجازت کے کہیں جانے کی غلطی نہ کرنا۔“

”آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے صاحب.....؟“

لیاقت حسین نے دبی زبان میں پوچھا۔

”دشمن کبھی تنہا نہیں ہوتا.....“ سراج نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ”بھی وہ خود پردے میں رہتا ہے اس کے پروردہ جرائم پیشہ اس کے اشاروں پر عمل کرتے ہیں اس لیے ہر حال میں احتیاط شرط ہے۔“

”میں خیال رکھوں گا.....“ لیاقت نے بات جاری رکھی ہے۔ ”خدا کا شکر ہے کہ اب آپ کی طبیعت بہتر ہے۔“

”ہاں..... کل سے میں ڈیوٹی بھی جوائن کر لوں گا۔“

سراج سے بات کرنے کے بعد لیاقت حسین دوبارہ باہر آ گیا۔ کچھ دیر قبل بھی اسے ذہن اور آنکھ کھلی رکھنے کا

مشورہ ملا تھا لیکن موت اور زندگی کے بارے میں اس کا اعتقاد تھا کہ خدا نے جو وقت تقدیر میں لکھ دیا ہے وہ اٹل ہوتا ہے۔ انسان کی تمام احتیاطی تدابیر دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

لیاقت حسین کرسیدمی کرنے کے ارادے سے لیٹ گیا۔ اس کے ذہن میں پھر فرحین کی فون پر فراہم کردہ اطلاع چکرانے لگی، وہ آنکھیں بند کر کے سیٹھ عثمان اور اپنے باپ کے درمیان پیدا ہونے والی کشمکش ختم کرانے کے بارے میں غور کرنے لگا۔ ذہن میں پریشان خیالوں کی یلغار شروع ہوئی تو اس کی آنکھ کچھ دیر کولگ گئی۔ اس کا بوجھل ذہن نیند کے عالم میں بھی کام کرتا رہا پھر..... وہ ایک آخری نتیجہ اخذ کرنے کے بعد دوبارہ اٹھا..... اس نے طے کر لیا تھا کہ ذاتی طور پر سیٹھ عثمان سے مل کر وہ اپنے باپ کی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کرے گا۔ خواہ اس کے نتائج کچھ بھی ہوں۔

اپنے ارادے پر عمل کرنے کے آخری فیصلے کے بعد اس نے سراج کی طرف سے ملنے والی ہدایت کو بھی یکسر فراموش کر دیا۔ وہ قدم اٹھاتا سراج کی کونجی سے باہر نکلا۔ ایک ٹیکسی پکڑ کر سیٹھ عثمان کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ ان سے ملاقات کرنے میں بھی اسے انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔ اسے فوراً اندر طلب کر لیا گیا۔ سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم دونوں لاؤنج میں موجود تھے۔

”کیسے ہو لیاقت حسین!“ راحیلہ بیگم نے بڑے خلوص اور اپنائیت سے پوچھا۔

”مالک کا کرم اور آپ لوگوں کی دعاؤں سے خیریت سے ہوں۔“

”اس وقت کیسے آنا ہوا.....؟“ سیٹھ عثمان نے سوال کیا۔ ”سراج کی طرف تو سب خیریت ہے؟“

”سب ٹھیک ہے صاحب..... سراج صاحب کل سے ڈیوٹی پر بھی جائیں گے۔“ لیاقت حسین نے جواب دیا پھر کچھ توقف سے بولا۔ ”صاحب، مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”کیا بات ہے؟“

”صاحب..... وہ..... دراصل میں نے ملازمت کے بعد سے اب تک آپ کو اپنے والد کے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن اب.....“ لیاقت حسین جھجکا تو راحیلہ خاتون نے مسکرا کر کہا۔

”آج تمہیں اس بات کا خیال کس طرح آ گیا؟“

کشکول

صاحب نے تو تم سے کئی بار پوچھا تھا۔“

”اب میں چاہتا ہوں کہ صاحب کا دل والد صاحب کی طرف سے صاف ہو جائے۔“ لیاقت حسین نے کہا پھر نظریں جھکا کر ایک ہی سانس میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو اس کے دل پر ایک بوجھ بنا ہوا تھا۔

”اوہ.....“ سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کو بہت غور سے دیکھا پھر کچھ تامل سے بولے۔ ”مجھے یہ جان کر خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی کہ تم سردار سرفراز خان کے بیٹے ہو۔ اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا تو میں تم کو یقیناً کسی بہتر اور مناسب ملازمت کی آفر کرتا۔ اب بھی وقت نہیں گزرا، میں تمہارے لیے.....“

”آپ نے جو احسان کیے ہیں صاحب، وہی بہت ہیں۔“ لیاقت حسین کی آواز رندھ گئی۔ ”آپ بس اتنا احسان کریں کہ والد صاحب کی جانب سے جو سامان پہنچنے میں دیر ہوئی اسے درگزر کر دیں اور..... ایک درخواست اور بھی کروں گا.....“ لیاقت حسین نے عاجزی کا اظہار کیا۔

”والد صاحب کو یہ نہ معلوم ہونے دیں کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں..... انہیں میرے بارے میں جان کر زیادہ دکھ ہوگا۔“

”یہ سب کچھ سوچنا اب میرا کام ہے۔“ سیٹھ عثمان نے اٹھ کر لیاقت حسین کے دونوں شانوں پر بے تکلفی سے ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اس بات کا یقین بھی کر لو کہ اب میرا دل تمہارے والد کی طرف سے شیشے کی طرح صاف ہو گیا ہے۔“

”شکر یہ صاحب.....“ لیاقت حسین کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمکنے لگے۔

”ایک بات میری بھی سن لو.....“ راحیلہ بیگم نے شوہر کی دیکھا دیکھی بڑے پیار سے کہا۔ ”ہم سے بھی اب تک اگر کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو اسے.....“

”میں ہاتھ جوڑتا ہے بیگم صاحب..... اس سے آگے کچھ مت کہیے گا۔“ لیاقت حسین نے پھر عاجزی کا اظہار کیا۔

”ایک شرط پر.....“ سیٹھ عثمان نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کہا۔ ”تمہیں پہلے کی طرح اب بھی ہماری کسی بات ماننے سے انکار نہیں ہوگا۔“

”آپ حکم دیں..... میں انکار کی گستاخی نہیں کروں گا۔“

لیاقت حسین کو خوشی تھی کہ وہ اپنے والد کی پوزیشن صاف کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سیٹھ عثمان نے اس سے ہر بات ماننے کا اقرار کر لیا تھا لیکن کوئی بات نہیں بتائی تھی۔

راحیلہ بیگم کے بے حد اصرار پر اس روز لیاقت حسین کو سب کے ہمراہ ایک ہی میز پر بیٹھ کر ناشتا کرنا پڑا۔ ناشتے کے دوران وہ زیادہ تر خاموش ہی رہا پھر واپس جانے لگا تو سیٹھ عثمان نے سوال کیا۔

”تم کس گاڑی پر آئے تھے؟“

”میں ٹیکسی پر آیا تھا صاحب.....“

”بہر حال، اب تمہیں میرا ڈرائیور چھوڑ آئے گا۔“ راحیلہ بیگم نے شوہر کا مقصد سمجھ کر کہا تو لیاقت حسین انکار نہ کر سکا۔ خلاف توقع تو وہ اس وقت محتاط نظر آ رہا تھا، گفتگو کے دوران بھی اس نے خود کو لیے دیے رکھا تھا۔ سیٹھ عثمان اسے باہر تک رخصت کرنے آئے تھے۔

راستے میں راحیلہ بیگم کے ڈرائیور نے اس کے ساتھ کھل کر گفتگو کرنی چاہی لیکن خلاف توقع لیاقت حسین صرف ہوں، ہاں میں جواب دیتا رہا۔ گاڑی اس وقت بڑے چوک سے گزر کر ایک قدرے ویران راستے کی طرف گھومی تھی جب لیاقت حسین نے راحیلہ بیگم کے ڈرائیور سے دبی زبان میں سوال کیا۔

”تمہارے پاس اسلحہ نام کی کوئی چیز ہے؟“

”نہیں لیاقت بھائی..... ہم ڈرائیوروں کا اسلحہ سے بھلا کیا کام۔“

”اگر کوئی آڑا وقت ناگہانی آجائے تو کیا کرو گے؟“ اتنا بزدل اور ڈرپوک بھی نہیں ہوں۔“ اس نے لیاقت حسین کو سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”خالی ہاتھ سے بھی کم از کم دو تین کو تو پھڑکا سکتا ہوں لیکن آپ نے اس وقت یہ ذکر کیوں چھیڑ دیا؟“

”برا وقت دعوت نامہ دے کر نہیں آتا۔“ لیاقت حسین بہ دستور سنجیدگی سے بولا پھر عقی شیشے پر نظر ڈال کر کہا۔ ”ہمارے پیچھے جو سفید کار اور دین آ رہی ہیں ان سے محتاط رہنا۔“

”میں سمجھا نہیں.....“ اس نے لیاقت حسین کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”گاڑی تیزی سے آگے بڑھا کر داہنی جانب بڑی عمارت کے پاس روک لو.....“

راحیلہ بیگم کا ڈرائیور مزید کوئی سوال کرنا چاہتا تھا جب کے بعد دیگرے دو دھماکے ہوئے پھر اس نے اگر اسٹیرنگ کنٹرول نہ کیا ہوتا تو وہ یقیناً کسی حادثے کا شکار ہو جاتا، کسی ماہر نشانہ باز نے سائیکلنگ لگے اسلحہ سے فائر کر کے گاڑی کے پچھلے دونوں بائرنے کا کارہ کر دیے تھے۔ لیاقت حسین پوری

طرح محتاط تھا۔ وہ اپنا پستول نکالتا ہوا اپنی سمت کا دروازہ کھول کر بڑی احتیاط سے روڈ پر ایک ہاتھ کے بل گرا پھر خود کو حیرت انگیز طور پر رول کرنا ہوا سڑک کے کنارے نئی تعمیر ہونے والی تجارتی عمارت تک پہنچ گیا۔ پیچھے آنے والی کار اور دین کچھ اور قریب آ کر روک دی گئیں۔ کئی گولیاں چلائی گئیں لیکن کار گر نہیں ہوئیں۔

عمارت کے قریب پہنچ کر لیاقت حسین نے ایک چوڑے پلر کی آڑ لے لی، اس نے سڑک کی دوسری جانب دیکھا، راحیلہ بیگم کا ڈرائیور کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ”تم ہماری نظروں میں ہو لیاقت حسین!“ کار کے اندر سے کسی ہینڈ کنٹرول مائیک کے ذریعے کہا گیا۔ ”ہم تمہیں مارنا چاہیں تو ایک دسی بم بھی استعمال کر سکتے ہیں جو تمہارے جسم کو دھجیوں میں تبدیل کر دے گا۔“

لیاقت حسین نے جواب دینے کے بجائے پھرتی سے پستول والا ہاتھ باہر نکال کر یکے بعد دیگرے فائر کیے۔ اس کا نشانہ خطا نہیں ہوا۔ کار کے اگلے دونوں بائرن بھی دھماکوں سے پھٹ گئے۔ دین کار کی پشت پر کھڑی تھی۔ دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں ملا۔ لیاقت حسین محفوظ پوزیشن لیے اس کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا، کار کا انجن شاید بند نہیں کیا گیا تھا۔ لیاقت حسین نے اسے ڈمگاتے ہوئے قریبی عمارت کی طرف بڑھتے دیکھا۔ شاید اس میں جو مجرم موجود تھے وہ بھی کسی محفوظ پوزیشن کی تلاش میں تھے۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا، عمارت کے قریب جا کر کار روک دی گئی پھر اس کے دونوں دروازے پوزی طرح کھول دیے گئے۔ لیاقت کی گرفت پستول پر مضبوط تھی اس کی انگلی ٹریگر پر جمی ہوئی اور نظریں کار پر مرکوز تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ کار کے اندر سے جو لوگ باہر نکل کر پوزیشن لینے کی کوشش کریں گے وہ انہیں ایک ایک کر کے جہنم رسید کر دے گا لیکن پھر جو کچھ ہوا وہ بھی غیر متوقع نہیں تھا۔ کار سے کسی کے باہر نکلنے سے پیشتر ہی دین اس کے سامنے لا کر روک دی گئی۔ لیاقت حسین نے دین پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ وہ بڑی تیزی سے پستول کے میگزین بدل رہا تھا لیکن اس عرصے میں کار والے نیچے اتر کر پوزیشن سنبھال چکے تھے۔ دین شاید بلٹ پروف تھی جو اس کی باڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن لیاقت حسین نے پہلی فرصت میں اس کے دونوں بائرنے کا کارہ کر دیے۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ فائرنگ کی پے در پے آوازوں سے علاقے کا سکون بھی برباد ہو گیا تھا۔ بے شمار لوگ دونوں جانب تجارتی اور رہائشی عمارتوں سے اس ہنگامے کی نوعیت

سمجھنے کی خاطر تار کا جھانگی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیاقت حسین نے کار کے سامنے دین آ جانے سے پیشتر بڑی دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنی پوزیشن تبدیل کر لی تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان ہی اطمینان تھا۔ خوف یا پریشانی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ پانچ منٹ خاموشی رہی پھر لیاقت حسین کو دوسری جانب سے لٹکار کر کہا گیا۔

”تم چاروں طرف سے گھیر لیے گئے ہو لیاقت حسین۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دی جائے لیکن ہم تمہیں زندہ گرفتار کر کے لے جائیں گے۔“

”اتنا دم خم ہے تو بزدلوں کی طرح آڑ میں کیوں چھپے ہو..... زخموں کا لبادہ اتار کر مردوں کی طرح سامنے آ جاؤ پھر آج یہ فیصلہ بھی ہو جائے گا کہ کون مرد ہے اور کون نامرد.....“

”پہلے تم اس کا ثبوت دو۔ پھر ہم بھی تمہاری بات ماننے سے انکار نہیں کریں گے۔“ دوسری آواز لیاقت حسین کے بائیں جانب والی عمارت سے سنائی دی۔ مطلب صاف ظاہر تھا، انہوں نے اب ایک نہیں کئی موچے بنا رکھے تھے۔ شاید وہ ہر قیمت پر اسے زندہ گرفتار کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ لیاقت حسین کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی پراسرار مسکراہٹ ابھری، وہ پستول نیچے کر کے سامنے آنے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن اسی لمحے ایک نئی صورت حال نے اسے پریشان کر دیا..... وہ راحیلہ بیگم کا ڈرائیور تھا جسے دشمن کے دو آدمی گھسیٹتے ہوئے سامنے لے آئے، ایک نے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر جکڑ رکھے تھے، دوسرے کے ریوالتور کی نال اس کی کپٹی پر جمی ہوئی تھی۔

”اب کیا ارادہ ہے لیاقت حسین؟“ ریوالتور والے نے لٹکارا۔ ”کیا تم اپنے ساتھی کی لاش دیکھنا پسند کرو گے۔ ہم صرف تین تک گئیں گے پھر اس کا بھیجا کھو پڑی سے نکال کر تمہارے سامنے ڈال دیں گے۔“

لیاقت حسین کے چہرے پر اس وقت بھی ایک پراسرار اور انجانی مسکراہٹ ابھری لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پستول لیے سینہ تانے سامنے آ گیا، وہ بالکل نارمل ہی نظر آ رہا تھا، اس کے چہرے پر کسی بھی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس کے سامنے آتے ہی تین اطراف سے تین اور نقاب پوش خود کار جدید قسم کی رائفلیں لیے سامنے آ گئے۔ ایک نے لیاقت حسین سے دو قدم کے فاصلے پر رک کر اس کا منہ محکمہ اڑاتے ہوئے کہا۔

”ہمیں تمہاری مردانگی پسند آئی لیاقت حسین۔ تم نے اپنی زندگی بچانے کی خاطر ہمارے قربانی کے جانور کی زندگی

بٹوارہ

موٹے طور پر دیکھا جائے تو موٹا پاخود ایک موٹی بیماری ہے اور اسے دور کرنے کے لیے روزانہ کم از کم آدھا گھنٹا تیز تیز قدموں سے چہل قدمی کرنا ضروری ہے۔ ویسے یہ کام موٹا پا آنے سے پہلے کرنا چاہیے۔ کیوں کہ بغیر بوجھ کے آدھا گھنٹا چلنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ موٹا پے کے ساتھ آدھا گھنٹا چلنے کے لیے آپ کو پورا ایک گھنٹا درکار ہوگا اور اس پر تیز قدم چلنے سے فربہ اندام کر کے لچک جانے کا بھی موٹا امکان ہے۔ یوں تو آج کل ایک خاص طبقے میں چہل قدمی کا چلن چلا ہے لیکن اس میں چہل قدمی کم اور چہل قدمی زیادہ ہوتی ہے۔ اور جب دو خواتین مل کر چہل قدمی کرتی ہیں تو وہ چہل قدمی پہلے سہل قدمی..... پھر چنچل قدمی بن جاتی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ انسان ہوتے ہوتے موٹا ہوتا تھا۔ لیکن اب..... ہوتے ہی موٹا ہوتا ہے۔ موٹا پے کا بوجھ اب بچوں پر بھی آن پڑنے لگا ہے۔ وہ اپنے بچپن کے دشمن میاں موٹا پے کو پل پل اٹھائے پھرتے ہیں اور ہر پل اسے اتار پھینکنے کے لیے بے چین بھی رہتے ہیں۔ یوں تو موٹا پے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ موٹا پا کچھ بچوں کو وراثت میں بھی ملتا ہے۔ بعض والدین جائداد کا بٹوارہ کرنے سے پہلے بچوں میں موٹا پے کا بٹوارہ کر دیتے ہیں۔ بڑے میاں تو بڑے میاں، چھوٹے میاں بھان اللہ!

نادر خان سرگروہ کی کتاب ”باادب با محاورہ ہوشیار“ سے اقتباس

بھی داؤ پر لگا دی۔“

”کیا مطلب؟.....“ لیاقت حسین کے اعصاب کشیدہ ہونے لگے۔ ”کیا تم اپنا وعدہ پورا نہیں کرو گے؟“

”محبت اور جنگ کے کھیل میں سب کچھ جائز ہوتا ہے جان من.....“ اسے مخاطب کرنے والا مسکرایا۔ ”ہم اتنے نادان بھی نہیں ہیں کہ تمہارے ساتھی کو چھوڑ کر اپنے خلاف کوئی مصیبت کھڑی کر لیں۔“

”لیاقت بھائی.....“ راحیلہ بیگم کے ڈرائیور نے مردہ سی آواز میں کہا۔ ”مجھے مرجانے دیا ہوتا..... تم نکل جاتے۔“

”فکر مت کرو میرے دوست..... لیاقت اگر زندہ واپس لوٹا تو تم بھی اس کے ساتھ ہو گے ورنہ جواو پر والے کو منظور ہو۔“

”ہم تمہیں سیاست دانوں کی تقریر کرنے کا موقع بھی دیں گے لیکن کسی بند کمرے کے اجلاس میں۔“ دوسرے رائفل والے نے لیاقت حسین کی پشت پر رائفل کی نالی اس کی پسلیوں پر اڑاتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال اچھے بچوں کی طرح خاموشی سے ہمارے ساتھ چل کر وین میں بیٹھ جاؤ۔ اسی میں تمہاری زندگی کی ضمانت بھی ہے۔“

لیاقت حسین نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر اس نے آہستہ آہستہ قدم اٹھانے شروع کر دیے۔ وین کے دونوں ناکارہ وہیل تبدیل کیے جا رہے تھے۔ راحیلہ بیگم کا ڈرائیور بڑی اذیت میں نظر آ رہا تھا۔ لیاقت حسین کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ سڑک پر دونوں جانب اب دور دور کچھ تماشا بین بھی جمع ہو گئے تھے۔ لیاقت حسین کا پستول ہاتھ سے جھپٹ لیے جانے کے بعد دو اور نقاب پوش بھی سامنے آ گئے، یہ ظاہر ان کی کل تعداد سات نظر آ رہی تھی۔ ممکن ہے کچھ ادھر ادھر روپوش بھی ہوں۔ البتہ وین اور کار کے ڈرائیور دور کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔

”اتنی جلدی تمہاری نانی مر گئی کیا جو ٹھک ٹھک کر چل رہے ہو۔“ پشت پر موجود رائفل بردار نے لیاقت حسین کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تو تم مردوں والی بات کر رہے تھے، اب حاملہ عورتوں کی رفتار سے قدم اٹھا رہے ہو۔“

لیاقت حسین کے بڑھتے ہوئے قدم ایک دم تھم گئے پھر یوں لگا جیسے اچانک بجلی سی کوند گئی ہو، لیاقت حسین نے قدم جما کر فضا میں سرسالت کیا اور برق رفتاری سے پیچھے والے کی رائفل اس کے ہاتھ سے چھین کر اس کی پشت پر چلا گیا۔ یہ سارا کارنامہ اس نے فضا میں اچھلنے کے بعد ہی انجام دیا تھا جس کی توقع باقی چار رائفل برداروں کو بھی نہیں تھی۔

مارشل آرٹ کا ایسا ناقابل یقین مظاہرہ انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، پھر اس سے پیشتر کہ وہ سچویشن کو سمجھتے یا اور کوئی جوانی کارروائی کرتے، پانچ میں سے چار موت کی نیند سو گئے۔ سرسراتی ہوئی گولیوں نے ان کے جسم کو چھلنی کر دیا تھا پھر لیاقت حسین کی گردن آواز ابھری جو ایک ہاتھ سے رائفل کو پوری قوت سے تھامے ہوئے تھے، دوسرے ہاتھ کے حلقے میں اس نے پانچویں نقاب پوش کی گردن کو اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ وہ مائی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔

”اپنا اسلحہ زمین پر پھینک کر مردہ جانوروں کی طرح زمین پر لیٹ جاؤ ورنہ تمہارا انجام بھی خطرناک ہی ہوگا۔“

لیاقت حسین نے ریوالتور والوں سے کہا۔

”ہم تمہارے ساتھی کو گولی مار..... مار..... مار..... دے.....“

”راہیلہ بیگم کے ڈرائیور کو کور کیے ہوئے نقاب پوش نے بازی پلٹنی چاہی لیکن لیاقت حسین کی رائفل سے دو فائر اور ہوئے اور ان دونوں کی پیشانی سے بھی خون کا فوارہ ابل پڑا۔ جملہ پورا کیے بغیر ہی وہ کسی درخت سے کٹی ہوئی شاخ کی طرح سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔ صورت حال کی نزاکت دیکھ کر وین کے سامنے موجود دونوں ڈرائیور آوندھے منہ سڑک پر لیٹ گئے، زندگی بچانے کا وہی سب سے محفوظ طریقہ بھی تھا۔

فضا میں موت کی چیخوں کے ساتھ بارود کی بو پھیلی تو ہر طرف سناٹا طاری ہو گیا۔ جس شخص کو لیاقت حسین نے اگلے ہاتھ کے حلقے میں جکڑ رکھا تھا وہ بھی گڑ گڑانے لگا۔

”مجھے..... مجھے نہ مارنا، م..... م..... میں تمہیں سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا۔“

جواب میں لیاقت حسین نے اسے جھٹک کر سڑک پر گرایا پھر اس کی سیدھی ٹانگ فضا میں لہرائی تو سڑک پر گرنے والے کے سامنے کے تین دانت بھی پلک جھپکتے میں غائب ہو گئے۔ اس کے منہ سے خون بھل بھل ایلنے لگا۔ کرب میں ڈوبی چیخ کی آوازیں بھی بلند ہونے لگیں۔

”لل..... لل..... لیاقت بھائی۔“ راحیلہ بیگم کے ڈرائیور نے تیزی سے لیاقت حسین کے قریب آتے ہوئے پھولی پھولی سانسوں کے درمیان کہا۔ ”اب یہاں سے جتنی جلدی ممکن ہو نکل چلو..... پولیس آگئی تو تمہانے کچہری کے چکر بھی شروع ہو جائیں گے۔“

”تم صاحب کی گاڑی یہیں چھوڑ کر واپس نکل جاؤ۔“ لیاقت حسین نے ٹھوس اور سرد آواز میں کہا۔ ”اپنی زبان نہ کھولنا ورنہ تم بھی پولیس اور عدالت کے رگڑے میں آ جاؤ گے..... جیسا تمہارے صاحب کہیں ویسا ہی کرنا۔“

”اور آپ.....“

”وقت مت برباد کرو..... جاؤ۔“ لیاقت حسین نے دوسری بار بھی حکمانہ انداز اختیار کیا تو سہا ہوا ڈرائیور دزدیدہ نظروں سے سڑک پر بکھری ہوئی لاشوں پر نظر ڈالتا ہوا واپسی کے لیے تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

لیاقت حسین نے ایک طویل سانس لی پھر وہ جیب سے موبائل نکال کر سراج کے بجائے ایس پی اورنگ زیب کے نمبر ملانے لگا۔

افضل خان اس وقت ہوٹل کے کمرے کو اندر سے لاک کیے بیٹھا تھا جب شبہم کی کال موصول ہوئی۔ نئے نمبر دیکھ کر وہ جھجکا۔ کال ریسیو کرنے کے بعد وہ چونکا بھی تھا، شبہم نے اس کے دریافت کرنے پر ہی بتایا تھا کہ اسے اغوا کرنے والوں نے پرانی سم اپنے قبضے میں لے کر اسے نئی سم دی ہے۔ یہ بات افضل خان کو ہنسنے نہیں ہو سکی۔ وہ شبہم کو کرید کر اصل صورت حال معلوم کرنا چاہ رہا تھا جب دو آدمیوں نے اچانک اسے پیچھے سے دبوچ کر موبائل اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا تھا پھر ان میں سے ایک نے بات کرنے کی کوشش کی..... لیکن دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ اس نے دوبارہ آنے والے نمبروں کو ملا کر بات کرنے کی کوشش کی۔ یہ بھی وارننگ دی تھی کہ اگر زبان نہ کھولی تو وہ افضل خان کو دوسری دنیا میں پہنچا دیں گے۔ اس موقع پر افضل خان نے جان پر کھیل کر بلند آواز میں شبہم کو زبان کھولنے سے منع کیا تھا۔ وہ جن حالات سے دوچار تھا ان میں اسے زندگی کی امید بھی بہت کم تھی۔ جن لوگوں نے اسلحے کے زور پر شبہم کو اغوا کیا تھا وہ اسے بھی ٹھکانے لگانے کی کوشش کر سکتے تھے۔ پہلے ایسا کیوں نہیں کیا گیا؟ اسے اس بات پر بھی حیرت رہی تھی۔ بگ باس نے فوری طور پر اپارٹمنٹ سے چلے جانے کا حکم کیوں دیا تھا؟ یہ بات بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ اس وقت بھی دو آدمیوں کا دروازہ کھول کر اچانک اندر آ جانا اس کے لیے حیرت انگیز ہی تھا۔ شاید ان کے پاس ماسٹر کی یا پھر ڈپٹی کیٹ موجود ہو۔ وہ بہر حال شبہم کو زبان بند رکھنے کی ہدایت کر چکا تھا اس لیے کہ شبہم ہی نے اسے خودشی سے روک کر ایک بار پھر قسمت آزمائے کا موقع فراہم کیا تھا۔ اچانک اندر آنے والے گھسے ہوئے اور ٹھوس جسموں کے مالک تھے، ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کسی قسم کے بھی مقابلے سے فوری نمٹنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ افضل خان ان دونوں کو نگاہوں میں تول رہا تھا، جب

قدرے دراز قد والے نے اسے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے خشک لہجے میں مخاطب کیا۔

”تم اس وقت کس لڑکی سے بات کر رہے تھے.....؟“

”سوری.....“ افضل خان نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”میں اس سلسلے میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا۔“

”کیا یہ آخری فیصلہ ہے.....؟“

”ہاں..... کم از کم اس وقت تک جب تک تم اپنا تعارف نہیں کراؤ گے۔“

”تم نے کیا اندازہ لگایا ہے؟“

”تمہیں میری نگرانی پر تعینات کیا گیا ہے۔ کس نے کیا ہے؟ یہ تم بتاؤ گے۔“ افضل خان نے شانے اچکا کر خود کو بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”ہم تمہاری زبان بھی کھلوا سکتے ہیں۔“ دوسرے نے کرخت لہجے میں کہا۔

”یہ تمہارے اختیارات کی بات ہے۔“

”تمہیں اپارٹمنٹ سے ہوٹل شفٹ ہونے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟“ پہلے نے سوال کیا۔

”جب تمہیں میری نقل و حرکت پر مامور کیا گیا ہے تو اس کا جواب بھی تمہیں معلوم ہوگا۔“

”ہمارے ذہن میں صرف ایک نام محفوظ ہے..... شیخ حامد۔“ اس نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”اب تمہارا کیا جواب ہوگا۔“

”یہ بات پیشتر لوگوں کے علم میں ہے کہ میں شیخ حامد ہی کے دفتر سے تعلق رکھتا ہوں۔“

”ہوں نہیں..... تھا، کہو۔“ دوسرے کے لہجے میں تلخی اتر آئی۔

”جب تمہیں تفصیل معلوم ہے تو پھر وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔“ افضل خان نے بہ دستور محتاط انداز میں جواب دیا۔

”کیا تمہیں علم ہے کہ تمہاری ساتھی لڑکی کو کون لوگوں نے اور کس مقصد سے اغوا کیا ہے؟“

”اس کا علم بھی تم دونوں کو بہتر ہوگا۔“

افضل خان کا جواب سن کر دوسرا آدمی آگے بڑھا تھا لیکن اس کے سامنے اسے روک دیا۔ ”اتنی جلد بازی نہ کرو..... میں اوپر سے معلوم کرتا ہوں کہ اس کی زبان کھلوانے کی خاطر کون سا نسخہ زیادہ کارآمد ہوگا۔“ پھر اس نے موبائل نکال کر کسی کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب سے رابطہ

بھی کوئی کمرے میں موجود تھا؟“
”تم کون بول رہے ہو.....؟“ اس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہارے لیے ڈبل بی کارفرس کافی ہوگا.....“ دوسری جانب سے مختصر اُکھا گیا۔ ”میں اسی نماستندہ بول رہا ہوں۔“

”کیا جانتا چاہتے ہو.....؟“
”کچھ دیر قبل تمہارے کمرے میں جو دو آدمی آئے تھے وہ کون تھے.....؟“

”تمہاری طرح میں ان سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہوں..... ممکن ہے انہیں بھی میری نگرانی پر تعینات کیا گیا ہو۔“ افضل خان نے گول مول جواب دیا۔

”چند مخصوص حالات میں مجھے بلیک ٹائیگر کا حوالہ استعمال کرنے کی بھی اجازت ہے..... اب کیا کہو گے؟“

افضل خان، بلیک ٹائیگر کے حوالے پر چونکا۔ اس نے یکفخت سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”اب میں تم سے کھل کر بات کر سکتا ہوں۔ وہ دونوں کون تھے؟ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایجنسی کے سادہ لباس والے ہوں۔“

”ہمارے دشمنوں کی بھی کوئی چال ہو سکتی ہے..... تمہاری ان سے کیا بات ہوئی تھی؟“

”وہ شبہم کے بارے میں میری زبان کھلوانا چاہتے تھے لیکن میں نے زبان نہیں کھولی۔ وہ دوبارہ آنے کو کہہ گئے ہیں۔“ افضل خان نے دیدہ و دانستہ شبہم کی طرف سے کی جانی والی کال کا تذکرہ کیے بغیر تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

سرغنہ کی ہدایت کی روشنی میں وہ میرا موبائل واپس کر چلے گئے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ تاکید کی ہے کہ میں ان تذکرہ بھی کسی اور سے نہ کروں۔“

”اوہ..... ایسی صورت میں تم میری کال ختم ہوتے اس کال کے تمام کوائف ڈیلیٹ کر دینا.....“ سنجیدگی سے گیا۔ ”ان کو فی الحال ٹالنے کی کوشش کرو، میں ایک دو روز میں ان کا کھوج بھی نکال لوں گا۔“

پھر اس سے پیشتر کہ افضل خان کوئی اور بات کرتا کال منقطع کر دی گئی، اس نے ہدایت کے عین مطابق پہلی فرصت میں اس کال کے تمام کوائف ڈیلیٹ کرنے میں بھی خاصی عجلت کا مظاہرہ کیا تھا۔

اس پر اسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید
واعبات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

قائم ہونے کے بعد اس نے افضل خان کو حقارت سے گھورتے ہوئے دریافت کیا۔ ”یہ شخص ہمارے سوالات کے شرافت سے جواب دینے کے موڈ میں نہیں ہے۔ کیا سلوک کیا جائے.....؟ ہم نے کوشش کی تھی لیکن اس نے بلند آواز میں لڑکی کو زبان بند رکھنے کی تاکید کر دی تھی..... بہ ظاہر ایسا ہی معلوم ہو رہا ہے لیکن یقین سے نہیں کہا جاسکتا..... ٹھیک ہے، ہم اس کو تنبیہ کر دیتے ہیں لیکن اس نے عمل نہ کیا تو؟..... اوکے۔“ فون کرنے والے نے موبائل آف کر کے افضل خان کو سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ ”فی الحال تمہاری جان بچ گئی ہے لیکن ہم بہت زیادہ ڈھیل دینے کے اصول کے بھی خلاف ہیں..... تمہیں ہمارے سلسلے میں اپنی زبان بند رکھنی ہوگی..... اوپر سے فوری طور پر یہی حکم ملا ہے۔“

”زبان بند رکھنے سے تمہاری کیا مراد ہے.....؟“ افضل خان نے ہونٹ کاٹتے ہوئے سوال کیا۔

”ہم اس وقت جا رہے ہیں لیکن تم سے بہت زیادہ دور بھی نہیں رہیں گے، ہمارے جانے کے بعد اگر کوئی اور آئے تو تم اس سے ہمارے بارے میں کچھ نہیں کہو گے۔“

”تم شاید میرے ساتھ چوہے اور بلی والا کھیل کھیل رہے ہو؟“ افضل خان مسکرایا۔ ”جب میں تمہارے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں تو.....“

”بکواس مت کرو.....“ دوسرے کے تیور پھر خراب ہونے لگے۔ ”جتنا کہا جا رہا ہے صرف اسی کو کان کھول کر سن لو۔“

اس بار افضل خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دونوں اسے کچھ دیر گھورنے کے بعد واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد افضل خان نے دوبارہ کمرے کو اندر سے لاک کیا۔

اس کا ذہن ان دونوں کے بارے میں کوئی آخری نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب اس کو موبائل پر سکنل ملا، کمرے سے جاتے وقت اس کا موبائل اسے واپس کر دیا گیا تھا جس پر اسے حیرت بھی ہوئی تھی۔ سکنل ملنے کے بعد اس نے موبائل پر روشن نمبروں کو غور سے دیکھا، وہ اس کے جانے پہچانے نہیں تھے۔

”شاید اب اسے دوسری طرح آزمانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔“ یہ سوچ کر اس نے لائن کاٹ دی لیکن ایک منٹ بعد ہی دوبارہ کال کی گئی، اس بار بھی وہی نمبر اسکرین پر نظر آ رہے تھے۔ افضل خان نے کچھ لمحے سوچ کر موبائل آن کر کے کانوں سے لگا لیا۔

”ہیلو.....“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
”تم نے پہلی کال کیوں کاٹ دی تھی؟ کیا اس وقت

دل آویز.....“

بعض لوگ اپنی زندگی ایسے گزارتے ہیں

جیسے کسی کا قرض چکارہ ہوں اور

کچھ اپنے اندر اتنی گھٹن رکھتے ہیں جیسے

گروی رکھ دیے گئے ہوں.... صورت حال

کچھ بھی ہو لیکن زندگی نہ تو قرض

ہوتی ہے اور نہ ہی گروی رکھنے کی کوئی

چیز... بس یہی ایک بات تمام

عمر اس کی سمجھ میں نہ آسکی شاید اسی وجہ سے وہ زندگی کی ایک بڑی

حقیقت کو محض ایک خواب گراں سمجھنے پر بضد رہا مگر ایام کی تلخی

اسے برابر احساس دلاتی رہی کہ ”ارے نادان! انسان تو محض مٹی کو پتلا ہے... بن

کر بکھرنا... بکھر کر بن جانا... یہی اس کی فطرت میں شامل ہے۔“

قرض حسنہ

ایم اے راحت

زرخیز زمین کے ہاتھوں تباہ ہونے والے ایک بے وقوف انسان کا احوال

سفر کے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ تاحد نگاہ ریت کے اونچے نیچے ٹیلے ویران اور تپتا ہوا صحرا نظر آ رہا تھا۔ میری زبان پیاس سے خشک ہو رہی تھی لیکن مجھے سفر کرنا تھا، منزل مقصود پر پہنچنا تھا۔ پھر بہت دور چیلیں اڑتی نظر آئیں اور میری رفتار تیز ہو گئی۔ میں نے صحرا عبور کیا اور اس نخلستان میں پہنچ گیا۔

ناریل اور کھجور کے درختوں کی بہتات تھی اور ان کے درمیان بہت سے لوگ نظر آ رہے تھے۔ غالباً گھوڑوں کی خرید و فروخت کا کاروبار ہو رہا تھا۔ میری باچھیں خوشی سے کھل گئیں پھر واپس اپنی جگہ آ گئیں کیونکہ گھوڑا خریدنے کے



لیے میرے پاس بیٹھے نہیں تھے۔ ایک ایجنٹ جو ایک پراسرار مشن پر نکلا ہو، بیٹھے کہاں سے لاتا؟ اس کے پاس تو پستول، مشین گن اور ہینڈ گرنیڈ وغیرہ ہوتے ہیں جو میرے پاس بھی تھے مگر پیسے نہیں تھے۔ کاش! میں سیکریٹ ایجنٹ کے بجائے کمیشن ایجنٹ ہوتا، اس دیرانے... سفر کے لیے ایک گھوڑا تو خرید لیتا۔

گھوڑوں کی منڈی میں شاندار گھوڑے اچھل کود کر رہے تھے۔ میں نے مشکلی رنگ کے ایک گھوڑے کو دیکھا، کیا اعلیٰ چیز تھی۔ ایک آدمی اس کی لگام پکڑے ہوئے تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔

”کتنے کاہے.....؟“ میں نے سوال کیا اور وہ ہنس پڑا۔

”خريدو گے اسے.....؟“

”ہاں..... میرے حلق سے بھنچی بھنچی آواز نکلی۔

”اپنی نسل، اپنے خاندان کے بارے میں بتاؤ۔ یہ اعلیٰ نسل کا گھوڑا ہے۔ اعلیٰ نسل کے لوگ اسے خرید سکتے ہیں۔“

”تو کیا میں شکل سے ناکی نظر آ رہا ہوں؟“

”ان کی شان یہ ہے۔ اعلیٰ نسل کے لوگوں کو سواری دیتا ہے۔ اگر تم اس پر شان سے سواری کر سکتے تو میں تمہیں یہ گھوڑا مفت دے دوں گا۔“

”زبان کی پابندی کرو گے؟“

”دوسری بار یہ بات کہی تو گولی مار دوں گا۔“ اس نے غرا کر کہا۔

میں نے گھوڑے کی طرف دیکھا، اس کے تیور بہت خراب تھے، آنکھیں سرخ تھیں۔ میں نے گدھے کا چیلنج قبول کر لیا اور اس نے گھوڑے کی راسیں مجھے تھما دیں۔ گھوڑا چونکا ہو گیا اور میرے اوسان خطا ہونے لگے، میں نے آہستہ سے کہا۔

”اے معزز نسل کے گھوڑے! اگر واقعی تیری نسل اچھی ہے تو اس وقت میری عزت رکھ لے۔ بڑے لوگ.....

میرا مطلب ہے بڑے گھوڑے ہمیشہ بلند ظرف ہوتے ہیں۔ میں تھک کر چور ہو گیا ہوں، پولیس میرے پیچھے ہے۔ اس وقت مجھے تیری ضرورت ہے۔“

گھوڑا مسکرایا اور اس نے مجھے آنکھ مار دی۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ پھر اس نے مجھے آسانی سے اپنی پشت پر سواری دے دی اور گدھے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ گھوڑا میری ملکیت بن گیا تھا۔ اس وقت پولیس کی گاڑی کا سائرن سنائی دیا اور میری خوفزدہ نظریں اس طرف اٹھ گئیں جدھر سے آواز آرہی تھی۔ وہی پولیس افسر وارنٹس پر

کسی کو ہدایات دے رہا تھا جو اس صحرائی بیچھا کر رہا تھا میرا اس کی شاندار گاڑی قریب ہی کھڑی ہوئی تھی۔

میں نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور ہوا ہو گیا۔ پولیس افسر اپنے ساتھیوں کو ہدایات ہی دیتا رہ گیا تھا۔ گھوڑا پورے طرح پر میرا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ مجھے دشمنوں کے نرے سے دور نکال لے گیا۔ ریگستان اور پہاڑی سلسلے تاحد تک پھیلے ہوئے تھے۔ پھر میں ایک راستے سے گزر رہا تھا کہ اچانک فائرنگ شروع ہو گئی۔

گولیاں اس قدر قریب سے چلائی گئی تھیں کہ میں ان کی زد سے نہ بچ سکا لیکن یہاں بھی گھوڑے نے اپنے اعلیٰ نسل ہونے کا ثبوت دیا۔ فائرنگ کی آواز پر وہ بھڑکا اور پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ لیکن آہ..... رائفل سے نکلی ہوئیں تمام گولیاں اس کے پیٹ میں اتر گئیں اور وہ منہ کے بل نیچے آ رہا۔ مجھ پر حملہ کرنے والے نے مجھے موقع دیے بغیر مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے رائفل کو وحشیانہ انداز میں گھمایا۔ اگر میں نے پھرتی کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا تو رائفل کا بٹ میری کھوپڑی کے لاتعداد ٹکڑے کر دیتا۔ رائفل کے زور کی جھونک میں وہ جیسے ہی جھکا، میں نے اس کا وار خالی دے کر اس کی رائفل پر ہاتھ ڈال دیا اور ایک جھٹکے سے اسے چھین لیا۔ وہ ایک قد آور اور تو مند آدمی تھا۔ رائفل ہاتھ سے نکلنے دیکھ کر اس نے پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لمبا چاقو نکال لیا۔ اس وقت صورت حال ایسی نہیں تھی کہ میں رائفل سیدھی کر کے اس پر فائر کر سکتا۔

چنانچہ چاقو سنبھال کر جیسے ہی وہ مجھ پر حملہ آور ہوا میں نے رائفل اس کے بازو پر ماری اور اس کا چاقو والا ہاتھ پکڑ کر پوری قوت سے اپنا گھٹنا اس کے پیٹ پر مارا۔ اس کے حلق سے ایک تیز آواز نکل گئی۔ اگر میں اس سے بھڑنے کی کوشش کرتا تو یقیناً مجھے نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اس نے سنبھال کر اپنی داہنی ٹانگ لہرائی اور مجھ پر وار کیا لیکن میں نے پھرتی سے اس حملے کو بھی ناکام بنادیا۔ آخر میں سیکریٹ ایجنٹ تھا۔ کوئی کمیشن ایجنٹ نہیں تھا۔

وہ زمین پر گر لیا لیکن پھر انتہائی پھرتی سے اٹھ کر سیدھا ہو گیا۔ میرے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پوری قوت سے اس کی ناک پر پڑی تو اس کی ناک کا بانسا ٹوٹ گیا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ میں نے پوری قوت سے ایک مکا اس کے چہرے پر رسید کر دیا اور اب اس کی پھرتی ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ زمین پر گرا، میرے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں اسے موت کے گھاٹ اتار دوں، لہذا

میں نے اس کی گردن کے اوپر پاؤں رکھ کر زور سے پاؤں کو موڑا اور اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کا قوی ہیکل بدن دو تین بار فضا میں اچھلا اور اس کے بعد وہ سرد ہو گیا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر ادھر ادھر دیکھا۔ خطرہ صرف اس پولیس آفیسر سے تھا جو کم بخت مسلسل اپنی شاندار لینڈ کروزر میں میرا تعاقب کر رہا تھا۔ گھوڑا اب چارہ اپنی اعلیٰ نسلی ثبوت دے کر اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ چنانچہ ایک بار پھر میرے لیے وہی صحرا تھا، وہی ریگستان اور پہاڑ تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔

پھر نہ جانے کس خیال کے تحت میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ یہ شخص بھی تو پیدل یہاں تک نہیں پہنچا ہوگا۔ ممکن ہے اس کے پاس کوئی سواری وغیرہ ہو۔ جس پہاڑی ٹیلے کے عقب سے اس نے فائرنگ کی تھی، میں وہاں پہنچا تو میری آنکھیں فرط مسرت سے پھیل گئیں۔ ایک شاندار موٹر سائیکل وہاں کھڑی ہوئی تھی۔ میرے بدن میں ایک بار پھر زندگی دوڑ گئی تھی۔ موٹر سائیکل کا فیول دیکھا تو اس کی تنگی بھری ہوئی تھی۔ چنانچہ میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ موٹر سائیکل ٹائروں والی تھی اور خاص طور سے ریگستانوں میں دوڑانے کے لیے بنائی گئی تھی۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہوئی کہ تھوڑا ہی سفر طے کرنے کے بعد مجھے ایک چوڑی سڑک ناگن کی طرح مل کھاتی ہوئی نظر آئی اور میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ سڑک مجھے کسی آبادی تک بہ آسانی پہنچا دے گی۔

میں نے موٹر سائیکل تیز رفتاری سے دوڑا کر سڑک پر ڈال دی اور اب میں کسی قدر پرسکون ہو گیا تھا۔ لیکن صاحب ایک سیکریٹ ایجنٹ کو سکون کہاں۔ زیادہ دور نہیں چلا تھا کہ اس بد بخت پولیس آفیسر کی کار کا سائرن سنائی دیا اور میرے ہوش دھواں گم ہو گئے۔ آدمی تھا یا جن! سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہر جگہ، کہاں سے کہاں پہنچ جاتا تھا۔

میں نے ایک سیلیئر گھمایا اور موٹر سائیکل کو اسپید دے دی۔ موٹر سائیکل کی رفتار بڑھ گئی لیکن اس کی رفتار بڑھتے ہی پولیس آفیسر نے بھی اپنی کار کی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ اعلیٰ درجے کی پولیس لینڈ کروزر تھی۔ چنانچہ آگے بڑھتی چلی آ رہی تھی اور فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل کو لہرانا شروع کر دیا۔ اس پولیس آفیسر سے چھٹکارا پانا بے حد ضروری تھا۔ اگر اس کے ہاتھ لگ گیا تو پھر زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کوئی ایسی ترکیب جس سے اس منحوس شخص سے نجات حاصل کی جاسکے۔ میں نے ایک دتی بم نکالا اور..... اس کا سیفیٹی کیچ ہٹا کر اسے پیچھے اچھال دیا۔ میرے

کان دھماکا سننے کے منتظر تھے لیکن دھماکا نہ ہوا۔ یہ کیا ہوا، شاید بم پھٹا نہیں تھا..... مگر اس کی وجہ؟

میری سمجھ میں کوئی وجہ نہیں آئی تھی۔ اب تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس پولیس آفیسر کی قسمت اچھی ہے۔ دیکھنا یہ تھا کہ اس زندگی اور موت کی بھاگ دوڑ میں کس کی تقدیر ساتھ دیتی ہے۔

پہاڑی راستے پر پھیلی ہوئی اس سڑک پر بے شمار بیچ و خم تھے۔ مجھے نہایت ہوشیاری سے موٹر سائیکل دوڑانی پڑ رہی تھی۔ ذرا سی غلطی جنت رسید کر سکتی تھی۔

دفعتاً اس شیطان نے فائرنگ شروع کر دی اور میرا خون خشک ہو گیا۔ فائرنگ مشین گن سے کی جا رہی تھی اور گولیاں میرے قریب وجوار سے سامنے سامنے کرتی نکل رہی تھیں۔ خوش قسمتی سے سڑک ڈھلان میں چلی گئی اور میں قدرتی طور پر ان گولیوں سے بچ گیا لیکن اس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ لینڈ کروزر اسی رفتار سے چلی جا رہی تھی اور بس یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اب مجھ تک پہنچی۔ میں بار بار گردن گھما کر اسے دیکھ رہا تھا اور پھر ایک انتہائی خوفناک لمحہ آ گیا۔

سڑک ایک پہاڑی موڑ سے اچانک گھوم گئی تھی اور چونکہ میں اس وقت پیچھے دیکھ رہا تھا۔ اس لیے کوئی اندازہ نہ ہو سکا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اچانک میں فضا میں پرواز کر گیا ہوں۔ موٹر سائیکل میرے نیچے سے نکل گئی۔

اور اس کے بعد..... اس کے بعد..... جو کچھ ہوا تھا، ناقابل یقین تھا۔ سڑک تو داہنی سمت گھوم گئی تھی اور بائیں سمت انتہائی گہرا کھڈ تھا۔ میں نے وحشت زدہ نگاہوں سے دیکھا کہ میری موٹر سائیکل نیچے اور نیچے چلی جا رہی ہے اور میں خلا کی بلندیوں سے اسے دیکھ رہا ہوں۔ پھر دوسرا واقعہ ہوا۔ مستقل مزاج پولیس افسر بھی میری سیدھ میں ہی آ رہا تھا۔ اس نے بھی موٹر نہیں کاٹا تھا اور اس کی لینڈ کروزر بھی موٹر سائیکل کے تعاقب میں چل پڑی۔ فضا میں اس کی چیخ لہراتی سنائی دی تھی اور پھر انتہائی گہرائیوں میں ایک دھماکا اور شعلوں کا طوفان.....

مگر میں کہاں ہوں؟

آہ! کیا شاندار سچویشن تھی۔ پہاڑی حصے میں ایک درخت لگا تھا اور میں اس درخت پر لٹکا ہوا تھا۔ اس درخت نے میری جان بچالی تھی۔ اس کی ایک نوکیلی شاخ میری ٹھیک پھاڑی ہوئی اندر گھس گئی تھی اور میں ٹھیک کے بل پر جمبول رہا تھا..... آہ..... یہ درخت، واہ..... یہ ٹھیک..... کیا مضبوط کپڑا ہے۔ میں نے شاید یہ ٹھیک لنڈا بازار سے خریدی تھی،

اتنی مضبوط اور کارآمد لٹکے گی مجھے گمان بھی نہ تھا۔

بہر حال پولیس افسر سے جان بچ گئی مگر آہ..... میں اب کیا کروں؟ میں نے خود کو سنبھالا اور اوپر دیکھا تو جان میں جان آئی۔ درخت کی شاخیں اوپر تک جانی تھیں اور میں تھوڑی سی محنت کر کے اس سڑک پر پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ میں کوشش کرنے لگا۔ میں نے شاخ کی مضبوطی کا اندازہ لگایا۔ آہستہ آہستہ کھسک کر کنارے پر آیا اور پھر الٹا لٹک کر خود کو اس شاخ سے باہر نکالا۔ پھر آہستہ آہستہ اوپر کی طرف کھسکنے لگا۔ کافی محنت کے بعد میں اوپر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا بدن پسینے سے شرابور تھا اور سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔ بہر حال زندگی بچ گئی تھی۔ یہی کافی تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر وہاں سے آگے کا سفر شروع کر دیا۔ یہ سڑک بھی مجھے کسی صحیح جگہ پہنچا سکتی تھی۔ چنانچہ میں سڑک پر سیدھا بڑھنے لگا۔ زیادہ دور نہیں نکلا تھا کہ میرے کانوں میں ایک آواز آئی اور میرے قدم ٹھٹھک گئے۔

میری ہر اسان لگا ہوں نے فضا کا ایک جائزہ لیا اور بہت دور..... مجھے ایک سیاہ نقطہ فضا میں تیرتا نظر آیا..... آہ..... یہ ہیلی کاپٹر تھا۔ سو فیصدی ہیلی کاپٹر تھا۔ یقیناً اس پولیس آفیسر نے تعاقب کرتے ہوئے دائرہ پولیس پر میرے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔ اب میری تلاش اعلیٰ پیمانے پر شروع ہو گئی تھی..... اب میں کیا کروں؟ سڑک پر چلتا رہوں یا نشیب کے راستے اختیار کروں۔

ہیلی کاپٹر تیز رفتاری سے قریب آرہا تھا، پھر اس نے ایک لمبا چکر لگایا اور میرے سر پر سے گزرتا چلا گیا..... پتا نہیں پائلٹ نے مجھے دیکھا تھا یا نہیں۔ میں سردنگا ہوں سے اسے دور تک جاتے دیکھتا رہا۔ مجھے سخت تعجب تھا کہ اس نے مجھ پر فائرنگ کیوں نہ کی..... اس جگہ تو مجھے آسانی سے مارا جاسکتا تھا۔

ہیلی کاپٹر دور نکل گیا اور میری نگاہیں اس کا تعاقب کرتی رہیں تب دفعتاً میں نے ہیلی کاپٹر سے ایک ہوا باز کو نیچے کودتے دیکھا۔ وہ پیراشوٹ باندھے ہوئے تھا اور آہستہ آہستہ زمین کی طرف آرہا تھا۔

”گویا دو بدو مقابلہ..... لیکن کیوں.....؟“ وہ تو میری زندگی کے گاہک تھے۔ وہ تو مجھے ہلاک کر دینا چاہتے تھے۔ میں ایک جگہ رک کر ہوا باز کو دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ پیراشوٹ زمین کی طرف پہنچ گیا اور ہوا باز نے نیچے آ کر اپنا ہوا بازی کا لباس اتار دیا اور میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ہوا بازی کے سوٹ کے نیچے سے ایک زنانہ لباس برآمد ہوا

تھا۔ پھر اس کے گیسو ہوا میں لہرائے۔ اس کی آنکھوں پر سیاہ رنگ کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ چہرہ بے حد خوب صورت تھا۔ قد لمبا اور بدن سڈول تھا۔ وہ گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی نئی چال ہے مگر یہ لڑکی..... وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ پھر میں نے اسے ایک جھیل کے کنارے رکھتے ہوئے دیکھا۔ جھیل کے پاس درخت لگے ہوئے تھے جن پر پرندے شام کا گیت گارہے تھے۔ وہ جھیل کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ میں آہستہ آہستہ فاصلہ کم کرتا جا رہا تھا کہ ایک بار پھر مجھے ٹھٹھکانا پڑا۔ دفعتاً ہی فضا میں ایک دلکش نغمہ گونج اٹھا۔

”آجارے میں تو کب سے کھڑی اس پار..... آجارے پر دیکھی۔“ میری آنکھیں شدت حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ یہ آواز اس کے منہ سے نکل رہی تھی۔ کوئی گہری چال، کوئی خوفناک سازش! لیکن نغمے کی کشش مجھے اس کے پاس لیے جا رہی تھی۔ میں اس کے سامنے پہنچا تو وہ گاتے گاتے رک گئی۔ اس نے آنکھوں سے چشمہ اتارا اور جذباتی لہجے میں بولی۔

”تم آگے میرے محبوب۔“ اس کی آواز بہت شیریں تھی۔

”کیا تم لٹا مٹیکھ کر ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں من جہانگیر!“

”بکواس کر رہی ہو۔ یہ آواز لٹا مٹیکھ کر جی کی ہے۔“

”میں جو کچھ بھی ہوں، تمہاری ہوں۔“ اس نے کہا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”میں بتاؤں تم کون ہو۔ تم اس دور کی شکستہ دیوی ہو اور میری تاک میں ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ خوفزدہ ہو گئی لیکن اسی وقت کسی طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا مجھے دھوکے سے گھیر لیا گیا تھا میں نے گولیوں سے بچنے کے لیے خود نیچے چھلانگ لگا دی۔

سر میں چوٹ لگی اور ہوش آ گیا، یہ فائرنگ نہیں بلکہ فلیٹ کے دروازے کو زور زور سے بجایا جا رہا تھا۔ سارا ماحول نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، ایک رسالہ میرے سامنے کھلا پڑا تھا اس کا سرورق سامنے تھا جس میں ایک دائرہ پولیس کرتا ہوا پولیس افسر ایک سیاہ چشمے والی شکستہ دیوی اور ایک فوجی ہیلی کاپٹر سے کودتا ہوا چھاتہ بردار نظر آرہا تھا۔

یہ ساری کہانی اس ٹائٹل کو دیکھ کر سر پر سوار ہو گئی تھی۔ فائرنگ بہ دستور ہو رہی تھی۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو نیچے والے فلیٹ کا نو سالہ لڑکا کھڑا ہوا تھا۔

”اماں نے لہسن منگوایا ہے۔ دال میں بگھار لگاتا ہے۔“ اس نے کہا۔

”جاتا ہے یا نکالوں بینڈ گرنیڈ۔“ میں نے غرا کر کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ بیڑوس کے کسی گھر میں گانے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔

”آجارے میں تو کب سے کھڑی اس پار.....“ میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ یہ خواب، یہ جاگتی آنکھوں کے خواب کب تک مجھے بھٹکاتے رہیں گے۔ یہ خواب..... یہ خواب..... جو میری زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور جب ان خوابوں سے نکلتا ہوں تو وہی زندگی، وہی دفتر، وہی روزمرہ کا معمول.....!

مگر یہ خواب گھر ہو یا دفتر میرا پیچھا نہیں چھوڑتے، اس دن ذہن پھر پریشان تھا۔ میری نگاہ شمسو پر پڑی۔ شمسو میرے پکارنے پر میرے پاس آ گیا۔ لاغر چہرہ عمرت مایوسی کی تصویر، عمر چالیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ لیکن چلنے سے پیچاس پیچس سے کم کا نہیں لگتا تھا۔ پچکے گال، دھندلائی ہوئی آنکھیں، دبلا پتلا بدن۔

زندگی کے مسائل نے اس کی چالیس سالہ عمر میں پندرہ سال اور چمکا دیے تھے..... تو بے چارہ شمسو، تنہا کمانے والا۔ چھوٹے چھوٹے بچے، حالات سے اکتائی ہوئی بیوی، شاید کچھ بزرگ بھی اور.....

”کیا حکم ہے صاحب جی؟“ شمسو نے مجھے اپنے خاندان کی چھان بین نہیں کرنے دی اور میں چونک پڑا۔

”ہاں..... وہ ایک حالات سے اکتائی ہوئی بیوی..... مم..... میرا مطلب ہے ایک گلاس پانی۔“ میں نے کہا اور شمسو گردن جھکا کر چلا گیا۔ میری نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ کچھ کرنا چاہیے اس کے لیے۔ مظلوم انسانیت اس طرح سسک کر دم توڑ دے یہ کیسے گوارہ کیا جاسکتا ہے۔ انسان، انسان کے لیے پیدا ہوا ہے اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی بے بسی سے نگاہیں چرانا، تذلیل آدمیت ہے۔ نہیں شمسو تم انسانوں کی طرح جیو گے۔ میں تمہاری خدمت کے لیے تخلیق کیا گیا ہوں۔“

ریوا لونگ چیئر کو میں نے کمر سے پیچھے جھکاتے ہوئے شمسو کے بارے میں چند فیصلے کیے اور ایک گہری سانس لے کر پائپ دانٹوں میں دبایا۔ سونے کے لائٹ سے پائپ سلگا کر میں نے چند گہرے گہرے کش لیے۔

”بیٹھ جاؤ شمسو.....“

”جی صاحب؟“ شمسو نے حیرت سے کہا۔

”ہاں..... شمسو میں نے تمہیں بیٹھنے کے لیے کہا ہے۔ اور..... زمین پر نہیں اس کرسی پر بیٹھو.....“

”نہیں صاحب جی! ہم یہ گستاخی نہیں کر سکتے۔“ شمسو نے لجاجت سے کہا۔

”اوہ..... گستاخی!“ میرے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”دنیا کے اس چلن سے مجھے نفرت ہے شمسو۔ دو ہاتھ، دو پاؤں اور دو آنکھوں والے تمام انسان یکساں ہیں۔ ساج اور معاشرے نے یہ تنگ نظر پیدا کی ہے۔ دولت کی یہ غلط تقسیم انسانوں کے درمیان تفریق بن گئی ہے۔ ورنہ ہر شخص کی تخلیق یکساں ہے۔“ میں نے جذبات میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

”جی صاحب جی!“ شمسو کی سمجھ میں میری بات نہیں آئی تھی۔

”مجھے اپنا دکھ بتاؤ شمسو۔ مجھے بتاؤ زندگی کے وہ کون سے دکھ ہیں جو تمہیں گھن کی طرح کھا رہے ہیں۔“

”کھانسی ہے صاحب جی! پیٹ میں درد ہوتا رہتا ہے۔ حکیم صاحب بتا رہے تھے کہ پیٹ میں کیڑے ہو گئے ہیں۔“ شمسو نے جواب دیا۔

”آہ..... شمسو! یہ مسائل کی کھانسی ہے، جسے تم صرف پیٹ کا درد کہہ رہے ہو، وہ تمہارے سارے وجود کا درد ہے۔ میں تمہیں اس درد سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔ بیٹھ جاؤ شمسو۔“ میں نے انٹرکام کا بٹن دبا کر کیشٹر کو طلب کیا۔ کیشٹر میرے ایر کنڈیشنڈ آفس میں داخل ہوا تو میں نے کہا۔

”پچیس لاکھ روپے شمسو کو دے دو۔“

”جی۔“ کیشٹر نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

”پچیس لاکھ کا مطلب سمجھاؤں یا شمسو کا؟“ میں نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا۔

”جی بہتر جناب عالی۔“ کیشٹر بولا۔ شمسو حیرت سے منہ پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا، پھر اس نے کہا۔

”صاحب یہ پچیس لاکھ.....!“

”یہ تمہارے زخمی وجود سے دکھ کی چادر اتار پھینکیں گے۔ شمسو جاؤ، جو اس دنیا میں انسانوں کی طرح جیو۔“ میں نے محبت بھرے لہجے میں کہا اور شمسو کی آنکھیں پونچھتا ہوا باہر نکل گیا۔

میرے دل کو ایک عجب طمانیت بھرا احساس ہو رہا تھا۔ فلم شرابی میں ایسا چمکن بھی یہی رول ادا کرتا تھا۔ پورے دفتر کو اس نے مالا مال کر دیا تھا اور خاص طور سے تھو لال کو..... کاش شمسو کی بھی موچھیں ہوتیں تو میں کہتا۔



جولائی کی چھ ماہیہ والی گرمیاں...
2012 کے شمارے کی سرگرمیاں...

جالِ احوال

زندگی کی رنگینی کو خیر باد کہہ کے سنگینی کو گلے لگا لینے والے جانبازوں کا ولولہ انگیز سفر....
سلیم فاروقی کا انداز تحریر

گداز

ملک کے مفادات کو زیرِ روزِ برکردینے والی کوششوں کو ناکام بنادینے کا عزم اور عمل کی تیز رفتار داستان کے سنسنی خیز مناظر... اسما قادری کے قلم سے

لیکاز

نئے امتحانات سے دو چار تالش اور عمران کے کارنامے طاہر جاوید مغل کا سلسلہ

سرواق کی کہانیاں

ہمارے ارد گرد رہنا ہونے والے واقعات کا پردہ احوال احمد اقبال کے ہمراہ سرورق کا پہلا پڑاؤ

تیمور اور شاہی کی سنگت میں مسکراہٹ بکھیر دینے والا سلسلہ کاشف زبیر کے قلم سے... سرورق کا دوسرا پڑاؤ

(اس کے علاوہ)

چینی کتہ چینی میں آپ کی شامل آلا... تبصرے... محبتیں

رہے تھے یتیم بچہ ہے۔ وہ پوری پوری کوشش کریں گے کہ انہیں سرکاری اسکول میں پرائمری ٹیچر لگوا دیں۔ زندگی بن جائے گی۔ بیٹے عزت کی نوکری ہے اور.....
”نہیں تایاجی! میں پڑھانے کے لیے نہیں پیدا ہوا۔“ میں نے تڑپ کر کہا۔ ”تایاجی کے الفاظ نے سارے خواب چکنا چور کر دیے تھے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ شاید تایاجی نے چودھری صاحب سے نورین اور میرے بارے میں کوئی بات کی ہے۔“
”پھر بیٹے کچھ اور کرنے کا ارادہ ہے؟“

”ہاں..... تایاجی! میری دستتیں لامحدود ہیں۔ اس بیکراں آسمان کے مانند میں اس کائنات میں اپنا ایک مقام بناؤں گا۔ میں کسمپرسی کی زندگی گزارنے کے لیے نہیں پیدا ہوا، میری منزل کچھ اور ہے۔“

”حوصلہ بڑی چیز ہوتی ہے، بیٹے! حوصلہ مند یقیناً کچھ کر دکھاتے ہیں لیکن کوئی نظریہ تو ہوگا تمہارا؟“
”میں بڑے شہر جاؤں گا اور مجھے معلوم ہے کہ بڑے شہر سونے کی کان ہیں وہاں میرے جیسے ذہین نوجوان کے لیے بہت کچھ ہے اور آپ دیکھ لیجیے گا تایاجی! جب میں شہر سے باہر روڈ اپنی چھمچائی کار میں آپ کے پاس فیض آباد آؤں گا تو آپ حیران رہ جائیں گے۔ میں یہ سب کچھ حاصل کر کے رہوں گا۔“

”تمہارے لہجے کی مضبوطی بتاتی ہے کہ واقعی تم جو کچھ کہہ رہے ہو کر دکھاؤ گے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں، کب تک جانا چاہتے ہو شہر.....؟“ تایاجی نے پوچھا۔

”بس تایاجی! آپ کی دعاؤں کے ساتھ جلد از جلد۔“
میں نے بادل ناخواستہ کہا۔ اس سے پہلے تو ٹھیک سے شہر کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اگر تایاجی چودھری صاحب کی بیٹی نورین سے شادی کی بات کرتے تو پوری عمر شہر کا رخ نہ کرتا، لیکن اب بات دوسری ہو گئی تھی اور تایاجی نے بات پکڑ لی تھی۔ وہ ہر قیمت پر نویں بچے کے لیے جگہ خالی کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کچھ قرض حسد دے کر مجھے شہر والی ریل میں بٹھا دیا۔ بڑا دعویٰ کر کے چلا تھا۔ اب اس دعوے کو پورا کرنے کے بارے میں سوچتا تھا۔ شہر میں کوئی خاص واقف کاری بھی نہیں تھی۔ مشکلات منہ پھاڑے کھڑی تھیں لیکن میرا عزم کمزور نہیں پڑا تھا۔ دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کے قصے مجھے یاد تھے۔ آخر وہ بھی تو میری طرح دو ہاتھ اور دو پاؤں رکھتے تھے۔ میرے پاس بھی تو دماغ ہے۔ روشنیوں کے شہر میں میرے لیے بھی روشنی کی کمی نہ

جاسکتا تھا۔
میرا تعلق فیض آباد سے ہے اور میری سچی کہانی دوسری بہت سی کہانیوں سے مختلف نہیں ہے۔ وہی کہانیاں جو انسانی زندگی سے عبارت ہوتی ہیں۔ ماں باپ مر گئے تو تایاجی کے گھر آ گیا۔ تایاجی نے تو اپنا خون سمجھ کر قبول کر لیا، مگر تائی جی نے اسے ہمیشہ خراب خون سمجھا اور اس سے ناک سیکڑتی رہی۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ تایاجی دیندار آدمی تھے اور دوسرے کے پیسے کو اپنے تصرف میں لانا حرام سمجھتے تھے چنانچہ میرے ماں باپ کے چھوڑے ہوئے پیسے انہوں نے مجھ پر خرچ کیے اور یہ پیسا انٹر میڈیٹ تک چل سکا۔

تایاجی نے ایک ایک پیسے کا حساب رکھا تھا۔ جس میں اس کا پی اور قلم کے پیسے بھی شامل تھے جس پر یہ حساب لکھا جاتا تھا اور جب یہ سارے پیسے ختم ہو گئے تو انہوں نے مجھ سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”اب شیراز بیٹے! تمہارے باپ اور میرے مرحوم بھائی کا چھوڑا ہوا ترکہ سب ختم ہو گیا ہے۔ سوائے اس کا پی کے جو پوری کی پوری بھر گئی۔ اس لیے بیٹے اب تم اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرو۔ میرے حالات تمہیں معلوم ہیں، آٹھ بچوں کا باپ ہوں، گھر کے حالات.....“

اور میں اس گھر کے حالات سے بہ خوبی واقف تھا۔ آٹھ بچوں کے ساتھ عمر کٹی تھی اور جیسے کٹی تھی میرا جی جانتا ہے۔ ان میں آٹھ کا اضافہ تو میرے سامنے ہی سامنے ہوا تھا۔ نہ جانے یہ سلسلہ کہاں جا کر ختم ہونے والا تھا۔ جس بڑے سے ہال میں، میں بچپن میں سوتا چلا آیا تھا۔ پہلے میری جگہ اس کے سینئر میں تھی۔ پھر کچھ اور کھسکا، کچھ اور، پھر کچھ اور اب میں دروازے کی چوکھٹ کے پاس تھا۔ کون جانے کب یہ چوکھٹ پار کرنی پڑے اس لیے کچھ نہ کچھ سوچتا ہی تھا۔ تایا جی نے کہا۔

”تم بارہویں پاس کر چکے ہو، آگے پڑھنا ممکن نہیں ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں چودھری بشارت سے بات کی ہے۔“

”جی؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے تایاجی کو دیکھا۔ ایک لمحے میں میری آنکھوں میں سنہرے خواب جگمگا اٹھے تھے۔ چودھری صاحب کی بیٹی نورین بچپن میں میرے ساتھ کھیلی تھی اور بارہا میں نے جوانی میں بھی اس کے ساتھ کھیلنے کی آرزو کی تھی۔ گویہ آرزو میرے سینے تک ہی محدود تھی۔ تایا جی کے الفاظ نے مجھے بھٹکا دیا۔

”ہاں۔ انہوں نے مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ کہہ

”موتھیں ہوں تو بس شمسو جیسی۔“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کیا حقائق سوچ ہے بہر حال پچیس لاکھ میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے لیکن اس سے شمسو کے سوکھے چہرے پر رونق آسکتی تھی۔ اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی تھی میرے لیے۔ میں تصور کی آنکھ سے شمسو کے اہل خاندان کو دیکھ رہا تھا۔ دکھوں کی ماری اس کی بیوی، جسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے سامنے رکھی نوٹوں کی گڈیاں اس کی ہیں۔ نہ جانے کتنے مسائل کے حل چھپے ہوئے تھے ان کاغذ کی گڈیوں میں۔ واہ..... ان کاغذوں میں کیسی انوکھی قوت پوشیدہ ہے۔

اور آج کیا ہر دور میں دولت کی طاقت تمام طاقتوں پر حاوی رہی ہے۔ میں نے اپنی ریوالونگ چیز کو پیچھے جھکایا اور سوچ کے دائرے مزید وسیع کرنے چاہے لیکن..... اپنے گرنے کی آواز میں نے خود بھی سنی اور اس کے ساتھ ہی معاشرتی کہانی ختم ہو گئی۔ دفتر کے کئی ساتھی مجھے اٹھانے دوڑ پڑے۔ مس روزی کبھی کبھی کر کے ہنسنے لگی۔ زہر لگتی تھی مجھے ان پینتالیس سالہ مس کی ہنسی۔

”کیا چکر آگیا؟“ رضوان نے ہمدردی سے پوچھا۔
”طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“

”ہاں..... پارٹیک ہوں، اس بھٹیاری خانے میں ایک ڈھنگ کی کرسی بھی نہیں ہے۔ کتنی بار کہا ہے کہ اسے تبدیل کر دیا جائے۔ اس کی پچھلی دونوں ٹانگیں ٹھس گئی ہیں مگر.....“ میں نے خفت کھاتے ہوئے کہا۔

کرسی سیدھی کر کے مجھے دوبارہ اس پر بٹھا دیا گیا۔ شمسو نے مجھے جلدی سے پانی کا گلاس پیش کر دیا۔ میں نے ہمدردی کی نگاہوں سے شمسو کو دیکھا۔ میرا تو خیر کچھ نہیں بگڑا تھا۔ بے چارے شمسو کو پچیس لاکھ کا نقصان ہو گیا تھا۔ کاش وہی ہوتا جو میں نے سوچا تھا، کاش میں فلم شرابی کا ایتنا بھڑا ہوتا، مگر کیسے..... فرق تھا، میں اس فرم کے مالک کا بگڑا ہوا بیٹا نہیں بلکہ اس فرم میں ٹائیسٹ تھا اور جس ریوالونگ چیز کو میں نے پیچھے جھکانے کی کوشش کی تھی۔ وہ یہاں نہیں بلکہ اندر مسٹر عمیر کے ایگزیکٹو آفس میں تھی۔ مسٹر عمیر جو اس فرم کے مالک تھے۔

لاحول ولا قوۃ.....! یہ کہانیاں میرے ذہن سے کیوں چپک گئی ہیں..... کیا کروں؟ کسے چھچھڑاؤں ان سے یقیناً یہ کوئی ذہنی بیماری ہے، میں جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگا تھا۔ یہ خواب بڑے مربوط اور ہر عیب سے پاک ہوتے تھے۔ ان میں سے ہر خواب کو تحریر کر کے کہانی کا رنگ دیا

ہوگی۔ میں اسی روشنی کی تلاش میں یہ سفر کر رہا تھا۔
بہت سے اسٹیشن آئے اور گزر گئے۔ پھر وہ اسٹیشن بھی
آگیا جو میری منزل تھی، میں پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ بڑی
افرا تفری تھی، جیسے کوئی ہنگامہ ہو گیا ہو۔ لوگ ادھر سے ادھر
بھاگ رہے تھے۔ میں گھبرائے ہوئے انداز میں انہیں
دیکھنے لگا پھر میں ایک شخص سے پوچھنے لگا۔
”کیا بات ہے بھائی جی! کوئی گڑبڑ ہو گئی کیا؟“
”کہاں..... کیا ہوا.....؟“ وہ شخص مجھ سے زیادہ گھبرا
گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”یہ لوگ کہاں بھاگے جا رہے ہیں؟“
”اویار! یہ تو اپنے اپنے کام کر رہے ہیں۔ تو نے
تو مجھے ڈرا ہی دیا۔“ اس شخص نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر
چونک کر بولا۔

”او تو پنجاب سے آیا ہے؟“
”ہاں.....“ میں نے کہا۔
”کس شہر سے آیا ہے؟“
”فیض آباد سے۔“

”اوہ..... اچھا معاف کرنا۔ تیری شکل میرے ایک
دوست سے ملتی ہے، ویسے تو ادھر کیسے آ گیا؟“
”نوکری کی تلاش میں۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہاں کدھر جاتا ہے؟“
”ابھی نہیں جانتا۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔
”اوئے کوئی ڈیر نہیں ہے ادھر.....؟“
”نہیں۔“

”پھر کہاں پڑے گا؟“
”مارا جائے گا یا بے..... سیدھا سچا بندہ لگتا ہے۔ اس
بڑے شہر میں کیا کرے گا۔ کسی نے بتایا نہیں تجھے۔ اوئے کسی
کا پتا ہی لے آتا۔“

”کوئی تھا ہی نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ اور وہ کسی
سوچ میں ڈوب گیا، پھر بولا۔

”آجا میرے ساتھ۔ آجا۔ کمائی تو زندگی بھر کی
ہے۔ آجا بس میرے ساتھ۔“ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔
اس کا نام عباس تھا۔ وہ بھی ہمارے ہی شہر کا نکلا اور اس بڑے
شہر میں ٹیکسی چلاتا تھا۔ عباس اس بڑے شہر میں میرا پہلا محسن
تھا۔ وہ چند دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر ایک ناجائز پلاٹ
پر جھگی بنا کر رہتا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے پانچ مہینے اس جھگی
میں گزارے۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے میری ایسی
مدد کی کہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ ان پانچ مہینوں میں،

میں نے پچاس سال کا تجربہ حاصل کیا۔
میں نے ان کی جھگی کو دیکھ کر حقارت سے کہا تھا کہ
لوگ ذہنی طور پر پسماندہ ہیں اس لیے کچھ نہیں کر سکے۔ مگر
انہیں مختصر وقت میں وہ سب کچھ کر کے دکھاؤں گا جس کا وہ
تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں نے کوششیں شروع کر دیں۔ باہ
کی دنیا میں نکل کر معلوم ہوا کہ میں ہی نہیں میری طرح لاکھوں
لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں لیکن..... آخر کوئی راستہ بھی ہو۔
کوئی ذریعہ بھی ہو۔ یہاں تو کوئی چھوٹی موٹی نوکری بھی نہیں
مل رہی تھی۔

پہلے مہینے میں بد دل نہ ہوا۔ دوسرے مہینے دل پر کچھ
اداسی آ گئی۔ تیسرے مہینے پریشان ہو گیا۔ اب صرف
دوسروں کے رحم و کرم پر تھا۔ پانی پلے جو کچھ تھا سب ختم ہو چکا
تھا۔ عباس نے مجھے گاڑی سکھانے کی پیشکش کی جسے میں نے
ٹھکرادیا۔ ”میں اور ڈرائیور۔“

جو تھے مہینے حوصلے دم توڑ گئے اور پانچویں مہینے بالآخر
میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ اونچی اونچی کوششیں آسمان
سے اترتی ہیں، ان میں رہنے والے کسی اور سیارے کی مخلوق
ہوتے ہیں جو چاہا بخیر جو ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے اور
ایک دفتر میں چپڑاسی تھے۔ مجھے سمجھاتے رہتے، وہ کہتے تھے۔
”بیٹا شیراز! عمل کی دنیا خیالوں کی دنیا سے جدا ہوتی
ہے۔ انسان خیالوں کی دنیا میں جی نہیں سکتا۔ ابتدا کرو اور خود
کو اللہ پر چھوڑ دو۔ جو تقدیر میں ہوگا وہی ملے گا۔ زیادہ کے
لیے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنا پاگل پن ہے۔“

پہلے میں ہنس پڑا اور میں نے انہیں بہت سے شعر سنائے
دیے۔ جن میں حوصلہ مندی کے جذبے تھے لیکن بعد میں فیصلہ
کرنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ بھائی شاعر بھی بس خیالوں کی دنیا
کے باشندے تھے وہ کبھی حقیقت کی تک نہیں اترے تھے۔

پانچ مہینے بہت ہوتے ہیں، اس کے بعد بھی خاموش
رہنا بے غیرتی تھی۔ ان لوگوں پر کب تک بوجھ بنا رہتا۔ دو
ہی صورتیں تھیں کہ یا تو واپس فیض آباد چلا جاؤں اور تاجی
سے کہہ کر پنچر بن جاؤں یا پھر اسی شہر میں نوکری کر لوں۔ اس
دور میں تاجی کو بھی خط نہیں لکھا تھا۔ میں تو ان سے چچائی
گاڑی میں واپس آنے کا وعدہ کر کے آیا تھا۔ لیکن اب تک ان
کے قرض حسنہ کی واپسی ہی ممکن نہیں ہوئی تھی بلکہ ان لوگوں کا
بھی قرضہ حسنہ مجھ پر چڑھ گیا تھا۔ جن کے ساتھ میں رہتا تھا۔
پھر یہ بھی جانتا تھا کہ تاجی کے ہاں نواں بچہ ضرور آ گیا ہوگا۔
جس کے بعد میری جگہ باقی نہ رہی ہوگی بس مذاق اڑانے کے
علاوہ اور کچھ نہ ہوگا۔ اس لیے اسی شہر میں پڑے رہو۔ جو کچھ

تقدیر میں ہے اسے قبول کر لو۔“ چاہا بخیر نے کہا۔
”شیراز، میرے دفتر میں ٹکڑ کی جگہ خالی ہوئی ہے۔
صاحب مجھ پر بہت مہربان ہیں کہ تو میں بات کروں؟“
”کر لو چاہا.....“ میں نے بے بسی سے کہا اور نتیجے
میں مجھے کلر کی مل گئی۔ یہ بھی بڑی بات تھی ورنہ اتنی آسانی سے
نوکری کہاں ملتی ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ کچھ تبدیلیاں
ہوئی تھیں۔ جس پلاٹ پر ہم رہتے تھے، اس کے مالک نے
اسے تعمیر کرا لیا۔ چاہا بخیر کو درگزر نہ ہوا تو وہ اپنے شہر واپس
چلے گئے۔ عباس نے واپس اپنے شہر جا کر شادی کر لی اور
وہاں ٹھیکیداری کرنے لگا۔ سب منتشر ہو گئے۔ میں نے فلیٹ
کرائے پر لے لیا جس کا کرایہ بہت کم تھا۔ گزر رہو جاتی تھی مگر
میں صرف گزر کے لیے تو اس بڑے شہر میں نہیں آیا تھا۔ میری
پرداز تو بہت اونچی تھی لیکن رفتہ رفتہ میرے بازو نکتے جا رہے
تھے۔ بلندی پر دوازی کے لیے مضبوط پرکھیں سے نہ حاصل
ہو سکے اور میری آرزو میں حسرت بن گئیں۔ پھر یہ حسرتیں،
خوابوں میں ڈھل گئیں۔ جاگتی آنکھوں کے خوابوں میں۔
نا آسودہ خوشیوں کو میں فلیٹ میں پڑی ہوئی چارپائی پر لیٹ
کر سرہانے کی کھڑکی سے جھانکتے آسمان پر نگاہیں جما کر
پوری کر لیتا تھا۔ بڑا سکون ملتا تھا۔

میرے خواب کہیں غیر مربوط نہ ہوتے اور میرا ذہن
راستے کے تمام سوالات سمیٹا آگے بڑھتا تھا۔ مشغلے کے طور
پر کبھی فلم دیکھ لیتا۔ سنیما ہال میں یا کسی شناسا کے گھروں ہی آر
پر۔ اس طرح میں نے فلم شرابی دیکھی اور عالم تصور میں شمسو کو
چمپس لاکھ دے ڈالے اور خود عمیر صاحب کے ایئر کنڈیشنڈ
آفس میں جا بیٹھا تھا۔ بس اب یہ خواب ہی زندگی تھے، فلموں
کے علاوہ میرا دوسرا مشغلہ ڈائجسٹ تھے۔ انہی ڈائجسٹوں کی
مدد سے ہی میں نے اپنے خوابوں کو ربط دیا تھا۔ مناظر دیے
تھے۔ دیس دیس کی سیر کرتا۔ کبھی ترکی، کبھی اندلس، کبھی لندن
راستے ہنگاموں سے پر ہوتے۔ دولت کے انبار ہوتے۔
دولت کے ساتھ حسین لڑکیوں کا ساتھ ہوتا۔ بڑی آسودگی ملتی
تھی ان داستانوں میں چاہا بخیر کی باتیں اب سامنے آرہی
تھیں۔ وہ اس دنیا کے بارے میں بے شک مجھ سے زیادہ
تجربے کار تھے۔

شمسو نے ایک اور کرسی لا کر میرے قریب رکھی اور
بولی۔ ”اٹھ جائیے صاحب، میں یہ دوسری کرسی رکھ دوں۔“
”اوہ..... شکریہ شمسو یہ کرسی واقعی خراب ہو گئی ہے۔“
میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور شمسو نے کرسی تبدیل کر دی۔
”تمہارے کتنے بچے ہیں شمسو؟“ میں نے اس کے

چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔
”بچے.....؟“ شمسو نے حیرت سے پوچھا۔
”کتنے بچے ہیں تمہارے؟“
”کوئی نہیں صاحب، ہماری تو شادی ہی نہیں ہوئی۔“
”اس.....“ میں چونک پڑا۔ ”کیوں؟“
”جی صاحب جی! شادی کی ہی نہیں۔“
”اوہ..... ماں باپ ہوں گے۔ چھوٹے بہن بھائی
ہوں گے۔“ میں نے رحم کا جذبہ برقرار رکھا۔
”نہیں صاحب جی، ماں باپ تو یاد بھی نہیں ہیں۔ بہن
بھائی تھے ہی نہیں، ہم اکیلے ہیں۔“ شمسو نے جواب دیا۔
”تب تمہاری حالت اتنی خراب کیوں ہے۔ چہرہ پیلا
پڑا ہوا ہے، گال چمکے ہوئے ہیں۔ اپنی عمر سے کہیں زیادہ
معلوم ہوتے ہو۔“
”اوہ..... شیراز تمہیں معلوم نہیں؟“ پیچھے سے رضوان
کی آواز ابھری۔

WELCOME BOOK SHOP
SOLE DISTRIBUTOR
of U. A. E

WELCOME BOOK SHOP
ASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT

P.O. Box 27869 Karama, Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae

Best Export From, Pakistan

WELCOME BOOK PORT
Publisher, Exporter, Distributor
kinds of Magazines, General Books
and Educational Books

”کیا.....؟“

”اپنا شمسو..... ہیرو ہے، ہیروئن کا عاشق، رات ہوتے ہی ہیروئن ہوتی ہے اور شمسو.....“ رضوان نے جواب دیا اور میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا تھوڑا لال بھی کہیں فراڈ تو نہیں تھا۔ شمسو کے بارے میں، میں نے کیا کیا سوچا تھا۔ شکر ہے، میں اس فرم کا مالک نہیں تھا ورنہ کتنا کیا نقصان اٹھانا پڑتا۔ دنیا بہت عجیب ہو گئی ہے۔ جو پریشان ہے، اس کے راستے بند ہیں جو پریشان نہیں وہ اپنے لیے پریشانی تلاش کرتا ہے۔ شمسو عسرت زدہ نہیں بلکہ ہیروئن کا مریض ہے۔ میرا ہر خواب جھوٹا ہوتا ہے۔ مگر کیا کروں ان خوابوں میں میری آسودگی ہوتی ہے۔ جو نہیں ملتا وہ ان خوابوں میں مل جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں خواب کچھ نہیں دیتے۔ لیکن میں ان سے متفق نہیں ہوں۔ جو نہ ہو سکے اس کے لیے تصورات کی دنیا آباد کر لیں، یہ کائنات اتنی بری نہیں لگے گی۔ زندگی کے شب و روز رواں دواں تھے۔ فیڈرل کیمپنل کالینٹ، مسٹر عزم کا آفس، پینتالیس سالہ روزی کی ہنسی جو میرے کانوں کو زہر لگتی تھی۔ یہ عورت عمر کو بھول گئی تھی اور اپنی دانست میں عزم انٹر پرائز کے سارے اسٹاف کی آنکھوں کا نور تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ شاید شمسو بھی اس کے لیے ہیروئن چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ بہر حال یہی زندگی تھی اور میں اس زندگی میں کسی خوشگوار تبدیلی کا خواہش مند تھا۔ اس دن طبیعت کچھ زیادہ ہی مکدر تھی۔ گھر واپس آنے کے بجائے اندرون شہر مارکیٹ کی طرف نکل گیا۔ یہاں نذیر سے میری شناسائی ہو گئی تھی۔ نذیر ایک گارمنٹ اسٹور کا سیلز مین تھا۔ اس کا چھوٹا سا اسٹور ایئر کنڈیشنڈ تھا جس کے شیشوں سے بازار کی تمام رونقیں نظر آتی تھیں۔ دولڑکے کام کرتے تھے اس کے ساتھ اور اسٹور کے مالک نے اسے انچارج بنا رکھا تھا۔

خوش اخلاق آدمی تھا۔ جب بھی میں اس کے پاس پہنچتا گھنٹوں بیٹھتا۔ اس وقت بھی مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ ریکی گفتگو ہو رہی تھی کہ کچھ گاہک آئے اور وہ ان میں مصروف ہو گیا۔ میں کاؤنٹر پر بیٹھ کر باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ سامنے فٹ پاتھ پر اچھی خاصی بھڑکھی۔ شاندار لوگ، شاندار کاریں۔ اس انوکھی دنیا کے باشندے تھے۔

سیاہ رنگ کی ایک مرسیڈیز اسٹور کے سامنے آ کر رکی اور پچھلی سیٹ سے چند لوگ نیچے اتر آئے۔ ان میں ایک دراز قد عمر خاتون بھی تھیں جو بھاری بدن کی مالک تھیں لیکن

پروکار لگ رہی تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر مرد اور ایک نوجوان لڑکی جس کے خدو خال اس خاتون سے ملتے جلتے تھے۔ ڈرائیور مرسیڈیز کو مناسب جگہ پارک کرنے لگا۔ وہ تینوں آگے بڑھنے لگا اور پھر ان تینوں کا رخ اسٹور کی طرف ہو گیا۔ لڑکی نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ اس کی نگاہیں دکان میں بھٹک رہی تھیں۔ پھر اس نے سرسری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی شہرتی آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں اور میرے ذہن میں سرسراہٹ ہونے لگی۔

میں نے اس عمر خاتون کو دیکھا۔ کیا عمدہ شخصیت ہے، کروڑ پتی سے کم نہ ہوں گی۔ عیش و عشرت کی زندگی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ اجنبی دنیا کے لوگ..... دفعتاً میرے کانوں میں ہلکی سی چیخ کی آواز ابھری اور میں چونک کر اس طرف دیکھنے لگا۔ معمر عورت کو اس کا ساتھی مرد بہ مشکل سنبھالے ہوئے تھا۔ ان کی طبیعت اچانک کچھ خراب ہو گئی تھی۔ اس شخص نے نذیر سے بھی مدد کی استدعا کی تھی اور نذیر نے مجھے بھی اشارہ کیا تھا۔ ہم نے مل کر معمر عورت کو مرسیڈیز تک پہنچایا۔ مرد نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”جو کچھ خریدنا ہے۔ اس کے لیے ہم لوگ پھر آئیں گے۔“ نذیر نے خوش اخلاقی سے کہا کوئی بات نہیں۔

”میری پرانی کسٹمرز ہیں بیگم صاحبہ اور کروڑ پتی ہیں۔“

”دیکھنے ہی سے لگ رہا تھا۔“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا اور پھر نجانے کب تک میں نذیر کے ساتھ رہا۔ سیاہ رنگ کی مرسیڈیز میرے ذہن میں سفر کرتی رہی۔ جس میں میری تنہائیوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ نوساڑھے نو بجے فلیٹ پر آ گیا۔ وہی بیمار زندگی تھی کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا اور میکش کی درد بھری آواز ابھرنے لگی۔ ”زندہ ہوں اس طرح کے عم زندگی نہیں۔“

دروازے پر ہونے والی آہٹ نے میکش سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ کون ہو سکتا ہے اس وقت؟ اٹھ کر دروازہ کھولا تو نذیر تھا اور اس کے ساتھ وہی شخص جو ان بیگم صاحبہ کے ساتھ نظر آیا تھا۔ میرے دل میں کچھ گھبراہٹ ہونے لگی۔ نذیر بھی اس شناسائی کے دوران پہلی بار میرے فلیٹ پر آیا تھا اور مجھے حیرت تھی کہ اسے میرا پتا کیسے معلوم ہوا؟

”سوری شیراز، تمہیں ڈسٹر ب کیا لیکن مسٹر فراز کو تم سے کچھ کام پڑ گیا تھا۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ مجھے ان کے ساتھ آنا پڑا۔“

”خوش آمدید..... لیکن مسٹر فراز.....؟“

”شام کو بیگم شاہ کے ساتھ آئے تھے اور بیگم شاہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ یہ لوگ میرے پرانے کرم فرما ہیں اور پھر انسانی ہمدردی بھی ضروری ہے۔“

”میرے لائق کوئی خدمت ہے تو میں حاضر ہوں۔“

میں نے فراز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایک عجیب سی کہانی سنانے آیا ہوں..... مسٹر شیراز..... لیکن کیا، کیا جائے۔ اس دنیا میں ایسی ہی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ بیگم شاہانہ شاہ میری بہن ہیں ان کے شوہر یعنی میرے بہنوئی شاہ عالم، بہت بڑا کاروبار کرتے تھے۔ بیگم شاہ کے دو بچے تھے۔ نادرہ شاہ عالم اور زین شاہ عالم زندگی میں غم نہ ہوں تو شاید وہ ادھوری کہلائی ہے۔ میری بہن پر اس وقت غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے جب شاہ عالم صاحب زین کے ساتھ سوئیڈن جا رہے تھے۔ فضائی حادثہ ہوا اور اعلان کے مطابق تمام مسافر ہلاک ہو گئے۔ انہی میں میرا بھانجا زین اور بہنوئی شاہ عالم صاحب بھی تھے۔ ہم نے لاشیں حاصل کرنے کی بے انتہا کوششیں کیں لیکن حادثہ ایک دشوار گزار پہاڑی راستے میں ہوا تھا اور لاشیں مسخ ہو گئی تھیں۔ جولائیں بہ مشکل تمام لاشیں جاسکیں وہ ناقابل شناخت تھیں۔ چنانچہ ہم مجبور ہو گئے۔ میری بہن تین ماہ تک سکتے کی کیفیت کا شکار رہی اور اس کے بعد ان کی حالت سنبھلی۔ تب بھی ان کی ذہنی حالت درست نہ ہو سکی۔ انہیں آج بھی یقین ہے کہ وہ دونوں زندہ ہیں اور کہیں بھٹک رہے ہیں۔ وہ ضرور واپس آ جائیں گے۔ تمام معاملات میں وہ بالکل ٹھیک ہیں لیکن ان دونوں کی واپسی کے سلسلے میں بالکل سنجیدہ ہیں۔ براہ کرم یہ تصویر دیکھیں۔“ فراز صاحب نے جیب سے ایک تصویر نکال کر میرے سامنے رکھ دی اور میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ میری تصویر تھی۔ میں ایک قیمتی سوٹ میں ملبوس مسکرا رہا تھا۔

”اسے دیکھ کر تمہیں صورت حال کا کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا۔ یہ زین ہے۔“

”زین.....!“ میرے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

”ہاں، میرا بھانجا زین..... مرحوم..... آج آپ ہی کو دیکھ کر ان کی حالت خراب ہو گئی تھی اور وہ اس میں حق بجانب ہیں، آپ کی صورت ہو بہو زین سے ملتی ہے۔ میں نے تو غور بھی نہیں کیا تھا لیکن نادرہ نے میری راہنمائی کی۔ وہ خود بھی آپ کو دیکھ کر رنگ رہ گئی تھی۔“

رکاوٹ

جنت میں جانے سے رکاوٹ کا باعث مطعم رضی اللہ عنہ سے سیدنا جبریل علیہ السلام کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔“ صحیح بخاری سے اقتباس

مرسلہ: محمد قیصر شہزاد، داجل، ضلع راجن پور

مجھے اسٹور میں داخل ہونے والی لڑکی یاد آئی جو واقعی مجھے دیکھ کر رنگ سی رہ گئی تھی۔

”مسٹر شیراز! ڈاکٹر پہلے ہی اس مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں۔ وہ میری بہن کو مریضہ قرار نہیں دیتے اور ان کا کہنا ہے جو کچھ ان کے ذہن میں ہے اسے کھولا نہیں جاسکتا۔ کوئی واقعہ کوئی حادثہ ہی ان کے ذہن کو ٹھیک کر سکتا ہے۔ کیا آپ اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں؟“

”میں..... میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”آپ کو زین بنا ہوگا۔ آپ کو زین بن کر انہیں پرسکون کرنا ہوگا اور جب ان کے بے قرار دل کو سکون آ جائے گا تو پھر کسی بھی طرح ہم انہیں حقیقت بتا دیں گے۔ اب شیراز صاحب، آپ کی اس کاوش کے لیے معاوضے کی پیش کش کمینگی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن آپ کا جو وقت صرف ہوگا اس کے لیے آپ کو..... آپ کو میں پچاس لاکھ روپے کی پیشکش کرتا ہوں۔“

مجھے بڑے زور سے چکر آ گیا۔ کلیجہ حلق میں آ پھنسا۔ یوں لگا جیسے کانوں کے پاس زوردار دھماکے ہوئے ہیں، سماعت شکن دھماکے۔ فراز صاحب کہہ رہے تھے۔ ”ویسے بھی یہ ثواب کا کام ہے، ایک ماں کی مامتا کو سکون پہنچانے کا صلہ آپ کو خدا کے ہاں بھی ملے گا۔“

”میرے خیال میں شیراز کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تو ایک نیک کام ہے۔ فراز صاحب، آپ اطمینان رکھیں۔ میرا دوست انکار نہیں کرے گا۔ میں اسے جانتا ہوں۔ آپ اس سے مل لیے بس مطمئن ہو جائیں۔ کل اسے آپ کی خواہش کے مطابق زین کی حیثیت سے کوئی میں پہنچا دیا جائے گا۔“

”کل جس وقت آپ کہیں گے نذیر صاحب، آپ

کے اسٹور پر آ جاؤں اور انہیں ساتھ ہی لے جاؤں گا۔“
 ”بارہ بجے تک مناسب رہے گا۔“ نذیر نے مجھ سے
 پوچھے بغیر کہا۔ مجھ سے پوچھتا، تب بھی میں شاید ہی کوئی
 جواب دیتا۔ میری کیفیت تو خود بیگم شاہ جیسی ہو گئی تھی۔ 50
 لاکھ میری سارے خوابوں کی تعبیر۔ میری چچا کی کار فیض آباد
 کی طرف دوڑ رہی تھی۔ سارا راستہ میری نگاہوں کے سامنے
 تھا۔ تالیابی کے نو بچے اور ان کے درمیان میرا مقام..... یہ
 سب کچھ میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ نجانے کس طرح میں
 نے فراز صاحب سے ہاتھ ملا کر انہیں رخصت کیا تھا۔ نذیر
 البتہ انہیں کار تک چھوڑ کر واپس آیا تھا۔
 ”یار شیراز..... میں نے تیری طرف سے اقرار تو کر لیا
 مگر تیری خاموشی مجھے پریشان کر رہی ہے۔“
 ”نہیں.....! ٹھیک ہے۔ میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔“
 ”کیا.....؟“

”کوئی گھپلا نہ ہو۔ یہ ایک بڑا شہر ہے۔ بڑی بڑی
 چالیں چلی جاتی ہیں یہاں۔“
 ”بہت پرانے کسٹمر ہیں یہ لوگ میرے۔ بڑے
 شریف لوگ ہیں ان کی ضمانت میں لیتا ہوں اور پھر یار، برا
 مت ماننا، پچاس لاکھ میں تو تمہاری تقدیر بدل سکتی ہے۔ کاش
 میں اس کا ہم شکل ہوتا۔“ نذیر نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں بھی
 ہنسنے لگا، پھر میں نے پوچھا۔

”تمہیں میرا پتا کیسے معلوم ہو گیا نذیر.....؟“
 ”تم نے ہی بتایا تھا ایک بار بھول گئے؟“
 ”ہاں! مجھے یاد نہیں۔ بہر حال میری نوکری.....“

”او میری نوکری..... پچاس لاکھ مل جائیں گے تو ایک
 گارمنٹ اسٹور کھول لیتا، زندگی بھر عیش کرو گے۔ پیسا تمہارا
 تجربہ میرا۔ ویسے اگر تم چاہو تو چھٹی لے لو۔ یہ بھی احتیاطاً کہہ رہا
 ہوں۔ ورنہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ پرائیویٹ نوکری ہے۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ میں نے کسی سحر زدہ شخص کے سے
 انداز میں گردن ہلا دی۔ نذیر مجھے اونچ نیچ سمجھا تا رہا اور پھر
 دن کے گیارہ بجے مجھے اپنے اسٹور پہنچ جانے کی ہدایت
 کر کے چلا گیا لیکن یہ رات میرے لیے بے چین کر دینے
 والی رات تھی۔ کیا واقعی قسمت مہربان ہو گئی تھی مجھ پر؟

یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو جائے گا؟..... خوف،
 مسرت، بے یقینی اور صبح کا انتظار نہ جانے کس طرح یہ رات
 گزری تھی۔ صبح پانچ بجے ہی چائے تیار کی غسل کیا، شیو بنایا
 اور فلیٹ کی ایک ایک چیز کو کریدتا رہا۔ شاید اس کے بعد اس
 فلیٹ میں آنا نہ ہو تو ضرورت بھی کیا تھی۔ مستقبل کے بے شمار

منصوبے ذہن میں آرہے تھے اور میں نے اس خیال سے
 انہیں دماغ سے جھٹک دیا تھا کہ یہ سب قبل از وقت تھے۔
 گھڑی کی سوئیاں جم گئی تھیں۔ ساڑھے نو بجے گھر سے نکلا اور
 ایک دکان سے دفتر فون کیا کہ آج دفتر نہیں آؤں گا اور پھر
 نذیر کے اسٹور کی جانب روانہ ہو گیا۔

ساڑھے دس بجے نذیر کے اسٹور کے لڑکے اسٹور
 کھولتے نظر آئے۔ اس وقت تک میں دوبار ایک چھوٹے
 ہوٹل پر چائے پی چکا تھا۔ گیارہ بج کر تین منٹ پر میں نذیر
 کے اسٹور میں داخل ہوا تھا۔

”ابھی ابھی فراز صاحب کا فون آیا تھا۔ بے چارے
 تمہارے بارے میں فکر مند تھے۔ سوچ رہے تھے کہ کہیں تم
 اپنا خیال نہ بدل دو۔ کہہ رہے تھے کہ بیگم شاہ مسلسل زین کی
 گردان کر رہی ہیں۔ میں انہیں ٹیلی فون کر دوں۔“

میری اجازت پر نذیر نے فراز صاحب کو فون کر دیا
 اور تھوڑی دیر کے بعد فراز صاحب، نذیر کے اسٹور پر پہنچ
 گئے۔ اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا بریف کیس بھی لائے تھے۔
 انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں یہ لباس پہن لوں اور زین بن
 جاؤں۔ یہ سب کچھ بے حد عجیب لگ رہا تھا۔ لیکن اسی میں
 میرا سنہرا مستقبل چھپا ہوا تھا۔ لباس پہننے کے بعد میں نے چند
 انکسٹریاں بھی پہنیں جو فراز صاحب اپنے ساتھ لائے تھے۔
 نذیر نے مجھے آنکھ ماردی اور اظہار کیا کہ میں بچ رہا ہوں۔
 فراز صاحب نے بھی حیرت ناک لہجے میں کہا تھا کہ میں ہو بہو
 زین لگ رہا ہوں۔

بہر طور میں فراز صاحب کے ساتھ ایک خوب صورت
 کونٹری کے احاطے میں داخل ہو گیا اور اس کے بعد مجھے بیگم شاہ
 کے پاس پہنچا دیا گیا۔ بیگم شاہ اس طرح مجھ سے لپٹ کر بلک
 بلک کر روئیں کہ خود میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ایک
 لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ کاش میں سچ سچ زین ہی ہوتا۔
 بہر طور اس کے بعد نہ جانے کیا کیا ہنگامے رہے۔ فراز
 صاحب نے مجھے کہہ دیا تھا کہ میں ہر خطرے سے بے نیاز
 ہو جاؤں اور جو کوئی بھی مجھے ملے۔ اسے یہ نہ بتاؤں کہ میں
 زین نہیں ہوں۔ بیگم شاہ ایک لمحے کے لیے بھی مجھے خود سے
 جدا نہیں ہونے دیتی تھیں۔

عہدہ کھانا، سوٹوں کے انبار، ضرورت کی ہر شے موجود
 تھی۔ یہ تھی زندگی، اسے زندگی کہتے ہیں۔ میں اجنبی سیاروں
 کے اجنبی لوگوں کی مانند اجنبی بن گیا تھا۔ کتنا تضاد تھا انسانی
 زندگی میں، ایک طرف مسائل کے انبار اور دوسری جانب
 عیش و عشرت کا یہ انداز.....

وقت گزرنے لگا۔ نادرہ مجھ سے شرارتیں کرتی تھی
 لیکن پھر اچانک سنجیدہ ہو جاتی تھی۔ ایک بار اس نے مجھ سے
 کہا کہ جو مسرتیں میں نے اس گھر کو لٹائی ہیں ان کے بارے
 میں یہ سوچ کر انتہائی خوف محسوس ہوتا ہے کہ وہ عارضی ہیں۔
 نادرہ مجھے بھائی جان کہتی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ فراز
 صاحب خطرناک آدمی تھے اور بارہا میں نے محسوس کیا تھا کہ
 وہ میری نگرانی کرتے ہیں۔ یقیناً سوچتے ہوں گے کہ کہیں
 میں اپنی اس حیثیت سے کوئی ایسا فائدہ نہ اٹھا لوں جو ان
 لوگوں کے لیے نقصان کا باعث بن جائے۔ لیکن مجھے اپنے
 ان پچاس لاکھ سے غرض تھی۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں
 چاہتا تھا۔ یہ بھی سوچ کا ایک انداز تھا۔ میں ظاہر ہے جرائم
 پیشہ نہیں تھا کہ کچھ اور پلاننگ کرنے لگتا۔ پچاس لاکھ ہی مل
 جائیں تو غنیمت ہیں۔

مجھے یہاں آئے ہوئے ایک مہینہ اور دس دن گزر چکے
 تھے۔ اس دوران کبھی بھول کر بھی میں نے اپنے دفتر یا فلیٹ کا
 رخ نہیں کیا تھا۔ البتہ مکان مالک کو میں نے کرایہ بذریعہ منی
 آرڈر روانہ کر دیا تھا تاکہ میرا وہ جھوپڑا برقرار رہے جو میرا
 سہارا تھا۔ غالباً ایک مہینے کے بعد یہ گیارہواں دن تھا، میں
 اپنی خوب صورت کونٹری کے لان میں بیٹھا ہوا نادرہ سے گفتگو
 کر رہا تھا۔ کونٹری کے صدر گیٹ سے ایک مفلوک الحال سا
 نوجوان اندر داخل ہوا اور آگے بڑھتا ہوا ہمارے قریب پہنچ
 گیا۔ میں تو اسے پہچان نہ سکا لیکن نادرہ کے حلق سے ایک
 ولدوز آواز نکلی۔

”زین بھائی!“ اور میں کرسی سے گرتے گرتے بچا۔
 بڑھی ہوئی ڈاڑھی، بوسیدہ لباس، اچھے ہوئے بال یقیناً اس
 کی شخصیت کو بدلنے کا باعث بن گئے تھے لیکن خدو خال پر
 غور کیا تو مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ اصل زین ہے۔ میرا کلیجہ
 خون ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے زمین گھومتی ہوئی
 محسوس ہوئی تھی اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہ
 گیا۔ زین واپس آ گیا تھا۔ نادرہ سسک سسک کر رو رہی تھی
 اور زین بھی اس سے لپٹا ہوا تھا۔ نادرہ نے مجھے یکسر نظر انداز
 کر دیا اور زین کو لیے ہوئے کونٹری کے اندرونی حصے میں پہنچ
 گئی۔ میں ساکت و جامد اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ یہ عجیب و غریب
 واقعہ تھا۔ بالکل فلموں کے مانند، کہانی میں ذرا سی تبدیلی ضرور
 تھی لیکن تھیم وہی تھا۔ اصل شخص آ گیا تھا اور نقلی آدمی تنہا رہ گیا
 تھا۔ لیکن فراز صاحب نے مجھے تنہا نہ چھوڑا۔

بیگم شاہ تو بگڑی گئی تھیں مجھ پر..... اور انہوں نے مجھے
 پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی تھی لیکن خدا بھلا کر فراز

صاحب کا انہوں نے صورت حال کو سنبھال لیا اور پھر تمام
 تفصیلات ان لوگوں کو بتا دیں۔ زین نے میرا شکریہ ادا کیا اور
 اپنی ماں کی صحت مندی کے سلسلے میں میری کاوشوں کو سراہا،
 پھر فراز صاحب نے مجھے رخصت کرتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں شیراز صاحب!
 آپ کے قدم مبارک ثابت ہوئے ہمارا زین ہمیں واپس مل
 گیا۔ اس سلسلے میں، میں نے آپ سے کچھ وعدے کیے
 تھے۔ میں ان کی تکمیل کے لیے حاضر ہوں۔ اب آپ اپنی
 ذمہ داریاں سنبھال سکتے ہیں۔“

”مجھے خوشی ہے، فراز صاحب کہ میں اپنا کام خوش
 اسلوبی سے انجام دے کر واپس جا رہا ہوں۔“

”براہ کرم کچھ انتظار کیجیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ فراز
 صاحب نے کہا اور میرا رواں رواں مسرت سے کانپنے لگا۔
 میں جانتا تھا کہ فراز صاحب کہاں گئے ہیں۔ پچاس لاکھ
 روپے کے نوٹوں کی گڈیاں میری نگاہ میں گردش کر رہی
 تھیں۔ بس ایک لمحہ..... اور نقدیر چمکی۔

لیکن نقدیر چمکنے نہ پاکی۔ ایک زوردار دھڑ دھڑا ہٹ
 نے ہوش و حواس کم کر دیے۔ غالباً فراز صاحب پولیس کو لے
 آئے تھے۔ پچاس لاکھ روپے کے بجائے انہوں نے میری
 گرفتاری کا انتظام کر دیا تھا۔ میں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے
 دروازے کی جانب دیکھا۔ دھڑ دھڑا ہٹ پھر ہوئی اور میں
 ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آ گیا۔

وہی میرا فلیٹ تھا۔ ٹیپ ریکارڈ آن تھا لیکن کیسٹ ختم
 ہو چکا تھا اور اس کی سرسراہٹ کی آواز ابھر رہی تھی۔ ہاں یہ
 میرے جاگتے خواب ہی تھے جنہوں نے مجھے زندگی سے اتنا
 بیزار کر دیا تھا کہ بعض اوقات مرجانے کو جی چاہتا تھا۔

دروازے پر تیسری بار دھڑ دھڑا ہٹ ہوئی اور میں
 گالیاں بکتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ کیا سہانا تصور تھا۔ دروازے پر
 جو بھی کم بخت ہے کم از کم مجھے پچاس لاکھ روپے تو وصول
 کرنے دیتا۔ میں نے غصیلے انداز میں آگے بڑھ کر دروازہ
 کھولا تو مجھے ایک حسین شکل نظر آئی۔

میلے کپلے لباس، سبک اور نازک نقوش چہرہ گلابی،
 آنکھیں انتہائی دلکش، سرخ ہونٹ خشک تھے اور آنکھوں
 میں خوف و ہراس کی کیفیت تھی۔ میں ایک لمحے اس پر نگاہیں
 جمائے رہ گیا۔ عمر اٹھارہ انیس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ ابھی وہ
 کچھ کہنے بھی نہیں پاکی تھی کہ دفعتاً سامنے والے فلیٹ کا دروازہ
 کھلا اور ایک قوی پھل آدمی باہر نکل آیا۔

اس کی مونچھیں لمبی اور نوکیلی تھیں، چہرہ خطرناک،

آنکھیں گہری سرخ۔ اس نے خونی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور میں سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ تب وہ آگے بڑھا اور اس نے لڑکی کا بازو پکڑ کر اسے فلیٹ کی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔
 ”کیوں تیری موت آگئی ہے حرامزادی! ماری جائے گی بے موت میرے ہاتھوں..... اندر چل.....“ اس نے زور سے لڑکی کو دھکا دیا اور میری غیرت جاگ اٹھی۔ میں دروازے کے قریب آیا۔

”سنیے تو صاحب، سنیے تو.....؟“ میں نے کہا۔

”اوجا باؤ، کام کرا پتا۔ دوسروں کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔“ اس نے خونخوار لہجے میں کہا اور اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ میں حیرت زدہ سا کھڑا رہ گیا تھا۔ سامنے والا فلیٹ چار پانچ روز تو پہلے خالی ہی تھا۔ پتا نہیں یہ لوگ کب اس میں آگئے تھے مگر یہ شخص، یہ لڑکی.....؟ اس آدمی کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ کتنے زور سے دھکا دیا تھا اس نے لڑکی کو فلیٹ کے اندر..... لڑکی مجھ سے کچھ چاہتی تھی۔ نجائے کیا؟ فلیٹ میں واپس آیا اور دروازے بند کر کے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کون کون سے غم اپنے سینے میں پالوں؟ سر پکڑے بیٹھا رہا۔ عجز اثر پر اثر کا ڈائریکٹر بھی نہ بن سکا تھا اور نہ ہی زمین کی حیثیت سے اپنا رول ادا کرنے کے بعد پچاس لاکھ روپے وصول کر سکا تھا۔ یہ سارا تصور ان خاتون کی بے ہوشی سے پیدا ہوا تھا اور میرے ذہن نے ایک کہانی بن ڈالی تھی۔ ایک ایسی کہانی جو ہر طرح کے جھول سے پاک تھی۔ کوئی بھی مسئلہ نہیں رہ گیا تھا۔ سوائے پچاس لاکھ روپے وصول کرنے کے۔

لعنت ہے مجھ پر، لعنت ہے۔ میں نے زور سے گال پر دو تھپڑ لگائے اور بستر پر لیٹ گیا۔ دوسرے لمحے سامنے والے فلیٹ کی حسین لڑکی کی سوالیہ نگاہیں میرے سامنے آگئیں۔ کون ہے یہ؟ کون ہو سکتا ہے وہ ظالم شخص جو اتنی حسین لڑکی پر ظلم کر رہا ہے۔ یقیناً اس لڑکی کا سوتیلا باپ..... ماں نے باپ کی موت کے بعد اس شخص کے چنگل میں پھنس کر دوسری شادی کر لی ہوگی اور اس شخص نے، جو چنگل سے ہی جرائم پیشہ نظر آتا ہے، بیوی کو زبردستی کر ہلاک کر دیا ہوگا اور اس کی بری نیت اس لڑکی پر ہوگی۔ صبح کو یہاں سے سیدھے پولیس اسٹیشن جانا چاہیے اور پولیس افسر کو اس صورت حال سے آگاہ کرنا چاہیے۔

انسانی ہمدردی بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور پھر وہ خوب صورت لڑکی جو یقیناً میرے پاس فریاد لے کر آئی ہوگی۔ مجھے یہ بتانے آئی ہوگی کہ وہ اس ظالم شخص کے چنگل میں پھنسی ہوئی

ہے۔ میں اس کی مدد کروں یا پھر ہو سکتا ہے..... لڑکی کا باپ کوئی جواری اور شرابی آدمی ہو اور اس نے نشے کی ترنگ میں لڑکی کا ہاتھ اس شخص کے ہاتھ میں دے دیا ہو۔ آہ.....! کیسی دلدوز بات ہے۔ اتنی معصوم اور حسین لڑکی، اتنی کم عمر اور خوب صورت..... اور قوی پہل بدل معاش اس کا شوہر۔ کیا کرنا چاہیے۔ کوئی ایسی ترکیب سوچوں کہ میں اس لڑکی کی مدد کر سکوں۔

دوسرے دن صبح جب میں باہر نکلا تو سامنے والے فلیٹ میں تالا لگا ہوا تھا۔ کیا یہ صرف میرا تصور تھا۔ کیا میں نے پھر جاگتی آنکھوں کوئی خواب دیکھا تھا؟ لیکن ابھی میں اپنے دروازے کا تالا بھی نہیں لگا سکا تھا کہ دفعتاً بند تالے کے پیچھے ہلکی سی آہٹ ہوئی اور میں چونک پڑا، کوئی اندر موجود تھا..... میں ادھر ادھر دیکھ کر دروازے کے پاس پہنچ گیا پھر میں نے..... دروازے کی جھری سے منہ لگا کر کہا۔

”اندر کون ہے.....؟“

”میں ہوں..... میں..... میں ایک مظلوم لڑکی ہوں۔ اس شخص کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہوں۔ اس نے مجھے اغوا کیا ہے۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے، میری مدد کیجیے۔ خدا کے لیے میری مدد کیجیے۔“

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس شخص کے بارے میں جو کچھ میں نے سوچا تھا، وہ اس شکل میں نہ سہی لیکن دوسری صورت میں درست تھا۔ لڑکی اس کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر بولا۔
 ”کیا اس سے تمہاری کوئی رشتہ داری ہے؟ تم اسے پہلے سے جانتی ہو؟“

”یہ بد معاش اور خطرناک آدمی ہے۔ میں بے سہارا ہوں۔ میرے ماں باپ مر چکے ہیں اور یہ مجھے زبردستی میرے گھر سے اغوا کر کے اس نامعلوم جگہ لے آیا ہے۔ خدا کے لیے میری مدد کرو۔ پتا نہیں، یہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتا ہے۔ یہ مجھے یہاں بند کر کے چلا جاتا ہے اور میں اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ میری مدد کرو۔ خدا کے لیے میری مدد کرو۔“ لڑکی کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔

میں ساکت رہ گیا تھا۔ میں نے کبھی خود کو بہت بہادر آدمی نہیں سمجھا اور لڑائی بھڑائی اور جھگڑوں کے معاملات سے دور ہی بھاگتا رہا ہوں لیکن اس لڑکی کے لیے میرے دل میں ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ اس شخص کی صورت ذہن میں آتی تو وحشت ہونے لگتی، کتنا خوفناک آدمی تھا اور کتنے خطرناک

لہجے میں اس نے کہا تھا کہ میں اپنے کام سے کام رکھوں۔ لڑکی کی سسکیاں اب بھی ابھر رہی تھیں۔ میں اسے کوئی جواب نہیں دے سکا اور خاموشی سے سیڑھیاں اتر کر چلا گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ دل کہتا تھا کہ پولیس اسٹیشن چلا جاؤں اور تمام صورت حال پولیس کو بتا دوں۔ لیکن پھر اندر سے خوف بھی ابھرنے لگا۔ وہ خطرناک آدمی میرا دشمن بن جائے گا اور اس کے بعد نہ جانے وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے۔ کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ پولیس اسٹیشن کا رخ تو نہیں کیا لیکن ذہن اسی سوچ میں گم تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ دفتر میں بھی دن بھر دل نہیں لگا تھا۔ شام کو سیدھا فلیٹ پر واپس آیا اور سامنے والے دروازے کو دیکھا۔ تالا کھلا ہوا تھا اور اندر سے آوازیں ابھر رہی تھیں لیکن کوشش کے باوجود اتنی ہمت نہ پڑی کہ میں اس دروازے تک جاتا۔ اپنے فلیٹ کا تالا کھولا اور اندر آ گیا۔ معمولات جوں کے توں تھے۔ منہ ہاتھ دھویا۔ دپٹی میں چائے کا پانی چڑھایا، ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور میں اچھل پڑا۔

بہر طور آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو وہی شخص کھڑا ہوا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی۔ دل تو اس خوف کا شکار تھا کہ کہیں اسے صبح کی گفتگو کے بارے میں معلوم نہ ہو گیا ہو اور اس وقت وہ کسی خطرناک ارادے سے یہاں نہ آیا ہو۔ لیکن اس کی مسکراہٹ بتاتی تھی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بہر طور میں نے سنبھل کر کہا۔
 ”جی فرمائیے؟“

”باؤ جی! پڑوسی ہوں، آپ کا۔ سامنے والے فلیٹ میں آیا ہوں نیا نیا۔ آپ اکیلے رہتے ہیں جی؟“ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ وہ مجھ سے راہ رسم بڑھاتا چاہتا ہے شاید۔ بہر طور لڑکی کی مدد کے سلسلے میں اگر تھوڑی سی چالاکی سے کام لے لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے فوراً ہی اپنا انداز تبدیل کر لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہاں بھائی اکیلا ہی رہتا ہوں۔ نوکری پیشہ ہوں، دفتر جاتا ہوں، گھر آ جاتا ہوں۔ اندر آؤ.....“ وہ ہنستا ہوا اندر آ گیا تھا۔

بڑے شہر کی زندگی بھی کیا خوب ہے جی آدمی اور مشین میں کوئی فرق ہی نہیں لگتا۔

”ہاں بیٹھو۔ میں ذرا چائے نکال لاؤں۔“

”اونیں جی! اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے؟“
 ”بن رہی ہے۔“ میں نے کہا اور باورچی خانے میں داخل ہو گیا۔ چائے کی دو پیالیاں بناتے ہوئے میں اس سے گفتگو کرنے کے لیے مناسب طریقہ کار منتخب کر لیا تھا۔ اس سے بات کر کے ہی لڑکی کی مدد کی جاسکتی تھی۔ باہر آ کر میں نے ایک چائے کی پیالی اسے دی اور دوسری خود لے کر بیٹھ گیا۔

”تم کہیں باہر سے آئے ہو شاید.....؟“

”ہاں..... جی! نند پور سے آیا ہوں۔“ اس نے کہا اور میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ کم از کم یہ بات اس نے سچ بتائی ہے۔

”کیا یہاں نوکری کی غرض سے آئے ہو؟“

”اور نہیں جی! نوکریاں اتنی آسانی سے کہاں ملتی ہیں۔ ہم تو دیے بھی زمیندار ہیں جی۔ اپنی زمینیں ہیں، بل چلاتے ہیں اور زمین سے اپنی روزی حاصل کرتے ہیں مگر باؤ جی کبھی بھی تقدیر ایسا چکر چلاتی ہے کہ بات سمجھ سے باہر نکل جاتی ہے۔“ اس نے چائے کی پیالی رکھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ میں گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر میں نے کہا۔

”کیوں خیریت۔ کیا بات ہے؟“

”بس باؤ جی محنت مزدوری کر رہے تھے۔ زندگی گزار رہے تھے کہ ایک مصیبت آن پڑی۔ اپنا نام رحیم خان ہے جی۔ اپنے بڑے بھائی بھی تھے..... خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ بھائی اور بھالی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایک بیٹی ہمارے سر چھوڑ گئے۔ ہم نے شادی کبھی نہیں کی جی۔ بس حالات نے اجازت ہی نہیں دی۔ اس بیٹی کو پالنے لگے اور محنت مزدوری کر کے یہ کوشش کرنے لگے کہ وہ بڑی ہو جائے اور اس کے ہاتھ پہلے کر کے اپنا فرض پورا کریں۔ دنیا میں اور تھا ہی کون..... بیٹی جان سے پیاری تھی۔ دوسرے رشتہ داروں میں اور کوئی اتنا سگائیں تھا۔ جو اپنی طرف توجہ دیتا۔ بچی ٹھیک ٹھاک پلتی رہی۔ بڑی ہو گئی پر خدا کا کرنا ایسا ہوا جی کہ اچانک ہی اسے ایک زہریلے سانپ نے کاٹ لیا۔ ہم نے اس کا علاج کرایا۔ باؤ جی، جاں تو بچ گئی اس کی، پر زہر دماغ پر چڑھ گیا اور وہ پاگل ہو گئی۔ ہماری جتنی ہمت تھی باؤ جی ہم نے اس کا علاج کرایا۔ مختلف شہروں میں علاج کے لیے مارے مارے پھرتے رہے پر فائدہ کچھ نہ ہوا۔ ہماری زندگی میں کچھ اور تو تھا نہیں، بس یہی بچی اپنا سب کچھ ہے، ہم نے سوچا رحیم خان تیری زندگی میں اور کیا رکھا ہے جس

پودے کو اتنا پروان چڑھایا اس کے لیے اپنی آخری پونجی بھی لگا دے تو باؤجی ہم اس کو یہاں لے آئے ہیں۔ ابھی یہاں رہ رہے ہیں۔ کچھ انتظامات کر رہے ہیں، تھوڑے دنوں کے بعد اسے دماغی اسپتال میں داخل کرا دیں گے۔ بس جی یہ ہے کہانی۔ کبھی بھی دل جھنجھلا جاتا ہے تو اسے برا بھلا بھی کہہ دیتے ہیں۔ پھر گھنٹوں آنسو بہانے پڑتے ہیں۔“ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں اور میں اپنے آپ پر نادم ہو رہا تھا۔

کیا دماغ کی خرابی ہے۔ یہ الٹے سیدھے خوابوں نے تو مجھے پاگل کر کے رکھ دیا ہے اور شاید وہ دن دور نہیں ہوگا، جب میرا بھی کوئی عزیز میرے لیے اس طرح بیٹھا رہا ہو۔ ممکن ہے تاجا جان کو اطلاع مل جائے کہ چچائی کا رلانا کا دعوے دار ایک اسپتال میں پڑا ہوا ہے، بلاوجہ میں نے اس بے چارے کے بارے میں نہ جانے کیا کیا ہوائی قلعے بنا لیے تھے۔ یہ تو اچھا خاصا معقول آدمی تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ خوب صورت لڑکی پاگل ہے اور ذہنی طور پر بیمار اور اسی بیماری کے عالم میں اس نے یہ تمام کبواس کی تھی۔ بہر طور میں نے اس شخص کا دل دکھانا مناسب نہ سمجھا اور اسے پیشکش کی کہ اسے میری جس طرح بھی مدد کی ضرورت ہو۔ میں حاضر ہوں۔ اس نے کلائی کی آستین سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

”بس باؤجی دعا کرو کہ ہمارا مقصد پورا ہو جائے۔ تھوڑا سا کام باقی رہ گیا بس انتظار کر رہے ہیں۔ چند دن کے بعد اسے اسپتال میں داخل کرا دیں گے اور پھر اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کریں گے۔ زیادہ وقت لگا تو پھر واپس چلے جائیں گے اور اگر ڈاکٹروں نے کچھ امید دلائی تو پھر باؤجی اس وقت تک یہیں پڑے رہیں گے جب تک یہ ٹھیک نہ ہو جائے۔“

”تم فکر نہ کرو، رحیم خان۔ تمہاری بیٹی یقیناً ٹھیک ہو جائے گی۔“ رحیم خان تھوڑی دیر تک میرے ساتھ بیٹھا رہا۔ اتنا برا آدمی نہیں تھا جتنا میں نے سمجھا تھا۔ بعض صورتیں دھوکا دیتی ہیں۔ میں اس کے لیے دل میں کافی ہمدردی محسوس کرتا رہا۔

دوسرے دن جب میں دفتر جانے کے لیے اپنے گھر کے دروازے کو تالا لگا رہا تھا تو اس دروازے پر پھر آہٹ سنائی دی۔ دروازے پر باقاعدہ دستک دی جا رہی تھی اور میں جانتا تھا کہ دروازے پر دستک دینے والا کون ہے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور دروازے پر پہنچ گیا۔

”ہاں..... کہو کیا بات ہے؟“

”بابو جی! آپ نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔ میں تو

سارا دن انتظار کرتی رہی۔ میں تو یہی سوچتی رہی کہ شاید آپ کے دل میں میرے لیے رحم آجائے اور آپ میری مشکل آسان کر دیں۔ خدا کے لیے بابو جی! میں آپ کی زندگی بھر احسان مند رہوں گی۔ مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دیں۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔“ آواز میں ایک ایسا سوز تھا کہ میرا ذہن پھر ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ یہ الفاظ کسی پاگل لڑکی کے تو نہیں ہو سکتے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

”تمہارا کیا نام ہے؟“

”مہ جی! میں آپ کو کس نام سے پکاروں بابو جی؟“

”میرا نام شیراز ہے، مہ جی!..... تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

”مر رہی ہوں، زندگی کے عذاب میں گرفتار ہوں۔ اس خوف کا شکار ہوں کہ نہ جانے میرا کیا حشر ہونے والا ہے۔ انسانیت کے نام پر میری مدد کیجیے بابو جی۔ میں آپ کی غلام بننا پسند کروں گی۔ بابو جی اس شخص کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔ یہ مجھے دھمکیاں دیتا رہتا ہے، کہتا ہے کہ اگر میں نے کسی کے سامنے زبان کھولی تو میری گردن دبا دے گا۔ خدا کے لیے بابو جی خدا کے نام پر.....“

میرے ذہن میں انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ ایک طرف رحیم خان تھا جس کا کہنا تھا کہ یہ اس کی بھتیجی ہے اور دوسری طرف مہ جی جو اسے ایک غنڈا بتاتی تھی۔ اب اگر پولیس سے رابطہ قائم کیا جائے اور میری دی ہوئی اطلاع غلط نکلے تو پھر خواہ مخواہ پریشان ہونا پڑے گا اور اگر لڑکی کی فریاد کو نظر انداز کر دیا جائے تو ضمیر کچھ دینے لگتا تھا۔

دوسرے دن بھی شام کو رحیم خان سے ملاقات ہوئی۔ وہ دستک دے کر خود ہی میرے پاس آیا تھا۔ کچھ تعویذ اس کی مٹھی میں تھے۔ کہنے لگا..... ان کوششوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنی بیٹی کے لیے پیروں فقیروں کے درباروں میں بھی جاتا ہے اور تعویذ گنڈے کراتا رہتا ہے، کہیں سے ہی کچھ ہو جائے۔

میں نے ایک بات محسوس کی کہ رحیم خان کی آواز میں تشویش تو ہوتی تھی لیکن کچھ عجیب سا انداز ہوتا تھا اس کا۔

بہت الجھنوں میں پڑ گیا تھا میں ان دنوں۔ مہ جیوں بھی روزانہ اس وقت کا انتظار کرتی تھی جب میں اپنے دروازے کو تالا لگاؤں۔ ایک دن اس نے یہ بات کہہ بھی دی۔

”شیراز تم، میرے بارے میں کچھ سوچو یا نہ سوچو۔ میں نے اس کا نام بھی لکھ کر لے گیا ہے اور کہہ گیا ہے کہ آپ جب بھی آئیں، تمہانے پہنچ جائیں۔“ میرے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ بہر طور معلومات کرنے پر پتا چلا کہ رحیم بخش بردہ فروشوں کے ایک گروہ سے تعلق رکھتا ہے اور وہ ایک لڑکی کو اغوا کر کے یہاں لے آیا تھا اور اسے فروخت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آج جب چند لوگ لڑکی کو دیکھنے کے لیے یہاں پہنچے تو پولیس بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی آگئی کیونکہ ان میں سے چند افراد پولیس کی نگاہوں میں مشتبہ

میں وہی سب کچھ لکھا ہے جو وہ شخص چاہتا ہے۔ میں اب تم سے دوبارہ مدد کی درخواست نہیں کروں گی۔ کرنا ہوتا تو تم پہلے ہی میرے لیے کچھ کر بیٹھتے، لیکن ایک بات یاد رکھنا شیراز تمہارا ضمیر ہمیشہ تمہیں پریشان کرتا رہے گا کہ ایک مظلوم لڑکی تم سے مدد کی درخواست کرتی رہی اور تم نے اس کے لیے کچھ نہ کیا.....“

میں خاموش رہا، لیکن اس کے یہ الفاظ دن بھر میرے ذہن پر ہتھوڑے کے مانند برستے رہے اور میں کرب و اذیت کا شکار ہو گیا۔ اس دن پھر میں نے شام کو نذیر کے شوروم کا رخ کیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا۔

”کہاں رہے بھی اتنے دن شیراز؟ ہم تو روزانہ ہی تمہارا انتظار کرتے ہیں۔ نکل آیا کرو یار، آج کل تو ویسے بھی کاروبار کچھ مدھم پڑا ہوا ہے۔“

”نذیر میری کچھ مدد کرو۔“ میں نے کہا اور نذیر سن بھل کر مجھے دیکھنے لگا۔

”خیریت، کیا بات ہے؟“

میں نے نذیر کو تمام تفصیل سنا دی۔ وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”واقعی الجھن والی بات ہے، غلط اطلاع پر پولیس بھی بگڑ جاتی ہے اور پھر رحیم خان، وہ کیا سوچے گا تمہارے بارے میں۔ بہتر یہی ہے کہ خاموشی اختیار کرو اور صورت حال کا جائزہ لیتے رہو۔“

نذیر بھی مجھے کوئی تسلی بخش مشورہ نہیں دے سکا تھا۔ سات ساڑھے سات بجے جب میں فلیٹ واپس پہنچا تو لوگ غیر معمولی طور پر اس بلڈنگ کے ارد گرد جمع تھے میں جس میں رہتا تھا یقیناً کوئی خاص واقعہ ہو گیا تھا..... میں پہنچا تو میرے چلی منزل کے ایک پڑوسی نے بتایا۔

”کمال ہے شیراز صاحب! آپ کو پتا بھی نہیں چل سکا اور وہ بد معاش یہاں اپنی من مانی کرتا رہا۔ آپ کا دروازہ تو اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے ہے۔“

”کیا ہوا، کیا بات ہے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

پردہ نشین

ملک صفدر

بات جب تک پردے میں رہے تب تک بظاہر خیریت بھی رہتی ہے مگر... یہ قول شخصے ”بکے کی ماں کب تک بخیر منائے گی“ بالخصوص جب ملک صفدر کے پاس کیس ہو اور مجرم پردہ کیے چین کی بانسری بجاتا رہے، ایسا کہاں ممکن... لہو جب تک رگوں میں دوڑے زندگی بھی دوڑتی ہے اور جب زمین پر رہے تو کتنے ہی دامن رنگین کرجاتا ہے... اور یہ رنگینی خواہ دامن کی ہو یا لمحات کی بعض اوقات بڑی سنگین صورت حال سے دوچار کر دیتی ہے۔ وہ جو شکار کرنے نکلے تھے جب خود شکار ہوئے تو احساس ہوا کہ قید تنہائی کس قدر بڑا عذاب ہے۔

گاؤں کی خاموش فضاؤں میں بپتے لہو کی چیخ و پکار

”اتنی رات کو کون آیا ہے بھی.....؟“

اس مرتبہ بھی میری آواز صدا بہ صحرائی ثابت ہوئی۔ باہر بہ دستور خاموشی طاری تھی۔ ایسی بات نہیں تھی کہ میں دروازہ کھولتے ہوئے کسی قسم کا ڈر یا خوف محسوس کر رہا تھا، جب میری دوسری پکار بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی تو میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

باہر مجھے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ تاحدنگاہ تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ میں نے گھور گھور کر اندھیرے میں کسی انسانی چہرے کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے اپنی اس کوشش میں ناکامی کا منہ ہی دیکھنا پڑا۔

میرا سرکاری کوارٹر تھانے کے عقبی حصے میں بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد دور تک سرسبز و شاداب کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے تھوڑی سی مڑگشت کر کے کوارٹر کے دونوں پہلوؤں میں اچھی طرح جھانک کر دیکھ لیا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ جی میں ایک خیال یہ بھی آیا کہ تھانے کے اندر جا کر

وہ ایک ٹھٹھرتی ہوئی گھپ اندھیری رات تھی۔

میں معمول کے کاموں سے فارغ ہو کر سونے کے لیے لیٹا تو دستک کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ اس وقت رات کے دس بجے کا عمل تھا۔ موسم کی مناسبت سے اتنی رات گئے کسی کا میرے کوارٹر کے دروازے پر دستک دینا کسی خطرناک اطلاع کے آثار ہی تھے۔ بہر حال میں نے گرم بستر چھوڑا اور ٹھنڈے ٹھار مچن میں سے گزر کر کوارٹر کے بیرونی دروازے پر پہنچا۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ شبینہ ڈیوٹی والے عملے میں سے کوئی آیا ہوگا۔

دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے احتیاطاً پوچھ لیا۔ ”کون ہے بھی؟“

میں توقع کر رہا تھا کہ جواب میں کوئی مردانہ آواز سنائی دے گی لیکن کیا مردانہ، کیا زنانہ..... کوئی آواز میری سماعت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ میں نے دوبارہ قدرے بلند آواز میں پکارا۔

صورت حال کا جائزہ لیتا ہوں لیکن پھر میں نے فوراً ہی اس خیال کو مسترد کر دیا اور دروازے کو کندی لگا کر دوبارہ بستر میں گھس گیا۔

میں سونے کے لیے لیٹ تو گیا تھا، تاہم ذہن اسی دستک کی طرف لگا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے یہ سوچ بھی ذہن میں ابھری تھی کہ یہ میرا وہم بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس رات بریلی ہوا میں بھی چل رہی تھیں۔ ممکن ہے، کوارٹر کا دروازہ ہوا کے تیز جھونکے سے بجا ہو۔

میں اس سوچ پر چند لمحے بھی نہیں رک پایا تھا کیونکہ میں اس آواز کو ہوا کی کارستانی سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہوا کی وجہ سے دروازہ بجتا اور کسی انسان کے ہاتھ کی دستک میں نمایاں فرق ہوتا ہے اور میں نے بڑی واضح دستک کی آواز سنی تھی۔

میں اپنے دماغ میں بکھری مختلف النوع سوچوں سے کافی دیر تک الجھتا رہا، پھر پتا نہیں کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

اگلی صبح، پچھلی رات کے موسمی تاثرات ہی کا عکس تھی۔ سورج کا کہیں نام و نشان نظر نہیں آتا تھا۔ گہری دھند نے فضا کی ہر شے کو اپنی آغوش میں چھپا رکھا تھا۔ یہ قول شخصے، ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ دھند کا سلسلہ گزشتہ کئی روز سے جاری تھا۔ اگرچہ دن کے وسطی حصے میں کبھی کبھار سورج اپنی موجودگی ظاہر کرنے کے لیے بادلوں کی اوٹ سے ہلکی پھلکی جھلک دکھاتا تھا لیکن اس کی تمازت ماحول کے حصے میں نہیں آتی تھی۔ ان دنوں ہر شے شدید سردی کی لپیٹ میں تھی۔ وہ جنوری کا مہینا تھا اور لگتا تھا، اب ہمیشہ جنوری ہی رہا کرے گا۔

میں نے حسب معمول ناشتا اپنے کوارٹر میں کیا پھر تیار ہو کر تھانے پہنچ گیا۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو رات والا واقعہ میرے ذہن میں تازہ تھا اور اب وہ سوچ کے رتھ پر سوار ہو کر میرے ساتھ ہی تھانے آ گیا تھا۔

میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر شبینہ ڈیوٹی والے اے ایس آئی کو اپنے پاس بلا لیا۔ مطلوب حسین میرے سامنے آ کر ایک کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”رات کیسی گزری مطلوب حسین؟“

”بڑی اچھی جناب.....!“ اس نے جواب دیا۔

”تھوڑی بہت نیند بھی لی یا ساری رات آنکھوں ہی میں کاٹ دی؟“

”رات کے آخری پہر دو تین گھنٹے کے لیے سویا تھا

جناب!“ اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔

”پھر اذان کے ساتھ ہی آنکھ کھل گئی تھی۔“

”رات کے آخری پہر.....“ میں نے اس کے کہے ہوئے الفاظ میں سے ایک ٹکڑا زیر لب دہرایا پھر پوچھا۔

”آدھی رات کے تو بعد ہی سوئے ہو گئے تم؟“

”جی بالکل.....“ وہ ابھمن زدہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں لگ بھگ دو بجے سونے کے لیے لیٹا تھا۔“

”ہوں.....!“ میں نے پُر سوچ انداز میں ہنکارا بھرا پھر پوچھا۔ ”رات تھانے کے اندر تو سب خیر خیریت رہی تھی نا..... کوئی ناخوش گوار واقعہ تو پیش نہیں آیا تھا؟“

”بالکل نہیں ملک صاحب!“ اس کے تجسس کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ”ادھر تو سب امن امان ہی رہا ہے۔“ اس نے تشویش ناک لہجے میں بتایا پھر پوچھا۔ ”یہ آپ آج روٹین سے ہٹ کر کیوں باتیں کر رہے ہیں؟ پہلے تو آپ نے بھی ایسا نہیں کیا۔“

”پہلے کبھی میرے ساتھ بھی تو ایسا نہیں ہوا ہے نا۔“ میں نے کہا۔

”آپ کے ساتھ ایسا کیا ہو گیا ہے ملک صاحب؟“ اس نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

اس کے استفسار کے جواب میں، میں نے مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے رات والے۔ ”دنگی“ واقعے سے آگاہ کر دیا۔ اے ایس آئی مطلوب حسین نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور سرسری انداز میں بولا۔

”ملک صاحب! رات کو کافی ٹھنڈی اور تیز ہوائیں بھی تو چل رہی تھیں۔ ہو سکتا ہے آپ کی سماعت کو دھوکا ہوا ہو۔ ہوا کے دباؤ سے بچنے والے دروازے کی آواز کو آپ نے دستک کی آواز سمجھ لیا ہو۔“

”ایسا خیال ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں بھی آیا تھا مطلوب حسین!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا کیونکہ.....“ میں نے لمحائی توقف کر کے گہری نظر سے اے ایس آئی کو دیکھا پھر جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ میری سماعت ہوا سے بچنے والے دروازے اور دستک کی مخصوص آواز میں بہ خوبی فرق کرنا جانتی ہے۔“

اے ایس آئی نے مجھ سے انجھنے کے بجائے بڑے محل سے کہا۔ ”پھر آپ کے خیال میں وہ کون ہو سکتا ہے؟“

”اگر میرا خیال اس سلسلے میں راہنمائی کر دیتا تو اس

پیر ۱۵ دسمبر

وقت میں تم سے سوال و جواب نہیں کر رہا ہوتا مطلوب حسین!“ میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

”میرا تو ذہن ہی کام نہیں کر رہا جناب!“ وہ بے بسی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے بڑی عجیب و غریب کہانی سنائی ہے۔“

”تمہارا ذہن شاید اس وقت ایک بھرپور نیند کا تقاضا کر رہا ہے مطلوب حسین!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”اس لیے تم گھر جا کر آرام سے سو جاؤ۔“

وہ میرے حکم کی تعمیل میں فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اس نے مجھے سیلیوٹ کیا اور پھر کمرے سے نکل گیا۔

ان دنوں میں ایک چھوٹے سے قصبے فیروز آباد کے تھانے میں بہ طور انسپکٹر تعینات تھا اور اس تھانے کا چارج مکمل طور پر میرے پاس تھا لہذا میں تھانا انچارج اور تھانے دار بھی کہلاتا تھا۔ تھانے کا عملہ مختصر سا تھا۔ میرے علاوہ ایک اے ایس آئی مطلوب حسین، ایک حوالدار رجب علی اور چار کانسٹیبلز اصغر علی، امین، آصف اور عمران اس عملے کا حصہ تھے۔ ان میں سے مطلوب حسین اور کانسٹیبل امین مقامی تھے یعنی ان کا تعلق فیروز آباد ہی سے تھا اسی لیے میں نے اے ایس آئی کو گھر جا کر آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ قصبہ چھوٹا سا تھا، تھانا محدود سا اور عملہ مختصر سا تھا اور اسی ”سا، سا، سا“ کے ساتھ مجھے تھانے داری کرنا تھی۔

اے ایس آئی مطلوب حسین کو میرے کمرے سے نکلے بہ مشکل پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے کہ کانسٹیبل امین گھبرایا ہوا میرے پاس آیا۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے اضطرابی لہجے میں سوال کیا۔

”کیا ہو گیا ہے بھئی؟“

”ملک صاحب! قتل کی ایک واردات ہو گئی ہے جناب.....!“ اس نے چڑھی ہوئی سانس کے ساتھ بتایا۔

”کہاں.....؟“ میں نے بے ساختہ پوچھا۔

”ادھر کھیتوں میں.....“ اس نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے کوارٹر کے پچھواڑے.....“

تھانے کے پچھواڑے میرا کوارٹر واقع تھا اور میرے کوارٹر کے پچھواڑے لہلہاتے ہوئے سرسبز کھیت۔ میں نے کانسٹیبل کی گھبراہٹ کے پیش نظر جلدی سے پوچھا۔

”قتل کون ہوا ہے؟“

میں بہ ظاہر کانسٹیبل امین سے سوال و جواب کر رہا تھا

لیکن لاشعوری طور پر میں اس معاملے کو رات والے دنگی واقعات کے ساتھ نہجی کرنے میں مصروف تھا اور لاشعوری طور پر ہی مجھے کنفرم بھی ہو گیا تھا کہ یہ دونوں واقعات کسی ایک ہی سنسنی خیز سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

”وہ کوئی نوجوان عورت ہے جناب.....!“ کانسٹیبل نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”گوری چٹی اور خوبصورت عورت.....“

”کیا تم اس عورت کی لاش بھی دیکھ آئے ہو؟“ میں نے اسے گھورا۔

”نہیں جناب! مجھے تو خادم حسین نے بتایا ہے۔“

”خادم حسین کون؟“

”جس کے کھیت میں قتل کی واردات ہوئی ہے۔“

کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ”وہی اس واقعے کی اطلاع دینے آیا ہے جناب۔ خادم حسین باہر برآمدے میں بیٹھا ہوا ہے۔“

”اسے فوراً میرے پاس لے آؤ.....“ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

کانسٹیبل امین نے فوراً سے پیشتر میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

اگلے ہی لمحے زمیندار خادم حسین میرے سامنے تھا۔

☆☆☆

خادم حسین قصبہ فیروز آباد کا ایک چھوٹا زمیندار تھا جس کے پاس صرف پانچ ایکڑ زرعی اراضی تھی۔ ان پانچ میں سے چار ایکڑ پر وہ موسم کی مناسبت سے مختلف اناج اگاتا تھا اور پانچواں ایکڑ اس نے اپنے شوق کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ پانچویں ایکڑ جس میں اس نے چار آم کے، دو جامن کے، دو شہتوت کے، دو امرود کے، دو کینو کے اور دو انار کے پیڑ لگا رکھے تھے۔ باقی بچ رہنے والی زمین پر اس نے مختلف سبزیوں کا شت کر رکھی تھیں۔ وہ فردوس، سبزی اور مختلف اناج کے حوالے سے خود کفیل تصور کیا جاتا تھا۔

میں، کانسٹیبل امین کو اپنے ساتھ رکھ کر خادم حسین کے ساتھ فوراً جائے وقوعہ پر پہنچ گیا تھا۔ درجن بھر سے زیادہ افراد پہلے سے وہاں موجود تھے۔ میں نے سب کو ایک طرف ہٹایا اور مذکورہ نوجوان عورت کی لاش کے قریب چلا گیا۔

کانسٹیبل امین نے غلط نہیں بتایا تھا۔ وہ واقعی ایک حسین و جمیل اور گوری چٹی عورت تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، اس کی عمر پچیس اور ستائیس کے درمیان کہیں کھڑی تھی۔ اسے گردن کاٹ کر بڑی بے دردی

سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس نے سرخ رنگ کا گرم جوڑا پہن رکھا تھا جو جگہ جگہ سے اپنی تباہی و بربادی کی داستان سنارہا تھا۔ اس کے بدن کے بعض حصے قابل اعتراض حد تک کھلے ہوئے تھے۔ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ موت کے گھاٹ اتارنے سے قبل، کسی کھلونے کے مانند اس کے بدن سے کھلو اڑ کیا گیا تھا۔ وہ ایک سو ایک فی صد اس دنیا سے اس دنیا میں منتقل ہو چکی تھی۔

میں اکڑوں بیٹھ کر لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ پہلی ہی نظر میں ایک چبھتی ہوئی حقیقت نے مجھے چونکا دیا۔ اس زمین نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی جہاں اس عورت کی لاش پڑی تھی اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ زمین کا وہ حصہ خون کے آثار سے قطعی پاک تھا۔ کسی شخص کی گردن کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا جائے اور اس کے بدن سے خون کا ایک قطرہ نہ ٹپکے..... یہ تو ایسے ہی تھا جیسے یونائیڈ اسٹیٹس کا کپٹل ٹوکیو یا بندر کے بارہ سینک.....!

مذکورہ عورت کو جتنی بے دردی اور سفاکی سے قتل کیا گیا تھا، اس کے نتیجے میں تو اس بدن نصیب کے زخروں سے خون کا ایک فوارہ پھوٹ جانا چاہیے تھا لیکن اس کھیت کی زمین اپنے سینے پر ایک بوند کا تمغا بھی نہیں سجائے ہوئے تھی۔ اس کا صرف اور صرف ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ اس بد بخت عورت کو کسی اور مقام پر قتل کیا گیا تھا اور بعد ازاں اسے اٹھا کر خادم حسین کے کھیت میں پھینک دیا گیا تھا، وہ کھیت جس کی بیشتر فصل کاٹی جا چکی تھی۔ اس کی لاش فصل سے پاک زمین پر پڑی تھی۔

”تم میں سے کوئی شخص اس عورت کو جانتا ہے؟“ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور وہاں موجود لوگوں کے چہروں کو باری باری دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کون ہے یہ.....؟“

کسی جانب سے اثبات میں جواب نہیں آیا۔ میرے سوال پر بیشتر افراد کی گردنوں نے نفی میں حرکت کی تھی اور یہی انکار بعض کی زبان سے بھی سننے کو ملا جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اس بدن نصیب مقتول کا تعلق قصبہ فیروز آباد سے نہیں تھا۔

میں نے اس کھیت کے مالک خادم حسین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”خادم حسین! کہیں سے چادر کا بندوبست کرو اور پہلی فرصت میں اس لاش کو ڈھانپ دو۔“

خادم حسین میرے حکم کی تعمیل میں ایک طرف گیا اور دو منٹ کے بعد وہ ایک گرم شال کے ساتھ واپس آ گیا۔ میں نے

خادم حسین کی مدد سے مقتول کی لاش کو ڈھک دیا اور اتمام حجت کے طور پر ایک مرتبہ پھر وہاں موجود لوگوں سے اس کے بارے میں استفسار کیا لیکن اس بار بھی کوئی نیا جواب سامنے نہیں آیا جس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ اس عورت کی بد بختی اسے کہیں اور سے اٹھا کر فیروز آباد لے آئی تھی۔

اس مقتول عورت کو کوئی جانتا تھا یا نہیں لیکن مجھے تو موقع کی کارروائی مکمل کرنا تھی۔ یہ تحقیق اور تفتیش بعد کے مراحل تھے کہ وہ کون تھی، کہاں سے آئی تھی اور اسے کس نے قتل کیا تھا.....؟

دیگر لوگوں کے علاوہ کانٹیل امین نے بھی اس امر کی تصدیق کر دی تھی کہ وہ طرح دار عورت موضع فیروز آباد کی رہنے والی نہیں تھی۔ اس نے پہلے کبھی اس عورت کو قصبہ میں نہیں دیکھا تھا۔

میں نے ضروری کارروائی سے نمٹنے کے بعد مقتول کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے امین کی نگرانی میں ضلعی اسپتال بھجوا دیا پھر اس کھیت کے مالک خادم حسین سے سوال وجواب میں مصروف ہو گیا۔

ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا اور وہ یہ کہ آلہ قتل کی تلاش میں بھی میں نے جائے وقوعہ اور اس کے آس پاس کا علاقہ اچھی طرح دیکھ ڈالا تھا لیکن میری توقع کے عین مطابق آلہ قتل مجھے کہیں بھی پڑا نہیں ملا تھا۔ مجھے اس بات کا تو سونی صدیقین تھا کہ اس عورت کو کسی اور جگہ پر موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد یہاں لا کر کھیتوں میں پھینک دیا گیا تھا لہذا آلہ قتل کا جائے وقوعہ پر پایا جانا بعید از قیاس ہی تھا۔ البتہ ایک بات طے تھی کہ اسے کسی تیز دھار آلے کی مدد سے قتل کیا گیا تھا مثلاً کسی خنجر یا چھری سے۔

خادم حسین کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ مضبوط ہاتھ پاؤں کا مالک ایک دراز قامت شخص تھا۔ رنگت گہری گندی مگر سانولی ہرگز نہیں تھی۔ پچاس کا ہندسہ عبور کرنے کے باوجود بھی وہ صحت مند، توانا اور چاق و چوبند دکھائی دیتا تھا اور اس صحت و تندرستی کا واحد راز تھا، محنت اور مشقت۔ وہ زمینداری کے کام میں کسی کی مدد نہیں لیتا تھا بلکہ اپنے کھیتوں کے تمام زرعی معاملات وہ خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیتا تھا۔

میں نے خادم حسین سے پوچھا۔ ”چاچا! تم نے اس عورت کی لاش کو کب دریافت کیا تھا..... میرا مطلب ہے، تم نے اسے کب دیکھا تھا؟“

”جناب! میں دریافت کا مطلب بھی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اور جہاں تک آپ کے

سوال کا تعلق ہے تو..... اس عورت کی لاش کو سب سے پہلے دینو کھار نے دیکھا تھا۔“

”یہ دینو کھار کون ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”دینو کا اصل نام دین محمد ہے جی!“ خادم حسین وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ ادھر قصبے ہی میں رہتا ہے جناب!“

”کیا دینو اس وقت یہاں موجود ہے؟“

جواب دینے کے بجائے اس نے وہاں موجود لوگوں پر ایک متلاشی نگاہ ڈالی پھر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا ”جی..... دینو وہ ادھر کھڑا ہے۔“

میں نے خادم حسین کے اشارے کا نگاہی تعاقب کیا اور بہ آواز بلند پکارا۔ ”دینو بابا! یہاں آ جاؤ۔“

اگلے ہی لمحے میرا اندازہ کچھ..... غلط ثابت ہو گیا جب دو درجن افراد کے مجمع میں سے ایک سانولا سانو جوان نکل کر میری جانب قدم بڑھانے لگا۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ دینو کھار اچھی خاصی عمر کا کوئی بندہ ہوگا جس میں نے اسے ”دینو بابا“ کہہ کر اپنے پاس بلایا تھا۔ بہر حال، کبھی کبھی انسان کا اندازہ الٹ بھی جاتا ہے۔

میں نے خادم حسین کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا ”جب تمہیں دینو نے اس عورت کی لاش کے بارے میں بتایا اس وقت تم کہاں تھے؟“

”میں گھر سے نکل کر اپنے کھیتوں کی طرف آ رہا تھا جناب عالی!“ وہ مجھے تفصیل سے آگاہ کرنے لگا ”آج کل میں اپنی فصل کی کٹائی میں لگا ہوا ہوں۔ کل ایک کھیت میں کٹائی کا کام ادھورا چھوڑ گیا تھا، میں اسے مکمل کرنے کے لیے ہی آیا تھا لیکن ابھی میں اپنے کھیتوں سے دو تین سو گز دور ہی تھا کہ اسی جانب سے میں نے دینو کھار کو آتے ہوئے دیکھا.....“ وہ سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یہ مجھے بہت گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی یہ بول پڑا اور اس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ مجھے بتایا کہ ادھر میرے کھیتوں میں کسی عورت کی گردن کٹی لاش پڑی ہے۔ میں اس کے ساتھ اپنے کھیتوں میں پہنچ گیا اور پھر میں نے اپنی آنکھوں سے اس بدن نصیب عورت کی لاش دیکھ لی۔“

”پھر تم نے کیا کیا؟“ وہ اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔

”جناب! میں تو بہت پریشان ہو گیا تھا۔“ خادم حسین نے جواب دیا۔ ”اس وقت جتنے بھی لوگ آس پاس کے

کھیتوں میں کام کر رہے تھے، وہ جمع ہو گئے اور ہم سب اس عورت کی دردناک موت کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرنے لگے۔ وہ ہم سب کے لیے قطعی اجنبی تھی۔ ہم میں سے کوئی بھی اسے جانتا یا پہچانتا نہیں تھا۔ اس واقعے کی خبر گاؤں کے اندر بھی پہنچ گئی تھی اور لوگ عورت کی لاش کو دیکھنے کے لیے کھیتوں میں آنے لگے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہاں اچھا خاصا رش لگ گیا۔ اسی وقت کسی ہمدرد نے مجھے مشورہ دیا.....“ یہاں تک بتانے کے بعد خادم حسین نے لمحاتی توقف کیا پھر ایک گہری سانس چھوڑنے کے بعد بولا۔

”اس نے سمجھانے والے انداز میں مجھے مشورہ دیا کہ میں فوراً تھانے جا کر اس واقعے کی اطلاع دوں۔ عورت کی لاش میرے کھیتوں میں پڑی ہے۔ اگر میں نے تھانے میں رپورٹ نہ کی تو الٹا کسی وبال میں آ جاؤں گا۔ بس جناب! پھر میں تھانے پہنچ گیا۔“

”یہ نیک مشورہ دینے والا تمہارا ہمدرد کون تھا؟“ میں نے دریافت کیا۔

اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”جناب! اس وقت تو مجھے یاد نہیں آ رہا۔“

”ٹھیک ہے.....“ یہ کہتے ہوئے میں دینو کھار کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”جب یاد آ جائے تو مجھے بتا دینا خادم حسین!“

”اچھا جی.....“ وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ دین محمد عرف دینو کھار کی عمر بیس اور پچیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک بھاری بھر کم اور سانولا سانو جوان تھا۔ اس کے سر کے بال گھونگھریا لے تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں سوال کیا۔

”ہاں بھی دینو! تم صبح ہی صبح خادم حسین کے کھیتوں میں کیا کر رہے تھے؟“

”میں جی..... خادم حسین کے کھیتوں کی طرف تو موتی کی وجہ سے گیا تھا ورنہ میرا وہاں کیا کام.....“ اس نے جواب دیا۔

”موتی کی وجہ سے.....؟“ میں نے زیر لب دہرایا۔

”یہ موتی کون ہے بھئی؟“

”موتی میرے کتے کا نام ہے تھانے دار صاحب!“

”اچھا..... تو وہ کتا تمہیں خادم حسین کے کھیتوں میں لے گیا تھا۔“ میں نے معنی خیز انداز میں اسے گھورا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”بات دراصل یہ ہے جناب کہ جب سے ابا کو فاج کا ٹیک ہوا ہے، دریا سے مٹی

قدرت کیا رنگ دکھاتے ہیں؟“
”اللہ رکھا! تمہیں یہ تو احساس ہو گیا ہوگا کہ یہ کتنا حساس معاملہ ہے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے کھوجی بابا کی طرف دیکھا۔

”آپ فکر ہی نہ کریں جناب!“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
”اور اس سلسلے میں جو بھی حقائق سامنے آئیں، انہیں راز میں رکھنے کی ضرورت ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ معاملات صرف ہم دونوں کے بیچ میں رہیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری تحقیق کے نتائج سے قاتل فائدہ اٹھا کر معاملات کو بگاڑ دے یا حالات و واقعات کو الجھا کر رکھ دے۔“

”میرا سینہ بہت وسیع اور گہرا ہے ملک صاحب!“ وہ اپنے سینے کو پھٹکتے ہوئے بولا۔ ”اس کنوئیں میں بڑے بڑے عظیم راز دفن ہیں جناب!“
میں مطمئن ہو کر اٹھا اور اللہ رکھا کو اپنے ساتھ لے کر جانے وقوع پر پہنچ گیا۔

”اللہ آپ کا بھلا کرے ملک صاحب!“ وہ کام کا آغاز کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے خدمت کا موقع دے کر مجھ پر بڑی نوازش کی ہے جناب، ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا، ان بوڑھی ہڈیوں کو بے کار پڑے پڑے زنگ ہی لگ جائے گا۔“
مخبر اور کھوجی ہر دور میں پولیس ڈیپارٹمنٹ کی ضرورت رہے ہیں۔ ہم لوگ گاہے بے گاہے ان سے کام لیتے رہتے تھے۔ یہ لوگ بڑے کام کے ہوتے ہیں۔ جب بھی تفتیش کی گاڑی کسی بندگلی میں جا پھنستی ہے تو یہی لوگ اپنے تجربے اور مہارت کا دھکا لگا کر اسے سڑک پر لاتے ہیں۔ ان کی اہمیت اور افادیت سے کسی بھی صورت انکار ممکن نہیں۔

اللہ رکھا دس منٹ تک جانے وقوع اور اس کے گرد و نواح کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ کبھی جھک کر زمین کو دیکھنے لگتا اور کبھی نیچے بیٹھ کر وہ مختلف زاویوں سے کھیت کا جائزہ لینے لگتا۔ میں بڑی دلچسپی سے اسے کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کا فن تھا لہذا میں خاموش تماشا بنائی بنا اس کی حرکات و سکنات کا نوٹس لیتا رہا۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد وہ میرے پاس آیا اور بڑے حتمی لہجے میں بولا۔

”ملک صاحب! چونکہ صبح بہت سارے لوگ جانے وقوع پر جمع ہو گئے تھے لہذا یہاں درجنوں قدموں کے چھاپے آپس میں گڈمڈ ہو چکے ہیں لیکن میں نے پھر بھی کام کی ایک بات پتا چلائی ہے۔“

”کام کی بات.....“ میں نے چونک کر اس کی طرف

لگ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں عموماً کھرا نکالا جاتا ہے تاکہ یہ پتا چلا یا جاسکے کہ قاتل یا مقتول کن راہوں سے گزر کر جانے وقوع تک پہنچا ہوگا۔ کھوج کا یہ کام اکثر بڑے حوصلہ افزا نتائج لاتا ہے لہذا نامعلوم حسین و جمیل مقتول کا کھوج لگانے کے لیے میں نے بھی یہی تفتیشی طریقہ اختیار کیا۔

میں نے دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے ایک کانسٹیبل کو بھیج کر کھوجی اللہ رکھا کو تھانے بلا لیا۔ اس دوران میں میرا ذہن مختلف زاویوں پر مسلسل سوچ بچار میں مصروف تھا اور میں اس پراسرار دستک کو بھی ایک لمحے کے لیے نہیں بھولا تھا جو رات کو میرے کوارٹر کے بیرونی دروازے پر سنائی دی تھی۔ مذکورہ دستک کا نامعلوم عورت کے بہیمانہ قتل سے کوئی تعلق تھا یا نہیں لیکن یہ ضرور تھا کہ اس دستک نے گزشتہ رات ہی سے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ میں اسی پریشانی کو ذہن میں لے کر سویا تھا اور اسی الجھن کے ساتھ بیدار ہوا تھا اور پھر جب میں تھانے میں آ کر بیٹھا تو یہ واقعہ سامنے آ گیا۔ کوئی آواز میرے اندر چپکے چپکے سے یہ سرگوشی کر رہی تھی کہ رات دالی دستک کا اس اجنبی دلکش عورت کے قتل کے ساتھ ضرور کوئی نہ کوئی تعلق جڑا ہوا تھا۔ کوئی بات واضح تھی اور نہ ہی میرے ہاتھ میں کوئی ثبوت تھا لہذا قتل از وقت میں کوئی فتویٰ صادر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے؟

کانسٹیبل، اللہ رکھا کو لے کر تھانے پہنچا تو میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلا لیا۔ کھوجی بابا اللہ رکھا کی عمر پینسٹھ کے اریب قریب تھی۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک مستعد بوڑھا تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی بھی رکھ چھوڑی تھی جو اس کے چہرے پر بڑی بھلی نظر آتی تھی۔ اس کی ڈاڑھی اور سر کے بال مکمل سفید ہو چکے تھے۔ اللہ رکھا نے پاپلین کا کرتہ اور تہ بند زیب تن کر رکھا تھا اور اپنے سینے کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لیے اس نے اوپر نیچے دو ادنیٰ سویٹرز پہن رکھے تھے۔ یعنی ایک کرتے کے اوپر اور دوسرا کرتے کے نیچے۔

میں نے نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں اللہ رکھا کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔
”سوباتوں کی ایک بات..... قاتل کا کھرا نکالنا ہے نا جناب!“

”بالکل..... اللہ رکھا! میں نے اسی مقصد کے لیے تمہیں تھانے بلا لیا ہے۔“

”کل ملا کر معاملہ یہ ہے کہ ہم جانے وقوع پر چلتے ہیں۔“ وہ پُر عزم لہجے میں بولا۔ ”پھر دیکھتے ہیں، حالات اور

”جی..... کون سی کہانی؟“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے نکلنے لگا۔

”یہی جو ابھی تم نے مجھے سنائی ہے۔“
”جناب..... میں نے آپ سے ایک لفظ بھی جھوٹ یا غلط نہیں کہا۔“ وہ قدرے خشکی آمیز انداز میں بولا۔ ”جو کچھ پیش آیا ہے وہی میں نے آپ کو بتایا ہے۔“

”لیکن میں تمہاری بات کا یقین کیسے کر لوں.....؟“
میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس عورت کو تمہی نے قتل کر کے یہاں پھینک دیا ہو؟“
”جناب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ وہ روہانسا ہو گیا۔ ”میں تو اس عورت کو جانتا تک نہیں۔“

”اسے تو یہاں پر کوئی بھی نہیں جانتا دینو!“ میں نے بہ دستور اسے شک زدہ نظر سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اس سے تمہاری بے گناہی کیسے ثابت ہوتی ہے؟“
”تھانے دار صاحب! جو کچھ تھا وہ میں نے آپ کے سامنے بیان کر دیا ہے۔ آپ کی مرضی ہے کہ میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں۔“

میرا پیشہ ورانہ تجربہ بتاتا تھا کہ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق دینو اس عورت کے قتل میں ملوث نہیں ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی اسے اپنے دباؤ میں رکھنے کے لیے میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

”دیکھو دینو! تمہاری بات کا یقین کر کے میں تمہیں چھوڑ تو رہا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں نکالنا کہ میں نے تمہیں بے گناہ سمجھ لیا ہے۔ کسی مرحلے میں اگر مجھے تم پر ذرا سا بھی شک ہو تو میں تمہیں پکڑ کر فوراً تھانے میں بند کر دوں گا۔“
”جی بالکل!“ وہ بڑے نڈر انداز میں بولا۔

”اور اس دوران میں تم اپنی آنکھیں، کان اور دماغ کے دروازے بھی کھلے رکھنا۔“ میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ”اگر تمہیں اس اجنبی مقتول دو شیزہ کے بارے میں کہیں سے کوئی سن گن ملے تو فوراً آ کر مجھے بتانا۔“

”جی..... میں وہی کروں گا جیسا آپ کہہ رہے ہیں۔“ اس نے بڑی فرماں برداری سے کہا۔

میں نے مزید دو تین سوالات کے بعد دین محمد عرف دینو کھار کو فارغ کر دیا اور خود ٹپلتے ہوئے تھانے آ گیا۔

☆☆☆

کسی قتل کی واردات میں جب مقتول اجنبی ہو اور علاقے کے لوگ اس کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے ہوں تو قاتل تک رسائی کے لیے تفتیش کی گاڑی کو تقریباً بریک ہی

نکالنے کی ذمہ داری میرے سر پر آگئی ہے۔ میں اپنے کھوتے (گدھے) اور کتے کے ساتھ صبح صبح مٹی نکالنے دریا کی طرف جا رہا تھا۔ جب میں خادم حسین کے کھیتوں کے قریب سے گزرا تو موتی نے بھونکنا شروع کر دیا۔ میں نے دو چار دیکے مار کر اسے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی لیکن وہ خادم حسین کے کھیتوں کی جانب منہ اٹھا کر مسلسل بھونکے جا رہا تھا۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی دھند کے باعث خادم حسین کے کھیتوں کا منظر واضح نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ موتی خواخواہ یہ حرکت نہیں کر رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کسی خاص وجہ سے میری توجہ ادھر کر دانا چاہتا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں تھانے دار صاحب..... بے زبان جانوروں کی حس ہم انسانوں سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔“

”ہاں، بالکل جانتا ہوں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور بے زبان جانوروں میں بھی کتے کی سونگھنے اور سننے کی حس انسانوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے۔“

”تو بس جناب! میں موتی کے توجہ دلانے پر ہی خادم حسین کے کھیتوں کی طرف گیا تھا۔“ وہ اپنا بیان مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”اور وہاں پہنچ کر موتی کے بھونکنے کی وجہ سمجھ آگئی۔ وہ عورت نیم برہنہ حالت میں، کھیتوں میں پڑی تھی۔ اس کی حالت کو دیکھ کر میرے ذہن میں جو پہلا خیال آیا وہ یہی تھا کہ اب وہ زندہ نہیں ہے۔“

”ایک خوبصورت اور دلکش عورت کو خادم حسین کے کھیتوں میں مردہ پڑے دیکھ کر تمہارے احساسات کیا تھے اور تم نے وہ دلخراش منظر دیکھ لینے کے بعد کیا، کیا تھا؟“ میں نے سوال و جواب کے سلسلے کو سیٹھتے ہوئے کہا۔

”جناب! اس عورت کی لاش کو دیکھ کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔“ وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ”اور فوری طور پر میری سمجھ میں یہی آیا کہ مجھے دوسرے لوگوں کو اس کے بارے میں فوراً بتانا چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ آس پاس کے کھیتوں میں اکاؤٹا لوگ کام تو کر رہے تھے لیکن دھند کے باعث ان کے ہیولے سے نظر آ رہے تھے۔ میں نے انہیں آواز دینے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ خادم حسین مجھے اپنی جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ بس..... تو پھر میں نے سب سے پہلے اسے ہی عورت کی لاش کے بارے میں بتا دیا۔“

میں نے دینو کھار کی نیت کو چیک کرنے کے لیے خاصے سخت لہجے میں کہا ”دینو! تم نے کہانی تو بہت عمدہ جوڑ لی ہے۔“

کمرے میں بلا لیا۔ وہ اسی گاؤں کا رہنے والا تھا اور میں امید کر رہا تھا کہ جیسے ہی اسے خادم حسین کے کھیتوں سے اس عورت کی لاش ملنے کی خبر ہوگی، وہ دوڑا دوڑا میرے پاس چلا آئے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، وہ حسب معمول اپنے مقررہ وقت پر ہی تھانے پہنچا تھا۔ اس کی اس ادا پر مجھے حیرت بھی ہوئی جیسی میں نے اسے فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ خوبصورت نامعلوم عورت کی دردناک موت والا قصہ اس کے گھر کی دہلیز سے نہ گزرا ہو۔

”ملک صاحب! یہ آج کیسا واقعہ پیش آ گیا ہے؟“ میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے سوال کر دیا۔ ”تم تو ایسے مجھ سے پوچھ رہے ہو جیسے تمہیں کچھ پتا ہی نہ ہو؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شکوہ بھرے انداز میں کہا۔

”یقین کریں، مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس واقعے کا علم ہوا ہے۔“ وہ ایک دم بے حد سنجیدہ نظر آنے لگا۔ میں نے پوچھا ”مطلوب حسین! کیا تم نے آج کا دن فیروز آباد سے باہر نہیں گزرا ہے؟“

”نہیں جناب! میں تو ادھر ہی تھا..... اپنے گھر میں۔“ ”کمال ہے، پھر بھی تمہیں اتنے بڑے معاملے کی کوئی خبر نہیں ہوئی۔“

”جناب! میں گہری نیند سو یا ہوا تھا۔“ ”تمہارے گھر والوں میں سے کسی نے جگانے کی کوشش نہیں کی؟“ ”گھر میں کوئی ہوتا تو یہ کوشش کرتا نا۔“ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے آنکھیں سکیڑ کر اسے گھورا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ملک صاحب! میری گھر والی بچوں کے ساتھ سسرال یعنی اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔ نیند کافی جمع ہو چکی تھی، میں تھانے سے جانے کے بعد ایسا پڑ کر سو یا کہ کوئی آدھا گھنٹا پہلے ہی میری آنکھ کھلی ہے۔“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے جیسے ہی پتا چلا کہ صبح خادم حسین کے کھیتوں میں سے کسی نامعلوم عورت کی لاش ملی ہے، میں آپ کی طرف آ گیا ہوں۔ یہ ہے کل کہانی جناب..... میں نے نہ تو دوپہر کا کھانا کھایا ہے اور نہ ہی ابھی گھر سے کچھ کھا کر نکلا ہوں۔“ ”اب تم کل صبح ایک ساتھ ہی ناشتا کرنا۔“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

تھا۔ اسی جھماکے کی ضیا پاشیوں سے آپ کو بھی منور کرتا ہوں۔ میرے خیال میں قاتل اس نامعلوم عورت کی لاش کو گھوڑے کی پیٹھ پر لا کر جانے وقوع تک پہنچا تھا، پھر اس لاش کو خادم حسین کے کھیتوں میں پھینک کر واپس چلا گیا تھا۔ آپ اگر میرے ان الفاظ پر غور کریں گے تو سنگل دباؤ والا کھرا اور ڈبل دباؤ والا کھرا کا مفہوم بہ آسانی آپ کی سمجھ میں آ جائے گا۔

تو میں آپ کو لوکیشن کے بارے میں بتا رہا تھا۔ جیسا کہ اس کہانی کی ابتدا میں اس بات کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ ان دنوں میں فیروز آباد نامی ایک چھوٹے سے قصبے کے ایک چھوٹے سے تھانے میں تعینات تھا۔ میرا تھانا ایک ہنگی سڑک کے کنارے واقع تھا جو شمالاً جنوباً رواں دواں رہتی تھی۔ فیروز آباد گاؤں لگ بھگ ڈیڑھ سو گھروں کی ایک آبادی تھی جو لوکیشن کے اعتبار سے میرے تھانے کے عقب میں مشرق کی جانب آباد تھا۔ تھانے اور گاؤں کے درمیان بہ مشکل آدھے میل کا فاصلہ رہا ہوگا جو سرسبز و شاداب کھیتوں کے قبضے میں تھا۔ گاؤں کے چودھری الہی بخش کی حویلی بھی گاؤں کے ایک کنارے پر واقع تھی۔

تھانے سے لگ بھگ ایک فرلانگ (دوسو بیس گز) کے فاصلے پر جنوب میں ایک دریا بہتا تھا۔ یہ دریا مشرق سے مغرب کی سمت رواں دواں تھا اور اسی دریا کے کنارے سے دینوکھار مٹی نکالنے آیا کرتا تھا۔ آسانی کے لیے یوں سمجھ لیں کہ فیروز آباد گاؤں، میرا تھانا، دریا اور ہنگی سڑک کے بیچ ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور انہی کھیتوں میں دریا کے کنارے کے ساتھ ایک ڈیرا بھی بنا ہوا تھا جو کہ چودھری الہی بخش کی ملکیت تھا۔ مذکورہ ڈیرے پر چودھری کا ملازم خاص رحم دین عرف رجور بتا تھا جو چودھری کے چھوٹے موٹے کاموں کے علاوہ کاشت کاری کے امور کی نگرانی بھی کرتا تھا اور سب سے دلچسپ اور چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ کھیتی بابا اللہ رکھانے کمرے کی مدد سے جس گھوڑے کا سراخ لگایا تھا، وہ اسی ڈیرے سے چل کر جانے وقوع تک پہنچا تھا اور پھر جانے وقوع سے واپس اس ڈیرے پر آیا تھا۔

اس انکشاف نے میرے رگ و پے میں سنسنی بھری تھی۔

☆☆☆

غروب آفتاب سے چند منٹ پہلے کی بات ہے۔ اے ایس آئی مطلوب حسین ڈیوٹی پر آیا تو میں نے فوراً اسے اپنے

اور قدرت کیا رنگ دکھاتے ہیں۔“ جیسے جملے اللہ رکھا اپنی گفتگو میں عام استعمال کرتا تھا جو کسی حد تک اس کے تکیہ کلام کی حیثیت رکھتے تھے لیکن ان لحاظ میں ایسے جملوں پر دھیان دینے کا ٹائم نہیں تھا میرے پاس۔ اس نے جو تازہ ترین انکشاف کیا تھا وہ میرے ذہن کو بھنچوڑنے کے لیے کافی تھا لہذا میں نے سرسرااتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”یہ بات تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہے ہو اللہ رکھا؟“ ”گھوڑے کے پاؤں کے مخصوص دباؤ کی بنا پر جناب! وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔“ اس جانب آتا ہوا کھرا بتاتا ہے کہ گھوڑے پر ایک سے زیادہ افراد سوار تھے اور یہاں سے واپس جاتا ہوا کھرا ایک سوار کی نشاندہی کر رہا ہے۔ جاتے ہوئے کمرے کی نسبت آنے والا کھرا ڈبل دباؤ کی جانب اشارہ کرتا ہے۔“

”ٹھیک ہے اللہ رکھا!“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”اب تم جلدی سے یہ پتا چلانے کی کوشش کرو کہ وہ ڈبل گھڑسوار کھرا کہاں سے آیا تھا اور یہاں سے سنگل گھڑسوار کھرا ابن کر کہاں چلا گیا ہے؟“

”ابھی پتا چلاتا ہوں سرکار!“ وہ پرعزم انداز میں بولا۔ ”آگے حالات و قدرت کیا رنگ دکھاتے ہیں، یہ بھی سامنے آ ہی جائے گا۔“

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ بڑے ماہرانہ انداز میں کام میں جت گیا۔

مزید ایک گھنٹے کی تحقیق و جستجو کے بعد کھیتی بابا نے جو سنسنی خیز انکشافات کیے وہ سننے اور بتانے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اس سے پہلے میں اس لوکیشن کی وضاحت کرنا چاہوں گا جہاں کی چھان پھٹک کے بعد اللہ رکھانے اپنا تحقیقی بیان جاری کیا تھا۔

آگے بڑھنے سے قبل ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ اب کھیتی بابا کہیں ذکر نہیں آئے گا۔ اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔ اس کیس میں مجھے جس حد تک اس کی تکنیکی مدد کی ضرورت تھی وہ اس نے مجھے فراہم کر دی تھی۔ اس معاملے کی ابھی ہوئی ڈور کا ایک سرا اللہ رکھا کے توسط سے میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔ زگ زگ کرتے ہوئے دوسرے سرے تک رسائی حاصل کرنا اب میرا کام تھا اور مجھے یقین تھا، میں اپنا کام بہ طریق احسن انجام دے لوں گا۔ سنگل گھڑسوار اور ڈبل گھڑسوار کا ذکر سنتے ہی میرے ذہن میں تیز روشنی کا ایک جھماکا ہوا تھا اور میں پلک جھپکتے میں ایک جتنی نتیجے پر پہنچ گیا

دیکھا ”وہ کیا اللہ رکھا؟“ ”انسان کے متعدد قدموں کے کمرے کے علاوہ مجھے یہاں ایک جانور کا کھرا بھی ملا ہے ملک صاحب!“ وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔

اللہ رکھا کی بات سن کر میرا دھیان لامحالہ دینوکھار کی طرف چلا گیا۔ آج صبح اسی نامعلوم عورت کی لاش دریافت کی تھی اور اس کے ساتھ دو جانور بھی تھے۔ میں نے اسی تناظر میں اللہ رکھا سے استفسار کیا۔

”گدھے یا کتے کا کھرا.....؟“ ”نہیں جناب!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”ان دونوں میں سے کسی کا نہیں۔“

”پھر.....؟“ میری حیرت الجھن میں بدل گئی۔

وہ بڑے پراعتماد انداز میں بولا ”میں گھوڑے کے کمرے کی بات کر رہا ہوں ملک صاحب!“

”گھوڑے کا کھرا؟“ میں سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”جی ہاں۔“ اس نے بڑے وثوق سے سر کو اثباتی جنبش دی اور بتایا۔ ”کوئی گھڑسوار یہاں تک آیا تھا اور یہاں سے واپس بھی گیا تھا۔“

میں بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔ ”وہ کہاں سے آیا تھا اور واپس کدھر چلا گیا؟“

”اس کا پتا تو میں ابھی چلا لیتا ہوں جناب کیونکہ میں نے اس گھوڑے کا کھرا اچھی طرح پکڑ لیا ہے۔“ وہ متذبذب انداز میں بولا۔

”جب گھوڑے کا کھرا پکڑا گیا ہے تو پھر گھڑسوار بھی پکڑا ہی جائے گا۔“ میں نے اللہ رکھا کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تمہارے چہرے پر الجھن کیوں پھیلی ہوئی ہے..... کوئی پریشانی والی بات تو نہیں۔“

”کوئی پریشانی نہیں ملک صاحب!“ وہ تسلی بھرے انداز میں بولا ”کل ملا کر یہ سمجھ لیں کہ گھوڑے کا کھرا مجھے ایک نئے زاویے پر سوچنے کے لیے مجبور کر رہا ہے۔“ ”کون سا نیا زاویہ اللہ رکھا؟“ میں پوچھتا ہوا بنا نہ رہ سکا۔

”سوباتوں کی ایک بات ملک صاحب!“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میرا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جب گھوڑا اس طرف آیا تو اس پر دو افراد سوار تھے اور جب وہ یہاں سے واپس گیا تو اس کی پیٹھ پر صرف ایک ہی سوار تھا۔“ ”کل ملا کر..... سوباتوں کی ایک بات..... حالات

پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ

آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ

لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

نے واپسی پر اسے ”خوشخبری دینے“ کی بات کی تھی تو کچھ مند نہیں کہا تھا۔

اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں نے کانٹیل آصف کو اپنے پاس بلایا اور چند ہدایات دے کر روانہ کر دیا۔

ہمارے تھانے کے ساتھ ہی ایک ٹانگا اسٹینڈ تھا جہاں تین چار دکانیں بھی بنی ہوئی تھیں اور انہی دکانوں میں ایک تنور والا ہوٹل بھی تھا۔ کہنے اور دیکھنے کو تو وہ ایک چھپر ہوٹل تھا لیکن یہ بات میرے تجربے میں کئی بار آچکی تھی کہ وہاں کے کھانے بڑے لذیذ اور خوش ذائقہ ہوا کرتے تھے۔ میں نے کانٹیل آصف کو اسی ہوٹل پر بھیجا اور تاکید کی کہ وہ بیس پچیس منٹ کے بعد خاصا صحت مند کھانا لے کر آجائے۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ مطلوب حسین کھانے پینے کا بہت شوقین تھا۔ کوئی کھانے کا شائق ہو اور وہ پچھلے بارہ گھنٹے سے بھوکا بھی ہو تو اس کی نظر میں دنیا کی سب سے عظیم نعمت کھانے کا حصول ہی ہو سکتا تھا۔

میں نے اے ایس آئی کی ضیافت کے لیے کانٹیل کو مرغی سالالانے کا حکم دیا تھا۔ ہوٹل ”علی مدد“ کی اسٹیشل ڈش ”مرغی سالالانے“ ہی تھی۔ ہوٹل کا مالک دیسی مرغی میں ایک خاص قسم کا سالالانہ بھر کر اسے بڑے اسٹیشل طریقے سے بھونتا تھا کہ کھانے والا اپنی انگلیاں چاٹتا بلکہ انگلیاں کا شمارہ جاتا تھا۔

ہوٹل ”علی مدد“ کے مالک کا نام تو استاد امداد حسین تھا لیکن وہ خود کو علی مدد کہلاتا پسند کرتا تھا اور اس کی وجہ تسمیہ یہ بتاتا تھا کہ ”امداد حسین“ درحقیقت ”علی مدد“ ہی ہے۔ بہر حال سالہا سال سے اس کے ہوٹل کا نام ”علی مدد“ ہی مشہور ہو گیا تھا۔ امداد حسین ایک ریٹائرڈ پہلوان تھا۔

میں ان لمحات میں اپنی کرسی پر بیٹھا مسلسل اسی حسین و جمیل عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کی لاش کو صبح میں نے پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا دیا تھا۔

کانٹیل امین مذکورہ لاش کو اسپتال پہنچا کر واپس آچکا تھا اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کل شام تک یا پرسوں صبح مل جائے گی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تو جب آتی تب دیکھ لیا جاتا کہ اس میں کون سا انکشاف ہوا ہے، فی الحال تو میں بڑی بے چینی سے اے ایس آئی کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆

رات کے سات بجے تھے لیکن یوں محسوس ہوتا تھا، رات آدمی سے زپادہ گزر گئی ہو۔ جنوری میں ویسے بھی پانچ

”کیوں جی؟“ وہ تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”کیونکہ میں ابھی تمہیں ایک اور مشن پر روانہ کرنے والا ہوں۔“

”کیسا مشن ملک صاحب!“ اس کی حیرت میں پریشانی بھی شامل ہو گئی۔

”اس مشن کو تم اس وقت تک نہیں سمجھ سکو گے جب تک تم میں تمہیں صبح والے واقعے کی تفصیلات سے نہ آگاہ کر دوں۔“ میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ”سنو گے تو بھوک، پیاس اور نیند..... سب کچھ اڑن چھو ہو جائے گا۔“ وہ بڑی سنسنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

میں نے آئندہ پانچ منٹ میں اے ایس آئی مطلوب حسین کو تازہ ترین حالات سے آگاہی فراہم کی پھر کہا۔ ”تمہیں ابھی اور اسی وقت ڈیرے کی جانب روانہ ہونا ہے۔ میں آدھے گھنٹے کے اندر چودھری کے خاص ملازم رحم دین عرف رحمو کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”تم اپنے ساتھ ایک آدھ کانٹیل کو بھی لے جاؤ تا کہ گرفتاری کے عمل میں کسی دشواری کا سامنا نہ ہو۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”تم میری بات سمجھ رہے ہو یا؟“ ”جی ملک صاحب! بڑی چلتی طراں سمجھ رہا ہوں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آدھا گھنٹا تو آپ نے بہت بتایا ہے۔ میں انشا اللہ اس سے پہلے ہی آپ کو خوشخبری سناؤں گا۔“

”اور جب تم کامیاب لوٹو گے تو میں بھی تمہیں ایک خوشخبری دوں گا۔“ میں نے معنی خیز نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ کوئی سوال کیے بغیر بڑی اطاعت مندی سے اٹھا اور میرے کمرے سے نکل گیا۔ ٹھیک پانچ منٹ کے بعد وہ کانٹیل عمران کو اپنے ساتھ لے کر چودھری الہی بخش کے ڈیرے کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔

میں جانتا تھا کہ میں نے مطلوب حسین کو خالی پیٹ رحمو کی گرفتاری کے لیے بھیج دیا تھا۔ یہ ایک طرح سے زیادتی والی بات نظر آتی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ اگر پندرہ بیس منٹ مزید اس کے پیٹ میں کھانا نہ پہنچا تو کوئی قیامت برپا نہیں ہو جائے گی۔ وہ اس مشن سے واپسی پر بھی پیٹ پوچا کر سکتا تھا۔ اور پھر میں نے اس کے لیے کچھ اور سوچ لیا تھا۔ اگر میں

بجے کے آس پاس (پنجاب میں) سورج غروب ہو جاتا تھا اور موسم سرما کے باعث لوگ سرشام ہی گھروں سے باہر نکلنا بند کر دیتے تھے۔ اس حساب سے سات بجے کے وقت کو اچھی خاصی رات کہا جاسکتا تھا۔

میں اس وقت اپنے کمرے میں موجود تھا اور اکیلا نہیں تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اے ایس آئی مطلوب حسین، چودھری الہی بخش کے ڈیرے سے واپس آ گیا تھا اور وہ ”خالی“ ہاتھ نہیں لوٹا۔ میں نے اسی لمحے مطلوب حسین کو شکم پر قسم کی پیٹ پوجا کے لیے دوسرے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ کاشییل آصف نے بڑی عقل مندی کا ثبوت فراہم کیا تھا اور وہ یہ کہ وہ اے ایس آئی کی آمد سے چند سیکنڈ پہلے ہی ہوٹل ”علی مد“ سے گرما گرم کھانے کی ٹرے اٹھائے تھانے میں داخل ہوا تھا۔

میرے سامنے رحم دین عرف رجو گردن جھکائے کھڑا تھا اور اس کے پہلو میں، میں نے حوالدار رجب علی کو ”تینیات“ کر رکھا تھا۔ رجو خاصا گھبرایا ہوا لگتا تھا حالانکہ قدرت نے اسے اچھا خاصا جٹ اور صحت عطا کر رکھی تھی، اس کے باوجود ان لحاظ میں اس کی حالت دیدنی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے تیس اور پینتیس سال کے درمیان قائم کیا۔ وہ ایک قد آور اور کچھ ضخیم شخص تھا۔ سانولی رنگت اور چہرے پر کڑھکی۔ اس نے ہلکی ہلکی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی جیسے ہفتہ دس دن کا شیو بڑھا ہوا ہو۔ تاہم اس کی مونچھیں خاصی صحت مند اور ہیبت طاری کرنے والی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں مجھے سرخی بھی نظر آئی تھی اور..... یہی رجو اس وقت ڈراسہا، سر جھکائے میرے سامنے کھڑا تھا۔

میں نے گفتیش کا آغاز کرتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔ ”رجو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں اچھی خاصی جان دی ہے پھر یوں میرے سامنے بھیگی ملی بنے کیوں کھڑے ہو؟“

وہ گردن اٹھا کر بولا۔ ”تھانے دار صاحب! آپ کے تھانے کے دو بندے مجھے ڈیرے سے پکڑ کر لے آئے ہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا اس لیے گھبرایا ہوا ہوں۔ میں بالکل بے گناہ ہوں جناب..... آپ چاہیں تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔“

”تھانا ہوا یا کچھری، قسمیں کھانے اور آنسو پینے سے بات نہیں بنتی رجو!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ان دو مقامات پر اپنی بے گناہی کو ٹھوس ثبوت کے ساتھ منوانا پڑتا ہے۔ تمہارے پاس ایسی کوئی شے ہے؟“

”جناب! میں خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت یا گواہ پیش نہیں کر سکتا۔“ وہ لجاجت آمیز انداز میں بولا۔

”میں بالکل سچ بتا رہا ہوں کہ میں نے کسی عورت کو قتل نہیں کیا بلکہ..... میں تو اس عورت کو جانتا تک نہیں، پہچانتا تک نہیں۔“

”یہ کوئی خاص یا اہم اطلاع نہیں ہے رجو!“ میں نے بہ دستور سخت انداز میں کہا ”یہاں کا کوئی بھی شخص مقتول عورت کو شناخت نہیں کر سکا۔ وہ سب کے لیے اجنبی تھی۔“

”جب مجھے پتا چلا کہ ادھر خادم حسین کے کھیتوں میں کسی عورت کی گردن کٹی لاش ملی ہے تو میں فوراً وہاں پہنچ گیا تھا۔“ وہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اس وقت تک آپ موقع کی کارروائی مکمل کر کے واپس جا چکے تھے۔ وہاں پر موجود لوگوں نے مجھے بتایا کہ مذکورہ عورت کی لاش کو سرکاری اسپتال بھجوا دیا گیا ہے۔ پھر جناب.....!“ وہ سانس لینے کے لیے تھما پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”میں واپس ڈیرے پر آ گیا تھا۔ اس کے بعد گاؤں میں کیا ہوتا رہا، مجھے کوئی خبر نہیں۔ اب آپ کے بندے مجھے اس عورت کے قتل کے الزام میں پکڑ کر تھانے لے آئے ہیں۔ مجھ پر رحم کریں سرکار..... قتل کی اس واردات سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

میں نے اس کے بیان کو چیک کرنے کی غرض سے کہا۔ ”اگر تمہارا نام رحم دین ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمہیں کھلی چھوٹ دے دوں گا۔ میں رحم صرف ان لوگوں پر کرتا ہوں جو بے قصور اور معصوم ہوتے ہیں یا پھر ان لوگوں پر جو قانون کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتے ہیں۔“

”سرکار! اس بات کا تو آپ پکا یقین کر لیں کہ میں بے گناہ ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اور جہاں تک قانون سے تعاون کرنے کا سوال ہے تو میں حاضر ہوں۔ آپ مجھے حکم دیں کہ کرنا کیا ہے؟“

اس دوران میں حوالدار رجب علی دو تین بار بڑی معنی خیز اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھ چکا تھا۔ اس کی ایسی نظر کا واضح مطلب یہی تھا کہ..... ملک صاحب، اگر اجازت ہو تو دو چار ہاتھ رکھوں اس سورا کی گردن پر!

اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ میں نے حوالدار رجب علی کو طرز رجو کے پہلو میں اسی لیے کھڑا کیا تھا کہ بہ وقت ضرورت وہ اس کی غلط بیانی پر ایک زوردار جھانپڑ رسید کر سکے لیکن میرے خیال میں ابھی ایسا موقع پیدا نہیں ہوا تھا۔ اسی لیے میں نے رجب علی کو زحمت نہیں دی تھی۔ میں طرزموں سے خواجواہ کی مار پیٹ اور تشدد کا قائل نہیں ہوں لیکن اگر سیدھی انگلی سے بھی نہ نکل پارہا ہو تو پھر میں انگلی کو ٹیڑھا کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر برداشت نہیں کرتا۔

پردہ کشیں

میں نے رجو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”تم آج کتنے بجے جانے وقوعہ پر پہنچے تھے؟“

”اس وقت لگ بھگ گیارہ بجے ہوں گے جی!“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے کوئی دس بجے وقوعہ کی کارروائی مکمل کر لی تھی اور دینو کھار کے انٹرویو کے بعد کم و بیش ساڑھے دس بجے تک میں واپس تھانے آ گیا تھا۔ اس حوالے سے رجو کا بیان درست تھا تاہم اس معاملے میں ابھی بہت سے پہلو میرے لیے اطمینان بخش نہیں تھے چنانچہ میں نے رجو کی گھسائی جاری رکھی۔

”سورج اٹنے کے فوراً بعد یعنی لگ بھگ صبح سات بجے پورے فیروز آباد کو اس بات کی خبر ہو چکی تھی کہ خادم حسین کے کھیتوں میں کسی نامعلوم عورت کی گردن کٹی لاش ملی ہے۔“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا ”جانے وقوعہ تمہارے ڈیرے سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر ہے، پھر تم چار گھنٹے دیر سے وہاں کیوں پہنچے تھے؟“

”جناب! جب مجھے پتا چلتا، تب ہی تو جانا تھا۔“

”تو تم یہ کہہ رہے ہو کہ اس واقعے کی اطلاع گیارہ بجے کے آس پاس تم تک پہنچی تھی؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔

”جی ہاں..... یہی بات ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”تو صبح سے تمہاری نظروں کے سامنے، ادھر کھیتوں میں جو لوگ جمع ہو رہے تھے، وہ تمہیں دکھائی نہیں دیے تھے؟“ میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ ”تم یہی سمجھے ہو گے کہ وہاں کبڈی کا کوئی ٹورنامنٹ ہو رہا ہے..... ہیں نا؟“

”جناب! میں آپ کو سمجھاتا ہوں.....“ وہ منت ریز انداز میں بولا۔

”ایک بات اچھی طرح اپنے ذہن میں بٹھالو رجو!“

میں نے اس کے کچھ بولنے سے پہلے بڑی سفاکی سے کہا ”مجھے کوئی چکر دینے یا کوئی دلچسپ کہانی سنانے کی کوشش نہیں کرنا۔ میرا حوالدار بڑی دیر سے اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دینے کے لیے بے چین کھڑا ہے۔ اگر مجھے تمہاری باتوں میں سے غلط بیانی کی بو آئی تو میں اسے اشارہ کرنے میں ذرا سی بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔ پھر تمہاری ہڈی پٹلی کا جو بھی حشر ہو، فریاد نہیں کرنا کیونکہ رجب علی گریہ و زاری کرنے والوں کی اور زیادہ ٹھکانی کرتا ہے.....!“

میری خطرناک اور دھمکی آمیز باتیں سن کر اس کے

چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ جلدی سے بولا۔ ”تھانے دار صاحب! آپ کو میری قسم کا چاہے یقین آئے یا نہ آئے مگر میں پھر بھی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ سے ایک لفظ کا بھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔“

”ٹھیک ہے، بتاؤ..... سچ کیا ہے؟“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”تمہیں اتنی تاخیر سے جانے واردات کی طرف جانے کا خیال کیوں آیا تھا؟“

”تھانے دار جی!“ وہ سنجیدہ لہجے میں بتانے لگا۔ ”پتا نہیں، کیا بات ہے کہ آج صبح میری آنکھ بہت دیر سے کھلی تھی حالانکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا.....“

”رات کو تم بہت دیر سے سوئے ہو گے نا.....“ میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ”اس لیے صبح اپنے وقت پر اٹھ نہیں سکے، ہیں نا؟“

”آپ خواجواہ میری ہر بات کو شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں جناب!“ وہ احتجاجی انداز میں بولا۔ ”میں رات کو اپنے مخصوص وقت پر سو گیا تھا..... پتا نہیں، پھر کیا ہوا کہ صبح وقت پر اٹھ نہیں سکا۔ یہ بات خود میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”ملک صاحب! میں چھوٹی بڑی ہر بات اس کی سمجھ میں ٹھونک دوں گا۔“ رجب علی نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس ڈشکرے کو آج کی رات میرے حوالے کر دیں۔“

”ہاں، رجب علی..... اب تو میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”لگتا ہے، یہ تمہارا ہی کیس ہے۔ شرافت کی زبان ٹھیک طرح سے اس کی سمجھ میں بیٹھ نہیں رہی۔“

رجو احتجاجی لہجے میں بولا۔ ”جناب! آپ کس بنا پر مجھے اس عورت کے قتل کے الزام میں گھسیٹ رہے ہیں۔ آپ کے پاس ایسا کون سا ثبوت ہے کہ.....؟“

”ثبوت.....!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ثبوت چاہیے تمہیں.....؟“

”آخر مجھے کچھ تو پتا چلے نا کہ.....“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

”پتا چل جائے گا..... ابھی پتا چل جاتا ہے۔“ میں نے ایک مرتبہ پھر قطع کلامی کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ”اس عورت کے قتل کا شک تم پر کرنے کے لیے میرے پاس بڑا ٹھوس ثبوت ہے۔ لو، تم بھی سن لو۔“

پھر نہایت ہی مختصر الفاظ میں، میں نے رحم دین عرف رجو کو کھوجی بابا اللہ رکھا کی تحقیق سے آگاہ کر دیا۔ میری بات

سن کر اس کی آنکھیں پھٹ گئیں اور وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

”جناب..... ڈیرے پر ایک..... مٹکی گھوڑا تو ہے لیکن..... میں نے، رات میں اس پر سواری نہیں کی..... اور نہ ہی اور کسی کو استعمال کے لیے دیا ہے..... وہ رات سے ادھر ڈیرے پر ہی بندھا ہوا ہے۔ آپ چاہیں تو جا کر دیکھ سکتے ہیں۔“

”میں اس مٹکی گھوڑے کو دیکھنے ڈیرے پر ضرور جاؤں گا لیکن اس دوران میں تم حوالدار کی مہمان داری کا ”لطف“ اٹھاؤ گے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا پھر حوالدار کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کر دیا۔

”رجب علی! اس ڈھکرے کو لے جاؤ اپنے ساتھ۔“ رحمونت سماجت کرنے لگا لیکن رجب علی نے اسے کالر سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور خونخوار لہجے میں غرایا۔ ”لاش تو اچھی خاصی ہے۔ دیکھتا ہوں، اس میں سے کتنے من مٹی نکلتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مٹی کے ساتھ ہی گوشت کا بھی اندازہ لگانا ہے رجب علی!“

”آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!“ وہ رحمو کو سر سے پاؤں تک تنقیدی نظر سے گھورتے ہوئے بولا ”آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ایسی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا ہنر کچھ خوب آتا ہے۔“

”بس، تو پھر یہ صحت مند لاش آج کی رات کے لیے تمہارے سپرد ہے۔“ میں نے حتیٰ لہجے میں کہا۔ ”میں نے محسوس کیا کہ اس کی زبان کا کوئی غدود بڑھا ہوا ہے جس کی وجہ سے اسے میرے سوالات کے جواب دینے میں خاصی دشواری محسوس ہو رہی ہے.....“ میں نے لچائی توقف کر کے معنی خیز انداز میں رحمو کی جانب دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے حوالدار سے کہا۔

”اب دیکھنا یہ ہے کہ صبح تک تمہارا ہنر کیا کمالات دکھاتا ہے..... میری بات تو تم سمجھ ہی گئے ہو گے؟“

”بڑی چٹکی طراں سمجھ گیا ہوں ملک صاحب!“ اس نے جواب دیا۔ ”آپ نے اسے میرے حوالے کر ہی دیا ہے تو پھر مطمئن ہو کر سو جائیں۔ میں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس کی ایسی خاطر داری کروں گا کہ ایک زبان ہی کیا، جسم کے ہر ہر اعضا سے پیوست غدود اپنی جگہ چھوڑ دے گا۔“

”اتنی زیادہ سرجری کی بھی ضرورت نہیں ہے رجب علی!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے صرف اس

کی زبان سے مطلب ہے..... سچ اگلنے والی زبان سے۔“ ”تو پھر ٹھیک ہے ملک صاحب!“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ”آپ نے تو میرا کام ہی آسان اور مختصر کر دیا ہے۔ میں اس کی زبان کے غدود کا ایسا آپریشن کروں گا کہ یہ تک یہ کسی سبیل کے مانند جاری و ساری ہو جائے گی۔“

اس کے بعد رجب علی، رحمو کو دھکیلے ہوئے اپنے ساتھ لے گیا۔ رجب علی نے جن نفیثی عزائم کا اظہار کیا تھا، میں سردست ان کے حق میں نہیں تھا تاہم اس نوعیت کی ڈراوے والی باتیں جرائم پیشہ افراد کا پتا پانی کرنے کے لیے بڑی موثر ثابت ہوئی ہیں اور ان ڈائلاگز سے میرا اصل مقصد بھی یہی تھا۔

پانچ منٹ کے بعد میں نے رجب علی کو اپنے پاس بلایا اور کچھ اس قسم کی ہدایت کی۔ ”رحمو پر ابھی ہاتھ ڈرا ہلکا ہی رکھنا ہے۔ ڈرا دھمکا کر کام چلانے کی کوشش کرو۔ تم فی الحال نفسیاتی حربے آزمادو۔ اگر وہ قتل کی اس واردات میں ملوث ہے تو اس کی زبان سے ضرور ایسی کوئی بات پھسل جائے گی کہ ہم کامیابی سے آگے بڑھنے کے قابل ہو جائیں گے۔“

”ابھی..... فی الحال.....“ اس نے میری کہی ہوئی بات میں سے دو الفاظ جن کر زیر لب دہرائے پھر تصدیق طلب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”ملک صاحب! اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو آپ رحمو کے حوالے سے کسی دوسرے زاویے پر بھی سوچ رہے ہیں۔“

”تمہارا اندازہ واقعی غلط نہیں ہے رجب علی!“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”رحمو کے حوالے سے مجھے ابھی ایک اہم رپورٹ موصول ہونے کا انتظار ہے.....“ میں نے لچائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”آج کی رات تم رحمو کے ساتھ تھوڑی سی نیٹ پریکٹس کر لو۔ اصل میچ کل شروع کرنا۔“

”جو آپ کا حکم ملک صاحب!“ اس نے فرمانبرداری سے کہا اور میرے کمرے سے رخصت ہو گیا۔

اگلے ہی لمحے اے ایس آئی مطلوب حسین میرے پاس حاضر ہو گیا۔ اس کے چہرے پر اب خاصی رعنائی اور توانائی نظر آ رہی تھی۔ اس نے خوب سیر ہو کر پیٹ پوجا کی تھی۔ میں نے اس کے بیٹھ جانے پر پوچھا۔

”مطلوب حسین! دن کے کھانے کی کسر نکل گئی یا میں کسی کا ٹشیل کو دوبارہ ”علی مدد“ ہوٹل کی طرف روانہ کروں؟“ ”نہیں جناب، اس کی بالکل ضرورت نہیں۔“ وہ نفی

پردہ نشین

میں مردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے ایسا ڈٹ کر کھایا ہے کہ کل کے ناشتے کا بھی کام ہو گیا ہے۔ کافی لذیذ اور مزے دار کھانا تھا جناب!“

”ایسا لذیذ اور مزے دار کھانا اپنا رنگ دکھائے بنا نہیں رہتا مطلوب حسین!“ میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”اور وہ بھی جب شدید بھوک کے بعد اسے معدے میں اتارا جائے۔“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ”کیا مطلب جناب..... یہ کھانا اب کون سا رنگ دکھانے والا ہے؟“

”نیند کا رنگ!“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے نہیں لگتا کہ آج رات تم پوری مستعدی سے ڈیوٹی کر سکو۔“

”آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میں اپنے فرض کو پہچانتا ہوں۔ میں کسی بھی طرح کوشش کر کے صبح تک ضرور ڈیوٹی دوں گا۔“

”مجھے تمہاری نیت یا کوشش پر کوئی شک نہیں ہے مطلوب حسین!“ میں نے واضح اور دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ ”لیکن میں انسانی جبلت اور خمار گندم کی حقیقت سے بھی بہ خوبی واقف ہوں لہذا میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہوں۔“ ”رسک!“ وہ تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ملک صاحب!“

”نہیں ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ ایک مہم پر روانہ ہونا ہے مطلوب حسین!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اس کے بعد واپس آ کر آرام سے نیند پوری کرتے رہنا.....“ میں نے لچائی توقف کے بعد ڈرامائی انداز میں اضافہ کیا۔ ”لیکن گھر جا کر نہیں، تم یہیں تھانے میں سو گے۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے ملک صاحب!“ اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔ ”لیکن آپ کس مہم پر مجھے لے جانا چاہتے ہیں، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔“

”تم میرے ساتھ جانے کے لیے تیار تو ہونا؟“ ”جی..... میں بھلا کیسے انکار کر سکتا ہوں؟“

”بس، تو پھر ٹھیک ہے...“ میں نے مطمئن انداز میں کہا۔

پھر اسے مہم کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔

☆☆☆

رات کے لگ بھگ نو بجے ہم تینوں چودھری الہی بخش کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ ہم تینوں سے میری مراد میں، اے

ایس آئی مطلوب حسین اور کھوجی بابا اللہ رکھا ہے۔ اللہ رکھا فیروز آبادی کا رہنے والا تھا اور اسے ہم نے اس کے گھر سے اپنے ساتھ لیا تھا۔ اس کی ہمت اور ولولے کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ آج کا پورا دن وہ کھرا اٹھانے کے کام میں تھک کر چور ہو چکا تھا اور رات میں جب میں نے اسے اپنے ساتھ ڈیرے کی طرف لے جانے کی بات کی تو وہ گرم بستر چھوڑ کر ٹھنڈی ٹھار فضا میں کود پڑا تھا۔ اس کے گھر والوں نے مجھے بتایا کہ اسے سوتے میں بے جگایا گیا تھا۔

اگر کوئی اور وقت یا کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں اللہ رکھا کو سردیوں کی اس سخت رات میں کبھی زحمت نہ دیتا لیکن میں اس کام کے لیے صبح کا انتظار نہیں کر سکتا تھا اور مزے کی بات یہ بھی کہ یہ کام اللہ رکھا کے سوا اور کوئی کر نہیں سکتا تھا۔

”ملک صاحب! جب میں یہاں سے رحمو کو گرفتار کر کے لے گیا تھا تو میں نے ڈیرے کا گیٹ بند کر کے اس پر تالا ڈال دیا تھا۔“ مطلوب حسین نے بتایا۔ ”اس تالے کی چابی اس وقت بھی میری جیب میں ہے۔“

”شاباش!“ میں نے سراپنے والے انداز میں کہا۔ ”یہ تم نے بہت نیک کام کیا تھا۔ اب اپنے مبارک ہاتھوں سے گیٹ کا تالا تم ہی کھولو گے۔“

مطلوب حسین آگے بڑھا تو میں نے ٹارچ روشن کر کے اس کی مدد کی۔ روشنی کے دائرے میں گیٹ کا تالا بڑا واضح دکھائی دینے لگا۔ اگلے ہی لمحے اے ایس آئی نے چابی گھما کر تالا کھول دیا۔ ہم سب ڈیرے کے اندر داخل ہو گئے۔ میری ہدایت پر اے ایس آئی نے ڈیرے کے گیٹ کو دوبارہ بند کر دیا۔

مجھے امید نہیں تھی کہ کسی نے ہمیں اس طرف آتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ موسم سردیوں کا ہو تو پنجاب کے گاؤں دیہات میں رات نو بجے کا مطلب ہے، آدمی رات..... اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ میں آج سے لگ بھگ پچاس سال پہلے کے پنجاب کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس زمانے میں کوئی سہولت یہاں نہیں تھی۔ گاؤں کا مطلب صرف گاؤں تھا..... ایک ماڈل گاؤں!

چودھری الہی بخش کا ڈیرا کم و بیش آدھے کنال رقبے پر پھیلا ہوا تھا جس کے مغربی حصے میں پہلو بہ پہلو تین کمرے بنے دکھائی دیے۔ باقی کی ساری جگہ ایک کشادہ صحن کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ اس صحن کی جنوبی دیوار کے ساتھ چار بھینسیں اور ایک گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ اندھیرا ہونے کے باعث میں ان جانوروں کا رنگ تو نہ دیکھ سکا البتہ بعد ازاں مجھے پتا چلا

کہ ان میں سے دو بھینسیں کالی اور دو بھوری تھیں جبکہ وہ گھوڑا مٹکی رنگ کا تھا۔ میں اللہ رکھا کو لے کر سب سے پہلے مذکورہ گھوڑے کی جانب بڑھ گیا۔

تھانے سے نکلنے وقت میں نے اور اے ایس آئی نے ایک ایک ٹارچ اپنے ساتھ رکھ لی تھی تاکہ رات کی تاریکی سے یہ خیر و خوبی نمٹا جاسکے۔ علاوہ ازیں میرا سروس ریوالور بھی بیلٹ کے ساتھ منسلک ہولسٹر میں موجود تھا۔ اگرچہ اس بات کا کوئی امکان تو نہیں تھا کہ ہمیں کسی ایمر جنسی کا سامنا ہو لیکن پھر بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مصیبت کبھی دستک دے کر نہیں آتی لہذا کسی بھی مشن میں انسان کو ہر پہلو سے چوکس اور ہوشیار رہنا چاہیے۔

مٹکی گھوڑے کی جانب بڑھتے ہوئے میں نے اللہ رکھا سے کہا۔ ”چاچا! آپ کو دن والے گھوڑے کا کھرا تو یاد ہوگا.....؟“

”سو باتوں کی ایک بات۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ”کوئی ایسا ویسا یاد ہے ملک صاحب..... یہ سمجھ لیں کہ وہ میرے حافظے میں ایسے نقش ہے جیسے کرنسی کے پر اس کی مالیت کندہ ہوتی ہے۔“

”پھر تو مزہ آجائے گا۔“ میں نے پر مسرت لہجے میں کہا اور مٹکی گھوڑے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”چاچا، مجھے یقین ہے، یہی گھوڑا اس واردات میں استعمال ہوا ہے۔ آپ اب اپنے تجربے کی روشنی میں تحقیق کر کے میرے خیال کی تصدیق یا تردید کرو۔ میں اسی مقصد سے تمہیں اتنی ٹھنڈ میں گرم بستر سے نکال کر لایا ہوں۔“

میں اللہ رکھا کو اس کے گھر سے لے تو آیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم کس جگہ اور کیا کرنے جا رہے ہیں۔ وہ گھوڑے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”کوشش کرتا ہوں ملک صاحب..... دیکھتا ہوں، حالات اور قدرت کیا رنگ دکھاتے ہیں۔“

میں نے اور اے ایس آئی نے اپنی اپنی ٹارچ روشن کر کے اللہ رکھا کے کام کو آسان بنانے کی کوشش کی۔ اس نے بڑی مہارت سے گھوڑے کی ٹانگ کو پکڑ کر اس کا پاؤں اوپر اٹھالیا پھر یہ غور اس کے کھراور سم کا جائزہ لینے لگا۔ چند سیکنڈ کے اس معائنے کے بعد اس نے بڑے مدبرانہ انداز میں گردن ہلائی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ملک صاحب! اس گھوڑے کو ذرا زمین پر چلا کر دکھائیں..... سواری سمیت!“

پر سے گھوڑے کی رسی کھول لی پھر میری ہدایت کے مطابق اس پر سوار ہو کر ڈیرے کے محن میں مختصر سی ”گھڑسواری“ مظاہرہ کرنے لگا۔

اللہ رکھا نے مطلوب حسین والی ٹارچ اپنے ہاتھ لے لی اور گھوڑے کے ہر قدم کی جانچ پڑتال شروع کر دی گھوڑا بہ مشکل آٹھ قدم چلا ہوا کہ اللہ رکھا نے یہ اعلان فرمایا۔ ”سو باتوں کی ایک بات اور کل ملا کر معاملہ سمجھ آ گیا ہے.....“

میں نے اسی کے انداز میں کہا۔ ”حالات اور قدرت کیا رنگ دکھا رہے ہیں چاچا؟“

”ملک صاحب! یہ بالکل وہی گھوڑا ہے جس پر دو سو اس ڈیرے کی جانب سے وہاں کھیتوں میں پہنچے تھے۔“ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اور پھر واپسی میں یہ گھوڑا ایک سو کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر اسی ڈیرے کی طرف آیا تھا.....“

”آپ کو تلاش بھی ملک صاحب!“

”ہم نے اس ڈیرے پر رہنے والے چودھری بخش کے ملازم خاص رحم دین عرف رحمو کو گرفتار کر لیا ہے۔ میں نے اللہ رکھا کو بتایا۔“ تھانے میں اس سے پوچھ کچھ جاری ہے۔ انشا اللہ! بہت جلد یہ کیس حل ہو جائے گا۔“

”اگر یہ رحمو اس کیس میں ملوث ہے تو پھر یہی نظر آ رہا ہے کہ اس نے نامعلوم عورت کی لاش کو گھوڑے پر لا کر خاں حسین کے کھیتوں میں پہنچایا تھا اور لاش کو وہاں پھینک دیا۔“

”یہ بھی معلوم کر لیں گے۔“ میں نے بڑے اعتماد سے اٹھا۔ ”اگر اس عورت کی لاش کو اس ڈیرے سے اٹھا کھیتوں تک پہنچایا گیا ہے تو پھر اس بات کے روشن امکانات ہیں کہ اسے اسی ڈیرے پر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہوگا۔ پھر میں نے ڈیرے کی مغربی دیوار کے ساتھ بنے ہوئے نہ کروں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے اے ایس آئی سے کہا۔ ”مطلوب حسین! ہم ان کمروں کی تلاشی لیں گے مجھے یقین ہے، اس عورت کے قتل کے شواہد اسی ڈیرے

سے ملیں گے۔“

”اور اس کا کیا کروں ملک صاحب؟“ مطلوب حسین نے گھوڑے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ کہیں تو میں اسے دوبارہ کھونٹے پر باندھ دیتا ہوں۔“

”یہاں نہیں.....!“ میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ وہ ابھمن زدہ انداز میں بولا۔ ”پھر کہاں ملک صاحب؟“

”ادھر کسی کمرے میں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور اس کے ساتھ ہی چاروں بھینسیں بھی کمرے کے اندر ہی بندھیں گی۔ باہر بڑی کڑا کے کی سردی پڑ رہی ہے۔ یہ بے زبان جانور ہیں تو کیا ہوا، موسم کی شدت تو ہر ذی روح پر اثر انداز ہوتی ہے نا.....“

”ممکن ہے، رحمو انہیں آج کل کمرے کے اندر ہی باندھتا ہو۔“ مطلوب حسین نے کہا۔ ”اتنی عقل اور تجربہ تو اس کا بھی ہوگا۔ میں نے گرفتاری کے وقت اسے کچھ کرنے یا سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔“

”تو پھر تم فی الحال گھوڑے کو ادھر کھونٹے پر ہی باندھ دو۔“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ ”پہلے ہم ان کمروں کا اندرونی جائزہ لے لیں، پھر ان جانوروں کے قیام کا بھی بندوبست کرتے ہیں۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے ملک صاحب؟“ کھوجی اللہ رکھانے پوچھا۔

”اگر آپ کو یقین ہے کہ جس گھوڑے کا کھرا ادھر خاں حسین کے کھیتوں سے اس ڈیرے تک پھیلا ہوا ہے وہ یہی مٹکی گھوڑا ہے تو پھر آپ کا کام ختم ہو جاتا ہے۔“ میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ ”اور اگر دن کی روشنی میں آپ اس گھوڑے کے کھرے کی مزید چھان بین کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو پھر صبح میرے پاس تھانے میں آجائیں۔“

”سو باتوں کی ایک بات.....!“ وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ ”کل ملا کر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ قدرت اور حالات نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ مجھے اس گھوڑے کے سلسلے میں مزید کسی جانچ پڑتال کی ضرورت نہیں۔“

”تو پھر آپ فارغ ہیں چاچا۔“ میں نے حتی لہجے میں کہا۔ ”آگے کے معاملات میں سنبھال لوں گا۔ آپ اس کیس کے اختتام پر اپنا انعام وصول کرنے میرے پاس تھانے ضرور آنا۔“

مخبروں، کھوجیوں اور قانون سے اسی نوعیت کا تعاون کرنے والے دیگر افراد کی محنت کے صلے کو ہم ”انعام“ کہا

کرتے تھے اور عموماً ہمیں یہ انعام اپنی جیب خاص ہی سے ادا کرنا پڑتا تھا۔

”تو پھر میں چلتا ہوں جناب!“ اللہ رکھا نے الوداعی انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے چاچا۔“ میں نے اسے جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ معاملہ ابھی راز ہی میں رہنا چاہیے۔“

”آپ بالکل بے فکر رہیں ملک صاحب!“ اس نے مجھے یقین دہانی کرائی۔

اور میں اس کی طرف سے واقعی بے فکر ہو گیا۔

اللہ رکھا کے جانے کے بعد میں اے ایس آئی کی معاونت سے ڈیرے کے تین کمروں کی تلاشی میں مصروف ہو گیا۔ ان تینوں میں سے ایک کو کٹڈی لگی ہوئی تھی، بانی دو کے دروازے کھلے دکھائی دیتے تھے۔ ہم نے سب سے پہلے کٹڈی والے کمرے کا رخ کیا۔

میں نے اے ایس آئی سے پوچھا۔ ”جب تم رحمو کو گرفتار کرنے آئے تھے تو تم نے ان کمروں میں جھانک کر بھی دیکھا تھا؟“

”نہیں جناب!“ مطلوب حسین نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”اس وقت میری ساری توجہ رحمو کی گرفتاری پر مرکوز تھی اور کسی چیز پر میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔“

کٹڈی گرا کر ہم مذکورہ کمرے میں داخل ہو گئے اور ٹارچ کی روشنی میں اس کا جائزہ لینے لگے۔ وہ کمرہ ایک مختصر سے بیڈروم کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں اگرچہ کمرے کی جزئیات تک تو رسائی ممکن نہیں تھی تاہم مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ اس بیڈروم کی سینک کم از کم رحمو کی اوقات سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ وہاں کی ہر شے سے صفائی، سلیقہ اور امارت نکلتی تھی۔

”مجھے لگتا ہے، یہ کمرہ چودھری الہی بخش نے اپنے آرام کے لیے سیٹ کر رکھا ہے۔“ اے ایس آئی نے میرے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”میرا بھی یہی اندازہ ہے مطلوب حسین.....!“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

چودھری اور وڈیرے اپنے ڈیروں وغیرہ پر ایک آدھ کمرہ اپنے لیے سیٹ کر کے رکھا کرتے ہیں جہاں وہ اکثر یا کبھی کبھار فرصت کے ”لمحات“ گزارنے چلے جاتے ہیں۔ میں نے ابھی جن خیالات کا ذکر کیا ہے وہ کوئی فارمولہ نہیں اور یہ بھی طے ہے کہ بیشتر صاحب اختیار افراد ان مصروفیات سے بچنے ہوئے نہیں۔ عقل مند قارئین کے لیے اشارہ ہی کافی ہے۔

اس سے سجائے بیڈروم میں جب ہمیں اپنے مطلب کی کوئی چیز نہ ملے تو ہم اس کے برابر والے کمرے میں گئے اور اندر گھستے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کمرہ حمو کے استعمال میں رہتا ہوگا۔ مذکورہ کمرے کے وسط میں ایک چارپائی نظر آرہی تھی جس پر دلائی اور رضائی والا ایک گرم بستر بھی بچھا ہوا تھا۔ کمرے کی ایک دیوار پر بنی دو چھتی پر کھانے پینے کے چند برتن بھی رکھے دکھائی دیے۔ ہم نے تارچ کی روشنی ادھر ادھر گھما کر کمرے کا معائنہ کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی بھی مشکوک شے ہماری گرفت میں نہ آسکی۔

اے ایس آئی نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ”ملک صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم دن کی روشنی میں ڈیرے کی خانہ تلاشی کا کام کریں تو ہمیں حمو کے جرم کا کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور مل جائے گا۔“

”تمہارا مشورہ اپنی جگہ بالکل درست ہے مطلوب حسین۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ہم دن میں بھی اس ڈیرے کا سروے کرنے آجائیں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مٹھی گھوڑے کے کمرے کی شکل میں ہمیں جو محسوس ثبوت حاصل ہو گیا ہے اس کی مدد سے نامعلوم عورت کے قاتل تک رسائی حاصل کرنا مشکل ثابت نہیں ہوگا۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اب تھانے جا کر میں حمو سے جو سوال وجواب کروں گا۔ تو وہ مجھے کوئی چکر نہیں دے سکے گا۔ مٹھی گھوڑا اور اس کا کھرا حمو کی زبان کے تمام بند کھول دے گا۔“

اے ایس آئی نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور ہم دوسرے کمرے سے نکل کر تیسرے کمرے میں داخل ہو گئے۔

یہ کمرہ دوسرے دونوں کی بہ نسبت سائز میں زیادہ بڑا تھا اور ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ اسے اسٹور روم کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ مختلف زرعی آلات رکھے نظر آ رہے تھے۔ کمرے کے کونے میں جانوروں کے چارے کا ڈھیر بھی دکھائی دیا اور اسی کمرے کے فرش پر چند گھونٹے بھی ٹھکے ہوئے تھے۔ یقیناً حمو موسم سرما میں بھینسوں اور گھوڑے کو سردی کی شدت سے بچانے کے لیے اسی کمرے میں باندھتا ہوگا۔ اس کمرے کے مختلف حصوں اور کونوں کھردروں کی تلاشی بھی بے سود ہی ثابت ہوئی۔ نامعلوم عورت کے قاتل کے حوالے سے ہمیں کسی قسم کے شواہد تک رسائی حاصل نہ ہو سکی۔

میں نے کمرے سے باہر آتے ہوئے اے ایس آئی

سے کہا۔ ”مطلوب حسین! ہمیں اب ان بے زبان جانوروں کو کمرے کے اندر باندھ دینا چاہیے۔“

اے ایس آئی نے میرے خیال کی تائید کی اور دونوں نے مل کر تھوڑی سی کوشش کے بعد چاروں بھینسوں اور مٹھی گھوڑے کو کمرے کے اندر پہنچا دیا۔ اے ایس آئی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد مجھ سے پوچھا۔

”ملک صاحب! اب ہمیں واپس چلنا ہے نا؟“

”بالکل..... ہم واپس تھانے جا رہے ہیں۔“ میں نے ڈیرے کے گیٹ کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”دوبارہ گیٹ کا تالا بند کر دو۔“

”ٹھیک ہے ملک صاحب۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔ ”جو آپ کا حکم.....!“

ہم جیسے ہی گیٹ کے قریب پہنچے، گیٹ کے باہر مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کوئی تیزی سے گزرا ہو۔ میں نے سوالیہ انداز میں مطلوب حسین کی طرف دیکھا۔ وہ میرے احساس کی تائید میں بولا، اس کی آواز سرگوشیاں تھی۔

”ملک صاحب! باہر کوئی ہے.....!“

میں نے فوراً اپنے سر دس رہو اور کو ہاتھ میں کر لیا اور دوسرے ہاتھ میں تارچ تھامے گیٹ کی جانب لپکا۔

گیٹ سے باہر آ کر میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور تارچ کی روشنی چھینک کر بھی دیکھنے کی کوشش کی لیکن دور دور تک مجھے کسی انسان کے آثار دکھائی نہ دیے۔ مزید تصدیق کے لیے میں نے اس نامعلوم شخص کو پکارا بھی۔

”اؤئے..... کون ہو تم..... سامنے آؤ!“

جب میری پکار پر کوئی رد عمل نہیں ابھرا تو میں نے للکارنے والے انداز میں ایک اور کوشش کی۔ ”تم جو کوئی بھی..... فوراً سامنے آ جاؤ..... ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔“

اس مرتبہ بھی میری آواز صدا بہ صحرا ہی ثابت ہوئی۔ میری نگاہ کے سامنے، گھپ اندھیرے میں یہاں سے وہاں تک سرسبز و شاداب کھیت پھیلے ہوئے تھے اور ان کھیتوں میں فصل کھڑی تھی۔ جب میری دوسری پکار پر بھی ادھر سے کوئی جواب نہ آیا تو مطلوب حسین نے کہا۔

”ملک صاحب! وہ کوئی شب بیدار جانور بھی تو ہو سکتا ہے۔“

”ہاں، ہو سکتا ہے.....“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن پتا نہیں کیوں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے..... بلکہ مجھے یقین ہے، وہ کوئی حیوان ناطق تو

جو..... پراسرار انداز میں، تاریکی کی آڑ لے کر ہماری سرگرمیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔“

اے ایس آئی نے بے یقینی سے مجھے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

اس کے انداز نے مجھے چونکا دیا، میں نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے مطلوب حسین؟“

وہ گیٹ پر تالا ڈالنے کے بعد بولا۔ ”کیا ہوا ملک صاحب.....؟“

”تم نے مجھے ایسے شک زدہ انداز میں کیوں دیکھا ہے؟“

”ملک صاحب! آپ کے ساتھ عجیب و غریب واقعات کیوں پیش آرہے ہیں؟“ جواب دینے کے بجائے اس نے التا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میری حیرت الجھن میں بدل گئی۔

”اس وقت رات کے دس بج رہے ہیں.....“ وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔

”تو پھر؟“ میں نے اسے بات مکمل نہ کرنے دی۔

”دس بج رہے ہیں تو کیا ہوا؟“

”پچھلی رات اسی وقت آپ نے اپنے کوارٹر کے دروازے پر ایک پراسرار دستک سنی تھی۔“ وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اور ابھی آپ کو یقین ہے کہ کوئی چھپ کر ہماری سرگرمی کا جائزہ لے رہا تھا، ہم جیسے ہی گیٹ کی جانب بڑھے، وہ یہاں سے بھاگ گیا ہے.....“

”تو کیا تم نے ادھر کسی کی موجودگی محسوس نہیں کی تھی.....؟“ میں نے دائیں بائیں گردن گھما کر اے ایس آئی سے سوال کیا۔

”محسوس کی تھی!“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میری سوچ میں اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ وہ کسی انسان کے بجائے کوئی جانور بھی تو ہو سکتا ہے، جیسا کہ رات والی دستک کے بارے میں میرا خیال ہے کہ وہ تیز ہواؤں کا نتیجہ ہوگی لیکن آپ تو.....“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اسی سنجیدگی سے اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

”لیکن آپ کو تو یقین ہے کہ رات کو بھی آپ کے کوارٹر کے دروازے پر کسی انسان نے ہی دستک دی تھی اور اب بھی کوئی انسان ہی ہماری تاک میں تھا.....“

”میرے دماغ میں ایسی پختہ سوچ کیوں ہے، اس کا

حاصل خواری

ایک لڑکی پیدائش سے اپنی طبعی عمر کو پہنچنے تک مختلف حیثیتیں اور پہچان اپناتی ہے مثلاً بیٹی، بہن، کزن، ماں، خالہ، بہو، ساس وغیرہ اور ہر حیثیت کے بعد دوسری حیثیت قبول کرتی جاتی ہے مگر ساس بننے کے بعد پھر بھی ماں، بہن، بیٹی، بہو میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔

اپنے ماں باپ کی آخری یا اکلوتی اولاد بیٹا شادی ہو جانے کے بعد بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس کی ذہنی اذیت اور پریشانی میں اس کی بیوی کا کردار اور حصہ زیادہ ہے یا اس کی ماں کا۔

دوسوئیں پاساں بہو اگر ایک دوسری کے گن گاہیں اور ایک ساتھ ہی خوشی رہنے کا دعویٰ کریں تو انہیں اگر جھوٹا نہ بھی سمجھو تو مجبوراً ضرور سمجھنا چاہیے، دعویٰ خواہ عملی ہو یا زبانی۔

کنوارے بچے میں ماں، باپ، بہن، بھائیوں سے جو جو یاد تیاں اور بد لحاظیاں روا رکھی جاتی ہیں، شادی کے بعد ایک ایک کر کے ان کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

مرسلہ: منسٹرب کلان

جواب میں فی الحال نہیں دے سکتا۔“ میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ ”دیکھتے ہیں، حالات اور قدرت کیا رنگ دکھاتے ہیں۔“

میں نے اللہ رکھا کے تکیہ کلام کو غیر ارادی طور پر استعمال کیا تو اے ایس آئی نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”کل ملا کر معاملہ یہ ہوا کہ اب ہمیں واپس تھانے جانا ہے.....“

مطلوب حسین نے سوا باتوں کی ایک بات کہی تھی لہذا ہم چودھری الہی بخش کے ڈیرے سے واپس آ گئے۔

☆☆☆

میں ایک مرتبہ پھر حمو سے سوال جواب کر رہا تھا۔ اسے اپنے کمرے میں بلانے سے پہلے میں نے حوالدار رجب علی سے اس کی رپورٹ لے لی تھی۔ حوالدار نے مجھے

بتایا تھا کہ رحمونے اس نامعلوم عورت کے قتل کا اقرار نہیں کیا۔ وہ ایسے کسی واقعے سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کر رہا تھا۔

”ملک صاحب! آپ نے سختی سے منع کر دیا تھا۔“
حوالدار نے رپورٹ کے اختتام پر کہا۔ ”اس لیے میں نے ابھی تک زبانی پوچھ گچھ ہی کی ہے اور بندہ کسی طرح چھری کے نیچے نہیں آ رہا۔“

”ٹھیک ہے، تم رحمونے کو میرے پاس لے آؤ۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔ ”لگتا ہے، اس کی گردن پر مجھے ہی چھری پھیرنا پڑے گی۔“

پھر حوالدار رجب علی ایک منٹ سے بھی پہلے رحمونے کو لے کر میرے پاس آ گیا تھا۔ میں نے رجب علی کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ کمرے سے نکل گیا تو میں رحمونے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ گردن جھکائے خاصانہ حال کھڑا تھا۔

”رحمونا! میں نے کبھی انداز میں اسے مخاطب کیا۔ ابھی تک اگر تمہارے ساتھ کوئی سختی نہیں کی گئی تو اسے پولیس کی کوئی کمزوری مت سمجھنا۔ میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں سچ بولنے کا۔۔۔۔۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ یا پھر کڑی تفتیش سے گزرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

”تھانے دار صاحب! آپ کو میری بات کا یقین کیوں نہیں آتا۔“ وہ فریادی لہجے میں بولا۔ ”جو کچھ تمہارے پاس کو بتا دیا ہے۔۔۔۔۔ میں نے کسی عورت کو قتل نہیں کیا جناب۔۔۔۔۔“

”ایک سچ تم نے مجھے بتایا ہے اور دوسرا سچ میری تفتیش کے نتیجے میں سامنے آیا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور ان دونوں سچائیوں میں کوئی تال میل نظر نہیں آتا۔ اب ایک ہی بات ہو سکتی ہے رحمونا۔“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا، پھر قدرے سخت لہجے میں اضافہ کیا۔ ”یا تو تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو اور یا پھر میری تفتیش غلط ہے، میں نے صبح سے اب تک جھک ماری ہے۔ مجھے تھانے داری چھوڑ کر آلو چھوڑنے کی ریڑھی لگا لینا چاہیے۔“

وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر میرے خاموش ہونے پر بولا۔ ”تھانے دار جی، آپ نے کیا تفتیش کی ہے؟“

اس کا یہ سوال بر محل تھا کیونکہ میں نے جتنے جذباتی انداز میں آلو چھوڑنے کی ریڑھی والی بات کی تھی اس پر رحمونا چونک جانا ایک لازمی امر تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کی حیرت اور کانوں کے کیڑے جھاڑنے کی غرض سے کہا۔

”سنو رحمونا وہ جو مشکلی گھوڑا تمہارے ڈیرے پر بندھا ہوا ہے وہی قتل کی اس واردات میں استعمال ہوا ہے۔ اس ڈیرے پر سے کوئی اس نامعلوم عورت کی لاش کو مشکلی گھوڑے کی پیٹھ پر لا کر پچھلی رات خادم حسین کے کھیتوں میں پہنچا تھا، اس نے لاش کو وہاں پھینکا اور پھر اسی گھوڑے پر سوار ہو کر واپس ڈیرے پر آ گیا۔ اس حقیقت کو تم کیا، دنیا کی کوئی طاقت جھٹلا نہیں سکتی۔ بتاؤ، اب کیا کہتے ہو تم؟“

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے متعجب انداز میں مجھ سے پوچھا۔ ”آپ مشکلی گھوڑے کے حوالے سے یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟“

میں نے اسے کھوجی اللہ رکھا کی ماہرانہ محنت کی تفصیل سے آگاہ کیا پھر سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں ابھی تمہارے ڈیرے سے آ رہا ہوں۔ ٹارچ کی روشنی میں جس حد تک ممکن تھا، میں نے وہاں کی تلاشی لی ہے۔ صبح ایک مرتبہ پھر ادھر کا سروے کروں گا لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ تم صبح سے پہلے ہی اپنے جرائم کا اقرار کر لو۔۔۔۔۔ اب کہ جب میں تمہیں حوالدار کے حوالے کروں گا تو پھر تمہاری ہڈی پٹلی کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔“

”سرکار! میں کس طرح آپ کو یقین دلاؤں۔۔۔۔۔ اس کے لہجے سے بے بسی جھلکنے لگی۔ ”میں اپنی بے گناہی کے لیے بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں لیکن آپ تو قسم کیا، میری بات سننے کو تیار نہیں ہیں۔ میں کروں تو کروں کیا۔۔۔۔۔“

”میں نے جتنی بک بک تمہاری سن لی ہے نا رحمونا۔۔۔۔۔! میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ”میں ملزموں کو اپنے سامنے اتنی زبان چلانے کی اجازت نہیں دیتا ہوں۔ اب تم صرف اور صرف میرے سوالات کے جواب دو گے۔“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا، پھر پوچھا۔

”وہ دلکش اور خوب صورت عورت کون تھی؟ وہ تمہارے ہاتھ کیسے لگی؟ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ اور۔۔۔۔۔ کیا کرنے کے بعد تم نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا؟ آہ قتل تم نے کہاں چھپایا ہے؟ تم نے اس بدنصیب کو کس جگہ ذبح کیا تھا۔۔۔۔۔؟“

ان خطرناک اور سنگین سوالات کی بھرمار نے رحمونے کی حالت خراب کر دی۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈ گئی اور ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ڈھانکی من کی وہ زندہ لاش دھواں دھار انداز میں رو پڑے گی مگر اگلے ہی لمحے اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہونے لگے۔ یہ

پردہ نشین

جدیلی میرے لیے حیرت انگیز تھی۔ ڈر، خوف اور سراسیمگی کی جگہ اعتماد، سکون اور اطمینان نے لے لی اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ کسی حتمی فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔ یہ فیصلہ میری تیوری کی تائید اور تصدیق میں بھی ہو سکتا تھا اور اس کے خلاف بھی۔ پھر جب وہ گویا ہوا تو اس کا دماغ کسی کتاب کے مانند کھل گیا۔

”تھانے دار صاحب! وہ بڑی توانا آواز میں بولا۔ ”میں نے منت سماجت کر کے، رو کر، گڑ گڑا کر اور بڑی بڑی قسمیں کھا کر آپ کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کر لی ہے لیکن آپ کسی بھی قیمت پر مجھے بے قصور سمجھنے کو تیار نہیں ہیں اس لیے اب میں اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا کیونکہ۔۔۔۔۔“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر پہلے سے بھی زیادہ سنجیدگی سے بولا۔

”کیونکہ میں نے اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ خدا جانتا ہے کہ میں نے کسی عورت کو قتل نہیں کیا۔ آپ اس ناکردہ جرم میں مجھے پھانسی بھی لگوا دیں گے تو میں اف تک نہیں کروں گا۔ پھر میرا خدا خود ہی آپ سے پوچھ لے گا کہ۔۔۔۔۔ اے ملک صفدر حیات! کیا میں نے تمہیں اس لیے تھانے دار بنایا تھا کہ تم بے گناہوں کو ناکردہ جرائم کی پاداش میں کال کوٹھری میں سڑاتے رہو اور انہیں تختے پر لٹکاتے رہو۔۔۔۔۔!“

رحمونے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ میں اندر سے ہل کر رہ گیا۔ کسی قاتل اور زانی شخص سے ایسی بردباری اور خدا سپردگی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ان لحاظ میں وہ مجھے بہت ہی معصوم اور بے گناہ نظر آیا اور پھر میرے ذہن میں تیز روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا اور بالکل مختلف انداز میں اس سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔

”تمہارے بے گناہ یا گناہ گار ہونے کا فیصلہ تو صبح تک ہو ہی جائے گا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ کل رات میں کسی نے وہ مشکلی گھوڑا تم سے استعمال کرنے کے لیے لیا تھا؟“

”نہیں جناب، اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ بڑی قطعیت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ گھوڑا صرف چودھری صاحب کے استعمال میں رہتا ہے جناب۔ مجھے تو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ گھوڑا ابھی تک کھلے میں بندھا ہوا ہے۔ اگر اسے ٹھنڈ لگ گئی تو چودھری صاحب میری کھال کھنچوا ڈالیں گے۔ آپ کے آدمی نے اتنی افراتفری میں مجھے گرفتار کر کے تھانے پہنچایا ہے کہ میں جانوروں کی طرف دھیان ہی نہیں دے سکا۔“

”ان جانوروں کے لیے تم خود کو فکر میں نہ ڈالو رحمونا۔“

میں نے بہ دستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے چاروں بھینسوں اور مشکلی گھوڑے کو ایک کمرے کے اندر باندھ دیا ہے۔۔۔۔۔ وہ کمر ا جہاں چارے کا ڈھیر اور چند زرعی آلات رکھے ہوئے ہیں۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے تھانے دار صاحب!“ وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے تو میری بہت بڑی مشکل ٹال دی ہے۔“

جو شخص قتل کے الزام میں زیر تفتیش ہو اور اپنے معاملے کو خدا کے حوالے کر کے مطمئن ہو گیا ہو، وہ چودھری کے غیظ و غضب سے بچ جانے کے لیے دل کی جن گہرائیوں سے میرا شکریہ ادا کر رہا تھا اس نے مجھے یقین دلا دیا کہ رحمونا مجرم نہیں ہو سکتا۔ میں نے قدرے نرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”رحمونا! اللہ تمہارا بھی بھلا کرے گا اگر تم میرے ساتھ تعاون کرتے رہو گے۔“

”جی، آپ حکم کریں، میں تو ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔“

”تو تمہیں پکا یقین ہے کہ وقوعہ کی رات کسی نے تم سے مشکلی گھوڑا نہیں لیا تھا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”اور نہ ہی تم اس گھوڑے کو ڈیرے سے باہر لے کر گئے تھے؟“

”بالکل نہیں جناب۔“ وہ پورے یقین سے بولا۔ ”جب میں رات کو سونے کے لیے لیٹا تو میں نے چاروں بھینسوں اور مشکلی گھوڑے کو چارے والے کمرے کے اندر باندھ دیا تھا اور آج جب میں کافی دیر سے سوکراٹھا تو وہ گھوڑا کمرے کے اندر اپنے کھونٹے پر جوں کا توں بندھا ہوا تھا۔“

”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تمہاری غیر معمولی گہری نیند کے دوران میں کوئی ڈیرے کے اندر داخل ہوا ہو۔“ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ”وہ مشکلی گھوڑے کو گھنٹے، آدھے گھنٹے کے لیے ڈیرے سے نکال لے گیا ہو اور پھر تمہاری بے خبری ہی میں اس نے گھوڑے کو لا کر واپس کمرے میں باندھ دیا ہو؟“

”ایسا بھی ہوا تو نہیں جناب!“ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مجھے جو پتا تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔۔۔۔۔“

”کل شام میں، ڈیرے پر تمہارے علاوہ اور کون تھا؟“

”میں تھا اور۔۔۔۔۔ بدری تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

ہوا تھا جو ہنوز جاری تھا۔ اس کا کوئی نام نہ تھا، سراسر ٹھکانا میرے علم میں نہیں تھا لہذا میں اس سلسلے میں مکمل بے بس تھا۔ رات کو جب میں سونے لگا تو رجمو کے الفاظ نے میرے ذہن میں کھلبلی مچادی۔ اس نے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر کے مجھے بہت بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ میں نے ان لمحات میں تہ دل سے یہ دعا کی۔

”اے میرے پروردگار! تو میرے ہاتھ سے کسی بے گناہ کو سزا نہ دلوانا ورنہ میں ساری زندگی عذاب مسلسل کا شکار رہوں گا۔“

☆☆☆

اگلی صبح میری دعا قبول ہوگئی! میں نے پہنچا تو وہاں اچھی خاصی رونق لگی ہوئی تھی۔ اے ایس آئی مطلوب حسین کو بدری کی طرف جانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی کیونکہ نصف شب کے بعد کانسٹیبل امین اینڈ کمپنی اسے پکڑ کر تھانے لے آئے تھے۔ بدری دیوار پھلانگ کر چودھری کے ڈیرے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ امین اور اس کے ساتھی کانسٹیبل نے اسے رنگے ہاتھوں قابو کر لیا تھا۔ ”رنگے ہاتھوں“ ان معنوں میں کہ اس کے پاس سے کپڑے میں لپٹا ہوا ایک خنجر بھی برآمد ہوا تھا جس کی دھار پر خون جما ہوا تھا۔

یہ وہی خنجر تھا جس کی تلاش مجھے آلہ قتل کی حیثیت سے تھی۔ اس نامعلوم عورت کو اسی خطرناک خنجر کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ بدری مذکورہ خنجر کو ڈیرے میں کسی ایسی جگہ رکھنا چاہتا تھا جہاں پولیس کی نظر نہ آسانی رسائی حاصل کر سکے۔ رجمو کو ہم نے گرفتار تو کر لیا تھا لیکن بدری کی خواہش تھی کہ رجمو کے بچاؤ کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ اس کیس کے پوشیدہ گوشے بدری کی گرفتاری کے بعد نمایاں ہو گئے تھے۔

میں نے کسی پوچھ گچھ سے پہلے بدری کو پندرہ منٹ کے لیے حوالدار رجب علی کی مہربانی میں دے دیا۔ رنگے ہاتھوں پولیس کی گرفت میں آنے کے بعد اس کی ہمت ویسے ہی ٹوٹ چکی تھی، رہی سہی کسر رجب علی کے مہربان ہاتھوں نے پوری کر دی۔ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد وہ پاؤں پڑ کر اور ہاتھ جوڑ کر اقبالی بیان دینے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

اس نے میرے روبرو، خدا کو حاضر و ناظر جان کر جن جرائم کا اعتراف کیا اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ مقتول نامعلوم عورت کا نام شاہدہ تھا اور وہ ایک پیشہ ور عورت تھی۔ بدری کسی دوسرے علاقے سے اسے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا اور شاہدہ کو بدری ہی نے دریا کے کنارے کھیتوں میں موت

”کب سے؟“

”اس واقعے سے ایک دن پہلے وہ لاہور روانہ ہو گئے تھے۔“ اس نے بتایا۔ ”اور ان کی واپسی تین چار دن کے بعد ہوگی۔“

”اوہ.....!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ”تو اس کا مطلب ہے، یہ گناہ ڈاکھیل چودھری الہی بخش کے غیاب میں کھیل گیا ہے.....؟“

رجمو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اسے رجب علی کے حوالے کر دیا۔

تھانے سے اٹھنے سے پہلے میں نے دو تین ضروری کام کیے۔ نمبر ایک، رجب علی کو سختی سے تاکید کر دی کہ ملزم رجمو کو ایک طمانچہ تک نہیں مارنا۔ اس نوعیت کے تمام تر ارمان نکالنے کے لیے اسے صبح کوئی اور شکار دے دیا جائے گا۔ نمبر دو، اے ایس آئی مطلوب حسین کو ہدایت دی کہ وہ کل علی الصباح ڈیوٹی آف کر کے سیدھا بدری کے گھر پہنچے گا اور اسے گرفتار کر کے تھانے پہنچائے گا۔ میں جب صبح تھانے پہنچوں تو بدری کو حوالات میں ہونا چاہیے۔ نمبر تین، میں نے مقامی کانسٹیبل امین کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے ساتھ ایک اور کانسٹیبل کو لے کر جائے گا اور رات کا باقی حصہ چودھری الہی بخش کے ڈیرے کی نگرانی میں گزارے گا اور جیسے ہی کوئی شخص اس ڈیرے میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو وہ لوگ فوراً اسے گرفتار کر لیں گے۔ پھر میں اطمینان سے اپنے کوارٹر میں آ گیا۔

رجمو میری نگاہ میں بے گناہ ثابت ہو چکا تھا۔ صبح اس کی بے گناہی کا کوئی نہ کوئی عملی ثبوت بھی مل جانا تھا۔ بدری کی ذات میری نظر میں مشکوک ہو گئی تھی۔ صبح اے ایس آئی جب اسے تھانے پہنچا دیتا تو میں اس سے بھی پوچھ گچھ کر لیتا۔ رات ڈیرے سے واپسی پر میں نے ڈیرے کے باہر کسی پراسرار موجودگی کو محسوس کیا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کوئی چھپ کر ہماری نگرانی کر رہا ہو۔ عین ممکن تھا، وہ ڈیرے کے اندر داخل ہونے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو پھر وہ امین اینڈ کمپنی کے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتا تھا۔ میں نے امین کو ہر قسم کی کارروائی کے اختیارات دے دے دیے تھے۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ بس بندے کو پکڑنا نہیں باقی سب چلے گا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جب میں صبح تھانے پہنچوں تو مذکورہ شخص سے بھی ملاقات ہو جائے۔

میں اگر کچھ نہیں کر سکا تو اس شخص کے لیے نہیں کر سکا جس کی پراسرار دستک کے بعد ہنگامہ خیزی کا یہ سلسلہ شروع

”میں نے پوچھا تو کہنے لگا، رات کو ڈیرے سے جانے کے بعد اسے ٹھنڈ لگ گئی تھی۔“ رجمو نے جواب دیا۔ ”اور وہ پوری رات بخار میں پھنک رہا۔ صبح وقت پر، ڈیرے پر آنے کی ہمت نہیں ہوئی اس لیے دوپہر کو وہ گھر سے نکلا تھا۔“ وہ لمحے بھر کو رکا، ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اس کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے میں نے اسے، شام سے پہلے ہی گھر بھیج دیا تھا۔ پتا نہیں، اس بے چارے کا اب کیا حال ہوگا.....!“

”اس بے چارے کا حال تو میں تمہیں ادھر تھانے ہی میں ملاحظہ کروادوں گا۔“ میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم صرف مجھے اتنا بتا دو کہ تمہاری گرفتاری پر ابھی تک حویلی کی طرف سے کوئی ہلچل کیوں نظر نہیں آئی۔ تم تو چودھری الہی بخش کے بہت خاص ملازم ہو.....؟“

”میں سمجھتا ہوں، میری گرفتاری کی خبر ابھی حویلی تک پہنچی ہی نہیں ہوگی۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”جب مجھے ڈیرے سے گرفتار کیا گیا تو رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا اور اس سے بہت پہلے بدری وہاں سے جا چکا تھا۔ اب صبح جب وہ ڈیرے پر پہنچے گا اور میں اسے وہاں نہیں ملوں گا تو میری تلاش ہوگی، پھر کہیں جا کر پتا چلے گا کہ میں تو تھانے میں بند ہوں۔“

”چلو، میں مان لیتا ہوں کہ تمہاری گرفتاری ابھی تک حویلی اور گاؤں والوں کی نظروں میں نہیں آئی۔“ میں نے بڑی رसान سے کہا۔ ”کیا اس نامعلوم عورت کی لاش کا قصہ بھی ابھی تک حویلی کے اندر نہیں پہنچا ہوگا؟“

”اس واقعے کی خبر تو ضرور حویلی کے اندر پہنچی ہوگی جناب۔“

”پھر ادھر سے کوئی رد عمل دیکھنے میں کیوں نہیں آیا؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ کوئی معمولی واقعہ تو نہیں۔ چودھری الہی بخش آخراں گاؤں کے کرتا دھرتا ہیں۔ انہیں تھانے آکر اس معاملے میں اپنی دلچسپی تو ظاہر کرنا چاہیے ہی نہ؟“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ”لیکن ہمارے چودھری صاحب تو گاؤں میں ہی نہیں ہیں اور حویلی میں ان کے بعد عورتیں ہی عورتیں باقی بچتی ہیں۔ اب وہ تو تھانے آنے سے رہیں۔“

”چودھری الہی بخش کہاں گئے ہیں؟“ میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

”وہ لاہور گئے ہوئے ہیں۔“ رجمو نے جواب دیا۔

”بدری کون؟“ میں چونک اٹھا۔

”اس کا نام تو بدر الدین ہے جی لیکن بچپن ہی سے وہ ”بدری“ مشہور ہے۔“

”جیسے تم رجمو مشہور ہو.....؟“

”جی ہاں.....!“

”یہ بدری تمہارے ڈیرے پر کیا لینے آیا تھا؟“ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”جناب! وہ بھی میرے ساتھ ڈیرے پر ہوتا ہے۔“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”میری طرح وہ بھی چودھری صاحب کا ملازم ہے پر.....“

”پر کیا رجمو؟“ میں نے فوراً اس کی بات کا ٹ دی۔

”جناب! بدری کی ڈیوٹی صبح سے شام تک ہوتی ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جبکہ میں رات کو بھی ڈیرے پر ہی رہتا ہوں۔“

”بدری کے ذمے کس نوعیت کے کام ہیں؟“

”وہ زیادہ تر جانوروں کی دیکھ بھال کرتا ہے جی۔“ رجمو نے بتایا۔ ”خصوصاً چودھری صاحب نے اسے گھوڑے کی دیکھ بھال کے لیے رکھا ہوا ہے۔“

”وقوعہ کی رات جب بدری ڈیرے سے رخصت ہوا تو کیا گھوڑا ڈیرے پر ہی موجود تھا؟“ میں نے پہلے پوچھے ہوئے سوال کو دوسرے انداز سے کیا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتانے لگا۔ ”اس رات بدری میرے لیے رات کا کھانا لے کر آیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کھانا کھایا اور مزے سے سو گیا۔“

ان لمحات میں میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا، میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ”اور پھر تم دوسری صبح یعنی آج صبح خلاف معمول بہت دیر تک سوتے رہے تھے ہیں نا.....؟“

”جی، بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا آج صبح بدری ٹھیک وقت پر ڈیرے نہیں پہنچا تھا؟“ میں نے جاننا چاہا۔ ”اس کی ڈیوٹی تو صبح سے شام تک ہوتی ہے نا؟“

”اگر وہ آج صبح وقت پر آ جاتا تو پھر میرے دیر تک سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جناب۔“ رجمو نے بڑا معقول جواب دیا۔ ”وہ مجھے جگا دیتا۔“

”وہ کتنے بجے ڈیرے پر پہنچا تھا؟“

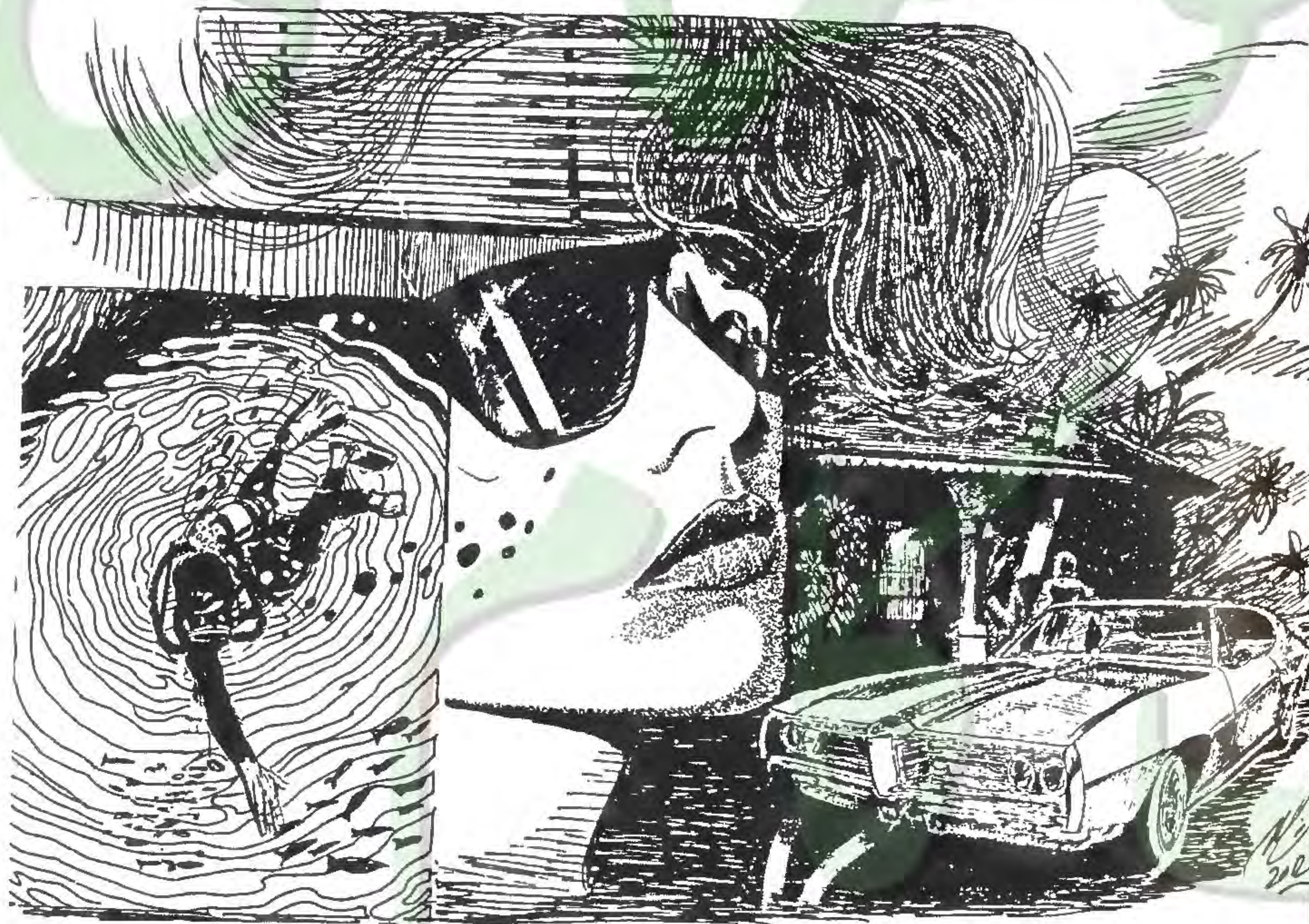
”دوپہر کے بعد.....!“

”اس تاخیر کا اس نے کیا سبب بتایا تھا؟“

جنت تئو ریاض

ہر پرسکون اور خوبصورت جگہ کو انسان جنت کا نام دیتا آیا ہے مگر... ہر جنت کو تباہ کرنے کے لیے کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی شیطان موجود ہوتا ہے۔ وہ بھی ایسے ہی شیطان صفت لوگوں کے درمیان گھبر گیا تھا مگر ہر زندان میں کوئی نہ کوئی روزن بھی ہوتا ہے، ضرورت صرف تلاش کرنے کی ہوتی ہے اور وہ اسے مل گیا تھا۔

سنی خیز جرائم کی دنیا میں مغرب کا ایک دلچسپ انداز



ہوا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔
”ہیلو! مجھے افسوس ہے ڈین کہ تمہیں جنت سے بلانا پڑ گیا۔“
”کوئی بات نہیں جناب۔“ لیونارڈ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یہاں کا موسم بھی اچھا ہے۔ کم از کم برف تو نہیں گر رہی۔“
بوائے نے دفتر میں موجود دیگر دو افراد سے اس کا

ایف بی آئی ایجنٹ ڈینیل لیونارڈ، ہونولولو کے علاقائی دفتر میں اپنی ڈیوٹی پر تھا کہ اسے فوری طور پر وارنٹیشن ڈی سی میں واقع ڈیپٹی ڈائریکٹر کے دفتر میں رپورٹ کرنے کے لیے کہا گیا۔ یہ حکم ملتے ہی وہ پہلی فلائٹ سے دارالحکومت کے لیے روانہ ہو گیا۔ پیر کی صبح جب وہ ڈیپٹی ڈائریکٹر ڈینس بوائے کے دفتر پہنچا تو وہ اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا

پولیس کے حرکت میں آ جانے سے کوئی راز، راز نہیں رہا تھا۔
بدری کے اعترافی بیان کے مطابق رحمونے کچھ زیادہ ہی ہاتھ پاؤں پھیلا لیے تھے۔ وہ چودھری کی عیاشیوں میں برابر کا شریک تھا جس کے لیے ڈیرے کا وہی کمر استعمال کیا جاتا تھا جو بیڈروم کی طرز پر سیٹ کیا گیا تھا۔ چودھری اپنے دسترخوان کا بچا بچا مال اسے بھی کھانے کو دے دیا کرتا تھا۔ اس طرح دونوں کی گاڑی بڑی خوش اسلوبی سے چل رہی تھی۔ اسی دوران میں چودھری الہی بخش پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ رحمونے بڑی خاموشی کے ساتھ اس کی حویلی کی ایک عورت پر بھی ہاتھ صاف کر رہا ہے۔ وہ بڑی آزادی سے حویلی کے اندر آتا جاتا تھا لہذا اس کام کے لیے اسے کوئی مشکل نہ ہوئی تھی۔ رحمونے اس گستاخی نے چودھری کے تن بدن میں آگ بھردی۔ ان ”تعلقات“ کی تصدیق ہو جانے پر چودھری نے رحمونے کو عبرت ناک سزا دینے کا منصوبہ بنالیا۔
چودھری اگر چاہتا تو خود اپنے ہاتھوں سے یا کسی بھی شخص سے کہہ کر رحمونے کو گھٹانے لگا سکتا تھا لیکن اس موقع پر اس نے ایک تیرے دو شکار کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاہدہ نامی اس پیشہ ور عورت سے بھی چودھری کو بہت سی شکایات تھیں اور وہ اسے بھی بدترین سزا دینے کا خواہاں تھا لہذا اس نے شاہدہ اور رحمونے کو تھکی کر کے ایک ہیکسج سبانا دیا تھا۔

اس کیس کی تمام گتیاں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے سے پہلے ہی کھل چکی تھیں۔ میں نے ایک لمحے کی دیر نہ کی اور بدری کے بعد چودھری الہی بخش کو بھی لاہور سے گرفتار کر کے حوالات کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا۔ وہ اپنی ذات کو ہر شک و شبہ سے بالاتر ثابت کرنے کے لیے وقوع سے ایک روز پہلے ہی منظر سے غائب ہو گیا تھا لیکن بدری کی حماقت اسے لے ڈوبی۔

بدری نے جو کچھ بھی کیا تھا وہ چودھری الہی بخش کے حکم کا نتیجہ تھا، قانون کی نظر میں وہ دونوں ایک جیسے مجرم تھے لہذا میں نے ان کے خلاف بڑا مضبوط چالان بنا کر انہیں عدالت کے حوالے کر دیا۔

بدری اور اس کا پردہ نشین آقا عدالت سے لمبی سزا پا کر جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے چلے گئے اور رحم دین عرف رحمونے ہمیشہ کے لیے اس گناہ سے توبہ کر لی جس کے سبب وہ اس مصیبت میں گرفتار ہوا تھا۔

یہ فیصلہ اس قدرت کی جانب سے آیا تھا جس کی عدالت عالیہ میں اس نے اپنا کیس دائر کیا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

کے گھاٹ اتارا تھا۔ موت کے منہ میں دھکیلنے سے قبل اس نے شاہدہ کے ساتھ بدتمیزی بھی کی تھی اور یہ سب کچھ سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا گیا تھا جس کا شکار رحمونے بنانا مقصود تھا اور اس مقصد میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گیا تھا۔

اس گھناؤنے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اسی نے رحمونے کے کھانے میں بے ہوشی کی دوامدائی بھی تاکہ وہ بے سدھ سوتا رہ جائے اور اسے ڈیرے سے گھوڑا نکالنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ مٹکی گھوڑا ویسے ہی اس کے ساتھ ہلا ہوا تھا لہذا یہ کام اس نے رحمونے کی بے ہوشی کے دوران میں بہ آسانی کر لیا تھا۔

جن کھیتوں میں بدری نے شاہدہ کی شہ رگ کاٹ کر اسے موت کی نیند سلا یا تھا وہ ڈیرے سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اپنے ظلم کا نشانہ بنانے کے دوران ہی میں اس نے شاہدہ کی کپڑی کو مسل کر اسے بے سدھ کر دیا تھا لہذا جب اس کی گردن پر خنجر چلانے کی باری آئی تو وہ بے چاری اپنی زندگی بچانے کے لیے ذرا سی بھی مزاحمت نہ کر سکی۔ جب کٹی ہوئی شہ رگ سے سارا خون نچڑ گیا تو وہ اسے کسی ذبح کیے ہوئے جانور کے مانند گھسیٹ کر ڈیرے کے قریب لے آیا تھا۔ اس نے ڈیرے کے اندر سے مٹکی گھوڑا نکالا اور اس کے بعد سب کچھ وہی کیا جس کا اندازہ میں نے اور کھوجی اللہ رکھانے قائم کیا تھا۔

بدری سے ایک سنگین غلطی یہ ہوئی کہ وہ آلہ قتل کو اسی جگہ بھول آیا تھا جہاں کھڑی فصل کے اندر اس نے شاہدہ کو اٹھایا تھا جبکہ پروگرام کے مطابق یہ خنجر اسے ڈیرے میں کہیں رکھنا تھا تاکہ ہر سمت سے شاہدہ کے قتل کا شک رحمونے پر جائے اور اس کے بچاؤ کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ آلہ قتل کو ڈیرے پر چھپانے کے لیے اس نے ایک کوشش اس وقت کی تھی جب میں اور مطلوب حسین ڈیرے کی تلاشی کے بعد واپس جا رہے تھے لیکن ہماری موجودگی نے اسے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا، پھر دوسری کوشش میں وہ پکڑا گیا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ بدری نے ایسا کیوں کیا؟ رحمونے کے ساتھ اس کی ایسی کیا دشمنی تھی اور وہ شاہدہ کی جان کا بھی کیوں دشمن ہو گیا تھا؟

ان نہایت ہی اہم سوالات کا بھی بدری نے جواب دیا اور وہ جواب بڑا انکشاف انگیز تھا۔ جی ہاں..... بدری نے یہ سب کچھ رحمونے کی ذاتی رنجش کی بنا پر نہیں کیا تھا، بلکہ اس کام کے لیے اسے چودھری الہی بخش نے احکامات صادر کیے تھے اور ان معاملات کو میضہ راز میں رکھنے کی تلقین بھی کی تھی لیکن

تعارف کر داتے ہوئے کہا۔ ”ان سے ملو ڈین۔ یہ انٹرپول کے انسپکٹر رولینڈ کپہر ہیں جبکہ کرنل جیکس مینارڈ کا تعلق فرانسیسی پولیس سے ہے۔“ پھر وہ ان دونوں آدمیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ ہمارا اسپیشل ایجنٹ ڈیوینل لیونارڈ ہے جس کے بارے میں میں نے تمہیں بتایا تھا۔“

لیونارڈ نے ان دونوں سے مصافحہ کیا اور بوائے کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بوائے نے کھٹکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ”انسپکٹر کپہر اور کرنل مینارڈ، ہم سے ایک ایسے معاملے میں مدد چاہتے ہیں جس نے انہیں تین سال سے پریشان کر رکھا ہے، میرا خیال ہے جیکس، تم خود ہی لیونارڈ کو پوری بات بتا دو۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ مینارڈ بولا۔ ”جیسا کہ تم جانتے ہو کہ بحر الکاہل کے جنوب میں جزائر کا ایک سلسلہ ہے جو فرانس کی ملکیت ہے۔ اس پٹی میں تقریباً سو جزیرے واقع ہیں جن کے مشرق میں جنوبی امریکا اور مغرب میں آسٹریلیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ معروف جزیرہ تائیٹی ہے اور اس سے قریب ترین جزیرے کا نام موریا ہے۔ ان جزایروں کی اہم پیداوار قدرتی موتی ہیں جو کہ کستور اچھلی میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ان موتیوں کی برآمد سے فرانسیسی حکومت کو ٹیکس کی مد میں ایک معقول رقم ملتی ہے۔ یہ آمدنی اس سے کہیں زیادہ ہے جو تمہارے ملک میں تمباکو اور الکحل پر ٹیکس سے حاصل ہوتی ہے۔“

مینارڈ نے ایک لمحہ کے لیے توقف کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”مسئلہ یہ ہے کہ سیاہ موتی بڑی تعداد میں ہماری حدود سے باہر نکالے اور غیر قانونی طور پر اسمگل کیے جا رہے ہیں۔ ان سے حاصل ہونے والی آمدنی کا کوئی حساب ہے اور نہ ان پر ٹیکس دیا جاتا ہے۔ شاید تمہیں ان موتیوں کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ ہو لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اب تک دریافت ہونے والے موتیوں میں یہ قسم انتہائی نایاب اور قیمتی ہے جو صرف کستور اچھلی سے ہی حاصل کیے جاتے ہیں۔ ان مچھلیوں کا ٹھکانا عموماً گہرے پانی میں ہوتا ہے اور وہاں تک جانے کے لیے غوطہ خوروں کو بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم تمہاری بات سمجھ گئے۔“ بوائے نے کہا پھر وہ انٹرپول کے افسر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم اس بارے میں کیا کہنا چاہو گے؟“

”شکریہ!“ انٹرپول کے نمائندے نے سر کو ہلکا سا خم دیا اور لیونارڈ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”جیسا کہ تم جانتے

ہو کہ ہم بین الاقوامی تنظیم ہیں اور دنیا بھر میں قانون نافذ کرنے والے اداروں سے تعاون کرتے ہیں۔ کوئی بھی ملک ہم سے جرائم کی تصحیح کینی اور مجرموں کی گرفتاری کے سلسلے میں رابطہ کر سکتا ہے۔ اسی جذبے کے تحت کرنل مینارڈ نے سیاہ موتیوں کے مسئلے پر ہم سے مدد مانگی اور اسی سلسلے میں ہم تمہارے پاس آئے ہیں۔“

بوائے نے لیونارڈ کے چہرے پر برہمی کے آثار دیکھے تو بولا۔ ”اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ فرانسیسی پولیس نے اپنے طور پر یہ مسئلہ کیوں حل نہیں کیا یا انہوں نے اس سلسلے میں کوئی کوشش نہیں کی تو یہ غلط ہے۔ انہوں نے اپنے ایک جاسوس کو اس علاقے کی نگرانی کے لیے بھیجا جہاں غیر قانونی طور پر سیاہ موتی نکالے اور اسمگل کیے جاتے ہیں۔ وہ شخص ایک مہینے سے بھی کم وقت میں لاپتا ہو گیا۔ انہوں نے یہ معاملہ انٹرپول کے حوالے کیا تو انسپکٹر کپہر نے اسکاٹ لینڈ یارڈ سے مدد مانگی لیکن ان کا بھیجا ہوا جاسوس بھی چھ مہینے بعد غائب ہو گیا۔“

”اور اب یہ لوگ ہمارے پاس آئے ہیں تاکہ ہم بھی اپنے کسی بہترین آدمی کو اس پر اسرار جزیرے کی بھیئت چڑھا دیں۔“

”درست!“ بوائے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”دوستو! اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو کچھ دیر باہر بیٹھ کر انتظار کرو۔ میں اپنے ایجنٹ سے کچھ ذاتی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

جب وہ دونوں باہر چلے گئے تو لیونارڈ بھی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”جناب۔ اگر مجھے اس وجہ سے یہاں بلایا گیا ہے تو میں درخواست کروں گا کہ مجھے واپس اپنے کام پر ہوائی جانے کی اجازت دی جائے۔“

”تمہاری درخواست مسترد کی جاتی ہے۔ اس میں میری خواہش کو دخل نہیں ہے بلکہ ڈائریکٹر کی طرف سے حکم آیا ہے اور میں یہ بھی بتا دوں کہ اسے اٹارنی جنرل کی منظوری حاصل ہے۔“

”ٹھیک ہے اگر آپ مجھے یہ کام دینا چاہ رہے ہیں تو میں استعفیٰ دے دیتا ہوں۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

”میں ایسا ہی کروں گا اور یہاں سے جانے کے بعد سیکرٹ سروس کے لیے کام کروں گا۔“

بوائے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”اب تمہاری اوقات یہ رہ گئی ہے کہ ڈرائیور کے روپ میں روزانہ دو بچوں کو اسکول چھوڑنے اور لینے جایا کرو گے، عام طور پر سیکرٹ ایجنٹ ایسے ہی کام کیا کرتے ہیں۔“

”کم از کم تائیدی جانے سے تو بہتر ہی ہوگا، تم کیوں چاہتے ہو کہ پہلے دو ایجنٹوں کی طرح میں بھی وہاں پہنچ کر غائب ہو جاؤں۔ میں شہر کے مچھلیوں کی خوراک نہیں بننا چاہتا۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔ اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ تم یہ کام کر سکتے ہو تو کبھی وہاں جانے کے لیے نہیں کہتا۔ تمہارے لیے یہ باتیں ہاتھ کاٹھیل ہے اور تم اس کے لیے بالکل موزوں ہو۔“

”واقعی!“ لیونارڈ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟“

بوائے اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے میں ٹھہرنے لگا پھر وہ لیونارڈ کے پاس رکھا اور بولا۔ ”تم جوان، اسارٹ اور مضبوط جسم کے مالک ہو۔ پھر تم زیر آب پیرا کی بھی کر سکتے ہو جو تائیٹی میں تمہارے لیے بہت کارآمد ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے چہرے کی رنگت بھی ایسی ہے جیسی جزیرے پر رہنے والوں کی ہوتی ہے۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کا جاسوس سفید فام تھا اس لیے نظروں میں آ گیا۔ اس کے علاوہ تم فرانسیسی جاسوس کی طرح فریج بھی نہیں بول سکتے۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ تم ان دونوں سے مختلف ہو اور یہ مسئلہ حل کر سکتے ہو۔“

لیونارڈ منہ بسورتے ہوئے بولا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ میری شادی ہونے والی ہے اور میری منگیتر ہوائی کے سینئر ٹرکی بیٹی ہے۔“

”میں اسے جانتا ہوں۔ ابی گیل نیوسم، نام ہے اس کا۔ میں نے اس کی تصویر اخبار میں دیکھی ہے، بہت خوب صورت ہے۔“

”اگر آپ اسے غصے کے عالم میں دیکھ لیں تو ڈر جائیں گے۔ سوچ رہا ہوں کہ جب یہ خبر اسے سناؤں گا تو میرا کیا حشر ہوگا۔“

”تمہاری شادی میں ابھی تین مہینے باقی ہیں جبکہ میرا خیال ہے کہ تم پانچ چھ مہینوں میں یہ کام ختم کر لو گے۔“

لیونارڈ نے پوچھا۔ ”کیا ڈائریکٹر کو ان دونوں جاسوسوں کی گمشدگی کا علم ہے؟“

”ہاں، اور اٹارنی جنرل بھی یہ بات جانتا ہے۔“

”اس کے باوجود وہ مجھے اس خطرناک مہم پر بھیجتا چاہ رہے ہیں۔“

بوائے کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”ڈینی! تمہارا نام اس رپورٹ میں نمایاں طور پر درج ہوگا جو انہیں بھیجی جائے گی اور ممکن ہے کہ وہ اسے صدر امریکا کو بھیج دیں۔ تمہاری کامیابی کا ڈنکان بج جائے گا کیونکہ تم وہ کارنامہ انجام دے کر واپس آؤ

گے جہاں برطانیہ و فرانس کی حکومتیں اور انٹرپول والے بھی ناکام ہو گئے، یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے تمہارے سر پر تاج رکھ دیا جائے۔“

لیونارڈ کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اب اس کے ذہن میں صرف دو ہی باتیں رہ گئی تھیں۔

صدر امریکا اور تاج۔

جب لیونارڈ نے ہونولولو پہنچ کر ابی گیل کو یہ خبر سنائی تو وہ اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تائیدی! تم مذاق تو نہیں کر رہے؟“

لیونارڈ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”کاش یہ مذاق ہی ہوتا لیکن یہ حقیقت ہے اور مجھے یہ ذمے داری سونپی گئی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ڈیڈی کو فون کرتی ہوں۔ وہ گورنر سے بات کریں گے اور گورنر.....“

”تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“ اس نے اپنی منگیتر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح ٹھکے میں میری پوزیشن بہت خراب ہو جائے گی، تم نہیں جانتیں کہ اگر کوئی اسپیشل ایجنٹ اپنی ذمے داری سے جان چھڑانا چاہے تو اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔“

”پھر تم اپنا تادلہ سیکرٹ سروس میں کروالو۔“

”تم چاہتی ہو کہ میں بھی ڈرائیور بن کر بچوں کو اسکول لے جایا کروں۔ تم نے ہمیشہ میرے ایف بی آئی ایجنٹ ہونے پر شہنی بگھاری اور اپنی دوستوں کے سامنے اس کا فخر یہ اظہار کرتی رہیں۔ اب تم مجھے سیکرٹ سروس میں جانے کا مشورہ دے رہی ہو جس کا مطلب ہے کہ ہمیں واشنگٹن میں رہنا ہوگا جہاں ہمیشہ برف پڑتی رہتی ہے۔“

”تائیدی سے ہمارا کیا تعلق ہے۔ یہ جزیرہ تو شاید اسپین یا کسی اور ملک کے پاس ہے۔“

”فرانس۔“

”پھر اس کام کے لیے تمہیں یا ایف بی آئی کو ہی کیوں منتخب کیا گیا۔“ وہ مشتبہ انداز میں بولی۔ ”ڈینی! کہیں کوئی خطرے والی بات تو نہیں؟“

”بالکل نہیں۔“ وہ اسے یقین دلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ محض موتیوں کی اسمگلنگ کا کیس ہے۔ تم اسے وائٹ کالر کرائم کہہ سکتی ہو۔“ پھر وہ اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ ”بوائے کا خیال ہے کہ میں اس معاملے کو پانچ چھ مہینوں میں نمٹا لوں گا۔“

”میری شادی کی تیاریاں آج سے ٹھیک دو ماہ بعد

شروع ہو جائیں گی۔“ وہ اسے یاد دلاتے ہوئے بولی۔“ اور مجھے یقین ہے کہ شادی سے پہلے کلب کے ممبران تمہارے اعزاز میں بچکر پارٹی ضرور دینا چاہیں گے۔“

”میں اس سے پہلے ہی واپس آ جاؤں گا۔“

۰۰۰

دس دن بعد لیونارڈ، تائیٹی کے دارالحکومت پے پیٹ کے مضافات میں واقع ایر پورٹ پر اترتا تو اس کی شناخت تبدیل ہو چکی تھی۔ اب وہ مل گارسن تھا جس کے پاسپورٹ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ گزشتہ سولہ ماہ کے دوران شمالی اور جنوبی بحر الکاہل کے مختلف جزیروں کے درمیان سفر کرتا رہا ہے اور ان میں سے بیشتر تک اس کی رسائی صرف کستی کے ذریعے ہی ممکن تھی۔ ایر پورٹ پر اترتے ہی اسے گری اور ہوا میں رطوبت کا احساس ہوا۔ کسٹم اور امیگریشن کی کارروائیوں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور ڈرائیور کو پے پیٹ جانے کا کرایہ پیش کر دیا دیتے ہوئے بولا۔ ”مجھے کچھ دیر کے لیے کارگو ٹرمینل پر رکنا ہوگا تاکہ وہاں سے اپنا سامان لے سکوں۔“

ڈرائیور نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”کوئی بات نہیں جناب۔“ یہ کہہ کر اس نے یوٹرن لیا اور گھوم کر پسنجر لاونج کے پچھلے حصے کی طرف چلا گیا جہاں اس نے ٹوکن رکھ کر اپنا بیگ وصول کیا جس میں غوطہ خوری کا سامان تھا۔

”کیا آپ چھٹیاں منانے آئے ہیں؟“ ڈرائیور اس کے بیگ کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

لیونارڈ نے وہ بیگ پچھلی سیٹ پر رکھا اور خود ڈرائیور کے برابر میں بیٹھ گیا۔ ”چھٹیاں منانے نہیں بلکہ کام کی تلاش میں آیا ہوں۔ سنا ہے کہ یہاں غوطہ خوروں کو آسانی سے کام مل جاتا ہے۔“

”یہاں گہرے پانی میں غوطہ خوری کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ لوگ بیس فٹ سے نیچے نہیں جاتے اور جال میں جتنی مچھلیاں آجائیں وہ پکڑ لیتے ہیں۔ اس امید پر کہ انہیں کچھ موتی مل جائیں گے۔“

”یہاں تو موتیوں کا کافی کاروبار ہوگا؟“

”ہاں۔ سیاحوں کی وجہ سے کافی موتی بک جاتے ہیں۔ وہ ہفتے میں ایک بار جہاز کے ذریعے یہاں آتے ہیں اور سارے موتی خرید کر لے جاتے ہیں۔ اس طرح غوطہ خوروں کو مزید ایک ہفتے کی مصروفیت مل جاتی ہے۔“ اس نے لیونارڈ کی طرف اچھتی ہوئی نظر ڈالی اور بولا۔ ”اگر تمہیں موتی خریدنا ہوں تو اچھی سی دکان پر لے چلتا ہوں۔“

لیونارڈ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ملازمت کی تلاش ہے اور میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہیں اس لیے مجھے کسی سستے سے ہوٹل میں لے چلو جو صاف سترا بھی ہو۔ اس کے علاوہ مجھے کسی بلیئر ڈروم کا پتا بھی بتا دو اگر مجھے کوئی ملازمت نہ ملے تو بلیئر ڈھکیل کر ہی کچھ پیسے کمالوں گا۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں تمہیں ایک ایسے ہوٹل میں لیے چلتا ہوں جو صاف سترا اور سستا ہے اور وہاں بار میں ہی بلیئر ڈھکیل بھی موجود ہے جہاں بہت سے سیاح پیسے کمانے کے لیے بلیئر ڈھکیلتے ہیں۔“

ٹیکسی ہوٹل، شہر کی مرکزی بندرگاہ کے قریب واقع تھا جہاں سے دوسرے جزیروں کو جانے کے لیے فیری سروس چلا کرتی تھی۔ لیونارڈ کو چھ کمر ملا اس میں معمولی نوعیت کا فرنیچر تھا۔ ہاتھ روم میں گلابی رنگ کے ٹائل لگے ہوئے تھے اور ٹیکسی ڈرائیور کے کہنے کے مطابق وہ کمر واقعی صاف سترا تھا۔ لیونارڈ نے بیگ کھول کر اپنا سامان چیک کیا۔ اسے غوطہ خوری کے آلات کی فکر تھی کہ دوران سفر انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا ہو۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ سب چیزیں صحیح سلامت تھیں۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور بار میں چلا گیا۔

بار میں زیادہ رش نہیں تھا اور وہ عقبی کونے میں ایک ایسی میز تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جہاں بیٹھ کر وہ بار میں ہونے والی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے ساتھ اپنے آپ کو یہاں کے ماحول میں ایڈجسٹ کر سکے۔ وہ ابھی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک مقامی لڑکی مختصر سی نیکر پہنے اس کے پاس آئی۔ اس کے سپرن پروٹیکس کا بیج لگا ہوا تھا۔

”آپ کیا پینا پسند کریں گے؟“ اس نے شیریں لہجہ میں کہا۔

”تمہارے پاس کون سی بیئر ہے؟“

”آسٹریلین گراؤن، جاپانی رائس بیئر، فیجی بیئر اور پینا نو۔“

”پینا نو۔ میں نے یہ نام پہلی بار سنا ہے۔“

”یہ مقامی بیئر ہے اور دوسری بیئرز کے مقابلے میں ہماری ہوتی ہے۔“

”ٹھیک ہے، وہی لے آؤ لیکن ٹھنڈی ہونی چاہیے۔“

اس کے جانے کے بعد لیونارڈ نے ہال کا جائزہ لیا تو اس کی نظر ٹیکسی ڈرائیور پر گئی جو کچھ فاصلے پر دو سفید قام لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔ ان دونوں نے ایک مرتبہ اس کی جانب دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ اسی کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے شاید ٹیکسی ڈرائیور انہیں بتا رہا ہوگا کہ ایک نیا غوطہ خور کام

کی تلاش میں یہاں آیا ہے۔

ویٹرس بیئر لے کر آئی اور بولی۔ ”چھ ڈالرز پلیز۔“

لیونارڈ نے پرس سے پیسے نکالتے ہوئے اس کے سینے پر لگے ہوئے بیج پر نام پڑھا۔ ”ڈومی!“

”اچھا نام ہے۔ ڈومی، کیا تم یہیں کی رہنے والی ہو؟“

”نہیں۔ یہ ڈومینیک کا مخفب ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم فرانسیسی ہو؟“

”ایک چوتھائی، ڈومینیک میری دادی کا نام تھا، چھ ڈالرز پلیز۔“

لیونارڈ نے اسے دس ڈالرز کا نوٹ دیا اور بولا۔ ”بقیہ پیسے تم رکھ لو۔“

اس کے جانے کے بعد وہ بیئر کی چسکیاں لیتا رہا پھر اس نے اپنا بیگ اٹھا لیا اور ٹھٹھا ہوا برابر والے کمرے میں چلا گیا جہاں بلیئر ڈھکیل رکھی ہوئی تھی۔ اس وقت بھی ایک مقامی شخص اور ایک سفید قام کے درمیان مقابلہ چل رہا تھا اور درجن بھر افراد دو قطاروں میں لگی بنچوں پر بیٹھے یہ بیج دیکھ رہے تھے۔ وہیں ایک فولڈنگ کرسی بھی رکھی تھی۔ لیونارڈ اس پر بیٹھ گیا۔ دونوں کھلاڑیوں اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں نے اسے تجسس سے دیکھا پھر ایک مقامی شخص اس کے پاس آ کر بولا۔ ”تم یہاں نہیں بیٹھ سکتے۔“

”کیوں؟“ لیونارڈ نے پوچھا۔

”یہ مسٹر تا مو کی کرسی ہے اور ان کے علاوہ کوئی شخص اس پر نہیں بیٹھ سکتا۔“

لیونارڈ نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ اور وزن کم از کم دو سو ساٹھ پونڈ ہوگا، بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں اور اس کا ایک بازو، لیونارڈ کی ران کے برابر تھا۔

”سوری!“ لیونارڈ نے کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا۔“

یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ گیا اور دوسرے تماشاخیوں کے ساتھ بیچ پر بیٹھ گیا۔

اسی اثنا میں وہ دونوں آدمی بلیئر ڈروم میں داخل ہوئے جنہیں وہ ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں بیئر کے گلاس تھے۔ وہ لیونارڈ کے بالکل قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور ان میں سے ایک بولا۔

”میرا خیال ہے کہ مجھے بھی ایک گیم کھیلنا چاہیے۔“ اس کا لہجہ برطانوی تھا اور لیونارڈ اس کی آواز بخوبی سن سکتا تھا۔

”کیا تم میرا ساتھ دو گے؟“ اس نے اپنے ساتھی سے

خوشنودی

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا۔ ”اے مالک! جب تو خوش ہوتا ہے تو کیا کرتا ہے؟“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”جب میں خوش ہوتا ہوں بارش برساتا ہوں۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوبارہ عرض کیا۔

”جب تو اور زیادہ خوش ہوتا ہے تو.....!“

”تو میں بیٹیاں پیدا کرتا ہوں۔“

”اے مالک دو جہاں تو سب سے زیادہ خوش ہو تو کیا کرتا ہے؟“

”پھر میں مہمان بھیجتا ہوں۔“

مرسلہ: حسنین عباس بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

پوچھا۔

”نہیں، تم ہی کھیلو۔“ دوسرے نے جواب دیا جو فرانسیسی لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔

برطانوی لہجے والا آگے بڑھا اور اس نے دیوار پر لگے ہوئے تختہ سیاہ پر سفید چاک سے اپنا نام لکھ دیا۔ برٹ، پھر وہ واپس مڑا اور لیونارڈ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”تم بلیئر ڈھکیلتے ہو؟“

”بھئی بھئی۔“ لیونارڈ نے کہا حالانکہ یہ سفید جھوٹ تھا۔ وہ پانچ سال تک بلیئر ڈھکیل کا شہسپن رہ چکا تھا۔

”میرے ساتھ ایک گیم کھیلنا پسند کرو گے؟“ برٹ نے پوچھا۔

جواب میں لیونارڈ نے کندھے اچکا دیے اور بلیک بورڈ پر اپنا نام لکھ دیا۔ ”ہل۔“

دونوں کھلاڑی گیم ختم کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنی چھتری مقررہ جگہ پر رکھ دی اور ایک لڑکے نے پھرتی سے آگے بڑھ کر نئے گیم کے لیے پندرہ گیندیں میز پر سجادیں۔ لیونارڈ نے اپنا بیگ خالی کیا اور چھتری لینے کے لیے آگے بڑھا۔ عین اسی وقت ایک طویل قامت اور سفید بالوں والا شخص کمرے میں داخل ہوا اور اس کرسی پر بیٹھ گیا جو لیونارڈ نے خالی کی تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہی مسٹر تا مو ہے۔

”ہم کھیل کو دلچسپ بنانے کے لیے عام طور پر شرط لگا کر کھیلتے ہیں۔“ برٹ بولا۔ ”میرے خیال میں بیس بیس

ڈالر ٹھیک رہیں گے۔

”یقیناً“ لیونارڈ نے اس کی تائید کی۔

ان دونوں نے اپنی جیب سے بیس بیس ڈالر نکال کر میز کے کونے میں رکھے اور لیونارڈ پہلی بازی جیت گیا۔

جب وہ جیتی ہوئی رقم جیب میں رکھ رہا تھا، فرانسیسی لہجے میں انگریزی بولنے والا اس کے پاس آیا اور بولا۔

”کیا تم واقعی اچھا کھیلتے ہو یا قسمت سے جیت گئے؟“

”اے میری خوش قسمتی سمجھو۔“

”پھر ایک گیم میرے ساتھ بھی کھیل کر دیکھو۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے بیس ڈالر کے دونوں نکال کر میز پر رکھ دیے۔

”یقیناً کیوں نہیں۔“ لیونارڈ نے بھی اپنی جیب سے چالیس ڈالر نکال لیے، اس دوران اس کا نیا حریف تختہ سیاہ

پراپنا نام لکھنے چلا گیا ”فرانک“۔

لیونارڈ سمجھ گیا کہ یہ وہی خفیہ ایجنٹ تھے جنہیں سیاہ موتیوں کی اسمگلنگ کے سلسلے میں یہاں بھیجا گیا تھا۔ ان میں سے ایک کا تعلق فرانسیسی پولیس اور دوسرے کا اسکاٹ لینڈ

یارڈ سے تھا۔

لیونارڈ نے یہ گیم بھی جیت لیا، پھر اس کے کانوں میں تالیوں کی آواز گونجی۔ یہ مسٹر تا مو تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر

لیونارڈ کے پاس آیا اور بولا۔ ”تم بہت اچھا کھیلتے ہو۔“ پھر اس نے تختہ سیاہ کی جانب دیکھ کر اس کا نام زیر لب دہرایا۔ ”بل۔“

اور بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ تمہارا پورا نام نہیں ہے۔“

”گارسن..... بل گارسن۔“ لیونارڈ نے اپنا فرضی نام بتایا۔

”آج تک کسی نے فرانک کو محض دو شائیں میں شکست نہیں دی۔ تم اب تک ساٹھ ڈالر جیت چکے ہو، کیا میرے

ساتھ اتنی ہی رقم کی بازی لگانا پسند کرو گے؟“

”میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیے۔“

”یہ اسپورٹس مین اسپرٹ کے خلاف ہے۔ باقی دی دے میرا نام سائن نامو ہے۔ میں اس ہوٹل، بار اور بلیئرڈ

روم کا مالک ہوں۔“

لیونارڈ نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں موجود ہر شخص اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ کسی کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ یہاں تک کہ راہداری میں کھڑی بارکی ویٹرس ڈوی کی نظریں بھی اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ لیونارڈ کو اپنے ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہوئے۔ وہ گھونٹ لگتے ہوئے بولا۔

”میں تمہاری بے عزتی نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے یہ

بازی ضرور کھیلوں گا۔“

تامو کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیونارڈ کو لگا جیسے وہ کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی ہار گیا ہو، اس نے دیکھا کہ تامو نے تختہ سیاہ پراپنا نام لکھنے کی

زحمت بھی گوارا نہیں کی۔

کھیل شروع ہوا۔ لیونارڈ جانتا تھا کہ تماشائیوں میں سے کوئی بھی تامو کی شکست پسند نہیں کرے گا اس لیے وہ جان

بوجھ کر اسے جیتنے کے مواقع فراہم کرتا رہا۔ حالانکہ کھیل کے دوران ایسے کئی مرحلے آئے جب وہ بہ آسانی اسے ہرا سکتا تھا

لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ گیم ختم ہوا تو اس نے تامو کے کھیل کی تعریف کی اور بلیئرڈ روم کے عقب میں بنے ہوئے

باتھ روم کی طرف آ گیا۔ جب وہ اپنے ہاتھ دھو رہا تھا تو تامو بھی وہاں آ گیا اور اپنی باری کے انتظار میں دیوار کی طرف

منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

”تم اگر چاہتے تو بہ آسانی گیم جیت سکتے تھے پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟“

لیونارڈ نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”تمہاری جگہ پر تمہارے لوگوں کے سامنے یہ اچھا نہ ہوتا۔ بہر حال میں نے

آخر تک مقابلہ کیا اور آخری شاٹ کو چھوڑ کر یہ گیم تقریباً برابر ہی رہا۔“

”میرے ساتھ ایک ڈرنک لینا پسند کرو گے؟“

یہ ایک اچھا موقع تھا لیکن لیونارڈ کسی قسم کی بے چینی ظاہر کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اس

وقت میرا کچھ اور پروگرام ہے۔“ وہ اپنی بائیں آنکھ دباتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے بار میں جو لڑکی ہے ڈوی، میں سوچ

رہا تھا کہ اس کے ساتھ قسمت آزمائی کی کوشش کروں۔“

”ٹھیک ہے۔ ڈرنک پھر سہی۔“ تامو نے کہا۔

بار میں داخل ہونے کے بعد وہ دوبارہ اسی کونے والی میز پر بیٹھ گیا۔ ڈوی ایک بار پھر اس کے پاس چلی آئی۔

”مجھے افسوس ہے کہ تم گیم ہار گئے۔“

”ضروری نہیں کہ میں ہر گیم جیتوں۔“

”کیا تمہارے لیے ایک اور بیئر لاؤں؟“

”پلیز!“ لیونارڈ بولا لیکن ڈوی فوراً ہی وہاں سے نہیں

چل دی بلکہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے؟“ لیونارڈ نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”یہاں آنے والے عام طور پر پلیئر کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔“

جب وہ بیئر لے کر آئی تو لیونارڈ نے پوچھا۔ ”تم کب تک یہاں کام کرتی ہو؟“

”یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”میرا خیال تھا کہ کام سے فارغ ہونے کے بعد تم میرے ساتھ نہیں چلتیں۔“

ڈوی کے چہرے پر سختی آگئی اور وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ”اگر تم کچھ غلط سوچ رہے ہو تو اس کام کے لیے

تمہیں راہ چلتے کئی لڑکیاں مل جائیں گی۔“

”میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔“ وہ گڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”میں تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ تم سے باتیں کرنا اچھا

لگے گا اور تم بھی کسی ایسے شخص سے باتیں کرنا پسند کرو گی جو پلیئر کہتا ہو۔“

ڈوی نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کا ذہن ٹوٹنے کی کوشش کر رہی ہو پھر بولی۔ ”میری شفٹ دس بجے

ختم ہو جاتی ہے۔ دیے تو گا ہک رات گئے تک آتے رہتے ہیں لیکن مسٹر تا مو ان اوقات میں کسی عورت کا یہاں کام کرنا

پسند نہیں کرتے۔“

”تم مجھے کہاں ملو گی؟“

”سڑک کے بائیں کونے پر ٹیلیز، کے نام سے مچھلی اور نوڈلز کی ایک دکان ہے۔ تم وہاں میرا انتظار کر سکتے ہو۔“

”تھینک یو۔“

وہ ایک بار پھر دل فریب انداز میں مسکرائی اور بولی۔

”تم بہت اچھے الفاظ استعمال کرتے ہو۔ میرے خیال میں تم سے باتیں کرنے میں مزہ آئے گا۔“

بیئر ختم کرنے کے بعد وہ ہوٹل سے باہر چلا آیا اور وقت گزارنے کے لیے واٹر فرنٹ اسٹریٹ پر ٹھہرنے لگا جہاں

سیاحوں کے علاوہ بندرگاہ پر کھڑے جہازوں کا عملہ بھی سیر و تفریح میں معروف تھا۔ جب وہ ٹیلیز کی دکان کے

ساتھ سے گزرا تو اسے ڈوی کا خیال آیا اور وہ سوچنے لگا کہ اس نے اسے باہر گھومنے کی دعوت کیوں دی تھی۔ اس سے تو بہتر

تھا کہ وہ مسٹر تا مو کی پیشکش قبول کر لیتا۔ شاید ان سے قریب ہونے کی صورت میں اس کے لیے موتیوں کے اسمگلروں تک

پہنچنا آسان ہو جاتا لیکن اس کے ذہن نے اس حقیقت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شاید ڈوی کی جسمانی کشش نے

اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کچھ وقت گزارے

گو کہ اس کی اپنی مگتیرا لی کیل کے ساتھ بہت بے تکلفی تھی

لیکن وہ بھی حد سے نہیں گزر رہے تھے۔ ابی کیل پرانے

خیالات کی لڑکی تھی اور لیونارڈ بھی اس کے اعتماد کو نہیں پہنچاتا۔

نہیں چاہتا تھا۔ چلتے چلتے اسے خیال آیا کہ وہ اس جگہ سے کافی آگے نکل آیا ہے جہاں ڈوی نے اس سے ملنے کے

لیے کہا تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بج کر کچھ منٹ اوپر ہو گئے تھے، وہ جلدی سے پلٹا اور تیز تیز قدم اٹھاتے

ہوئے منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب وہ مقررہ جگہ پر پہنچا تو ڈوی اس کا انتظار کرتے کرتے بائیں ہو کر واپس جانے ہی والی تھی۔ اسے دیکھ کر بولی۔

”میں سمجھی کہ تمہارا ارادہ بدل گیا ہے یا پھر تمہیں کوئی راہ چلتے لڑکی مل گئی ہے۔“

”نہیں۔“ وہ اپنی سانس پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”میں راستہ بھول گیا تھا۔“

”کیا تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟“ ڈوی نے مچھلی کی دکان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں بلکہ بیئر کے دو گلاس پینے کے بعد تو میری بھوک چمک اٹھی ہے۔“

دونوں دکان کے اندر چلے گئے۔ مچھلی اور نوڈلز دونوں ہی مزے دار تھے، اس کے ساتھ ہیٹکو جوس نے

کھانے کا لطف بڑھا دیا۔

”تم کتنے عرصے سے مسٹر تا مو کے ساتھ کام کر رہی ہو؟“ لیونارڈ نے جوس کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”دو سال سے۔“ ڈوی بولی۔ ”میں مکالی کی رہنے والی ہوں۔ اس جزیرے میں مسٹر تا مو کا موتیوں کا کاروبار

ہے۔ میرا شوہر غوطہ خور تھا لیکن ایک روز اسے شارک مچھلی نے نگل لیا لیکن غلطی اسی کی تھی۔ سب غوطہ خور جانتے ہیں کہ

سورج ڈوبنے کے بعد شارک مچھلیاں سطح آب پر آ جاتی ہیں اور اندھیرے میں پانی کا رنگ گہرا ہو جاتا ہے۔ ہمارا ایک

بیٹی بھی ہے اور وہ اسے اعلیٰ تعلیم کی غرض سے فرانسیسی اسکول میں بھیجتا چاہ رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اسے زائد آمدنی کی

ضرورت تھی اور وہ رات میں بھی جال لے کر مچھلیاں پکڑنے کے لیے غوطہ خوری کیا کرتا تھا اور اسی کوشش میں ایک دن

اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔“

”اچھا، تمہاری ایک بیٹی بھی ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟“

”ماریا۔ وہ آٹھ سال کی ہو چکی ہے اور ہفتے میں چار دن میری آنٹی اس کی دیکھ بھال کرتی ہیں، جب میں یہاں

ڈیوٹی کر رہی ہوتی ہوں۔“

”مسٹر تا مو نے شوہر کے مرنے کے بعد تمہیں یہ

ہاں۔ وہ بہت سہراں میں اور انہوں نے مکان کے لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ انہیں ملازمتیں دی ہیں۔ ایک اسکول کی سرپرستی کرتے ہیں، سستی اشیا کا اسٹور کھول رکھا ہے۔ لوگوں کو رہائش کی سہولت فراہم کرتے ہیں اور ضعیف لوگوں کی دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں۔

”کیا اس ہوٹل کے علاوہ بھی ان کا کوئی کاروبار ہے؟“

”ہاں، ان کے پاس چند مچھلیاں پکڑنے والی کشتیاں ہیں لیکن زیادہ تر کاروبار موتیوں کی فروخت سے ہوتا ہے جو وہ پے پیٹ کی دکانوں اور دوسرے جزائر کو دیتے ہیں۔“

”انہیں اتنی بڑی تعداد میں موتی کہاں سے ملتے ہیں؟“

”غوطہ خور سمندر کی تہ میں جا کر مچھلیاں پکڑتے ہیں اور ان کا پیٹ چاک کر کے یہ موتی حاصل کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر بیہوش ہیں جبکہ کچھ مکالی اور دوسرے جزائر میں رہتے ہیں۔“

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم بھی گہرے پانی میں غوطہ خوری کرتے ہو۔“

”ہاں، میرے پاس زیر آب سانس لینے والا آلہ بھی ہے اور مجھے کام کی تلاش ہے۔“

”شاید مسٹر تامو نہیں ملازمت دے دیں۔“

”ہو سکتا ہے۔“ لیونارڈ نے بے پروائی سے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

کھانے کے بعد انہوں نے سڑک پر ٹھلنا شروع کر دیا۔ ان کے درمیان زیادہ بات نہیں ہو رہی تھی بلکہ وہ ارد گرد کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ اچانک ہی رک گئی اور لیونارڈ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

”میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں مل۔“

اس کا پیار بھرا لہجہ لیونارڈ کے دل میں اتر گیا اور اس کا دل چاہا کہ وہ اس معصوم لڑکی کو دھوکا دینے کے بجائے اسے اپنی اصلیت سے آگاہ کر دے لیکن وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

”میں بھی تمہیں پسند کرتا ہوں ڈوی۔“

وہ دونوں ہوٹل واپس آئے تو ڈوی بولی۔ ”یہی وہ جگہ ہے جہاں میں پورے ہفتے رہتی ہوں۔“

”میں بھی یہیں ٹھہرا ہوا ہوں۔“

”جانتی ہوں۔ تمہارا کمرانچلے فلور پر ہے۔“

وہ یہ سن کر حیران رہ گیا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ ٹیکسی

ڈرائیور، برٹ، غراں، نامو اور اب ڈوی، کیا یہ لوگ اس کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں جبکہ اسے یہاں آئے ہوئے محض چند گھنٹے ہی ہوئے تھے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے مزید محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے دو آدمی اس مہم کے دوران غائب ہو چکے تھے اور وہ اپنا نام اس فہرست میں شامل کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔

دوسری منزل پر پہنچ کر وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول رہا تھا کہ ڈوی نے اپنی تعظیم اس کے گال پر رکھ دی اور بولی۔ ”میں تمہیں پسند کرتی ہوں مل۔“

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگی جو نیچے ہال کے ایک کونے میں تھا۔ لیونارڈ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ڈوی نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی لیکن اس نے دروازہ بند نہیں کیا۔ لیونارڈ چند لمحے کھڑا سوچتا رہا پھر وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔

دوسری صبح جب وہ بار میں آیا تو اسے ڈوی کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ ٹھٹھا ہوا ہوٹل سے باہر چلا گیا کہ اس کی نگاہ ایک کیفے پر لگے ہوئے بورڈ پر گئی جس پر لکھا ہوا تھا۔ ”یہاں امریکی ناشتا ملتا ہے۔“ وہ کیفے کے اندر چلا گیا اور اس نے اپنے لیے توس اور ابلے ہوئے انڈوں کا آرڈر دیا۔ اس کے ساتھ ہی کافی بھی تھی۔ لیونارڈ کو اس کا ذائقہ بہت اچھا لگا۔ وہ ناشتا کر رہی رہا تھا کہ سائمن تامو بھی وہاں آ گیا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”صبح بخیر! مسٹر مل گارن؟“

”صبح بخیر! مسٹر سائمن تامو!“

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ گزشتہ شب تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے یا نہیں؟“

”نہیں۔“ اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ”وہ بہت ہی پیاری لڑکی ہے اور اس نے مجھے اس مقصد کے لیے کسی راہ چلتی لڑکی کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔“

”اور تم نے اس کی بات مان لی؟“

”نہیں۔ میں پیشہ ور لڑکیوں کی سرپرستی نہیں کرتا۔“

”تم بہت سمجھ دار ہو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم گہرے پانی میں غوطہ خوری کر لیتے ہو؟“

”ہاں۔ میں زیر آب تیراکی کر لیتا ہوں۔“

”اور یہ کہ تمہیں ملازمت کی تلاش ہے؟“

”جی ہاں۔“

”کیا تم کستور اچھی پکڑنے کے لیے گہرے پانی میں جاسکتے ہو؟“

”اگر اچھے پیسے ملیں تو میں کسی بھی چیز کے لیے غوطہ

لگا سکتا ہوں۔“

”یہاں سے شمال کی جانب ایک جزیرہ ہے۔ جہاں میں کستور اچھلیاں جمع کرتا ہوں تاکہ ان سے موتی حاصل کیے جاسکیں۔ اس خوب صورت جزیرے کا نام مکالی ہے۔“

یہ نام سنتے ہی اسے ڈوی یاد آگئی۔ اس کا گھر بھی تو وہیں تھا۔

”اس وقت تمہارے پاس کتنے غوطہ خور ہیں؟“

”سمندر کی تہ میں جانے والا کوئی نہیں۔ وہ سب سطح آب پر ہی رہتے ہیں اور سمندری ہوا چلنے سے جو مچھلیاں اوپر آجائیں، انہیں پکڑ لیتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ مجھے ایسے آدمی کی تلاش ہے جو گہرائی میں جا کر مچھلیاں پکڑ سکے۔“

”اندازاً کتنی گہرائی تک جانا ہوگا؟“

تامو نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ میرے غوطہ خور تیس فٹ گہرائی تک جا چکے ہیں لیکن ان کے قدم تہ تک نہیں پہنچے۔ اس کی گہرائی کا اندازہ کوئی زیر آب غوطہ خور ہی لگا سکتا ہے۔“

”گو یا تمہیں مجھ جیسے آدمی کی ضرورت ہے؟“ لیونارڈ نے پوچھا۔

”ہاں، اگر تم چاہو تو۔“

”معاوضہ کتنا ملے گا؟“

”پہلی بار پانچ سو ڈالر، اس کے بعد معاوضہ بڑھایا جاسکتا ہے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ تم کتنی گہرائی میں جاسکتے ہو۔ ایک دن میں کتنے غوطے لگاتے ہو اور ہر بار کتنی مچھلیاں پکڑ کر لاتے ہو۔“

لیونارڈ نے کافی کا آخری گھونٹ لیا اور بولا۔ ”مجھے کب سے کام شروع کرنا ہوگا؟“

دوسری صبح سائمن تامو کی چالیس فٹ طویل کشتی کے عرشے پر کھڑے ہو کر اس نے دور سے جزیرے کا جائزہ لیا تو اسے پہلی نظر میں ہی وہ بہت خوب صورت لگا۔

”کیسی جگہ ہے؟“ اس کے کانوں میں ایک نرم آواز آئی۔ یہ ڈوی تھی جو ہفتہ وار تعطیل پر اپنی بیٹی سے ملنے مکالی جا رہی تھی۔

”بہت ہی حسین منظر ہے۔“ لیونارڈ بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ یہاں بہت سے ساح آتے ہوں گے۔“

”نہیں، یہاں کوئی نہیں آتا۔ یہ جزیرہ مسٹر تامو کی ملکیت ہے اور یہاں صرف ان کے چند فانی دوستوں کو ہی

کشتیوں پر آنے کی اجازت ہے۔“

لیونارڈ سمجھ گیا کہ یہ ذاتی دوست کون ہو سکتے ہیں۔ یقیناً یہی لوگ اس جزیرے سے کشتیوں کے ذریعے موتی اسمگل کر کے لے جاتے ہوں گے۔

”یہ جزیرے کتنا بڑا ہے؟“ اس نے بات کو آگے بڑھانے کی خاطر پوچھا۔

”اس جزیرے کے گرد گھومنے والی سڑک بائیس میل طویل ہے۔ ہماری ملاقات ہوتی رہے گی۔ تم کب سے کام شروع کر رہے ہو؟“

”میں کل صبح سویرے ہی غوطہ لگا دوں گا۔ اس وقت لہریں پرسکون ہوتی ہیں۔ تم مجھے اپنی بیٹی سے کب ملواری ہو؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“

اسی دوران کشتی کنارے لگ چکی تھی۔ برٹ اور فراگ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بڑی پھرتی سے کشتی کو مضبوط رسیوں کے ذریعے کنارے سے باندھ دیا۔

”کیا یہ دونوں بھی مسٹر تامو کے لیے کام کرتے ہیں؟“

”ہاں۔“

”یہ اتنی جلدی یہاں کیسے پہنچ گئے؟“

”شاید کسی دوسری کشتی کے ذریعے رات کو ہی یہاں آگئے ہوں گے۔“ ڈوی نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

”یہ دونوں کیا کام کرتے ہیں؟“

”یہ مچھلیوں کو چھیل کر ان میں سے موتی نکالتے ہیں۔“

”اس کے علاوہ اور کتنے لوگ یہ کام کرتے ہیں؟“

لیونارڈ نے پوچھا۔

”کچھ مقامی لوگ ہیں جو صرف سطح آب سے پکڑنے والی مچھلیوں کو چھیلتے ہیں لیکن یہ دونوں صرف وہی مچھلیاں چھیلتے ہیں جو سمندر کی تہ سے پکڑی جاتی ہیں۔“

گویا برٹ اور فراگ صرف وہی مچھلیاں چھیلتے ہیں جن میں سے سیاہ موتی بڑی تعداد میں نکلتے ہوں۔

”لیکن مجھ جیسے غوطہ خور کے نہ ہوتے ہوئے گہرے پانی سے مچھلیاں کس طرح پکڑی جاتی ہیں؟“

”کچھ غوطہ خور بھی کبھی گہرے پانی میں جانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن زیادہ تر کونا کامی ہوتی ہے، اسی لیے مسٹر تامو نے تمہیں رکھا ہے۔“

دوسری صبح لیونارڈ اپنی پہلی مہم کے لیے تیار تھا۔ اس

نے پشتہ کے آخری کنارے پر اپنا بیگ کھولا۔ مسٹر تامو، برٹ اور فراگ بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اس نے غوطہ خوری کا لباس پہنا اور کمر کی پشت سے آکسیجن کے سلنڈر باندھ لیے۔

”تمہارے سلنڈر میں کتنی آکسیجن ہے؟“ تامو نے پوچھا۔

”آکسیجن نہیں بلکہ ہیلوکس نامی گیس ہے جس میں چار حصے ہیلیم اور ایک حصہ آکسیجن شامل ہے اور یہ ستر منٹ کے لیے کافی ہے۔“

جب سب تیاریاں مکمل ہو گئیں تو اس نے چہرے پر سانس لینے کا آلہ لگایا جس میں دور بر کی نلکیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک سانس لینے کے لیے اور دوسری اخراج کے لیے۔ اس میں پریشر گج، گہرائی ٹاپنے کا آلہ اور مقناطیس بھی نصب تھا۔ پھر اس نے چہرے پر ماسک چڑھایا۔ تامو کو دیکھ کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا یا اور سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

پینتا لیس ڈگری زاویہ پر گہرائی میں جاتے ہوئے وہ ایک حیرت انگیز دنیا سے روشناس ہوا۔

پانی بالکل صاف شفاف تھا۔ اس کے ارد گرد مختلف سمندری جانور تیر رہے تھے اور اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی ایکوریم کا نظارہ کر رہا ہے۔ وہ ان کی مختلف اقسام اور تعداد دیکھ کر حیران رہ گیا۔ قدرت نے بھی سمندر کی تہ میں کیسے کیسے خزانے چھپا رکھے ہیں۔ وہ دس سال تک مختلف سمندروں میں غوطہ خوری کرتا رہا لیکن ایسا نظارہ اس نے کہیں نہیں دیکھا تھا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ اسے زیر آب تیرتے ہوئے بائیس منٹ ہو چکے ہیں۔ اس نے تیزی سے نیچے کی جانب جانا شروع کیا اور ستر فٹ کی گہرائی پر پہنچ کر اس کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ وہ زیر آب سطح تک پہنچ چکا تھا جو ایک فٹ بال اسٹیڈیم جتنی بڑی تھی اور اس پر سفید مچھلیوں کا بستر بچھا ہوا تھا۔ جیسے پانی کی سطح کے نیچے برف کی تہ جم گئی ہو۔

اس نے پشت سے بندھا ہوا چھ فٹ لمبا جال کھولا اور اسے زمین کی سطح پر پھیلا دیا پھر اس نے ایک بازو لہرا کر مچھلیوں کو ہانکنا شروع کیا۔ پندرہ منٹ کے اندر جال پوری طرح بھر چکا تھا۔ اس نے دونوں ڈوریاں کھینچیں اور وہ جال ایک پوری کی شکل میں بند ہو گیا۔ پہلے وہ بے وزنی کی کیفیت میں زیر آب سطح تک آیا تھا لیکن وہاں ہی اس کا سفر اسے جال میں بھری ہوئی مچھلیوں کے وزن کے ساتھ کرنا تھا۔ وہ بڑی مہارت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ اوپر آیا اور بھرا ہوا جال مسٹر تامو اور اس کے ساتھیوں کے حوالے کر دیا۔

۰۰۰

اس سہ پہر، مٹ اور فراگ ان سات آٹھ سو مچھلیوں کو چھینے میں مصروف تھے جو لیونارڈ گہرے سمندر کی تہ سے پکڑ کر لایا تھا جبکہ سائنس ناموس کا گیس سلینڈر دوبارہ بھرا جانے کے لیے بے پیٹ گیا ہوا تھا تاکہ اگلے روز کی غوطہ خوری کے لیے تیاری مکمل ہو سکے۔ لیونارڈ ایک درخت کے سائے میں لیٹا آرام کر رہا تھا کہ ڈوی اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی خوب صورت لڑکی بھی تھی۔

”میں اپنی بیٹی کو تم سے ملانے کے لیے لائی ہوں۔ ماریا، یہ مسٹر بل ہیں۔“

”ہیلو بل!“ ماریا اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا تم قلمی اداکار ہو؟“

”پہلے کبھی ہوا کرتا تھا لیکن اب میں تھک چکا تھا۔ اس لیے یہ کام چھوڑ دیا۔“

”کیا تم جونی ڈیپ کو جانتے ہو؟“

”ہاں، میں نے ہی تو اسے سکھایا ہے کہ ایکٹنگ کیسے کی جاتی ہے۔“

”واقعی!“ وہ معصوم لڑکی تقریباً چیختے ہوئے بولی۔

”میں نے تو نام کروڑ کو بھی پڑھایا ہے۔ اس کے ساتھ مسئلہ یہ تھا.....“

”بس آج کے لیے اتنا کافی ہے۔“ ڈوی مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ ”ہم تمہیں اس جزیرے کی سیر کرانے کے لیے آئے تھے۔ میں نے اس مقصد کے لیے مسٹر تامو سے ایک جیب لے لی ہے، چلو۔“

ڈوی جیب چلا رہی تھی جبکہ لیونارڈ اس کے برابر میں اور ماریا پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈوی نے ایک ٹوکری میں دو پہر کے کھانے کا سامان رکھ لیا تھا۔ جس میں سے ماریا وقفے وقفے سے کوئی پھل نکال کر کھا رہی تھی اس کی گود میں ایک مہینے پرانا قلمی میگزین رکھا ہوا تھا۔

ڈوی نے جیب اس سڑک پر ڈال دی جو جزیرے کے گرد گولا کی میں گھومتی تھی۔ تقریباً آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے جیب اندر کی جانب موڑ لی اور چڑھا کی چڑھنے لگی۔ آگے ایک گھٹنا جنگل تھا۔ اس نے دس منٹ چلنے کے بعد جیب ایک جگہ کھڑی کر دی اور سامان نکال کر ایک صاف جگہ پر چٹائی بچھانے لگی۔ انہوں نے کھانے کا سامان رکھا اور وہاں بنے ہوئے قدرتی تالاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈوی بولی۔ ”پہلے تیراکی کریں گے۔“

لیونارڈ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ اسے ڈوی سے

اس بے تکلفی کی امید نہیں تھی۔ ماریا پہلے ہی پانی میں چھلانگ لگا چکی تھی۔ ڈوی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بولی۔ ”تم بھی آ جاؤ۔ یہاں ہمیں دیکھنے والا کوئی نہیں ہے۔“

لیونارڈ کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے اپنی قمیص اتاری اور ڈوی کے ساتھ ہی پانی میں کود گیا۔

اگلے دس دنوں تک لیونارڈ پہلے سے طے شدہ معاوضے پر روزانہ ایک غوطہ لگا تا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے ساٹھ فٹ کی گہرائی سے ساری مچھلیاں نکال لیں۔ اس نے مزید گہرائی میں جا کر مچھلیاں تلاش کرنے کی کوشش کی تو وہاں اسے ایک بہت بڑا غار نظر آیا جہاں ہزاروں مچھلیاں موجود تھیں جس کا مطلب تھا کہ وہ یہاں مزید کئی ہفتوں تک کام کر سکتا تھا۔

دسویں روز جب وہ اپنے بھرے ہوئے جال سمیت واپس آیا تو اس نے سائنس نامو کو دراندے میں بیٹھے دیکھا۔ وہ دور خلا میں گھور رہا تھا جیسے اس کی نظریں کسی کو تلاش کر رہی ہوں جب اس نے تامو کو مچھلیوں کے نئے ذخیرے کے بارے میں بتایا تو اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ یوں لگا جیسے اسے لیونارڈ کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

”وہاں بہت ساری مچھلیاں ہیں۔“ لیونارڈ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”ان کو نکالنے کے لیے شاید سو یا اس سے بھی زیادہ غوطے لگانا پڑیں گے۔“

تامو نے اپنا سفر نامی میں ہلایا اور بولا۔ ”تم شاید کبھی بھی ان تمام مچھلیوں کو اوپر نہیں لاسکو گے۔“

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”تم جو جگہ دیکھ کر آئے ہو۔ وہاں ان مچھلیوں کی افزائش ہوتی ہے، اگر تم وہاں سے سو مچھلیاں پکڑو گے تو دوسو مزید پیدا ہو جائیں گی۔“

”کیا تم جانتے تھے کہ سمندر کی تہ میں ایسی کوئی جگہ ہے؟“

”مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ تم جو مچھلیاں پکڑ کر لا رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ ان کی افزائش گہرے پانی میں ہوئی ہے۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

اسی اثنا میں دراندے کی طرف آنے والا دروازہ کھلا اور برٹ اور فراگ اندر داخل ہوئے۔ برٹ کے ہاتھ میں ریو لور تھا اور فراگ نے ایک ڈنڈا پکڑ رکھا تھا۔

”اتنے معصوم نہ بنو۔“ برٹ نے کہا۔ ”تمہیں بہت

کچھ معلوم ہے اور سیاہ موتیوں کے بارے میں جاننے کے لیے ہی تم یہاں آئے ہو۔“

”میں نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ لیونارڈ نے معصوم بننے کی کوشش کی۔

”ہمارے ساتھ کھینے کی ضرورت نہیں۔“ فراگ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ”تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے اور تم کس کے لیے کام کر رہے ہو؟“

”مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔“

برٹ نے اس پر ریو لور تان لیا۔ ”کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں مچھلیوں کی خوراک بننے کے لیے سمندر میں پھینک دیا جائے۔ اگر تم اسی طرح جھوٹ بولتے رہے تو شاید ہمیں یہی کرنا پڑے گا۔“

”بس اتنا کافی ہے۔“ سائنس نامو نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”اپنا ریو لور جیب میں رکھ لو اور اسے بتا دو کہ تم دونوں کون ہو۔“

برٹ نے ریو لور جیب میں رکھا اور بولا۔ ”آئن ٹین۔ میں کبھی اسکاٹ لینڈ پارڈ میں ہوا کرتا تھا۔“

”بال ڈوول۔“ فراگ نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ”فرانسیسی پولیس کا سابق لیفٹیننٹ۔“

”اب تم بھی ہمیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو۔“ تامو نے کہا۔

لیونارڈ نے گہری سانس لی۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کا مجید کھل چکا ہے۔ ”ڈینیئل لیونارڈ۔ ایف بی آئی کا اسپیشل ایجنٹ۔“

”ٹھیک ہے۔“ سائنس نامو اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”ہم سب اندر چل کر بیٹھتے ہیں تاکہ دوستانہ ماحول میں بات کر سکیں۔“

سائنس نامو کی اسٹڈی کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ چاروں آدمی ایک دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے اور اس برانڈی سے کھٹل کرنے لگے جو سفید کوٹ میں ملبوس ایک ملازم وہاں رکھ کر گیا تھا۔ بھی تامو نے لیونارڈ کو اس جزیرے کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

”میں نے چند سال پہلے ایک امریکی اداکار مارلن برانڈو سے یہ جزیرہ خریدا تھا جس کا اب انتقال ہو چکا ہے۔ اس کے پاس ایسے کئی جزیرے تھے لیکن جب وہ ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں تائی آ یا تو اسے یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ اس نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے اسے منتخب کر لیا اور باقی

۰۰۰

۱۵۱

۱۵۰

۱۵۱

۱۵۰

جزیرے فروخت کر دیے۔ اس سے چند سال قبل میں بھی تابیٹ منتقل ہو چکا تھا۔ بھریں نے ایک چھوٹی سی کشتی خریدی جسے میں موتیوں کی تلاش کے لیے استعمال کیا کرتا تھا۔ میں نے کئی مقامی لڑکوں کو ملازم رکھا جو میرے لیے غوطہ خوری کرتے اور اتنے موتی لے آتے کہ میں انہیں اپنی چھوٹی سی دکان کے ذریعے فروخت کر دیتا۔ مجھے اس کاروبار میں اچھا خاصا منافع ہو رہا تھا۔ میں نے چند سالوں میں اتنے پیسے جمع کر لیے کہ مزید کشتیاں اور دکانیں خرید سکوں۔ جب کچھ کمپنیوں کے تفریحی جہاز یہاں آنے لگے تو میرا کاروبار چمک اٹھا۔ پھر میں نے یہ ہوٹل خرید لیا۔ میری قسمت زوروں پر تھی اور ایک دن میں یہ جزیرہ بھی خریدنے کے قابل ہو گیا۔ جب میں نے یہ جزیرہ خریدا تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ میں نے اسے سنوارنے کے لیے بڑی محنت کی اور اپنے کاروبار کا بڑا حصہ تابیٹ سے یہاں منتقل کر دیا۔ میرے غوطہ خور پہلے کے مقابلے میں زیادہ مچھلیاں پکڑ کر لانے لگے اور اس طرح مجھے بڑی تعداد میں سیاہ موتی ملنے لگے جنہیں میں نے قرب وجوار کے جزیروں پر بھیجا شروع کر دیا۔

ایک دن فرانسیسی ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کے دو افسر میرے پاس آئے اور کہا کہ میں جو موتی برآمد کر رہا ہوں ان پر مجھے پینتالیس فیصد ٹیکس ادا کرنا ہوگا اور یہ کہ بندرگاہ پر آنے والے تفریحی جہازوں کے سیاحوں کو جو موتی فروخت کیے جائیں گے، وہ برآمدی اشیاء میں شمار ہوں گے اور ان پر بھی ٹیکس دینا ہوگا۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی معلوم کرنا چاہا کہ میں اتنی بڑی تعداد میں یہ موتی کہاں سے حاصل کر رہا ہوں۔ میں نے جھوٹ بولا کہ بے پیٹ میں رہنے والے غوطہ خور میرے لیے یہ موتی تلاش کرتے ہیں۔ میں نے ان کے سامنے اس جزیرے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا ہوگا کیونکہ یہاں کسی اور دکان دار کے پاس اتنی بڑی تعداد میں موتی نہیں تھے۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ موتیوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی پر ٹیکس ادا کروں۔

اس ٹیکس کی ادائیگی سے بچنے کے لیے میں نے آہستہ آہستہ اپنی دکانوں پر موتیوں کا ذخیرہ کم کرنا شروع کر دیا اور مکالی میں یہ موتی ذخیرہ کرنا شروع کر دیے۔ یہیں سے ایک تفریحی جہاز کا آفیسر ان موتیوں کو اسمگل کر کے انڈونیشیا پہنچا دیا کرتا تھا۔ میں نے اسمگلنگ سے ہونے والے منافع کو جزیرے کی حالت بہتر بنانے پر خرچ کرنا شروع کر دیا۔ میں نے یہاں مفت اسپتال کھولا اور اسے چلانے کے لیے ڈاکٹر

اور نرسوں کو ملازمت دی۔ بوڑھوں کو مفت رہائش کی سہولت فراہم کی اور بچوں کے لیے اسکول کھولا جہاں بہترین ٹیچرز کو رکھا گیا۔ اس کے علاوہ سستی اشیاء کا اسٹور بھی کھولا۔ سڑکوں کی مرمت کروائی، لوگوں کو پینے کا صاف پانی مہیا کیا اور بجلی پیدا کرنے کے لیے سورج کی روشنی سے چلنے والا پلانٹ لگایا۔

”غرضیکہ مسٹر تامو نے اس جزیرے کی حالت بدل دی۔“ پال ڈیول بولا۔

”پھر ہم دونوں اس منظر میں داخل ہوئے۔“ آئن بولا۔ ”فرانسیسی حکومت نے پال کو یہ معلوم کرنے کے لیے یہاں بھیجا کہ ٹیکس کی ادائیگی کے بغیر اتنے بڑے پیمانے پر موتیوں کی تجارت کس طرح ہو رہی ہے۔“

”مجھے اس معے کو حل کرنے میں ایک مہینہ لگ گیا۔“ ڈیول نے کہا۔ ”لیکن جب میں بے پیٹ میں لوگوں سے ملا تو وہ سب مسٹر تامو کی تعریف کرتے ہوئے نظر آئے کہ کس طرح انہوں نے اس جزیرے میں رہنے والے لوگوں کے لیے فلاحی کام کیے اور اپنی دولت کا بڑا حصہ اس پر خرچ کر رہے ہیں تو میں بہت متاثر ہوا اور میں نے اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے اس آپریشن میں عملی طور پر حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک ماہ بعد آئن اسی مشن پر یہاں آیا تو میری نظر اس پر پڑی، میں نے اسے اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دیا۔ اس طرح وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔“

”مجھے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی۔“ آئن نے اعتراف کیا۔ ”مسٹر تامو ٹیکس میں ادا کی جانے والی رقم سے کہیں زیادہ اس جزیرے کے لوگوں کی حالت بہتر بنانے پر خرچ کر رہے ہیں۔ اگر وہ فرانسیسی حکومت کو ٹیکس ادا کریں تو یہ رقم خزانے میں چلی جائے گی اور یہاں کے لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لیے مجھے مسٹر تامو کا طریقہ پسند آیا۔“

لیونارڈ نے براہ راستی کا گھونٹ لیا اور بولا۔ ”تم لوگوں نے مجھے کب پہچان لیا تھا؟“

”پہلے ہمیں یقین نہیں تھا کہ تم کوئی ایجنٹ ہو۔ اسی لیے مسٹر تامو نے تم پر بھروسہ کرنے کا فیصلہ کیا۔“

”پھر تمہیں مجھ پر شک کس طرح ہوا؟“ لیونارڈ نے تامو سے پوچھا۔

تامو مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا تم ڈومی کے سلسلے میں جذباتی ہو رہے ہو لیکن تم نے انکار کر دیا، جو سچ نہیں تھا۔ تم اس پر مر مٹے تھے، میرے ہوٹل میں ہونے والا کوئی بھی واقعہ مجھ سے چھپا نہیں رہ سکتا لیکن شاید تم نے اس کی سادھ بچانے کی خاطر مجھ سے جھوٹ بولا

کیونکہ تم اس کی قربت حاصل کرنا چاہ رہے تھے، اسی وقت تم میری نظروں میں مشکوک ہو گئے اور میں نے تمہاری نقل و حرکت پر نظر رکھنا شروع کر دی۔“

”ڈومی ہماری بھی پسندیدہ تھی۔“ آئن نے کہا۔ ”لیکن اس نے ہم دونوں کو ٹھکرا دیا، ہمیں امید ہے کہ تم مستقبل میں اس کا پورا خیال رکھو گے۔“

”کیسا مستقبل؟“ لیونارڈ نے غصے سے پوچھا۔ ”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”اب تمہارا مستقبل اس جزیرے سے وابستہ ہے۔“ ڈیول بولا۔ ”تم یہیں رہو گے۔ مکالی میں ہمارے ساتھ۔“

لیونارڈ نے حیرت سے اسے دیکھا پھر اس کی نگاہ آئن اور تامو پر گئی۔ ان سب کے چہروں پر ایک ہی تحریر تھی۔ اس نے ڈومی اور اس کی بیٹی کے بارے میں سوچا لیکن اسے ابی گیل کا خیال نہیں آیا۔

”ہاں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اب یہیں میرا مستقبل ہے۔“

دو ہفتے بعد مقامی اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی جس کی سرخی تھی۔

”طیارہ سمندر میں گر گیا۔ تین افراد لاپتہ۔“

خبر کے مطابق ایک انجن والا چھوٹا طیارہ جس میں چار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اٹلس ایر لائنز سے کرایہ پر لیا گیا تھا۔ اطلاعات کے مطابق وہ تابیٹ اور موریا کے درمیان کسی مقام پر سمندر میں گر گیا۔ جہاز پر تین افراد سوار تھے جو لاپتہ ہیں۔ ان کے نام کلائڈ بوائے، جیک ڈوگن اور بل گارسن بتائے جاتے ہیں۔ ان تینوں کا تعلق بالترتیب پیرس، لندن اور ہونولولو سے تھا اور وہ ٹیکسی ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ اس جہاز کو بوائے نے کرایہ پر لیا تھا اور ایک دن کا کرایہ بھی پیشگی ادا کر دیا تھا۔ وہ لائسنس یافتہ پائلٹ تھا۔ کنٹرول ٹاور سے جہاز کا آخری رابطہ اس وقت ہوا جب وہ تابیٹ سے دس میل کے فاصلے پر تھا۔ دو دن کی تلاش کے باوجود جہاز کا ملبا یا مسافروں کی لاشیں نہیں مل سکیں۔ متعلقہ سفارت خانوں کو اس حادثے کی اطلاع دے دی گئی ہے۔“

جب لیونارڈ معمول کے مطابق غوطہ خوری کر کے واپس آیا تو ڈیول اور آئن نے اسے اخبار میں شائع ہونے والی وہ خبر دکھائی جسے پڑھ کر لیونارڈ نے کہا۔ ”بہت افسوس ناک حادثہ ہے۔“

”ہاں۔“ ڈیول سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں ان مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کرنی چاہیے۔“ آئن نے کہا۔

وہ تینوں تہقہ مار کر ہنس دیے۔ کیونکہ حقیقت سے وہی واقف تھے۔ طیارہ سمندر میں گر کر تباہ نہیں ہوا تھا بلکہ اسے مکالی کے شمالی ساحل پر اتار لیا گیا تھا اور فوری طور پر اس کے مختلف حصوں کو الگ کر کے سمندر میں ڈبو دیا گیا۔ اس وقت تک امدادی پارٹیاں مایوس ہو کر تلاش کا کام ختم کر چکی تھیں۔

”کیا تم سمجھتے ہو کہ فرانسیسی حکومت موتیوں کی اسمگلنگ کی تحقیقات کرنے کے لیے کسی اور ایجنٹ کو بھیجے گی؟“ ڈیول نے پوچھا۔

”اگر ایسا کوئی شخص آیا تو ہم اسے پہچان لیں گے۔“ لیونارڈ نے کہا۔

”پھر کیا ہوگا؟“ آئن نے پوچھا۔

”یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔“ لیونارڈ نے کہا۔ ”لیکن ہم سب اس پر متفق ہیں کہ مکالی کی حفاظت کریں گے۔“

”یقیناً۔“ ڈیول پر جوش انداز میں بولا۔

”میں بھی تم سے متفق ہوں۔“ آئن نے کہا۔

لیونارڈ نے اپنا غوطہ خوری کا سامان اور لباس جسم سے الگ کیا اور تولیا سے اپنا بدن پونچھنے لگا۔ اسے ہارن کی آواز سنائی دی۔ ڈومی ایک نئی جیب کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ اس نے لیونارڈ کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور جیب سے اتر کر دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ اس کا روشن چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ اس کے چہچہے مار یا بھی دوڑتی ہوئی آرہی تھی۔

”بل۔ تم میرے لیے مچھلی لے کر آئے۔“ وہ چلاتے ہوئے بولی۔

لیونارڈ اس کے لیے روزانہ خاص طور پر مچھلی لے کر آتا تھا اور اکثر اس میں سے ایک سیاہ موتی برآمد ہوتا۔ یہ بات مسٹر تامو کے علم میں بھی لیکن اس نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔

لیونارڈ نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور ڈومی کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”میں یہ بات کیسے بھول سکتا ہوں۔“

وہ مطمئن تھا کہ آہستہ آہستہ اس کے خزانے میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مسٹر تامو سے ملنے والے معاوضے کی رقم اس کے علاوہ تھی۔ اسے یقین تھا کہ بہت جلد وہ بھی تامو کی طرح امیر کبیر ہو جائے گا۔ اسے ایک مرتبہ بھی ابی گیل کا خیال نہیں آیا۔ وہ اپنی اس جنت میں خوش تھا جہاں ڈومی جیسی حور اس کے پاس تھی۔

مذہب شہر و سدن



✽ احسان اللہ بھٹی..... سکھیکی گاؤں
خود کی راہ گزر پر کوئی دیوانہ نہیں جاتا
جہاں ناداں جاتے ہیں وہاں دانا نہیں جاتا
✽ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر..... نئی منڈی سکھیکی
بتا رہی ہے یہ آنکھوں کی منجھ لالی
کڑے دنوں کٹھن رت جکوں سے گزرے ہو
بجھا بجھا سا چہرہ دھواں دھواں سی آنکھیں
خوشی کی کھوج میں کتنے غموں سے گزرے ہو
✽ نذیر احمد بڑی..... دھریچہ نگر
تیری یادوں سے بچ لکھوں مجھے تدبیر دے کوئی
میری جانب سے ہر رستہ تیری جانب نکلتا ہے

✽ حسنین عباس بلوچ..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
کب تلک اندھیروں میں یوں رہیں گے ہم
آئے گا کب سورج گھر میں روٹنی بن کر
✽ ایم یوسف خان..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
کتنے مجبور ہیں تقدیر کے ہاتھوں فراز
نہ اسے پانے کی اوقات رکھتے ہیں نہ اسے کھونے کا حوصلہ
✽ ریاض شاہد پینٹرز..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
اک درد مسلسل مجھے سونے نہیں دیتا
دل صبر کا عادی ہے مجھے رونے نہیں دیتا
وہ یہ راز تو جان گیا کہ میں اس کا ہوں
وہ کس کا ہے یہ احساس مجھے سونے نہیں دیتا
✽ ظفر اقبال کھوکھر..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
بڑی مدت سے وہ نظارہ نہیں دیکھا
اک چاند چھلکتا تھا شام سے پہلے

✽ احسان سحر..... میانوالی
پھول کاغذ پر بنایا مت کرو
رنگ فطرت کا چرایا مت کرو
آنسو آنکھوں میں ہی اچھے لگتے ہیں
انہیں پلکوں سے گریا مت کرو

✽ محمد آصف ساجد..... ضلع قصور
ہر شام ہے شام غم ہر رات ہے اندھیری
کوئی نہیں اپنا کیا زندگی ہے میری
✽ حکیم سید محمد رضا شاہ نورنگہ..... میانوالی
ایک دن ایسا بھی ہوگا انتظار یار میں
نیند آجائے گی دروازہ کھلا رہ جائے گا
✽ محمد لطیف ساحل..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
خواب دیکھے شب زنداں میں سہانے کتنے
رنگ بھرتے ہیں نگاہوں میں نجانے کتنے
رات ہم نے تیری تصویر سے پوچھا اے دوست
تجھ سے پھڑکے ہوئے بیتے ہیں زمانے کتنے
✽ نادر سیال..... کنڈیاں، میانوالی
راہوں سے نظر رکھنا ہونٹوں سے دعا رکھنا
آجائے کوئی شاید دروازہ کھلا رکھنا

✽ سعدیہ بخاری..... انک
خفگی وتری پر قادر ہے آسان مری مشکل کردے
ساحل کی طرف کشتی نہ بھی کشتی کی طرف ساحل کردے
✽ سلطان احمد قائم خانی..... ہٹڈو خان محمد
نیا اک رشتہ پیدا کیوں کریں ہم
پھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم
✽ قاری محمد رمضان حسرت الحسنی..... نور پور قہل
فقط اتنا کہا تھا ناں! ہمیں تم سے محبت ہے
ہماری جان لوگے کیا؟ ذرا سی بات کے پیچھے
✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ٹاؤن، خانپور
غیروں سے پوچھتی ہے طریقہ نجات کا
اپنوں کی سازشوں سے پریشان زندگی
✽ سلطان احمد قائم خانی..... ہٹڈو خان محمد
اب تو شاید ہی مجھ سے محبت کرے کوئی
میری آنکھوں میں تم صاف نظر آتے ہو

✽ سنیہ منظور..... پوچنا آباد، لاہور
اس کے دل پر بھی کیا خوب گزری ہوگی
جس نے اک مرض کا نام محبت رکھا
✽ سید محی الدین اشفاق..... فتح پور، لیہ
مجھے آگیا یقین سا کہ یہی ہے میری منزل
سر راہ جب کسی نے مجھے دفعتاً پکارا
✽ مسز ضیا القمر سلطانہ..... رتی ٹی، ساہیوال
شعور کا ہے کرشمہ یہ شوق تنہائی
کہ رفتہ رفتہ نظر سے اتر رہے ہیں لوگ
امیر شہر تیری سادگی قیامت ہے
خوشن ہے تو فاقوں سے مر رہے ہیں لوگ
✽ محمد اقبال خان احمد خلیل..... چودہ ہوان
اک تبسم جو ان کا مل جاتا
ہم بھی سرمایہ دار ہو جاتے
✽ عرفان سیال ججی..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا بتاؤ کیا لگا
تم اگلے زخموں کو چھوڑو یہ گھاؤ کیا لگا
✽ خلیل احمد انجم..... دھنی سیداں، کھاریاں
بے تابیاں سمیٹ کر سارے جہان کی
جب کچھ نہ بن سکا تو میرا دل بنا دیا

✽ حسنین عباس، کمیل عباس..... کھاریاں
اپنے دل میں جگہ نہ دے مجھ کو
دل کی سب کائنات لوٹوں گا
اشک ہوں میں پلک جھپکنے میں
تیری آنکھوں سے گر کے لوٹوں گا
✽ محمد جاوید راؤ..... بہاولنگر
میں اس کو چھوڑ تو سکتا ہوں، پر چھوڑ نہیں پاتا
وہ شخص مری بگڑی ہوئی عادت کی طرح ہے
✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی
سوچا تھا تیری سادگی پہ لکھوں گا ایک غزل
افسوس کہ تیرے معیار کے الفاظ نہ مل سکے
✽ محمد رشید سیال..... دوہڑی، ضلع سکھر
دل سا بھی کوئی دوست کہاں مجھ کو ملے گا
جتا ہے میرے ساتھ سلگتا ہے میرے ساتھ
✽ ماریہ علی بھٹو..... شکار پور
دوستوں سے ہم نے وہ صدمے اٹھائے جان پر
دشمنوں سے دشمنی کا سب گلہ جاتا رہا
✽ بشیر احمد بھٹی..... بہاولپور
اس کی قربت میں تیزی سے کٹے ماہ و سال
وہ پھڑپھڑا تو دھیمی ہوگئی وقت کی چال
✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال
قلم کیا میرے ہاتھوں کو شب پرستوں نے
میں لکھ رہا تھا چراغوں کی داستاں لوگو
✽ محمد اشفاق سیال..... شورکوٹ سٹی
اب دن کو بھی چراغ لیے گھومتے ہیں لوگ
تاریکیوں کا زہر اجالوں کو ڈس گیا
✽ این ایس آر مدثر..... بلدیہ ٹاؤن، کراچی
میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
تو سمجھتا ہے مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں
✽ عمران حیدر بلوچ..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
گھر میں عزیز، شوق بھی دل میں سفر کا ہے
یہ روگ ایک پل کا نہیں، عمر بھر کا ہے
✽ رائے نعیم احمد بھٹی..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
عجیب لمحہ شام وصال تھا وہ بھی
مجھے بھی منج تھا، افسردہ حال تھا وہ بھی

محمد زریان سلطان..... اردو بازار، کراچی
جہاں مامور کرتا ہے خدا تخریب کاروں کو
وہاں دوچار وہ بستی بسانے والے رکھتا ہے
گلریز خان..... پشاور

آوارگی کو چھوڑے زمانہ ہوا مگر
آیا نہیں ابھی ہمیں گھر بار دیکھنا
امیر بخت..... انک

اوپنی عمارتوں کا مقدر بنا گئیں
وہ بارشیں جو میرے گھروندے کو ڈھا گئیں
طیب احمد..... ایبٹ آباد

چلو سفر ہی کٹے گا، کچھ اپنا حال کہو
جو ہم پہ عشق میں بیتی ہے، ہم سنا دیں گے
محمد یونس سیٹھی..... صفدر آباد، ضلع شیخوپورہ

تو مصر کے بازار کا بچھڑا ہوا یوسف
دل تیری جدائی میں مانند یعقوب رہا ہے
راجا افتخار علی افقی..... چوآسدن شاہ (موہڑہ)

جس کو بھی دیکھا پیار میں روتے ہوئے دیکھا سائل
یہ محبت تو مجھے کسی فقیر کی بددعا لگتی ہے
ارسلان افضل..... روہڑی

اب دیکھتے ہیں کس کی جان جاتی ہے
میں نے اس کی اس نے میری قسم کھائی ہے
رضوان..... لاہور

کم یاد کروں اس کو میرے حق میں ہے بہتر
یہ الفاظ مجھے طبیب نے ہاتھ جوڑ کے کہے ہیں
شرف راقان سنی..... شاہ حسین، نورپور تھل

یہ در پردہ رقیبوں سے گلے شکوے نہیں اچھے
تمہیں جو بھی شکایت تھی ہمارے روبرو کرتے
جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی

کل شب ترے خیال سے غافل رہا تھا میں
بھولے سے اپنے آپ کو یاد آگیا تھا میں

بشیر احمد بھٹی..... بہاولپور

رہا نہ دل میں وہ بے درد اور درد رہا
مقیم کون ہوا ہے، مقام کس کا تھا؟
اسلم عارفی..... گوجرہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ

اس سے کب دیکھی گئی تھی میرے رخ کی مردنی
پھیر لیتا تھا وہ منہ، جی کو دوا دیتے ہوئے
ذوہب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی

بس ہم تو لشکری ہیں پھر بھلا ہتھیار کیوں ڈالیں
کہ ایسا کام تو اپنے سپہ سالار کرتے ہیں
محمد اقبال..... کورنگی، کراچی

تجھ کو کیا معلوم اے جان جہاں تیرے بغیر
میرا جیون کٹ گیا اور میں جیا کچھ بھی نہیں
جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی

اسی کا نام ہے شاید تعلق خاطر
سفر میں تم ہو بدن چور چور میرا ہے
احسان سحر..... میانوالی

دل کو پہلے ہی درد کی دیمک جاٹ گئی تھی
روح کو بھی اب کھاتا جائے تنہائی کا زنگ
ذیشان منہاس..... گلشن اقبال، کراچی

ضبط کرنا نہ بھی ضبط میں وحشت کرنا
اتنا آساں بھی نہیں تجھ سے محبت کرنا
محمد اظہر..... بلیر، کراچی

اب ضد پہ آگئے ہو تو یہ کام بھی کرو
خود کو ہمارے نام سے بدنام بھی کرو
یمینی احمد..... کراچی

آؤ اک سجدہ کریں، عالم بدستی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں
کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی

پھر وہ کہنے لگے، تو مرے گھر آیا تھا
چاند، جن چار گواہوں کو نظر آیا تھا

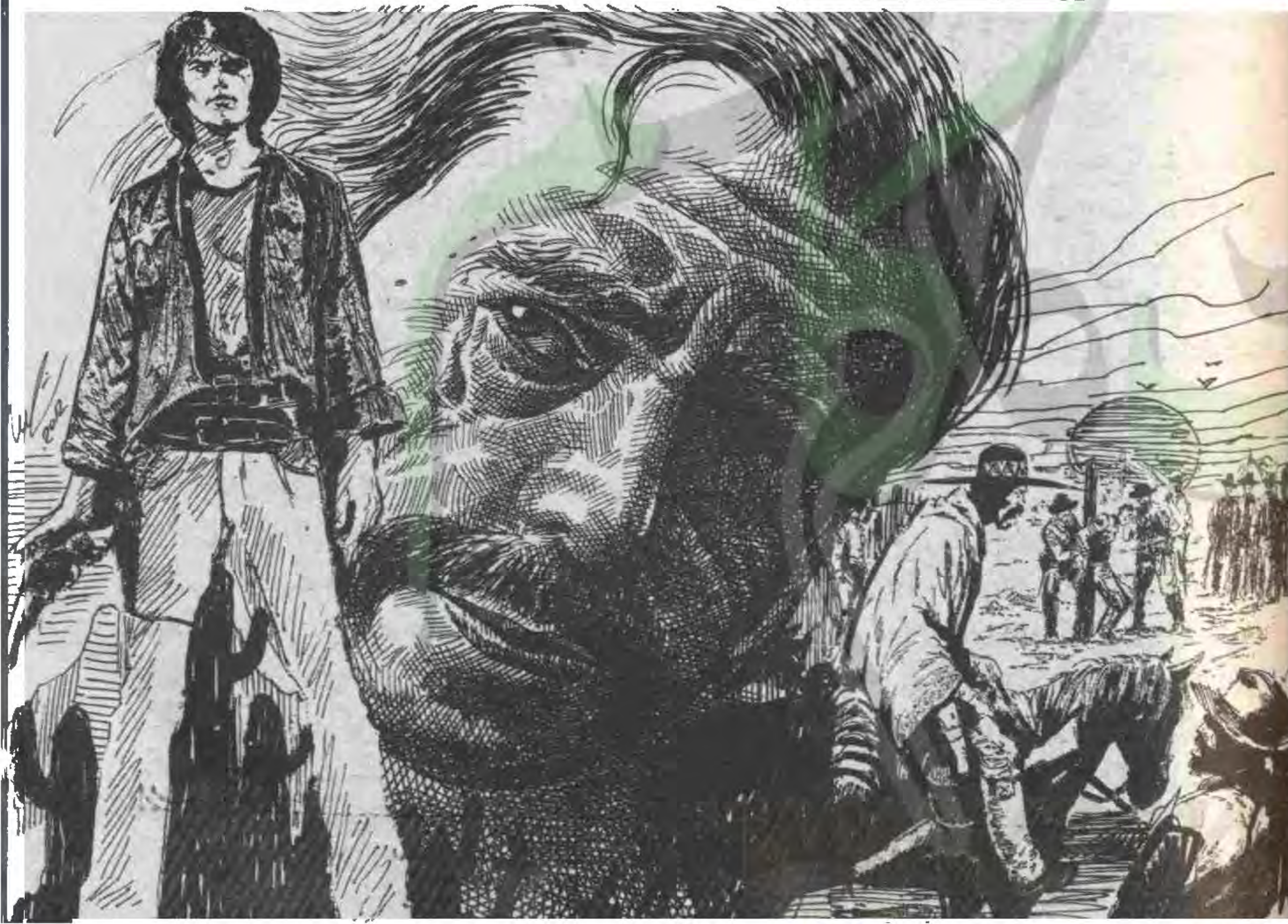
تا حد نگاہ پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ سبزے کا دور
دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ ہاں اونچے نیچے ٹیلوں کی چٹنی
ہوئی دراڑوں میں کہیں کہیں کانٹے دار جھاڑیاں اک آکی
تھیں۔ جن کا شمار اگر سبزے میں کیا جاسکتا ہے تو وہاں سبزہ
ضرور تھا۔ ان اونچی نیچی چھوٹی بڑی پہاڑیوں میں گونجنے والی
فانروں کی آواز بے حد عجیب لگ رہی تھی۔
بوڑھے سن برگ نے ابھی تک شکست تسلیم نہیں کی
تھی۔ اس کا شکست تسلیم کرنا مشکل ہی تھا کیونکہ خود اپنی جوانی

وہاں وحشتی

نسیم اقبال

اکثر لوگ بھول جاتے ہیں، ظالم اور بہادر میں بہت واضح فرق ہوتا ہے...
ظلم روشنی سے اور بہادری تاریکی سے دور کرتی ہے... بس یہی ایک
نکتہ اس سے چوک گیا... زندگی کے پل پل سے لطف اندوز ہونے والا
انسان جانے کن لمحوں کے عذاب میں گرفتار ہو کر ان راہوں پر چل نکلا
جہاں وحشت اس کی ہم سفر تھی... شاید اس مخصوص علاقے کا اثر
لوگوں پر ایسے بے پڑتا تھا کہ محبت کو رگیدنا اس کی سرشت میں شامل
ہو گیا۔

گلاب لہجوں پر زرد موسم کا حصار اور..... تنازع احساسات کا اظہار



محفل شعروسیخت

نام :
پتا :

کوین
برائے
شمارہ
ستمبر
2012

میں وہ ویلا کے جیالوں میں شمار ہوتا تھا اور اس نے بڑے بڑے سو رماؤں کے دانت کھٹے کر دیے تھے۔ وہ تو دانتا کی ماں تھی جس کے حسن جہاں سوز نے اس منہ زور گھوڑے کو رام کر لیا تھا اور نہ اس کے پستول کی گولیاں نہ جانے کتنے خوں رنگ افسانے لکھتیں۔ سن برگ کی زندگی جولیانہ کے حسن کی رعنائیوں میں مقید ہو گئی اور وہ اپنی محبوبہ، اپنی بیوی کے شہر میں محدود ہو گیا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ سن برگ پیٹ پالنے کے لیے کسی جفاکاری امیر کے ہاں ملازمت کرتا یا کسی دکان پر بیٹھ کر کچھ فروخت کرتا۔ شہر کے امیروں کے لیے تو یہی کیا کم تھا کہ اس نے اپنی خطرناک سرگرمیاں ترک کر دی تھیں۔ چنانچہ وہ سن برگ کو ایک معقول رقم انحصی کر کے بہ طور خراج پیش کرتے اور سن برگ کی زندگی بڑے آرام سے گزر رہی تھی۔

لیکن جس زندگی میں انقلاب نہ ہو وہ موت سے بدتر ہوتی ہے سن برگ کی زندگی میں بھی ایک غمناک موڑ آیا۔ دانتا پیدا ہوئی اور اس کی ماں دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اس انقلاب نے سن برگ کی زندگی بدل دی۔ وہ بزدل بن گیا۔ بیوی کی موت اور بچی کی پرورش کے خیال نے اسے خوفزدہ کر دیا۔ حسین بیوی مرتے وقت ایک پریشان کن تحفہ دے گئی تھی۔ اس تحفے کی رکھوالی کے تصور سے اس کے کندھے جھک گئے اور اس دیس میں جھکے ہوئے کندھوں کا۔۔۔ پرستار کوئی نہ تھا۔ بستی کے امیروں نے سن برگ کے جھکے ہوئے کندھے دیکھے اور شیر ہو گئے اس کا خراج بند ہو گیا اور سن برگ کانپ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اس کا زوال ہے چنانچہ بچی بھی رقم سے اس نے ایک چھوٹا سا قہوہ خانہ کھول لیا۔ اب وہ سن برگ نہ تھا، ایک بوڑھا کا انداز، ایک بوڑھا باپ تھا اور ان دونوں عہدوں کے مالک کی زندگی دوسروں کی خوشامد میں بسر ہوتی ہے۔ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ ویلا نے صرف سن برگ کو ہی جنم نہیں دیا تھا۔ اس کی مٹی دوسرے بہادر بھی پیدا کر سکتی تھی۔

اور ان دنوں پشکر کا طوطی بول رہا تھا۔ پشکر، سن برگ کی طرح کوئی باوقار بہادر نہیں تھا۔ بلکہ وہ لومڑی کی طرح چالاک اور گیدڑ کے مانند مکار آدمی تھا۔ وہ گروہ بنا کر رہنے کا عادی تھا اور اب پورے ویلا میں اس کا گروہ پھیلتا جا رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی تعداد کے سہارے وہ بہادر بنا تھا۔ اس کے ساتھی تباہی اور بربادی کے پیغامبر تھے۔ جس طرف نکل جاتے بستیاں ویران کر دیتے۔۔۔۔۔

یہ سب سن برگ کی زندگی میں پہلا دہشتہ لڑائیوں کی عصمت وری

کرتے۔ اس طرح پشکر پورے ویلا میں مشہور ہو گیا۔ دانتا کی عمر انیس سال ہو گئی تھی اور بوڑھے سن برگ کے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہو گیا تھا کہ ایک دن چھ آدمی اس کے قہوہ خانے میں آئے۔ سب کے نسب قومی یکساں تھے۔ ان کے چہروں سے وحشت نکلتی تھی۔ ہولناکیوں میں ریوا لور لٹکے ہوئے تھے۔ اندر داخل ہو کر انہوں نے ناپسندیدہ فرستہ کو ٹھوکریں مار کر ادھر ادھر پھینک دیا اور پھر ایک میز پر قبضہ جما کر بیٹھ گئے۔

”قہوہ!“ ان سے ایک نے بھاری آواز میں کہا اور سن برگ نے پیچھے کھڑی ہوئی دانتا کو گردن سے اشارہ کر دیا۔ ویسے نہ جانے کیوں اس کے دل میں ایک خوف سا کروٹیں لے رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ گڑبڑ اس لیے اس نے لوگوں کے وحشیانہ رویے کے باوجود اپنے چہرے پر مصنوعی خوش اخلاقی قائم رکھی۔

تھوڑی دیر کے بعد دانتا نے ان سب لوگوں کے سامنے قہوہ سرو کر دیا۔ جس وقت دانتا ان کے سامنے قہوے کی پیالیاں رکھ رہی تھی۔ وہ سب لپٹائی ہوئی نظروں سے اس کے گداز جسم کو دیکھ رہے تھے۔ پھر ان میں ایک نے اچانک جھک کر اس کے اسکرٹ کو پیچھے سے الٹ دیا اور دانتا کا پچھلا جسم برہنہ ہو گیا۔ دانتا اس اچانک حادثے پر ششدر ہو گئی۔ میز کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کے بے ہنگم ہتھکڑیوں نے اسے چونکا دیا اور دوسرے لمحے اس کا ہاتھ گھوم گیا۔

اسکرٹ الٹنے والے کے رخسار سے پٹانے کی آواز بلند ہوئی اور ہنسنے والے ایک دم خاموش ہو گئے۔ دانتا کا چہرہ لال سمجھو کا ہو رہا تھا اور وہ خونخوار ملی کی طرح اس شخص کو گھور رہی تھی۔ طمانچا کھانے والے نے جھپٹی ہوئی نظروں سے اپنے ساتھیوں کے سنجیدہ چہرے دیکھے اور پھر وہ ہنسنے لگا۔ اسے ہنسنے دیکھ کر دوسرے لوگ بھی ہنسنے لگے۔

لیکن سن برگ کو اس ہنسی میں چھپی ہوئی غراہیں صاف محسوس ہو رہی تھیں اور اس کے ہاتھ اپنے سامنے کاؤنٹر کے ایک خانے میں رکھے ریوا لور کو ٹٹول رہے تھے۔ جب ریوا لور میں بھری ہوئی گولیوں کا اسے یقین ہو گیا تو اس نے قدرے اطمینان کا سانس لیا اور دانتا کو آواز دے دی۔

دانتا کاؤنٹر کے پیچھے بنے ہوئے رہائشی حصے میں چلی گئی۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک غیظ و غضب کی چنگاریاں اڑ رہی تھیں ان سب نے انتہائی خاموشی اور سنجیدگی سے قہوہ ختم کیا اور پھر آستین سے ہونٹ خشک کرتے ہوئے کھڑے

ہو گئے۔ وہ سب ہی کاؤنٹر کے قریب آ گئے۔ سب سے آگے والے نے جیب سے ایک سفید کارڈ نکال کر سن برگ کے سامنے رکھ دیا۔ اس کارڈ پر ایک شکرے کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ تصویر پشکر کا نشان تھا جس کے بارے میں سن برگ بھی بہ خوبی جانتا تھا۔

اس نے گردن ہلائی اور بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے جناب! کوئی بات نہیں ہے۔ پشکر کے آدمیوں سے پیسے لینے کی ہمت بھلا کس میں ہے۔“

”ہم نے تجھے پیسے نہ دینے کے لیے یہ نشان نہیں دکھایا ہے بوڑھے کتے!“ کاؤنٹر پر کارڈ رکھنے والے نے غراتے ہوئے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ ”وہ لڑکی کون ہے؟“ ”میری بیٹی ہے جناب۔ میری بیٹی ہے۔“ سن برگ نے بہ دستور خوشامدانہ انداز میں کہا۔

”وہ ہمارے ساتھ جائے گی۔“ اس نے کہا اور سن برگ کے جسم میں سناٹا پھیل گیا۔

”رحم کیجیے، رحم کیجیے جناب۔ میری ایک بیٹی ہے میں اس کے بغیر بے سہارا ہو جاؤں۔۔۔۔۔“ بوڑھے نے گڑگڑاتے ہوئے کہا اور گریبان پکڑنے والے کے زوردار گھونٹنے نے اس کے داہنے گال پر خون کی لکیر بنادی سن برگ کاؤنٹر کے پیچھے گر پڑا اور وہ سب اسے چھوڑ کر کاؤنٹر کے پیچھے بنے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

لیکن جوں ہی ان میں سے ایک نے اندر قدم رکھا اچانک رائفل کا دھماکا گونجا اور وہ ایک کریہہ چیخ کے ساتھ سینے پر ہاتھ رکھ کر زمین پر گر پڑا۔ دوسرے لمحے اس کے دوسرے ساتھیوں نے اچھل کر پوزیشن لینے کی کوشش کی لیکن سن برگ کے رعشہ دار ہاتھ بھی صحیح نشانہ لگا سکتے تھے۔ دھماکے دھماکے کی آوازیں پورے قہوہ خانے میں گونج اٹھیں اور چند لمحات کے بعد وہاں چھ جسم تڑپ تڑپ کر سرد ہو گئے تھے۔

سن برگ کی ٹھہری ہوئی زندگی میں ایک بار پھر انقلاب برپا ہو گیا تھا۔ سویا ہوا سن برگ پھر جاگ اٹھا تھا اندر سے دانتا رائفل لے کر نکل آئی۔ سن برگ نے محبت بھری نظروں سے غیور بیٹی کو دیکھا جس نے اپنی بے عزتی کرنے والے پہلے مرد کو موت کی نیند سلا دیا تھا اور اس کا سر تانگیز قہقہہ گونج اٹھا۔

”ونڈرفل دانتا لیکن اب یہاں سے چلنے کی تیاریاں کرو۔ پشکر اور اس کے ساتھی کسی جگہ معمولی تعداد میں نہیں جاتے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے ساتھیوں کو اپنے ساتھیوں

کی موت کا علم ہو جائے گا اور وہ ایک فوج کی شکل میں ہمارے چھوٹے سے قہوہ خانے پر حملہ کریں گے جلدی کرو۔ اگر ہمارا اس سے مقابلہ ہوا تو اس کے لیے کھلا علاقہ موزوں رہے گا۔“

اپنے ساتھ لانے والے سامان میں ایک بڑی مقدار رائفل اور پستول کے کارتوسوں کی بھی اور باقی دو تین جوڑے کپڑے اور تھوڑی سی کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ جس وقت دونوں باپ بیٹی اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر قہوہ خانے کے احاطے سے باہر آئے تو ایک بڑا مجمع چاروں طرف جمع تھا۔ لوگ شاید گولیوں کی آوازیں کی وجہ سے قریب نہیں آئے تھے۔

”ہے سن برگ! اندر گولیاں کیسے چل رہی تھیں؟“ اس علاقے کے بد معاش جوشوے نے پوچھا اور سن برگ کے پستول کی گولی نے اس کے سر سے ہیٹ اڑا دیا۔ ”ایسے چل رہی تھیں شہدے۔ سامنے سے ہٹ جاؤ نہ دوسری گولی تیرا بھیجا اڑا دے گی۔“ سن برگ نے کہا اور پھر قہقہہ لگاتے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ جوشوے منہ پھاڑ کر رہ گیا۔ سن برگ کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی لوگ اس کے قہوہ خانے کی طرف دوڑ پڑے اور بہت جلد انہیں معلوم ہو گیا کہ سن برگ نے پشکر کے چھ لڑاکے مار دیے ہیں۔

”بہتر یہ ہے دوستو۔ اگر اپنی بستی کو تباہی سے بچانا چاہتے ہو تو خود جا کر پشکر کے گروہ والوں کو اس واقعے سے آگاہ کرو اور اس کی حمایت میں آوازاٹھاؤ۔ انہیں سن برگ کے فرار کی سمت بتاؤ۔“ جوشوے نے مشورہ دیا اور بہت سے لوگ پشکر کے ساتھیوں کی تلاش میں چل پڑے۔

☆☆☆

بستی سے تقریباً بیس میل دور جانے کے بعد پشکر کے آدمی سن برگ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ تلاش کرنے والوں میں پشکر بذات خود شامل تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی موت کے انتقام کے لیے بے چین تھا۔ اس وقت سن برگ کا گھوڑا ایک بلندی پر چڑھ رہا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اسے نہ دیکھ پاتے۔

پشکر نے ان دونوں کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے اپنی دور مار رائفل سیدھی کی اور سست رفتاری سے بلندی پر چڑھتے ہوئے گھوڑے کی ٹانگوں کو نشانہ بنایا۔ سن برگ کا گھوڑا بری طرح اچھلا اور دونوں باپ بیٹی نیچے گر پڑے۔ اپنے کامیاب نشانے کے بعد پشکر نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی لیکن اس نے سن برگ اور اس کی لڑکی کو

پتھروں کی آڑ لے کر اوپر جاتے ہوئے دیکھ لیا۔
 ”اس فیکری کو چاروں طرف سے گھیر لو۔ وہ شاید
 مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔“ پشکر نے گرجدار آواز میں کہا اور اس
 کے ساتھیوں کے سبک رفتار گھوڑے مختلف سمتوں میں
 دوڑ پڑے۔

دوسری طرف سن برگ ایک بڑی چٹان کی آڑ لے
 چکا تھا۔ اس نے اور وائٹا نے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ سن
 برگ کے ہاتھ میں رائفل تھی اور وائٹا ریوالور لیے ہوئے تھی۔
 دونوں باپ بیٹی کی پشت لی ہوئی تھی اور وہ چوکنے انداز میں
 دشمن کو دیکھ رہے تھے۔ سن برگ سمجھ گیا تھا کہ دشمن انہیں چاروں
 طرف گھیر رہے ہیں۔ مخصوص فاصلے پر پہنچ کر پشکر کے آدی رک
 گئے۔ یہ ان کے لیے بہترین پوزیشن تھی۔ یہ جگہ رائفل کے علاوہ
 پستولوں کی رینج میں بھی تھی۔ البتہ یہاں سے آگے بڑھ
 کر مقابلہ کرنے میں نقصان ہو سکتا تھا۔ اور پھر فائرنگ شروع
 ہوئی۔ پہاڑیاں گولیوں کی آوازوں سے گونج اٹھیں۔ پشکر
 کا خیال تھا کہ سن برگ چند منٹ سے زیادہ نہ ٹک سکے گا لیکن
 بہت جلد اسے دشمن کے خطرناک ہونے کا اندازہ ہو گیا۔ سن
 برگ بڑی چالاکی سے مقابلہ کر رہا تھا۔ پشکر کے ساتھیوں کے
 مقابلے میں وہ بڑی احتیاط سے گولیاں چلا رہا تھا۔ اس کے
 نشانے خطرناک تھے۔ اگر ان کے پاس صحیح مورچے نہ ہوتے تو
 شاید پشکر کو زبردست نقصان اٹھانا پڑتا لیکن یہ غنیمت ہوا کہ اس
 کے ساتھی جوش میں زیادہ آگے نہ بڑھ گئے۔

آدھے گھنٹے کے خوفناک مقابلے کے بعد پشکر نے
 اپنے ساتھیوں کو رک جانے کا اشارہ کیا۔ ان جگہوں سے
 مقابلہ گولیاں ضائع کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ جگہ بدلنے
 کی ضرورت تھی۔ اور پشکر کی نظریں ایسی جگہ تلاش کر رہی تھیں
 جہاں سے وہ سن برگ پر عمدہ نشانہ لگا سکیں لیکن سن برگ کی
 خوش قسمتی تھی کہ قریب میں کوئی اونچی پہاڑی نہیں تھی ورنہ وہ
 آسانی سے مار لیا جاتا۔ ان کوششوں میں ناکام رہ کر پشکر بری
 طرح جھلا گیا تھا۔ کوئی ترکیب نہ پا کر اس نے پھر فائرنگ کا
 حکم دیدیا اور اس کے ساتھی گولیوں کی بارش کرنے لگے۔ سن
 برگ کے لیے سر اٹھانا مشکل تھا۔ چٹان سے ٹکرانے والی گولیاں
 ... آوارہ کھینچوں کی طرح ادھر ادھر اڑ رہی تھیں اور ان کی
 ضرب سے چٹانوں سے اڑنے والے سنگریزے دھوئیں کی
 شکل اختیار کر گئے تھے۔

خود سن برگ بھی اس صورت حال سے مطمئن نہیں تھا
 اسے احساس تھا کہ وہ ابھی تک پشکر کے ایک بھی آدی
 کو ہٹانے میں لگا سکا ہے۔ اس نے وائٹا کو اشارہ کیا

اور رائفل لوڈ کر کے تیار ہو گیا۔ پھر اس کے حلق سے ایک
 دلخراش چیخ نکلی اور وائٹا چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ باپ کی
 چالاکی پر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ سن برگ نے
 اسے گولی چلانے سے منع کر دیا تھا۔

”زیادہ سے زیادہ آدمیوں کے نشانے پر آ جانے کے
 بعد فائر کرنا۔“ سن برگ نے اسے ہدایت کی اور وائٹا نے
 سر ہلا دیا وہ پشکر کے آدمیوں کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن پشکر بھی
 اتنا بے وقوف نہ تھا۔ اس نے پورے پندرہ منٹ انتظار کیا۔
 اسے شبہ تھا کہ سن برگ نے کوئی چال نہ چلی ہو لیکن پندرہ منٹ
 کے انتظار کے بعد وہ اکتا گیا۔ اس نے اپنے دو آدمیوں کو آگے
 بڑھایا اور پھر وہ احتیاط سے اوپر چڑھنے لگے آدھے سے
 زیادہ فاصلہ طے ہو گیا تو پشکر نے مزید دو آدمیوں کو اشارہ کیا۔
 سن برگ نے یابوسی سے ہونٹ سیکڑے یہ تعداد اس
 کی توقع سے بہت کم تھی۔ بہر حال وہ جان گیا کہ پشکر اس
 سے زیادہ آدی نہیں بھیجے گا۔ چنانچہ جو کچھ بھی ہیں، وہ ان
 لوگوں کے مزید آگے بڑھنے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے
 وائٹا کو اشارہ کیا اور دوسرے ہی لمحے اس کی رائفل اور وائٹا
 کا پستول گر جا۔ پشکر کے حلق سے ہڈیاں چیخ سی نکلی گئی
 تھی۔ وہ اپنے آدمیوں کے لڑھکتے جسم دیکھ رہا تھا۔ چاروں
 ہی چھلنی ہو گئے تھے۔ دوسرے لمحے پشکر کے آدمیوں نے
 رائفلوں کے دہانے کھول دیے۔ پشکر دیوانوں کی طرح چیخ
 رہا تھا اور اس کے ساتھی خوفناک انداز میں گولیاں برسا رہے
 تھے۔ وہ اس چٹان کو ادھیڑ ڈالنا چاہتے تھے جس کے پیچھے سن
 برگ چھپا ہوا تھا۔ سن برگ کی طرف سے بھی برابر گولیاں چل
 رہی تھیں لیکن اچانک سن برگ کے چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی
 اس نے رائفل لوڈ کرنے کے لیے کارتوسوں کے تھیلے میں
 ہاتھ ڈالا تو تھمبھلا خالی تھا۔ اس کے پاس کارتوس ختم ہو گئے
 تھے۔ اس نے بدحواسی سے وائٹا کی طرف دیکھا جو اپنا خالی
 پستول چلا رہی تھی۔ پھر اس نے بھی کارتوسوں کے تھیلے کی
 طرف ہاتھ بڑھایا لیکن باپ کے لٹکے ہوئے چہرے کو دیکھ
 کر چونک پڑی۔

”کارتوس ختم ہو گئے وائٹا!“ سن برگ نے شکست
 خوردہ لہجے میں کہا۔
 ”یہ تو بہت برا ہوا پاپا، پھر اب؟“ وائٹا نے بھی
 تشویش سے کہا۔

”شکست!“ بوڑھے سن برگ نے پھمکی مسکراہٹ
 سے کہا اور پھر دونوں ہاتھوں سے منہ کے سامنے بھونپو بنا کر
 چیخا۔ ”اے پشکر! میرے پاس گولیاں ختم ہو گئی ہیں۔ کیا تم

کچھ گولیاں مجھے ادھار دو گے؟“ اس خطرناک وقت میں بھی
 باپ کی پر مزاح بات سن کر وائٹا مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔
 ”خود کو میرے حوالے کر دے سن برگ، ورنہ میں
 سال بھر تک مقابلہ کر سکتا ہوں۔“ پشکر کی آواز سنائی دی۔
 ”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ گولیاں ختم ہو چکی ہیں۔ کیا تم
 ایک باعزت فائر کی طرح سمجھو تا کرو گے؟“ سن برگ نے کہا
 اور دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

پھر چند منٹ کے بعد پشکر کی آواز سنائی دی۔ ”اگر تم
 سچ کہہ رہے ہو تو ہاتھ بلند کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ اس سے پہلے
 اپنی رائفل اور پستول سامنے پھینک دو۔ مجھے علم ہے کہ
 تمہارے پاس ایک ہی پستول اور ایک رائفل ہے۔ میں ایک
 باعزت فائر کی طرح تم سے سمجھوتا کر لوں گا۔“

سن برگ نے کھڑے ہو کر پستول اور رائفل
 دوڑ پھینک دی۔ اور پھر دونوں باپ بیٹی نے ہاتھ بلند
 کر دیے۔ پشکر کے خوفناک چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
 اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پستول سیدھے کیے
 اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کر کے چڑھائی پر چڑھنے لگا۔ اس
 کے ساتھی پوری طرح چوکنے، دائرہ بنائے اس کے ساتھ بڑھ
 رہے تھے۔ اور آہستہ آہستہ وہ اس چٹان کے بالکل نزدیک
 پہنچ گئے۔ ان کی آنکھوں میں خون اتر ا ہوا تھا۔ اس ذلیل
 بوڑھے نے اس کے پورے دس ساتھی ہلاک کر دیئے تھے۔
 پشکر کو اپنے دس ساتھیوں کی موت کا تو زیادہ افسوس نہیں تھا
 لیکن ایک معمولی سے آدی نے اس کی ساکھ خراب کر دی تھی
 اس لیے وہ بہت تلملایا ہوا تھا۔ اس نے سن برگ کو چٹان کے
 پیچھے سے نکل آنے کا حکم دیا اور سن برگ ہاتھ بلند کیے چٹان
 کے عقب سے نکل آیا۔ پشکر کی نگاہوں نے پہلے اسے اور پھر
 اس کی لڑکی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ لڑکی کو دیکھ کر اس کے
 ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”تو تم مجھ سے باعزت سمجھوتا
 چاہتے ہو؟“ اس نے غراتے ہوئے کہا۔

”جیالوں کا اصول تو یہی ہے۔ مجھے شکست نہیں ہوئی
 ہے بلکہ میرے پاس کارتوس ختم ہو گئے ہیں۔ اگر تم لڑنا
 چاہتے ہو تو تمہارے سے کارتوس ادھار دے دو اور اپنی پرانی
 پوزیشن پر چلے جاؤ ورنہ امن اور سمجھوتا!“

”میں تم سے سمجھوتا کرنا چاہتا ہوں سن برگ!“ پشکر
 نے سرد لہجے میں کہا۔

”بتاؤ۔ کیا شرط ہے؟“ سن برگ نے کہا۔
 ”شرط!“ پشکر کے کریہہ ہونٹوں پر پھر بھیانک
 مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ”میری

شرط ہے سن برگ کہ تم اپنی لڑکی کو برہنہ کر کے میرے ساتھیوں
 کے حوالے کر دو اور خود اس پہاڑی سے چھلانگ لگا کر خود کشی
 کر لو۔“ وہ بولا اور سن برگ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

”میں تمہاری شرط ابھی پوری کر دوں گا۔“ اس نے
 غراتے ہوئے کہا اور اچانک پشکر پر چھلانگ لگا دی لیکن اس
 کے معلق جسم میں درجنوں گولیاں پیوست ہو گئیں اور آدھے
 راستے میں ہی نیچے گر پڑا۔ وائٹا کو باپ کی موت کا یقین
 ہو گیا تھا۔ اس کے حلق سے ایک گھٹی ہوئی سی آواز نکلی اور بس
 پھر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان لوگوں کی کارروائی دیکھتی رہی۔
 پشکر کے اشارے سے اس کے باپ کی لاش ایک
 گھوڑے سے باندھ دی گئی۔ خود وائٹا کے ہاتھ جکڑ کر اسی
 گھوڑے پر بٹھایا گیا جس سے اس کی باپ کی لاش بندھی ہوئی
 تھی اور پھر پشکر نے اپنے آٹھ ساتھیوں کو علیحدہ کر کے حکم دیا۔
 ”اسے لے کر میرے دلچ پر پہنچو۔ بوڑھے کی لاش
 میرے دروازے کے سامنے میرے دشمنوں کے قبرستان میں
 گاڑ دو۔“ اور پشکر کے دلیر ساتھیوں نے گردن جھکا دی۔

☆☆☆

شائیلانے دوسرے گھوڑے کی زین بھی مضبوطی سے
 کس دی اور پھر اس کی مضبوطی کا اندازہ کرنے کے بعد کمر پر
 دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ محبت بھری نظروں سے
 دونوں قوی ہیکل گھوڑوں کو دیکھ رہی تھی جن پر اس کے دونوں
 شیر دل بھائی سواری کرتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ان دونوں
 گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین دہل رہی ہوگی۔ اس نے سوچا
 اور اسی وقت کسی نے پیچھے سے اس کے بال مضبوطی سے
 پکڑ لیے، شائیلانے چیخ نکلی گئی۔ اس نے گردن گھمانے کی
 کوشش کی لیکن بال اس مضبوطی سے پکڑے گئے تھے کہ وہ
 گردن نہ گھما سکی۔ تب اس نے زور زور سے چیخا اور پیچھے
 ہاتھ کر کے بال پکڑنے والے کو گھونسنے مارنا شروع کر دیے۔
 ”اے ٹونی چھوڑ دے اس کے بال کیوں پریشان
 کر رہا ہے؟“

مکان کے دروازے سے لشر کی آواز سنائی دی اور ٹونی
 نے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کے بال چھوڑ دیے۔ وہ پلٹ پڑی
 اور جھلائے ہوئے انداز میں ٹونی کے سینے پر گھونسنے مارنے
 شروع کر دیے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اسے برا بھلا بھی کہتی جا رہی
 تھی۔ لشر مسکراتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

”کیوں پریشان کر رہا ہے اسے۔“ اس نے ٹونی کے
 کان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میرا دل چاہتا ہے لشر کہ اس کے تمام بال

اکھاڑ دوں اور یہ گنجی ہو جائے۔ گنجی ہو کر یہ کیسی لگے گی لشر؟“
ٹوٹی نے اس کے ہاتھ کی زد سے اپنا کان بچاتے ہوئے کہا۔
”اور میرا دل چاہتا ہے کہ اس چاقو سے تمہاری ناک
علحدہ کر دوں۔ بغیر ناک کے تم کیسے لگو گے؟“ وہ جھلائے
ہوئے انداز میں ٹوٹی سے بولی۔

”میں تو اور خوبصورت ہو جاؤں گا مگر تم بغیر بالوں کے
شتر مرغ کی مادہ معلوم ہوگی۔“ ٹوٹی نے اسے چھیڑتے
ہوئے کہا۔

”میں کہتی ہوں کہ زبان بند کر لو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ اتنا
کام کرتی ہوں پھر اوپر سے مجھے چھیڑتا رہتا ہے۔“ وہ بولی
اور اسی وقت لشر نے ٹوٹی کی کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے اسے
گھوڑے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”جلدی چلو۔ آج ویسے بھی کافی دیر ہو گئی ہے۔“ اس
نے کہا اور ٹوٹی بھی گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

”آج میرے لیے ایک خوبصورت طوطا ضرور پکڑ لینا
لشر ورنہ اچھا نہ ہوگا!“ وہ چیخ کر بولی۔

”میں بھی تیرے لیے ایک پرندہ پکڑوں گا شاید۔
ایک بے حد خوبصورت پرندہ۔“ ٹوٹی نے کہا۔ لشر گھوڑے کو
ایڑ لگا چکا تھا۔

”کون سا؟“ وہ تھوڑی دیر پہلے کی ٹوٹی کی زیادتی
بھول کر خوش ہوتے ہوئے بولی۔

”الو!“ ٹوٹی نے کہا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اس
نے ٹوٹی کو منہ چڑایا لیکن اس کی پشت اپنی طرف ہوتے ہی
اس کی آنکھوں میں محبت اٹھ آئی۔ کتنے پیارے تھے اس کے
دونوں بھائی۔ لشر سب سے بڑا تھا اور ٹوٹی اس سے چھوٹا۔ وہ
ان دونوں سے چھوٹی تھی اور یہ سب اپنی چھوٹی سی دنیا
میں خوش رہتے تھے۔

بوڑھے آسکر نے شہر سے دور اپنی چھوٹی سی دنیا بسائی
ہوئی تھی۔ تاحد نگاہ پھیلی ہوئی سرسبز پہاڑیوں کے درمیان اس
کا گھر سچ جنت نظر تھا۔ لکڑی کے خوبصورت اور کشادہ گھر
کے پیچھے اس نے سبزیوں کے کھیت لگائے تھے۔ جن کی
رکھوالی اس کی بیوی اور بیٹی کرتی تھیں۔ وہ خود بھیڑوں کی
گنہبانی کرتا تھا اور اس کے دونوں بیٹے جنگل سے شکار کراتے
تھے۔ اناج اور دوسری ضروری چیزوں کے حصول کے لیے
انہیں ہر تیسرے ماہ شہر جانا پڑتا تھا۔ اس طرح وہ لوگ آبادی
سے دور ایک خوبصورت سی پرسکون دنیا بسائے ہوئے تھے۔

آسکر شادی کے بعد سے ہی یہاں آ گیا تھا۔ وحشیوں
کی بستی میں اس کا دل نہیں لگتا تھا وہ امن پسند انسان تھا۔

امن کا خواہاں لیکن جتنے دوست اتنے دشمن کا اصول اسے مو
تھا۔ اس لیے اسے یہ ہی دنیا بھلی معلوم ہوئی۔ یہیں لشر
ہوا اور پھر ٹوٹی، اس کے بعد شاید۔ تب اس کی بیوی۔
مزید بچے پیدا کرنے سے انکار کر دیا اور وہ شہر جا کر اس
آپریشن گرا لایا۔ تینوں بچے جنگل کی آزاد فضاؤں میں
پرورش پا رہے تھے۔ لیکن آسکر کو اپنی موت کے بعد ان کی
زندگی کا خیال بھی تھا۔ بہر حال یہ تینوں بچے اس طرح اس
جنگل میں گزارہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے اس نے تینوں کو
ماحول کی ضرورت سے پوری طرح روشناس کر دیا تھا۔

جنگلی سانڈ کی طرح طاقتور اور شیر کا سادل رکھنے والے
لشر اور ٹوٹی بہترین نشانہ باز بھی تھے اور آسکر اپنے شیر دل
بیٹوں سے پوری طرح مطمئن تھا۔ اس نے انہیں سکھایا تھا کہ
اس دنیا کی سب سے قیمتی شے ہے لیکن اس سے بھی قیمتی شے
ایک اور ہے اور وہ ہے عزت! انسان ذاتی غرض کے لیے بھی
جنگ نہ کرے لیکن جب عزت کا سوال آجائے تو پورے اعتماد
سے اپنی زندگی اس کی بحیثیت چڑھا دے اور دونوں بیٹوں
نے اس کی بات گرہ میں باندھ لی تھی۔

لشر اور ٹوٹی کے گھوڑے برابر برابر دوڑ رہے تھے۔
وہ دونوں آپس میں گفتگو کرتے جا رہے تھے۔ موضوع بحث
لاگاس کے کلب میں رقص کرنے والی رقاصہ جولی تھی۔

”تم اس کی کمر کے بل گن کر بتا سکتے ہو لشر۔ اگر تم
اس کی کمر کے بل گن سکو تو میں تمہیں دس کارتوس انعام
دوں گا۔“ ٹوٹی نے ہنس کر کہا۔

”ہوں۔ تو تم اس کی کمر کے بل گنتے رہتے ہو۔
مجھے تو اس کا فن پسند ہے۔“ لشر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
”کیا خیال ہے لشر۔ اس بار اگر گریڈ لے اس کے
ساتھ بدتمیزی کرے تو اس کی مرمت کر دی جائے۔ وہ ہمیشہ
جولی کو پریشان کرتا ہے۔ خود کو بہت بہادر سمجھتا ہے۔ تم نے
دیکھا ہوگا اس کا چوبیس انچ کا سینہ ہمیشہ اکڑا رہتا ہے۔“

”ہاں۔“ لشر بے ساختہ ہنس پڑا۔ ”سینہ تو بے شک
اس کا چوبیس انچ سے زیادہ نہیں ہے لیکن بلاوجہ کسی سے
جھگڑا کرنے سے فائدہ؟ اور پھر جولی سے ہمارا کیا رشتہ ہے
اس کے دوسرے بہت سے عاشق وہاں ہیں۔ کوئی نہیں بولتا۔“
”مگر ہم اس کے عاشق تو نہیں۔ میرا مطلب ہے اس
کے علاوہ وہ سب بزدل ہیں۔ وہ گریڈ لے کے سیاہ رنگ کے
پستول سے خائف رہتے ہیں۔“

”بکو اس مت کرو۔ ڈیڈی نے ہمیں جھگڑا کرنے
سے منع کیا ہے اور سچ بات بھی یہ ہے۔ امن کی زندگی میں جو

لفظ ہے وہ جھگڑے میں نہیں ہے۔“ لشر نے اس کی بات
پر جھجھکاتے ہوئے کہا اور ٹوٹی شانے اچکا کر خاموش ہو گیا۔
ان دونوں کے گھوڑے برابر برابر دوڑ رہے تھے۔ باتیں
کرنے کے دوران بھی ان کی نظریں شکار کی تلاش میں بھٹک
رہی تھیں اور وہ اپنے مکان سے تقریباً تین میل دور نکل آئے
تھے۔ سبز علاقہ ختم ہو گیا تھا اور اب ان کے سامنے بے آب
وکلیا پہاڑیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ہوا کی کاٹ نے انہیں
مختلف شکلیں دیدی تھیں۔ ان پہاڑیوں پر ہرن اور دوسرے
جانور بے آسانی مل جاتے تھے۔ وہ قریب کے سرسبز علاقے
میں خوراک تلاش کرنے کے بعد یہاں پناہ لیتے تھے۔

ابھی وہ اس پہاڑی میدان میں تھوڑی ہی دور چلے
تھے کہ ٹوٹی کی نگاہ ایک خوبصورت اور تندرست ہرن پر پڑی
ٹوٹی نے زین سے لٹکے ہوئے ہو لشر سے رائفل نکال لی
اور ہرن کا نشانہ لینے لگا لیکن اسی وقت ہرن اچھل کر بھاگ
نکلایا یہاں شکار کی کمی نہیں تھی لیکن ٹوٹی کو وہ ہرن پسند آ گیا تھا۔
اس نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ لشر اس کھنڈرے
لڑکے کی فطرت سے واقف تھا، وہ جانتا تھا کہ وہ اس وقت
تک ہرن کے پیچھے دوڑتا رہے گا جب تک اسے شکار نہ
کرے۔ ٹوٹی کی بہ نسبت لشر قدرے سنجیدہ تھا۔ بہر حال وہ
بھی ٹوٹی کے پیچھے چل پڑا۔ ہرن ایک اونچی پہاڑی پر چڑھ
رہا تھا اور ٹوٹی کا گھوڑا ابھی تعاقب میں لگا ہوا تھا۔

چند لمحات کے بعد وہ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے لیکن
ابھی ٹوٹی دوسری طرف اترنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اچانک
اس کی نگاہ پہاڑی کے دوسری طرف پڑی۔ آٹھ گھڑ....
سوار دوڑ رہے تھے۔ ان کے ساتھ نواں گھوڑا بھی تھا جس
پر ایک لڑکی سوار تھی لیکن لڑکی کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے
اور لڑکی کے گھوڑے سے ایک انسانی جسم بندھا ہوا تھا جو زمین پر
گھس رہا تھا۔ ٹوٹی نے ہاتھ کے اشارے سے لشر کو بلایا۔
وہ ہرن کا تعاقب بھی بھول گیا تھا۔

لشر نے بھی یہ منظر دیکھا اور حیران رہ گیا۔
”یہ تو بڑا ظلم ہے لشر، زمین پر گھسنے والا تو مر چکا
ہوگا۔“

”ہاں یہ ظلم ہے، انہیں روکنا چاہیے۔ یہ غیر انسانی
سلوک ہے۔“
”آؤ!“ ٹوٹی نے گھوڑے کو آگے بڑھاتے ہوئے
کہا۔

”نہیں ٹوٹی۔ رک جاؤ ظاہر ہے ایسے ظالم لوگ اچھے
انسان نہ ہوں گے۔ وہ آٹھ ہیں۔ ہمیں ان سے مقابلہ کرنے

میں ہوشیاری سے کام لینا چاہیے!“ لشر نے کہا۔
”کیا مطلب؟“

”تم گھوڑے کو پیچھے کھڑا کر دو اور اس چٹان کی آڑ
میں رکو میں جاتا ہوں۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوگی تو میں ہاتھ بلند
کر دوں گا اور اس کے بعد تم اندازہ کر سکتے ہو کہ تمہیں
کیا کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے!“ ٹوٹی نے جواب دیا اور لشر نے اپنے
گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اس کا قومی ہیٹل گھوڑا طوفانی انداز
میں نیچے اتر رہا تھا اور لشر کی آنکھوں میں خون چھلک رہا تھا۔
وہ ایک چکر کاٹ کر ان کے سامنے پہنچ گیا اور ان لوگوں نے
بھی اسے دیکھ لیا۔ ان سب کی رائفل سیدھی ہو گئی تھیں۔ لشر
آہستہ آہستہ گھوڑا آگے بڑھا کر ان کے سامنے پہنچ گیا۔ اس
نے خاموشی سے ان لوگوں کو دیکھا اور پھر ان سے گزر کر اس
کی نگاہ لڑکی پر پڑی۔ لڑکی کا چہرہ ویران تھا اور وہ سپاٹ
نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد اس کی نگاہ
گھوڑے سے بندھے ہوئے آدمی پر پڑی جس کے خدوخال
زمین کی رگڑ سے تقریباً ختم ہو چکے تھے اور اب خون
اور گوشت کے لوتھڑوں کے علاوہ اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔
گھوڑے رک گئے اور ان میں سے ایک آدمی آگے
بڑھ آیا۔

”کیا بات ہے، کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟“ اس نے
کرخٹ آواز میں پوچھا۔

”یہ کون ہے؟ اور اس کا کیا قصور تھا جو تم نے اس کے
ساتھ یہ ظالمانہ سلوک کیا ہے؟“ لشر نے سنجیدگی سے سوال کیا
گھوڑے پر بیٹھا ہوا آدمی اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر ہنس
پڑا۔ پھر لشر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پشکر کو جانتے ہو؟“
”شاید تم اس لشر کے کی بات کر رہے جس کے ظلم کے
قے مشہور ہیں؟“ لشر شہر میں پشکر کا نام سن چکا تھا معمولی سے
لوگ بھی خود کو پشکر کا آدمی بتا کر جرائم گزرتے پھرتے تھے۔

”چلو وہی سہی۔“
”وہ یہ پشکر ہے؟“ لشر نے گھوڑے سے بندھے
ہوئے شخص کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”بکومت پورے ویلٹا میں کس کی مجال ہے جو پشکر
کے ساتھ یہ سلوک کر سکے۔ یہ پشکر کا شکار ہے۔ ہٹو سامنے
سے اس سے زیادہ گفتگو نہیں کی جاسکتی۔“

”یہ لڑکی کون ہے؟“ لشر نے اس کی بات نظر انداز
کر کے سر دلچے میں کہا۔
”سامنے سے ہٹ جاؤ، اس لڑکی کا مستقبل بہر حال

روشن ہے شاید یہ پشکر کی محبوباؤں میں شامل ہو جائے۔“
”اسے کھول دو اور اس شخص کی لاش کو بھی کھول دو۔“
لشتر نے حکم دیا اور گھوڑے والا اسے گھورنے لگا۔

”شاید تیری موت ہی آگئی ہے۔“ وہ دانت پیستے ہوئے بولا اور دوسرے لمحے اس نے ہولشتر سے اپنا پستول نکال لیا۔ لیکن اس سلسلے میں وہ لشتر سے زیادہ پھرتی نہ دکھاسکا۔
لشتر کا پستول اس سے پہلے نکل آیا تھا اور گولی گھوڑے والے کی پیشانی توڑتی ہوئی دماغ میں گھس گئی۔ فار کی آواز سے گھوڑے بھڑک کر منتشر ہو گئے اور لشتر کا ہاتھ بلند ہو گیا۔

مرنے والے کے ساتھیوں نے لشتر پر فار جھونک دیے لیکن لشتر گھوڑے پر کہاں تھا۔ وہ تو فار کرنے کے ساتھ ہی پھرتی سے نیچے کود گیا تھا۔ البتہ پہاڑی پر سے ہونے والے فاروں نے دو گھوڑوں کی زین اور خالی کردی۔ نیچے کودتے ہوئے لشتر کے آٹو میٹک پستول نے مزید دو آدمیوں کو چاٹ لیا۔ باقی تین لڑاکے اندھا دھند فارنگ کرتے ہوئے بھاگ نکلے۔ وہ لشتر کے پستول کی زد سے تو نکل گئے لیکن ٹوٹی کی دور تک مار کرنے والی رائفل نے ان میں سے ایک کو ڈھیر کر دیا۔ بقیہ دو نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔

لشتر کے چہرے کی ویرانی ختم ہو گئی اور وہ خوفزدہ نظر آرہی تھی۔ لشتر نے گردن اچکا اچکا کر بھاگ جانے والوں کو دیکھا اور پھر لڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے سہارا دے کر لڑکی کو گھوڑے سے اتار لیا اور چاقو نکال کر اس کے ہاتھوں میں بندھی ہوئی رسیاں کاٹ دیں۔ اور اس کے بعد وہ گھوڑے سے بندھی ہوئی لاش کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے لاش کی رسی بھی کاٹ دی اور پھر اسے اٹھا کر گھوڑے پر ڈال دیا۔ اتنی دیر میں ٹوٹی بھی گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔

”میں نے اونچی چٹانوں پر چڑھ کر دیکھا ہے۔ وہ دونوں جنوب کی طرف بھاگے ہیں۔“ ٹوٹی نے کہا۔

”ہاں وہ پشکر کے ساتھی ہیں۔ اس کے گاؤں کی طرف گئے ہوں گے۔“ لشتر نے کہا۔

”یہ کس کی لاش ہے؟“ ٹوٹی نے پوچھا اور سوالیہ نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

”میرے باپ کی!“ لڑکی کی غمناک آواز ابھری اور دونوں بھائی چونک پڑے پھر لشتر نے گردن ہلائی اور لڑکی سے بولا۔

”ہمارے ساتھ چلو! اس لاش کو احترام سے دفنانے کے بعد تم جہاں کہو گی تمہیں پہنچا دیا جائے گا۔“ لڑکی نے

گردن جھکا دی۔ لشتر نے ٹوٹی کو اشارہ کیا اور ٹوٹی نے بے تکلفی سے لڑکی کی کمر میں دونوں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھا اور گھوڑے کی پشت پر بٹھا دیا۔ لڑکی چونک کر اس کی شکل دیکھنے لگی لیکن ٹوٹی کے چہرے کے کھلندرے پن نے اسے مطمئن کر دیا۔ دوسرے لمحے ٹوٹی خود بھی اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس نے آہستگی سے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔

لڑکی اس کے سینے سے چپکی ہوئی تھی۔ ٹوٹی کے دونوں ہاتھ اس کے گرد حلقہ بنائے ہوئے لگاموں کو پکڑے ہوئے تھے اور نہ جانے کیوں ٹوٹی کے گرم سینے سے لگے ہوئے لڑکی کو بے حد سکون محسوس ہو رہا تھا۔

ان کے پیچھے لشتر اپنے گھوڑے پر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کے ساتھ ساتھ دوسرے گھوڑے کی راسیں بھی پکڑی ہوئی تھیں۔ جس پر بوڑھے سن برگ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ لڑکی اور لاش کی وجہ سے انہیں ست رفتاری سے سڑ کرنا پڑ رہا تھا۔ اس لیے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ٹوٹی گھوڑے سے کود پڑا۔ وہ والدین کے سامنے لڑکی کو اس طرح سینے سے لگائے نہیں جاسکتا تھا۔

لشتر بھی اس کے گھوڑے سے اترنے کی وجہ سمجھ گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بھی گھوڑے کی رفتار سست کر دی۔ دور سے شاید شایلا نے ان کو دیکھ لیا تھا۔ اس لیے وہ بھاگتی ہوئی مکان سے نکل آئی اور متعجب نظروں سے ان لوگوں کو دیکھنے لگی۔

پھر قریب پہنچنے پر اس نے دونوں گھوڑوں کی لگامیں پکڑ لیں۔ لڑکی کو دیکھ کر وہ کوئی دلچسپ فقرہ کہتی۔ لیکن اس کی نظریں اس مسخ شدہ لاش کو بھی دیکھ چکی تھیں۔

”یہ کیا ہوا۔ یہ کون ہے؟“ اس نے گہرائے ہوئے انداز میں لاش کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ڈیڈی کو بھیجو۔ وہ کہاں ہیں؟“
”دوسری طرف کھیتوں میں کام کر رہے ہیں۔“

”بلاؤ!“ لشتر نے کہا اور شایلا بے تحاشا باپ کو آواز دے دیتی ہوئی دوڑ گئی۔ چند منٹ کے بعد لشتر کی ماں اور باپ دونوں آتے نظر آئے۔ بوڑھے آسکر نے بھی اسی حیرت سے

ان دونوں کو دیکھا تھا۔ ”کیا بات ہے لشتر! یہ لاش کیسی ہے؟“
”ظلم کا شکار ہے ڈیڈی، کچھ لوگ اسے گھوڑے سے

باندھ کر کھینٹے ہوئے لے جا رہے تھے اور انہوں نے اس لڑکی کو بھی باندھ کر گھوڑے پر بٹھایا ہوا تھا۔“

”اوہ، اوہ۔ ویلٹا کے لوگ آخر اس قدر وحشی کیوں ہیں۔ ان کی نگاہوں میں انسان اس قدر حقیر شے کیوں ہے۔“

میری سمجھ میں نہیں آتا!“ بوڑھے آسکر نے افسوسناک لہجے میں کہا اور پھر جھک کر لاش کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آسمان کی طرف رخ کر کے سینے پر کراس بنایا اور بولا۔ ”بڑا ظلم کیا گیا ہے اس شخص پر مگر لڑکی سے اس کا کیا رشتہ ہے؟“

”یہ اس بے چاری کا باپ ہے۔“ لشتر نے کہا۔
”اوہ۔“ بوڑھے کے ہونٹ سکڑ گئے۔ وہ گردن جھکائے کھڑی لڑکی کی طرف دیکھنے لگا جس کے چہرے پر یاس اور محرومی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ پھر بوڑھا آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اس نے لڑکی کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور غمزدہ آواز میں بولا۔ ”ظالموں نے تیرے باپ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ لیکن اب میں تیرے باپ کو واپس نہیں لاسکتا میری بیٹی۔ ہاں تیرے لیے باپ کی آغوش اب بھی موجود ہے۔“ اس نے لڑکی کو اپنے سینے سے بھیج لیا اور لڑکی بھی اس سے بری طرح چٹ گئی، وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

بوڑھا آسکر اور اس کی بیوی لڑکی کو تسلی دیتے رہے اور اس کی سسکیاں کم ہو گئیں۔ لشتر نے ٹوٹی کو اشارہ کیا اور دونوں ایک طرف چل پڑے۔ مکان کے عقبی حصے میں انہوں نے زمین کھودنے کے اوزار اٹھائے اور بوڑھے کے لیے ایک مناسب جگہ میں قبر تیار کرنے لگے۔

”ڈیڈی کو پشکر کے بارے میں کیسے بتایا جائے ٹوٹی۔“ قبر کھودتے ہوئے لشتر نے کہا۔

”کیا مطلب..... پشکر یعنی وہ غنڈا؟“
”ہاں وہ پشکر کے غنڈے تھے اور لڑکی کو اس کے گاؤں لے جا رہے تھے۔“

”تب تو..... تب تو میرا خیال ہے اس کام سے فارغ ہوتے ہی ہمیں سب سے پہلے ڈیڈی کو تفصیل بتانی چاہیے تاکہ ہم سب بے خبری میں نہ مارے جاسکیں۔ پشکر جیسے کینہ پرور انسان سے خاموشی کی توقع نہیں ہے۔“

”ہاں میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ لشتر نے جواب دیا۔ قبر تیار کر کے وہ واپس گھر پہنچ گئے جہاں لڑکی، شایلا اس کی ماں اور بوڑھے کو رو کر اپنی کہانی سنارہی تھی اور بوڑھے کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔

”ہر عروج کو زوال آتا ہے بھی سن برگ کے نام سے ویلٹا کے باشندے کانپتے تھے اور آج اسی سن برگ کا ایک غنڈے نے یہ جھڑکیا ہے۔“

”سن برگ؟“ یہ نام دونوں بھائیوں کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

”ہاں لشتر! مظلوم شخص ویلٹا کا جیالاسن برگ ہے۔ وہ سن برگ جس نے شادی کرنے کے بعد اپنی محبت کرنے والی بیوی کی خواہش پر اپنی سرگرمیاں ترک کر دی تھیں اور پھر بیوی کی موت اور بیٹی کی پیدائش کے بعد وہ صرف ایک متشکر باپ رہ گیا تھا۔ یہ وہی سن برگ ہے جو بیٹی کی عزت کے محافظ کی حیثیت میں پھر جاگ اٹھا تھا اور اس نے پشکر کے دس غنڈوں کو قتل کر دیا تھا۔ لیکن ایسوسی ایشن ختم ہو جانے کی وجہ سے انہوں نے اس پر قابو پا لیا۔“

”مجھے تجھ سے ہمدردی ہے میری بیٹی۔ لیکن اب ہم بھی ایک جنگ کا آغاز کر چکے ہیں۔ پشکر خاموش بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ ان دونوں کی تلاش میں زمین و آسمان ایک کر دے گا۔ بہر حال کچھ بھی ہو تو ہماری پناہ میں ہے اور اب ہماری موت کے بعد ہی تیرا بال بیکا ہو سکتا ہے!“ بوڑھے آسکر نے کہا۔ اور پھر ان دونوں کی طرف رخ کر کے بولا۔

”میں نے تم دونوں کو ہمیشہ ہمدردی اور امن کا سبق دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں ایک اور بات بھی کہہ چکا ہوں۔ دنیا میں سب سے قیمتی شے عزت ہے۔ اور اگر عزت پر حرف آنے لگے تو انسان کو پہاڑوں سے نکل جانا چاہیے۔ دانتا ہماری عزت ہے اور اگر پشکر کی آنکھ اس کی طرف اٹھے تو ہمیں اس کی آنکھیں پھوڑ دینا ہوں گی۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟“

”آپ ہمیں شرمندہ کر رہے ہیں ڈیڈی ہمارے لہو کا ایک قطرہ اپنی آن پر بہہ جانے کے لیے بے چین ہے۔“ لشتر نے کہا۔ ٹوٹی کے جڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں جو اس کے شدید جوش میں ہونے کی علامت تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد لشتر نے کہا۔

”قبر تیار کر دی گئی ہے۔“
”ہاں ہمیں اسے دفن کرنے کی تیاریاں کرنی ہیں۔“ بوڑھا اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

☆☆☆
”ڈیڈی عقبی حصے میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ شایلا نے ٹوٹی سے کہا تو ٹوٹی گہرے خیال سے چونک پڑا۔ ”چلو!“ اس نے شایلا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اور پھر چند قدم چلنے کے بعد بولا۔ ”دیکھ لیا تم نے لشتر کتنا برا آدمی ہے۔“

”کیوں؟“ شایلا چونک کر بولی۔
”اس نے آج تم سے طوطا لانے کا وعدہ پورا نہیں کیا۔ میری بات اور ہے، میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔“

”کیوں تم نے کون سا وعدہ پورا کیا ہے؟“ شایلا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا تھا کہ تمہارے لیے الولادوں گا۔“

”الو... کہا ہے وہ؟“

”اونہ۔ تم بھی بالکل احمق ہو کیا اس لڑکی کی شکل الو سے ملتی جلتی نہیں ہے؟“ ٹوٹی نے کہا اور شایلا غصے سے رک گئی۔

”دیکھو ٹوٹی۔ اگر تم نے اس بچاری کو ذرا بھی چھیڑا تو پھر میں تم سے کبھی نہیں بولوں گی۔ وہ تو ویسے ہی مظلوم ہے۔ ہائے کیسے رو رہی تھی۔ مجھے اس سے بہت محبت ہو گئی ہے ٹوٹی میں ہمیشہ اسے اپنے ساتھ رکھوں گی۔“

”کس ظالم کو اس سے محبت نہ ہوگی۔“ ٹوٹی نے آہستہ لہجے میں کہا جسے شاید شایلا نہ سن سکی اور دونوں اس جگہ پہنچ گئے جہاں بوڑھا آسکر لشر سے بات کر رہا تھا۔ سن برگ کو انہوں نے احترام سے دفن کر دیا تھا اور شایلا کی بوڑھی ماں وانکا کو اپنے ساتھ مکان میں لے گئی تھی۔ تب آسکر نے لشر کو بلایا اور الگ لے گیا۔ اس نے شایلا کے ساتھ ٹوٹی کو بھی بلایا تھا۔ پھر اس نے اشارے سے شایلا کو چلے جانے کے لیے کہا اور اس کے جانے کے بعد بولا۔

”بات اتنی معمولی نہیں ہے جتنا تم سوچ رہے ہو۔ پشکر جیسے کینہ پرور انسان کے انتقام سے بچنے کے لیے ہمیں جلد از جلد کچھ کر لینا چاہیے ایسا نہ ہو کہ وہ آرام سے آکر ہمیں شکار کر لے۔“

”میں آپ سے متفق ہوں ڈیڈی۔“ لشر نے کہا۔ اور ٹوٹی نے بھی گردن ہلا دی۔

”میں اپنے اصول کا پکا ہوں ہم نے پوری زندگی عیش و عشرت سے گزاری ہے۔ ہماری خواہش تھی کہ بقیہ زندگی بھی اسی طرح گزرے۔ لیکن اللہ ہمارا امتحان چاہتا ہے۔ وہ ہم سے اس زندگی کا خراج چاہتا ہے۔ تو ایسے موقع پر ہمیں پشت دکھانی چاہیے؟“

”ہرگز نہیں ڈیڈی۔“ ٹوٹی نے جو شلے انداز میں کہا۔

”تب ہمیں اس عیش و عشرت کے گھروندے کو اپنے ہاتھوں سے تباہ کرنا ہوگا۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔ اور میں اس ترکیب سے پوری طرح مطمئن ہوں تمہیں اس پر عمل کرنا ہوگا۔“

”حکم دیں ڈیڈی۔“

”تمام پالتوں مویشیوں کو جنگل میں ہانک دو۔ اگر حالات سازگار رہے تو ہم انہیں دوبارہ بھی پکڑ سکتے ہیں۔“

صرف سامان باندھ لو اور تم دونوں حفاظت سے تینوں عورتوں کو لے کر کشماری کی پہاڑیوں میں چلے جاؤ۔ میں پشکر کو بے وقوف بنانے کی کوشش کروں گا۔ اگر بنا سکا تو ٹھیک ہے ورنہ پھر میں اسے ڈاج دے کر تمہارے پاس پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ اگر نہ پہنچ سکوں تو سمجھ لینا کہ میں اپنی آن پر قربان ہونے کی ابتدا کر چکا ہوں اور پھر باقی کام تمہارے سپرد ہوگا۔“

”میں ایک بات کہنے کی اجازت چاہتا ہوں ڈیڈی۔“ ٹوٹی نے دبے دبے لہجے میں کہا اور بوڑھے آسکر کی تیز نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ ”آپ یہ کام میرے سپرد کر دیں۔ لشر سے ان کی براہ راست دشمنی ہے اور وہ لشر کو پہچانتے ہیں۔ آپ کی ضرورت ان سب کو ہے، آپ ان کی بہتر حفاظت کر سکتے ہیں۔ البتہ میں ان لوگوں کو آپ کی ہدایت کے مطابق.....“

”بکو اس مت کرو ٹوٹی۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ مجھے اپنی اسکیم میں کوئی مداخلت پسند نہیں ہے۔ تم دونوں صرف میری ہدایت پر مکمل کرو۔“ بوڑھے آسکر نے درمیان سے ٹوٹی کی بات کاٹ دی ”میں نے تمہیں ہدایات دیدی ہیں۔ ان پر اب سے دو منٹ کے بعد عمل شروع کر دیا جائے۔“

اور پھر ٹھیک دو گھنٹے کے بعد سات گھوڑے کشماری کی پہاڑیوں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ جو غاروں کی پہاڑیاں کہلاتی تھیں۔ ان پہاڑیوں میں بے شمار غار بکھرے ہوئے تھے۔ بوڑھا آسکر گھوڑوں کو اس وقت تک دیکھتا رہا۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔ سات گھوڑوں میں سے تین پر عورتیں سوار تھیں۔ دو پر ٹوٹی اور لشر تھے۔ باقی دو گھوڑوں پر ضروری سامان لدا ہوا تھا۔ وہ سب ہاتھ ہلاتے ہوئے ماحول میں گم ہو گئے۔ اور آسکر نے گردن جھٹک دی پھر وہ تیزی سے مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ بوڑھا ہونے کے باوجود وہ جوانوں کی سی پھرتی رکھتا تھا۔ مکان کے نیچے ایک چھوٹے سے تہ خانے کو انہوں نے اسلحہ خانہ بنایا ہوا تھا جہاں کسی بھی جنگی ضرورت پر کام آنے کا تمام سامان موجود تھا۔ آسکر نے اسلحہ خانے سے بارود کے کئی بکس نکالے اور باہر لا کر جمع کرنے لگا پھر اس نے انہیں مکان کی پشت پر ایک مخصوص حصے میں چھپا دیا۔ یہاں سے وہ کسی کو نہیں نظر آ سکتے تھے۔ اس کے بعد اس نے بارود میں لپٹی لمبی ڈوری نکالی اور اس کو بکس کے سوراخ سے منسلک کر کے مضبوطی سے باندھ دیا۔ اس کے بعد وہ اس ڈوری کو لکڑی کی دیوار کے ایک رخنے سے نکال کر مکان کو پیچھے دوڑ تک لے گیا اور ایک جگہ اسے باندھ دیا۔ ڈوری کو اس نے گھاس پھوس

سے چھپا دیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے دونوں پستول لوڈ کیے اور انہیں پتلون کے پانچوں کے نیچے پنڈلی میں بندھے ہوئے ہولسٹروں میں لگا لیا۔ کارتوسوں کی پٹی قیس کے نیچے باندھی اور رائفل لوڈ کر کے باہر نکل آیا اور اس کے سامنے والے حصے میں کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ اسے یہ رات اسی جگہ گزارنی تھی۔

کرسی پر بیٹھ کر اس نے رائفل قریب رکھ لی اور ایک سگار نکال کر پینے لگا۔ اسے یقین تھا کہ پشکر کے آدمی صبر نہ کر سکیں گے اور آج ہی رات کے کسی حصے میں اس کے مکان پر حملہ آور ہوں گے اور اس کا یہ یقین غلط نہ ثابت ہوا۔

سورج غروب ہونے والا تھا کہ اس نے دور بہت دور تقریباً پندرہ گھنٹہ سوار دیکھے جو اسی طرف آرہے تھے۔ تب وہ جلدی سے اٹھا اور اس نے آخری کام بھی کر لیا۔ اس نے اپنا سیاہ رنگ کا گھوڑا دور لے جا کر ایک درخت سے باندھ دیا۔ گھوڑے کی زین وغیرہ کسی ہوئی تیار تھی اس کے بعد وہ دوبارہ آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے غیظ و غضب میں ڈوبے ہوئے پندرہ افراد اس کے سامنے پہنچ گئے۔ ان میں سے آگے پشکر تھا۔ تین آدمی سامنے سے آئے باقی مکان کے چاروں طرف پھیل گئے۔ وہ مکان کو گھیرے میں لے چکے تھے۔

بوڑھا بوکھلائے ہوئے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ پشکر کی آنکھوں میں آگ سلگ رہی تھی۔ وہ گھوڑے سے کود پڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دونوں ساتھی بھی نیچے آ گئے تھے۔

”لڑکی کہاں ہے؟“ پشکر نے سرد آواز میں کہا۔

”میں آپ کا ہی منتظر تھا جناب میں سوچ رہا تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔ وہ ناخلف میری اولاد ہے اور جب میں نے سنا کہ اس نے آپ کے آدمیوں سے نکر کر اس لڑکی کو حاصل کیا ہے تو میں نے اس کی موت کی پیش گوئی کر دی تھی۔ لیکن وہ نوجوانی کے جوش میں اندھا ہو رہا تھا۔ میری اس سے جنگ ہو گئی اور اس کی ماں بہن نے بھی اسی کا ساتھ دیا۔ تب میں نے ان سب کو گھر سے نکال دیا۔ میں آپ سے لڑائی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ آپ کو ضرور علم ہوگا کہ میں ایک امن پسند آدمی ہوں۔“

”جاؤ، اندر دیکھو۔“ پشکر نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا اور بوڑھے پر پستول تان لیا۔ ”دوسرا کون تھا جس نے پہاڑیوں کے پیچھے سے فائرنگ کی تھی؟“

”وہ بھی میرا بیٹا ہی تھا۔ مگر وہ دونوں بے وقوف ہیں

جناب۔ بھلا کہاں آپ اور کہاں وہ۔ میں نے ان کی اچھی طرح خبر لی ہے۔ میری درخواست ہے جناب کہ آپ ان دونوں کو معاف کر دیں۔“

پشکر خوشخوار انداز میں آگے بڑھا اور اس نے بوڑھے کا گریبان پکڑ لیا۔ ”اگر وہ لوگ اندر نہیں ہیں تو تجھے بتانا ہوگا کہ وہ کہاں ہیں اور اگر وہ اندر ہیں تو تیرا حشر بوڑھے سن برگ سے مختلف نہ ہوگا۔“

”میں آپ سے آخری بار درخواست کرتا ہوں جناب کہ انہیں معاف کر دیں۔ وہ مجھ بوڑھے کا سہارا ہیں۔ وہ میری.....“ لیکن جملہ پورا ہونے سے قبل پشکر کا زوردار گھونسا بوڑھے کے منہ پر پڑا اور وہ اپنی رائفل کے نزدیک جا گرا۔ لیکن اس نے رائفل اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کوشش اسے فوری موت سے ہمکنار کر سکتی تھی کیونکہ پشکر کی انگلی پستول کے ٹرائگر پر تھی۔

پشکر کے آدمی باہر نکل آئے۔ ”اندر کوئی نہیں ہے۔ پورا مکان خالی ہے۔ وہ لوگ سامان بھی لے گئے ہیں۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”ہوں! اب تم بتاؤ وہ کہاں ہیں؟“ پشکر نے کہا۔

”وہ قصبہ تھا کر گئے ہیں۔ وہاں ان کا چچا رہتا ہے مگر میں تم سے رحم کی بجائے مانگتا ہوں پشکر!“ بوڑھے نے التجا کی۔

”اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر گھوڑے پر بٹھا لو۔“ پشکر نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

”میرا گھوڑا ادھر موجود ہے۔“ بوڑھے نے کہا اور پشکر مکان کی عقبی سمت دیکھنے لگا۔

”لے کر آؤ اور تم اس کی نگرانی کرو۔“ پشکر نے ایک آدمی سے کہا۔ اور اس نے گردن ہلا دی۔ پشکر نے دوسرے لوگوں کو جو مکان کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ آواز دے کر بلالیا۔

اب آسکر کو اپنا کام نہایت صفائی سے کرنا تھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے مکان کی پشت پر پہنچ گیا اور پھر اس نے سلگتے ہوئے سگار کو بہ ظاہر نہایت بے پروائی سے لیکن دراصل بڑی صفائی سے بارود لپٹی ہوئی ڈوری پر پھینک دیا۔ ڈوری سے اٹھتی ہوئی چنگاریاں دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی۔ اور یہ دستور آہستہ قدموں سے سامنے نظر آنے والے گھوڑے کی طرف بڑھتا رہا۔ وہ ایک ایک لمحے کا اندازہ کر رہا تھا کہ اب ڈوری کی آگ کہاں تک پہنچ چکی ہوگی۔

دور کھڑا ہوا پشکر کا آدمی رائفل تانے سے گھوڑے تک جاتے دیکھ رہا تھا اور بوڑھے کی کسی بھی حرکت پر

گولیاں برسانے کے لیے تیار تھا۔ بالآخر آسکر کے قدموں میں تیزی آگئی اور اس نے گھوڑے کی لگام درخت سے کھولی اور صرف چند ساعت کے بعد ایک ساعت شکن دھماکا ہوا اور کڑی کامکان فضا میں بلند ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی بوڑھے نے گھوڑے کی پشت پر چھلانگ لگا دی اور گھوڑا اہوا ہو گیا۔ وہ طوفانی رفتار سے کشتاری کی پہاڑیوں کی طرف جا رہا تھا۔ بوڑھے کے چہرے پر مسرت کے آثار تھے۔ اسے یقین تھا پشکر اور اس کے ساتھیوں کا کام تمام ہو چکا ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ اس علاقے کی طرف رخ کرنا خطرناک ہوگا بلکہ جہاں بھی رہتا ہوگا محتاط ہو کر رہنا ہوگا۔

گھوڑا برق رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ اس بڑھاپے میں بھی آسکر کی ہمت جوان تھی۔ رات ہونے تک وہ کشتاری کی پہاڑیوں میں پہنچ گیا۔ پہاڑیاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں اور اس تاریکی میں لشر وغیرہ کو تلاش کرنا مشکل کام تھا۔ ایک چٹان کے پاس وہ گھوڑے سے اتر گیا اور پھر چٹان پر کھڑے ہو کر اس نے ایک مخصوص انداز میں سیٹی بجائی۔

سیٹی کی آواز ہواؤں کے ساتھ دور دور تک پھیل گئی لیکن اس کا کوئی رد عمل نہ ہوا تب اس نے دوبارہ سیٹی بجائی اور اسی وقت چٹان کے عقب سے لشر کی آواز گونجی۔ ”ڈیڈی!“

”اوہ میرے بیٹے!“ آسکر خوشی سے بولا اور لشر آ کر آسکر سے لپٹ گیا۔ باپ کو زندہ پا کر اسے بے حد مسرت ہوئی تھی۔

”کیا ہاڈیڈی کیا پشکر آیا تھا؟“ اس نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں۔ تمہارے ساتھ آنے سے پہلے میں ایک کوشش کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پشکر ہمیں نظر انداز کر دے میں نے اس ذلیل سے معافی بھی مانگی تھی۔ لیکن وہ طاقت کے نشے میں چور تھا۔ اور جب میں نے یہ کوشش ناکام دیکھی۔ تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔“

”موت کے گھاٹ اتار دیا؟“ لشر خوشی سے چیخ اٹھا۔ ”ہرا! ونڈر فل ڈیڈی، ونڈر فل!“ اس نے خوشی کے عالم میں بوڑھے کو گود میں اٹھالیا۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد بوڑھا ایک غار میں بیٹھا ان لوگوں کو اپنے کارنامے کی روداد سنارہا تھا۔

”ہمیں اس امکان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ پشکر زندہ بھی بچ سکتا ہے۔ بالفرض اگر وہ زندہ نہیں ہے تو اس کے ساتھی ہماری تلاش ضرور کریں گے۔ اس لیے ہمیں محتاط رہنا

ہوگا۔ فی الحال یہ غار بہترین جگہ ہے۔ اس کے بعد ہم کوئی فیصلہ کریں گے۔ لیکن غار سے باہر رہ کر نگرانی کرنا ضروری ہے۔“ بوڑھے نے کہا اور وہ گردن ہلانے لگے۔

☆☆☆

وسط ماہ کا چاند پہاڑیوں پر سونا بکھیر رہا تھا۔ جوان چاندنی فضا کو منور کیے ہوئے تھی۔ اور نشلی ہواؤں نے ماحول کو بے خود کر دیا تھا۔ لشر ایک چٹان سے پشت لگائے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کی رائفل برائیں رکھی ہوئی تھی اور اس کی خواب آلود آنکھوں میں ایک حسین چمک لہرا رہی تھی۔ پھر اس کے ہونٹ خود بخود مسکرا اٹھے۔ اور اسی وقت اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دوسرے لمحے اس نے کسی خوشخوار چیتے کی طرح لپک کر رائفل اٹھالی اور پوزیشن میں آ گیا۔

لیکن قدموں کی چاپ اجنبی نہ تھی۔ یہ وہی تھی جسے وہ اپنے خوابوں میں بسائے ہوئے تھا۔ وہ اسی طرف آ رہی تھی۔ لشر کا رواں رواں خوشی سے جھوم اٹھا۔ وہ اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔

”وانٹا!“ اس نے لرزتے ہوئے لہجے میں آواز دی اور وانٹا چونک کر رک گئی۔ ”میں یہاں اس چٹان پر ہوں۔“ لشر نے کہا اور وانٹا اس کی طرف بڑھ گئی۔ لشر نے اسے سہارا دے کر چٹان پر چڑھایا اور جب وہ چٹان پر پہنچی تو لشر کا چوڑا چکلا سینہ سامنے تھا۔ وانٹا کا جسم اس کے سینے سے ٹک گیا اور لشر کے ہاتھ خوبہ خود اس کی کمر پہنچ گئے!

”کیسے نکل آئیں وانٹا؟“ اس نے اسے خود سے بچھتے ہوئے کہا۔

”یونہی۔ بس نیند نہیں آ رہی تھی۔“ وانٹا کسمساتے ہوئے بولی۔ اور پھر چٹان پر بیٹھ گئی! بیٹھنے کی وجہ سے لشر کے ہاتھ خوبہ خود اس کی کمر سے نکل گئے تھے۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔

”کیوں نیند نہیں آ رہی تھی؟“ اس نے مخمور لہجے میں کہا۔

”میں آپ سب لوگوں سے بے حد شرمندہ ہوں۔ میری وجہ سے آپ کو اپنی دنیا لٹائی پڑی ہے۔ کیسی بدنصیب ہوں میں۔“ وہ گردن جھکا کر بولی۔

”ایسی باتیں کیوں کرتی ہو وانٹا کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے زندگی لٹانی جاسکتی ہے۔“ لشر نے کہا۔

”آپ سب بڑے رحمدل ہیں۔“ وانٹا نے بہ دستور گردن جھکائے ہوئے کہا۔

”سوچنے کا انداز بدل دو وانٹا۔ اب تم ہم میں سے

ایک ہو۔ غور کرو ہم سب کی ایک دوسرے کی نگاہوں میں کیا اہمیت ہے۔ ہم میں سے ہر فرد ایک دوسرے کے لیے ایسی ایسی ہزار زندگیوں کا سہارا ہے اور وانٹا تمہارے آنے سے تو ہماری زندگی میں بہار آگئی ہے۔ تم میری مسرتوں کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔“

ماحول نے لشر کو مدھوش کر دیا تھا۔ ایک بار پھر اس کے ہاتھ وانٹا کی کمر کی طرف بڑھے۔ اور اس نے اسے آغوش میں لے لیا۔ وانٹا عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی لیکن جب لشر کے ہونٹ اس کے رخساروں سے ٹکرائے تو وہ چونک پڑی۔ اس نے لشر کی آنکھوں میں دیکھا اور لشر نے اس کے دیکھنے کے انداز کو نہ جانے کیا سمجھا۔ اس نے وانٹا کے ہونٹ اپنے ہونٹوں میں دبالیے۔

دفعۃً دو کوئی آہٹ ہوئی اور وہ چونک پڑا۔ وانٹا بھی ایک دم کھڑی ہو گئی تھی۔ لشر رائفل لے کر ادھر ادھر دیکھنے لگا لیکن آہٹ کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ ”میں چلتی ہوں لشر!“ اس نے کہا اور چٹان سے کود پڑی۔

”کیوں..... نیند آ رہی ہے؟“ لشر نے پوچھا۔

”ہاں!“ وانٹا نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ لشر اس کے خوبصورت جسم کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظر آتی رہی اور پھر اس کے غار میں داخل ہو جانے کے بعد لشر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ وانٹا کے نرم و گداز ہونٹوں کے لمس اور ان کی گرمی اپنے ہونٹوں پر محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

یوں تو غار میں انہیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ کھانے پینے کی چیزیں خاصی مقدار میں موجود تھیں۔ لیکن پانی لینے کے لیے یہاں سے دور جانا پڑتا تھا۔ چنانچہ ٹوٹی کینوس کی مشک لے کر پانی لینے جا رہا تھا کہ وانٹا بھی اس کے قریب پہنچ گئی۔

”کہاں جا رہے ہو ٹوٹی؟“ اس نے پوچھا۔

”پانی لینے۔“

”میں نے انکل سے نہانے کے لیے کہا تھا تو انکل نے کہا ٹوٹی کے ساتھ چلی جاؤ، چشمے پر نہا لینا۔ میں تمہارے ساتھ چلوں ٹوٹی؟“ ٹوٹی نے سلگتی نظروں سے اسے دیکھا۔

ایک اور زین اٹھا کر دوسرے گھوڑے پر کس دی اور پھر وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ دوسرے گھوڑے پر زین کئے کا مطلب تھا کہ وہ وانٹا کو ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہے۔

چنانچہ وانٹا بھی مسکراتی ہوئی گھوڑے پر بیٹھ گئی اور دونوں گھوڑے چٹانیں پھلانگتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔ چشمہ

یہاں سے کافی دور ایک خوبصورت علاقے میں تھا۔ راستے میں وانٹا نے کئی بار اپنا گھوڑا ٹوٹی کے ساتھ لانے کی کوشش کی لیکن ٹوٹی ہر بار اپنا گھوڑا آگے نکال لیتا۔

تھوڑی دیر بعد وہ چشمے پر پہنچ گئے۔ ٹوٹی گھوڑے سے کود پڑا۔ اور خاموشی سے مشک میں پانی بھرنے لگا۔

”پانی زیادہ ٹھنڈا تو نہیں ہے ٹوٹی؟“ وانٹا نے اس کے نزدیک پہنچ کر کہا۔

”نہیں تم، نہا سکتی ہو۔“ ٹوٹی نے سرد لہجے میں جواب دیا اور وانٹا اسے دیکھنے لگی۔ پھر اس کی آنکھوں میں اداسی تیرنے لگی۔

”شاید تمہیں اپنا خوبصورت مکان تباہ ہونے، اپنی حسین زندگی کے ختم ہو جانے کا دکھ ہے ٹوٹی۔“ اس نے رنجیدہ لہجے میں کہا اور ٹوٹی چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب تاثرات ابھر آئے۔

”کیوں بار بار مکان کا نام لے کر ہمیں ذلیل کرتی ہو۔ کیوں ہمارے خلوص کا مذاق اڑاتی ہو تم۔“ ٹوٹی نے پھر سے

ہوئے لہجے میں کہا اور وانٹا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ ٹوٹی کے غصے سے سرخ چہرے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی اور پھر اس کی آنکھوں ڈبڈبا آئیں اور اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

”تمہیں یہ خیال کیوں آیا ٹوٹی کہ میں..... میں تمہارے خلوص کا مذاق اڑاؤں گی۔ میں..... جس کا بال بال تمہارے احسانوں سے دبا ہوا ہے۔“

”ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے تمہارے اوپر کوئی احسان نہیں کیا ہے ہم جانتے تھے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ہم نے تمہیں اپنا سمجھ کر یہ سب کچھ کیا تھا۔ لیکن تم ہمیں ہمیشہ غیریت کا احساس دلاتی رہیں۔ آخر کیوں.....؟ کیوں تم ہمارے اوپر اپنا حق نہیں سمجھتیں۔ بتاؤ کون سی ترکیب کی جائے؟“

ٹوٹی یہ دستور پھر اہوا تھا۔

وانٹا بہ دستور رسک رہی تھی۔ وہ اسی طرح روتے ہوئے بولی۔ ”میں تو تمہارے اوپر جان بھی نچھاور کرنے کو تیار ہوں ٹوٹی میں تمہیں غیر کیسے سمجھ سکتی ہوں۔ میں نے اس وقت یہ الفاظ صرف اس لیے کہے تھے کہ تم تین چار دن سے بالکل خاموش خاموش رہنے لگے ہو۔ یقیناً کوئی ٹوٹی میں نے تمہارے چہرے پر اداسی کی جھلکیاں دیکھی تھیں۔“

اور ٹوٹی چونک پڑا۔ چند لمحے وہ اسے گھورتا رہا۔ پھر دوسری طرف منہ کر کے بولا۔ ”ہاں وانٹا، میں اداس ہوں۔ میرا بھائی مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے آج تک میں نے جو

سینس ڈائجسٹ 168 اگست 2012ء

سینس ڈائجسٹ 169 اگست 2012ء

چاہا اس سے مانگ لیا اس نے مجھے کبھی انکار نہیں کیا۔ پھر ہم دونوں کو ایک خوبصورت موتی ملا، ہم دونوں اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو گئے۔ وہ موتی میرے بھائی نے اپنے قبضے میں کر لیا لیکن میں اس سے وہ موتی نہیں مانگ سکتا کیونکہ وہ مانگنے کی چیز نہیں ہے۔ وہ تو قسمت سے تعلق رکھتا ہے۔“

”خدا کے لیے صاف صاف کہو ٹونی۔ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کس کی باتیں کر رہے ہو؟“ وائنا کسی شے کے تحت بولی۔

”اس رات کی بات کر رہا ہوں وائنا جب چاند کی جوانی چمک رہی تھی اور چٹان کے اوپر محبت کھیل رہی تھی۔ دو جسم ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ کاش میں اس منظر کے لیے خود کو تیار کر سکتا۔ وہ سب اچانک میرے سامنے آیا اور میں خود کو لٹے دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا۔ میں شرمندہ ہوں وائنا کہ تم نے میرے چہرے سے اس رات کا تذکرہ پڑھ لیا۔ میں..... ٹونی خاموش ہو گیا۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ پھر وہ اس وقت چونکا جب پیچھے سے وائنا کے ہاتھ اس کی گردن میں آ گئے۔ اس کے خوبصورت جسم کا گداز ٹونی کے دل میں ہلچل پیدا کر رہا تھا۔ ”میں اپنے بوڑھے مظلوم باپ کی قسم کھاتی ہوں ٹونی کہ وہ منظر میں نے ترتیب نہیں دیا تھا۔ میں اداس تھی اور نیند نہ آنے کی وجہ سے باہر نکل آئی تھی۔ تب لشر نے مجھے دیکھ لیا اور پھر اس نے مجھے پاس بلایا۔ میں چلی گئی اور..... اور یقین کر دو ٹونی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ میرے لیے اچانک اور غیر متوقع تھا۔ پھر آہٹ سنائی دی۔ وہ غالباً تم تھے اور مجھے وہاں سے آنے کا موقع مل گیا۔“

ٹونی اچانک پلٹ پڑا۔ اس کے چہرے پر مسرت رقص کر رہی تھی۔ ”تو..... تو..... کیا..... کیا تم میری محبت قبول کرو گی وائنا۔ تم میری محبت قبول کرو گی؟“ اس نے وائنا کے شانے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

اور وائنا نے مسکراتے ہوئے اپنا سر اس کے سینے سے ٹکا دیا۔ ٹونی اسے گود میں اٹھا کر ناپنے لگا۔ ”تم نے مجھے زندہ کر دیا ہے وائنا میں شاید لشر سے نکل جاؤں لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ تم اسے پسند کرتی ہو تو میرا دل ٹوٹ گیا تھا۔“

”میں لشر کی عزت کرتی ہوں ٹونی۔ لیکن شائلا کی طرح.....“ اس نے جواب دیا۔ اور ٹونی نے اس کی ٹھوڑی اوپکی کر کے اس کے خوبصورت ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ وائنا کے ہاتھ اس کی گردن سے لپٹ گئے۔ اس نے ٹونی کے بوسے کا گرم جوشی سے جواب دیا تھا۔ طویل بوسے سے فارغ ہو کر ٹونی نے مست نظروں سے اسے دیکھا اور پھر دوبارہ لپٹا

لیا۔ ”اب تم نہا لو وائنا پھر ہم واپس چلیں گے“ اس نے کہا۔ ”پلیز۔ ادھر چلے جاؤ۔“ وائنا نے التجا کی اور ٹونی گردن ہلا کر ایک ٹیلے کی طرف بڑھ گیا اور پھر ٹیلے کی آڑ سے وہ وائنا کو کپڑے اتارتے دیکھتا رہا۔ وائنا کا ریشم کی طرح ملائم اور چمکدار جسم ایک لمحے کے لیے کنارے پر نظر آیا اور پھر اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ مچھلی کی طرح پانی میں تیر رہی تھی اور پھر اچانک ہی ٹونی کی نگاہ ٹیلے سے دوسری طرف اٹھ گئی۔ اسے ایک گھوڑا نظر آیا جو شاید یہیں کہیں سے نکل کر گیا تھا۔ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے لشر کی پشت ٹونی کے سامنے تھی لیکن ٹونی نے اسے آسانی سے پہچان لیا۔

اور اس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات ابھر آئے تو لشر ہمارا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔ اس نے سوچا۔ ظاہر ہے اس نے سب کچھ دیکھ لیا ہو گا۔ اچھا ہے اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ اس نے سوچا اور پھر وہ پانی میں تیرتی ہوئی وائنا کو دیکھنے لگا جس کا کندنی جسم پانی کی چادر سے بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے وائنا کو جھیل سے نکل کر کنارے پر آتے اور کپڑے پہنتے دیکھا۔ پھر وائنا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اسے مسلسل سے فارغ ہونے کی اطلاع دے رہی تھی۔

☆☆☆

بوڑھا آسکر کھانے پینے کی چیزیں اور دوسرا سامان لے کر واپس آیا تو متفکر تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہرے غور و فکر کے آثار تھے۔ پھر اس نے شام کو سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے بتایا۔

”شیطان کی زندگی بہت طویل ہوتی ہے اور پشکر بھی شیطان کی نسل کا ایک فرد ہے۔ وہ کم بخت زندہ ہے۔“

”زندہ ہے؟“ شائلا کی ماں کے ہاتھ سے چمچہ چھوٹ گیا۔

”ہاں۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جب میں نے اسے دیکھا تو مجھے یقین نہیں آیا۔ تب میں نے لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہے۔ البتہ وہ ایک ہاتھ سے محروم ہو گیا ہے۔ اور اب اس کا صرف ایک ہاتھ ہے بائیں طرف کا گال بھی اڑ گیا ہے۔ اور اب اس طرف سے اس کے دانت باہر سے نظر آتے ہیں۔ اس کی شکل کافی بھیا تک ہو گئی ہے۔ لیکن اس کی خباثت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔“

”خوب! ٹونی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے حیرت ہے کہ وہ اس دھماکے سے کیسے بچ گیا

بہر حال ہمیں اور زیادہ محتاط ہونا پڑے گا۔“

”اوہ۔ لشر جیسا پھرے دار موجود ہے ڈیڈی تو فکر کس بات کی ہے۔ خاص طور سے چاندانی راتوں میں تو وہ بے حد چوکنا ہو جاتا ہے۔ اس مناسبت سے ہم اسے چاندنی رات کا چوکیدار کہہ سکتے ہیں۔“ ٹونی نے کہا اور لشر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ دوسرے لمحے اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کانٹے سے ٹونی پر وار کر دیا اور کانٹا ٹونی کا داہنا گال زخمی کرتا ہوا نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی لشر نے ایک پلیٹ اٹھا کر ٹونی پر دے ماری اور عورتیں جھین مار کر جلدی سے اٹھ گئیں۔

”لشر! کیا تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے؟“ آسکر دباؤ۔

”یہ..... یہ ہمیشہ میرا مذاق اڑاتا ہے ڈیڈی! میں اسے قتل کر دوں گا۔“ لشر غرایا اور بوڑھا عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے لشر کے الفاظ پر شدید حیرت تھی۔ یہ دونوں تو ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ پھر یہ الفاظ کہاں سے آئے۔

”یہ تو اس کی عادت ہے لشر اس پر تمہیں اس قدر غصہ کیوں آ گیا؟“ بوڑھے نے حیرت سے کہا۔

”اس سے کہہ دو خود کو قاپو میں رکھے ورنہ..... ورنہ.....“ لشر مٹھیاں بھیج کر بولا اور دوسری طرف مڑ گیا۔ ٹونی اپنے گال سے بہنے والے خون کو پونچھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے ٹونی۔ لشر اس قدر کیوں بگڑ گیا؟“ آسکر نے ٹونی سے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا۔“ ٹونی نے بھی بگڑے ہوئے لہجے میں کہا اور اٹھ کر ایک طرف چلا گیا۔ آسکر کی آنکھ میں تشویش بڑھ گئی اور پھر وہ آہستہ سے بولا۔ ”ہم جس قدر خطرے میں اب ہیں۔ پہلے بھی نہ تھے۔ ہمارے محل کے ستون مل گئے ہیں۔ اور اب کسی بھی وقت کسی بھی وقت.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا!

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ دونوں بھائیوں کی کشیدگی حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ ہفتوں ایک دوسرے سے بات کیے ہوئے گزر جاتے۔ ویسے اس دوران اور کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن آسکر اور اس کی بیوی حالات سے واقف ہو گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فساد کی جڑ وائنا ہے۔ آسکر کی بیوی نے اس کے سامنے تجویز پیش کی کہ وائنا کو شہر چھوڑ آئے لیکن آسکر اس کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے کہا کہ وہ مظلوم ہے اس کے لیے گھر لٹا دیا اور اب اسے یوں بے سہارا کر دیا جائے۔“

سنہری باتیں

☆ اچھا انسان وہ ہے جو کسی کا دیا ہوا دکھ تو بھلا دے مگر کسی کی دی ہوئی محبت کبھی نہ بھلائے۔

☆ لوگ آپ کی پیٹھ کے پیچھے تین وجوہات کی بنا پر آپ کے خلاف باتیں کرتے ہیں (1) جب وہ آپ کی سطح تک نہیں پہنچ پاتے (2) جب وہ آپ جیسا نہیں کر سکتے (3) جب وہ آپ کا طرز حیات اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر نہیں کر پاتے۔

☆ ہمیشہ اچھے اور خوش باش رہیے۔ یہ ان لوگوں سے بہترین انتقام ہے، جو آپ کو دکھی اور ناخوش دیکھنا چاہتے ہیں۔

☆ تین دوستوں علم، دولت اور عزت کی خوبصورت کہانی۔ یہ تینوں دوست تھے۔ تینوں میں پیار بھی بہت تھا۔ ایک دفعہ ایسا وقت آیا کہ تینوں کو جدا ہونا پڑا۔ تینوں نے ایک دوسرے سے سوال کیا کہ دوبارہ کہاں ملیں گے؟ علم بولا۔ ”میں مدرسے، مسجد اور اسکول میں ملوں گا۔“

دولت بولی۔ ”میں محل اور انیروں کے پاس ملوں گی۔“ مگر عزت خاموش رہی۔ دونوں نے وجہ پوچھی تو عزت نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ”میں ایک بار چلی گئی تو واپس نہیں آؤں گی۔“

☆ خوش نصیب وہ نہیں جس کا نصیب اچھا ہے بلکہ خوش نصیب وہ ہے جو اپنے نصیب پر خوش ہے۔

مرسلہ: اختر شاہ عارف، ڈھوک جمعہ جہلم

اس نے کہا ”صرف ایک محفے میں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ اس کی شادی کر دی جائے لیکن کس کے ساتھ۔ وائنا ٹونی کو پسند کرتی ہے اور ٹونی اسے۔ لیکن لشر بھی وائنا کو چاہتا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ کوئی طوفان نہ آجائے۔ اگر میں وائنا کی شادی لشر سے کر دوں تو یہ وائنا کی مرضی کے خلاف ہو گا۔ اور ٹونی بھی میرے فیصلے کو قبول نہ کرے گا۔ اور اگر ٹونی کے ساتھ اس کی شادی کر دوں تو نہیں جانتا کہ انجام کیا ہو۔“

”اس کا ایک ہی حل ہے۔“ اس کی بیوی نے کہا۔
 ”دانتا کو خاموشی سے شہر چھوڑ آؤ۔ تھوڑے دنوں کے بعد
 دونوں بھائی معمول پر آجائیں گے۔“ اور آسکر خاموش
 ہو گیا۔ دانتا سے ہمدردی اپنی جگہ تھی۔ اس ہمدردی میں وہ
 اپنی دنیا اجاڑ کر ان پہاڑوں میں تو آسا تھا لیکن اپنے بیٹوں
 کی قربانی اسے قبول نہ تھی۔ وہ گہری سوچ میں غرق تھا۔

اور دوسری طرف ایک اور ڈراما ترتیب پا رہا تھا۔
 اس دن مطلع صبح ہی سے ابر آلود تھا۔ نشہ انگیز ہوا میں
 سرسراہٹ پھر رہی تھی۔ اور جوان ذہن کیف و سرور میں
 ڈوبے ہوئے تھے۔ غار میں استعمال کا پانی موجود تھا لیکن
 ٹوٹی نے مشک اٹھائی اور دانتا کو اشارہ کر کے چل دیا۔ تھوڑی
 دیر کے بعد وہ جھیل پر پہنچ گئے اور دانتا موسم کی شراب کے
 سرور میں مست ہو کر ٹوٹی سے ہم آغوش ہو گئی۔ ٹوٹی نے بھی
 اس کی محبت کا جواب پوری گرجوٹی سے دیا تھا۔ ابھی وہ کیف
 و سرور میں ڈوبے ایک دوسرے سے ہم آغوش تھے کہ
 اچانک ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ اور دونوں اچھل پڑے!
 ایک زخمی پرندہ ان دونوں پر آگرا۔ نشانہ باز نے اس
 پرندے کو نشانہ بنایا تھا۔ اور پہاڑی ٹیلے سے لشر نیچے اترتا
 دکھائی دیا۔ وہ خاموشی سے ان کے قریب آیا اور جھک کر
 پرندہ اٹھا لیا۔ ٹوٹی کی آنکھوں میں غصے کے آثار تھے۔
 ”تمہیں شکار کھیلنے کے لیے یہی جگہ ملی تھی؟“ اس نے
 سخت لہجے میں کہا۔

”تم بھی اسی جگہ شکار کھیلتے ہو!“ لشر نے ذومعنی انداز
 میں کہا۔ اشارہ دانتا کی طرف تھا۔

”تمہاری زیادتیاں حد سے بڑھتی جا رہی ہیں لشر، تم
 مجھ سے صرف ڈیڑھ سال بڑے ہو لیکن میں تمہارا ادب
 کرتا ہوں مجھے بدتمیزی پر مجبور مت کرو۔“
 ”میں چاہتا ہوں کہ تم بدتمیزی پر مجبور ہو جاؤ تاکہ فیصلہ
 جلد ہو جائے۔“

”کیا چاہتے ہو؟“ ٹوٹی سیدہ تان کر کھڑا ہو گیا۔
 ”میں چاہتا ہوں کہ تم اسے میرے حوالے
 کر دو۔“ لشر نے صاف گوئی سے کہا۔
 ”وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اگر وہ تمہیں چاہتی تو مجھے
 اعتراض نہ ہوتا۔“

”صرف ایک رات اس نے مجھے بھی چاہا تھا۔“
 ”یہ تمہاری غلط فہمی بلکہ زیادتی تھی۔“
 ”بکواس! یہ آوارہ ہے۔ تمہاری بھی نہیں ہو سکتی یا پھر
 ایسا کرو۔ ہم اسے آپس میں بانٹ لیں۔“ لشر نے کہا۔ ٹوٹی کا

طاقتور گھونسا اس کے جڑے پر پڑا۔ لشر لڑکھڑا گیا۔ لیکن
 دوسرے ہی لمحے اس کا پستول نکل آیا۔ پستول ٹوٹی کے پاس
 بھی تھا لیکن اس نے اسے نکال کر ایک طرف پھینک دیا۔
 ”میں تم پر پستول نہیں نکال سکتا۔“ اس نے حقارت
 سے کہا اور لشر نے بھی پستول پھینک دیا اور پھر وہ قدم ٹوٹی
 کی طرف بڑھانے لگا اور دانتا دہشت زدہ ہو کر کانپنے لگی۔
 اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ دونوں ہی
 گینڈے کی طرح طاقتور اور شیر کے مانند نڈرتے تھے۔ دونوں
 ایک دوسرے پر بھاری تھے اور جنگ کا فیصلہ نہیں ہو
 پا رہا تھا۔

وہ لڑتے لڑتے لہو لہاں ہو گئے۔ دونوں کے لباس
 پھٹ گئے تھے اور جسم کے ایک ایک حصے سے خون بہہ
 رہا تھا۔ وہ بری طرح زخمی ہو گئے اور لڑنے کے دوران وہ ان
 گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھی نہ سن سکے جو انہیں چاروں
 طرف سے گھیر رہے تھے۔

خود پشکر بھی اس خونریز جنگ کو دیکھ کر حیران تھا۔ اس
 کے ساتھیوں نے اسے بتایا تھا کہ یہ دونوں آسکر کے بیٹے
 ہیں۔ بہر حال وہ اس جنگ کے انجام کا منتظر تھا۔

لیکن اچانک دانتا کی نگاہ ان لوگوں پر پڑ گئی۔ اور وہ
 خوف سے چیخ پڑی۔ ”ٹوٹی..... لشر..... پشکر آ گیا۔“
 اور دونوں لڑاکے رک گئے۔ انہوں نے چاروں طرف
 کھڑے ہوئے دشمن کو دیکھا اور پھر لشر آہستہ سے بولا۔
 ”ٹوٹی!“

”ہوں؟“
 ”رائفلوں تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ اس لڑکی کو بچاؤ،
 میں اس چٹان کے پیچھے چھلانگ لگاؤں گا اور تم اس جگہ محفوظ
 رہو گے جہاں دانتا کھڑی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ٹوٹی نے بھی سرگوشی کی اور پھر
 دونوں نے نہایت چالاکی سے رائفلوں پر چھلانگ لگا دی۔
 پشکر بھی سمجھا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو مارنے کے لیے
 یہ کارروائی کر رہے ہیں۔ اس لیے اس نے تعرض نہ کیا۔ لیکن
 جب انہوں نے مورچے لے کر فائرنگ شروع کی تو وہ بوکھلا
 گیا اور پھر اس نے بھی اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔

ٹوٹی نے دانتا کو بھی چٹان کے پیچھے لٹایا تھا اور پھر
 اس نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ پشکر کے ساتھیوں کی
 تعداد کا کافی تھی۔ لیکن وہ کھلے علاقے میں تھے اس لیے
 نقصان اٹھانے لگے۔ ٹوٹی کی بہ نسبت لشر کی پوزیشن
 کمزور تھی۔ وہ ایسی جگہ تھی جو پیچھے سے غیر محفوظ تھی۔ پھر بھی وہ

نہایت دلیری سے چاروں طرف فائرنگ کر رہا تھا اور اب
 تک پشکر کے کئی ساتھیوں کو لڑکا چکا تھا۔
 دفعتاً ٹوٹی کو اس کی چیخ سنائی دی اور اس کا دل دہل
 گیا۔ یہ لشر کی چیخ تھی اس کے بھائی کی۔ اس کا کلیجہ منہ کو آنے
 لگا اور اس نے گولیوں کی پروا کیے بغیر گردن اٹھا کر لشر کو
 دیکھنے کی کوشش کی لیکن کئی گولیاں اس کے قریب سے نکل
 گئیں۔

اور پھر دفعتاً پشکر کے ساتھیوں پر پیچھے سے فائرنگ
 شروع ہو گئی۔ یہ بوڑھا آسکر، اس کی بیوی اور بیٹی تھے۔
 انہوں نے اس طرح جان توڑ کر اندھا دھند فائرنگ کی کہ پشکر
 کو اپنے بے شمار ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ اس
 نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ جب پشکر بھاگ گیا تو ٹوٹی جلدی
 سے اپنی جگہ سے نکل کر لشر کے قریب پہنچ گیا۔ لشر کے جسم
 میں تین گولیاں پیوست تھیں۔ تینوں نازک مقامات پر لگی
 تھیں اور لشر دم توڑ رہا تھا۔ ٹوٹی کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر
 مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ٹوٹی کا ہاتھ پکڑا اور خون آلود
 آواز میں بولا۔

”میں..... میں شرمندہ ہوں..... ٹوٹی میرے بھائی!“
 اور پھر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی! ٹوٹی کا جسم آہستہ
 آہستہ کانپ رہا تھا اور اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار
 تھے۔ لشر کی ماں دھاڑیں مارتی ہوئی اس کے قریب پہنچ
 گئی۔ آسکر بھی بیٹے کی لاش سے چٹ کر رہا تھا۔ اور شایلا
 بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔ اور ٹوٹی اپنی رائفل اٹھائے آہستہ
 آہستہ اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سب لشر کی لاش
 سے لپٹ کر رہے تھے اس لیے ٹوٹی کو جاتے ہوئے کوئی نہ
 دیکھ سکا۔ البتہ جب ان کا غم آنکھوں کے راستے نکل
 گیا تو انہوں نے ٹوٹی کو تلاش کیا لیکن وہ جا چکا تھا۔ نہ جانے کہا؟

☆☆☆

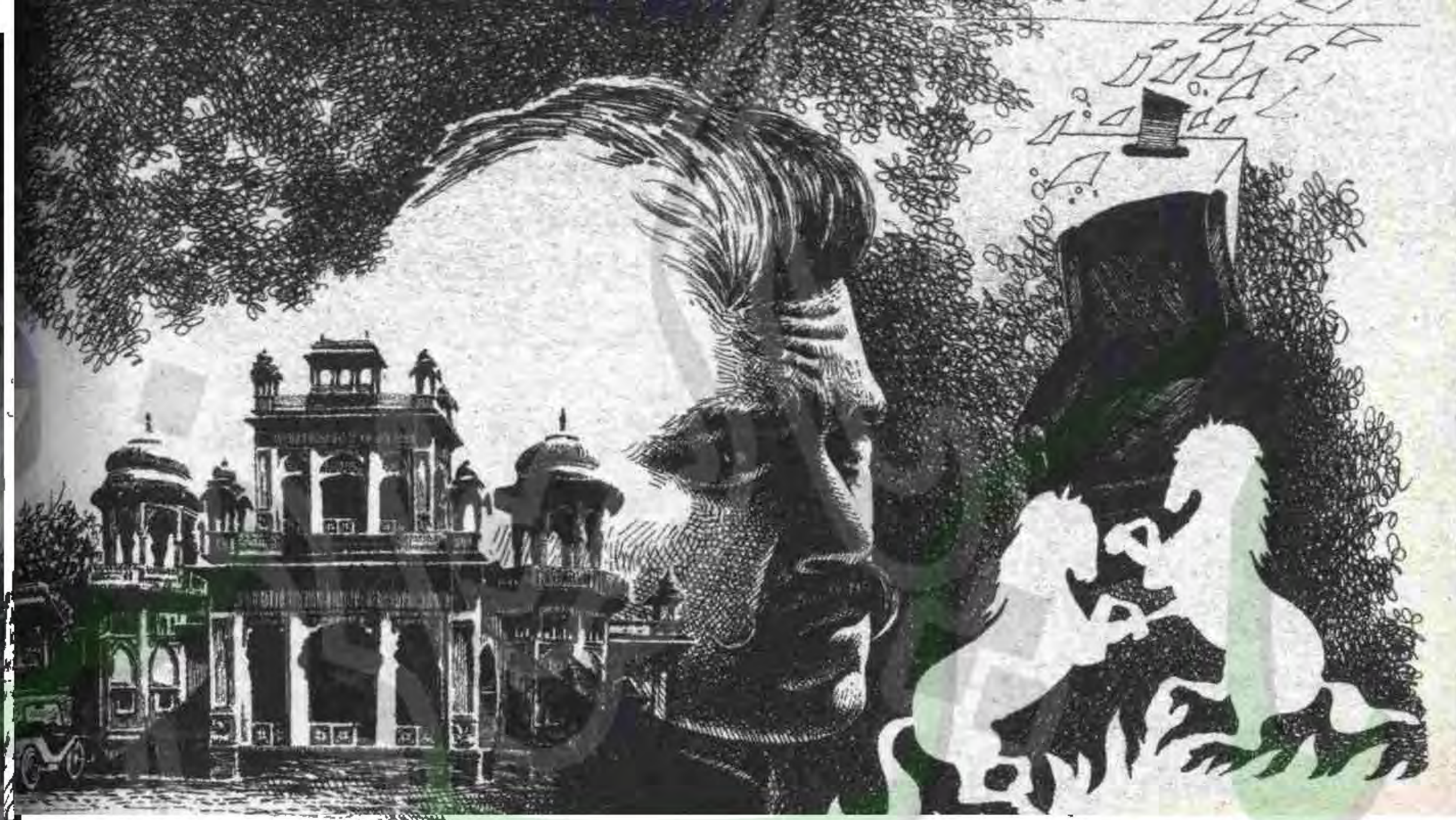
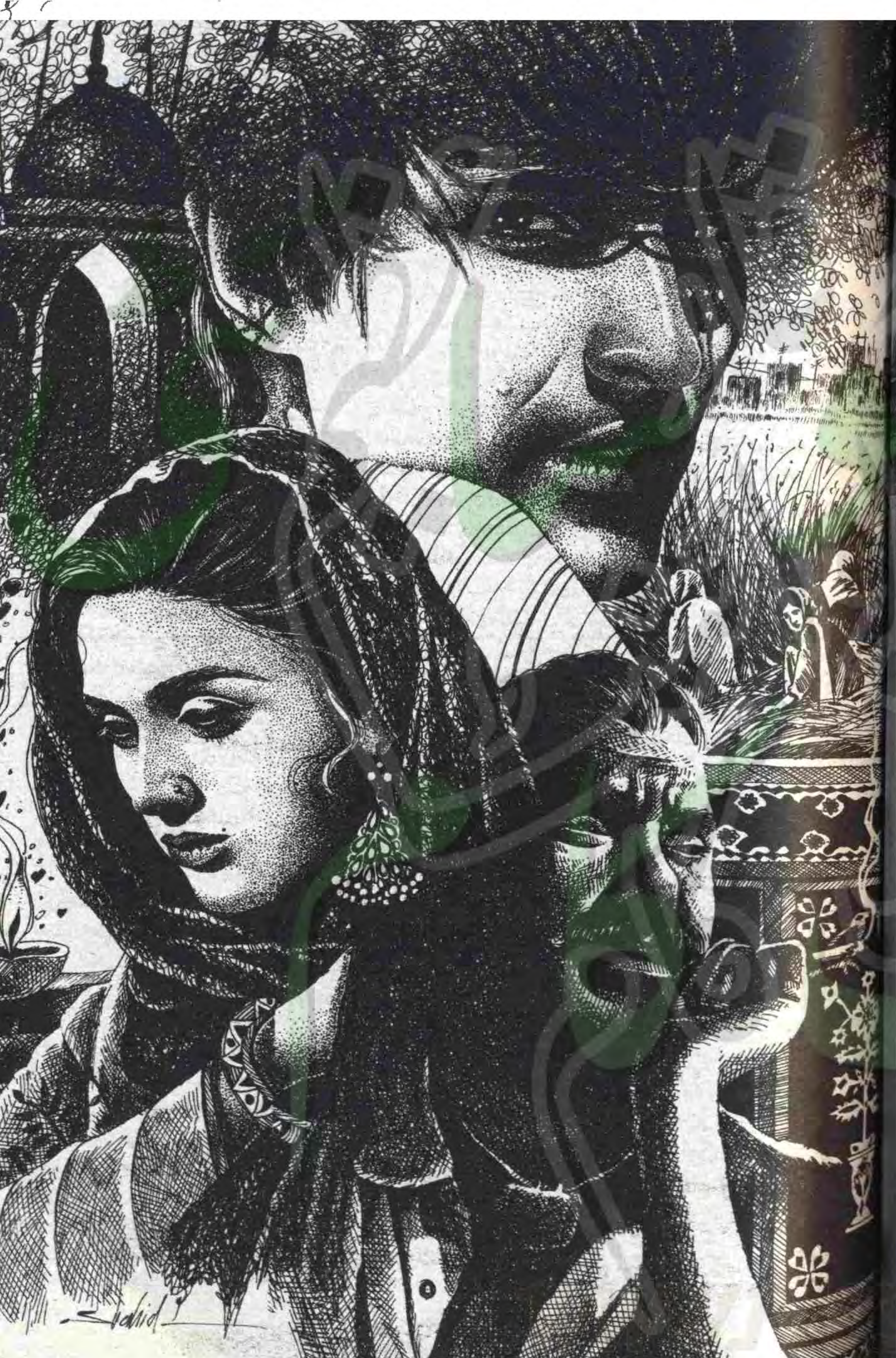
پھر ویلا میں ایک اور جیلے کا نام ابھرا، یہ ٹوٹی تھا۔
 طوفان کی طرح تیز و تند۔ جس کی رائفل بادلوں کی طرح
 گرجتی تھی اور اس کے دشمن دہشت سے مر جاتے تھے۔ پشکر
 کو اس نے اس کے گاؤں میں اس کے اپنے بیس ساتھیوں کی
 موجودگی میں قتل کیا اور پھر ان بیس ساتھیوں میں سے صرف
 چند جان بچا کر بھاگ سکے۔ اور اس کے بعد پشکر کے گروہ
 کے دوسرے افراد چن چن کر قتل کیے جانے لگے۔ وہ
 پہاڑوں میں، غاروں میں پناہ لیتے پھر رہے تھے لیکن موت
 کا فرشتہ ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ پورے ویلا میں پشکر کا ایک
 بھی حامی زندہ نہ بچا۔ جن لوگوں نے پشکر کے ساتھ کوئی

معمولی سی ہمدردی بھی کی تھی۔ وہ خوف و دہشت سے مرے
 جا رہے تھے۔ ہر جگہ ٹوٹی کے نام کے چرچے تھے۔ اس کے
 گھوڑے کی رنگت کی باتیں کی جاتی تھیں۔ اس کے لباس
 اس کی رائفل کے تذکرے ہوتے تھے اور ویلا کے
 رؤسائے اس کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیے تھے۔
 وہ بھی ایک چاندنی رات تھی۔ آسمان سے نور برس
 رہا تھا اور دانتا اپنے باپ کی قبر کے نزدیک مغموم بیٹھی تھی۔
 کبھی کبھی اس کی نظریں اس دوسری قبر کی طرف بھی اٹھ جاتیں
 جو یہاں سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔ یہ لشر کی قبر تھی۔ آسکر
 نے اپنی دنیا پھر سے آباد کر لی تھی۔ اسے مونس بھی مل گئے
 تھے اور کپاریاں خوب سبزی اگل رہی تھیں لیکن اس کی
 کمر ٹوٹ گئی تھی۔ دونوں بازو بیکار ہو گئے تھے۔ وہ اپنے
 مکان کے دروازے پر بیٹھا سگار پیتا اور خلا میں گھورتا رہتا۔
 اور پھر جب ماحول تاریکی میں ڈوب جاتا تھا وہ ٹھنڈی سانس
 لے کر واپس اندر آ جاتا جہاں اس کی بیٹی شایلا اور بیوی کے
 اداس چہرے اس کے منتظر ہوتے۔

دفعتاً دانتا کے کانوں نے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنی
 اور وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ کوئی آ رہا تھا۔ وہ آنے والے سے
 خوفزدہ ہو کر ایک جگہ چھپی۔ تب اس نے گھوڑے سے اترنے
 والے کو دیکھا اور اس کا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔ یہ ٹوٹی تھا،
 اس کا ٹوٹی! وہ دل میں گد گدی لیے اسے دیکھتی رہی۔ ٹوٹی
 نے پہلے اپنا مکان۔ پھر بوڑھے سن برگ کی قبر۔ اور پھر
 دوسری قبر دیکھی اور آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ
 سر جھکائے مجرموں کی طرح قبر کے سامنے کھڑا تھا۔ اور دانتا
 بھی اس کے نزدیک پہنچ گئی۔

”ٹوٹی!“ اس نے مسرتوں سے لبریز آواز میں اسے
 پکارا۔ لیکن ٹوٹی اس کی طرف نہ مڑا۔ وہ بہ دستور گردن
 جھکائے کھڑا تھا۔ دانتا نے اس کی گردن میں بائیں ڈال دیں
 تو ٹوٹی خاموشی سے مڑا اور اس نے دانتا کی بائیں گردن سے
 نکال دیں۔

”میں تمہاری عزت کرتا ہوں دانتا لیکن میرے
 قریب مت آؤ۔ میں تم سے محبت نہیں کر سکتا۔ میں تم سے
 شادی نہیں کر سکتا کیونکہ..... کیونکہ تم میرے بھائی کا پیار ہو۔
 میں اپنے بھائی کی امانت میں خیانت نہیں کر سکتا، میں
 مجبور ہوں۔ میں بالکل مجبور ہوں میں اسے مرنے کے بعد بھی
 تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔“ اس نے رندھی ہوئی آواز میں
 کہا اور اپنے مکان کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔



ناصر ملک

مسافر

قسط نمبر: 6

کلنگز اور سسٹم سے راہ پر خار تک ایک مسافر بے نوا کی روزِ دادِ حیات

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبائے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود پر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور ابلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضاؤں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہو جاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کر کے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہو جاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کر دینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی ایک سفر ہے اور ہم سب مسافر ہیں، راہ کی کشائیں سے بے خبر اپنے سفر پر رواں ہیں۔ داستان سفر شروع کرنے سے پہلے اپنا تعارف ضروری ہے۔ میرا نام شہر یار ہے جسے لوگ پیار سے شہر کہتے ہیں۔ میرا گھرانہ عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد امام دین عرف سوہتا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف راجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبہ نور پور میں مقیم تھا۔ والد صاحب کھیتوں میں مزدوری کر کے عزت کی روزی کھاتے تھے کہ ایک روز جب میری عمر پانچ برس تھی ایک خوشنماں واقعے میں میرے والدین کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنا لیا اور اپنے تین بچوں کی طرح ہماری تربیت کی۔ حالانکہ وہ بھی کوئی آسودہ مال گھرانہ نہیں تھا۔ گاؤں ہی میں چھوٹی کبرئی رہتی تھی جنہوں نے بچپن ہی میں اپنی بیٹی غزالہ سے میرا رشتہ طے کر دیا تھا۔ چچا نے مجھے تعلیم دلائی، میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم

دوسری جانب سے رپورٹ ملی تو خوش ہو کر بولی۔ ”دیری گڈ! اسے اس طرح ٹریپ کریں کہ وہ زخمی نہ ہو۔“ سیون پر پہنچا کر مجھے مطلع کرنا۔ اوکے؟“

میری سانس میں سانس آئی۔ بد قسمتی سے کھالا جان بچانے کے لیے بھاگتا ہوا اُس گلی میں آن پہنچا تھا جو اُس کے لیے جو ہے دان ثابت ہونے والی تھی۔ میں نے ابھی تک میڈم کے تربیت یافتہ لوگ نہیں دیکھے تھے مگر اُس کے اعتماد اور چٹکی بجانے کی سی دیر میں سرانجام ہونے والے کارنامے دیکھ کر بہ آسانی اس کے کارندوں کی مشاقی اور غیر معمولی مستعدی کو تسلیم کیا جاسکتا تھا۔ اب میڈم بالکل نارل تھی۔ تفکرات کی پرچھائیاں عفتا تھیں اور اس کے خوب صورت چہرے کی فطری معصومیت لوٹ آئی تھی۔

اُس نے ٹیبل سائڈ پر لگے سوچ بورڈ میں نصب شدہ ایک بٹن کو پش کیا۔ چند لمحوں کے بعد، جو ملازم مجھے بلا کر یہاں لایا تھا، نے دروازے میں جھانکا اور مؤدبانہ انداز میں ”جی میڈم“ کہا۔

میڈم نے اُسے قریب بلایا اور کہا۔ ”اُسے ریٹائرنگ روم میں چھوڑ آؤ۔“ پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ”تم تھوڑی دیر کے لیے آرام کرو۔ کچھ لوگوں کی آمد کی بدولت میں بہت مصروف ہونے والی ہوں۔ فارغ ہو کر ریٹائرنگ روم میں آ جاؤ گی۔“

میں نے سر تسلیم خم کیا اور ملازم کے پیچھے چلتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ گیلری کے اختتام پر واقع آخری کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ فرنیچر سے عاری تھا اور نہایت دبیز قالین فرش پر بچھا ہوا تھا۔ آٹھ دس جوان العمر لوگ قالین پر براجمان تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ تین لڑکیاں فیک لگائے بیٹھی تھیں۔ میں نے طائرانہ نظر سے سبھی افراد کو دیکھا۔ ہر کوئی اپنی موج میں تھا۔ کوئی کتاب پڑھ رہا تھا، کوئی اخبار..... تو ایک ٹولی تاش کے بتوں سے دل بہلا رہی تھی۔

میں نے بہ آواز بلند ”السلام علیکم“ کہا تو مجھے دیکھ کر چونک جانے والوں کے استعجاب گیس چہروں پر مسکراہٹیں تیر گئیں۔ شاید اس محفل میں سلام لینے کا رواج نہیں تھا۔

ایک ساتویں سلونی سی لڑکی نے شوخی سے کہا۔ ”وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!“

دو تین دہائیوں میں اس کو نہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے میرے بارے میں مستفسر ہوتے، ملازم مجھے لیے کمرے کے اندر کھلنے والے ایک دروازے میں داخل ہو

”میڈم! یہ تو کھالا ہے، میرا جانی یار..... ہاں، ہاں!“

مجھے خود بھی احساس ہوا کہ میری آواز جذبات سے ملفوب ہو کر کچھ زیادہ ہی بلند ہو گئی تھی۔ میڈم چونکی، مجھے حیرانی بھری نظروں سے دیکھ کر بولی۔ ”کون کھالا؟“

میں جلدی سے اسکرین کے بہت زیادہ قریب ہو گیا۔ اسکرین پر کھالے کا سائڈ پوز نظر آ رہا تھا۔ میڈم نے ماؤس کی مدد سے ”ونڈو“ کا سائز بڑا کر دیا۔ اب کھالے کا چہرہ مائیکرو پوری اسکرین پر پھیلا ہوا تھا۔ مجھے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی، وہ میرا یار خالد لوہار عرف کھالا ہی تھا جو اس وقت کتوں میں گھرے ہوئے بھیڑیے کی طرح گھبرائے ہوئے انداز میں ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ننھا سا پستول بھی دبا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میں نے میڈم کو دیکھے بغیر کہا۔ ”بالکل وہی، جس کے ساتھ میں نور پور سے ملتان آیا تھا۔ وہ، جس نے مولی کو پارک کے باہر گولی مار دی تھی..... مگر یہ ان لوگوں کے ساتھ کیوں یہاں آیا؟“

میری بات ختم ہوئی۔ میڈم کی طرف سے کوئی رد عمل نہ آیا کر میں نے اُسے دیکھا۔ وہ بڑے اشتیاق سے مجھے گھور رہی تھی۔ مسکرائی اور بولی۔ ”واٹ آنیچرل ری ایکشن..... سچ کہتے ہیں، دیہاتی لوگوں کے من میں کوئی کھوٹ نہیں ہوتی۔“

میں نے جھینپ کر نظریں اُٹھائیں۔ میرے من میں کھوٹ تھا، نہیں تھا، مجھے کوئی سروکار نہیں تھی۔ میرا ذہن تو برقی رفتاری سے کھالے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ عافیت یہ تھی کہ وہ زندہ اور باخیریت تھا۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ وہ خطرناک کریمنل گینگ میں شامل ہو کر میڈم پر حملہ کرنے کے جرم کا ارتکاب کر چکا تھا۔ اس کے سر پر منڈلاتے ہوئے موت کے آسیب مجھے آنے والے واحد میں دکھائی دے گئے جبکہ اپنی جانب آتی ہوئی کرب ناک موت نظر نہیں آ رہی تھی۔

میڈم نے میری اُدھیڑ بن میں ہی کسی وقت کیسرا بدل دیا۔ منظر بدل گیا۔ کھالا اوجھل ہو گیا۔ اُسے ہمیشہ کے لیے اوجھل نہیں ہونا چاہیے، یہ سوچ کر میں نے مؤدبانہ لہجے میں میڈم سے کہا۔ ”میڈم! کھالے کو موت روکیں۔ اُسے زندہ واپس جانے دیں۔ رابطہ ہونے پر اُسے سمجھا دوں گا، وہ آئندہ آپ کے سامنے نہیں آئے گا۔“

وہ چند لمحوں تک مجھے دیکھتی رہی پھر مسکرا کر فون پر کسی کو ہدایات دینے لگی۔ ”کیا تم لوگوں نے اُسے ٹریپ کر لیا ہے؟“

مہدے پر فائز رہا اور تھیاروں کے استعمال و دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر اس کے بعد میں نور پور واپس آ گیا۔ گاؤں میں دوستوں میں امیرنوا بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نہر دار حیات خان کا بیٹا تھا۔ میں ان کے حسابات کی فکری گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرتا تھا میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی وکیل چلاتا تھا اور سواریاں لے کر قریشی موڑ تک جاتا تھا، اسی نے مجھے ڈرائیونگ سکھائی تھی جبکہ تیسرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹری حیثیت سے تعینات تھے گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی کیونکہ اس سے پہلے کوئی ڈاکٹر زیادہ مرے گاؤں میں نہیں ٹھہرتا تھا۔ میں زیادہ وقت ان کی صحبت میں گزارتا تھا۔ وہ ایک سلجھے ہوئے عقل مند مگر کچھ قوی انسان تھے لیکن نڈر اور بہادر۔ میں ان سے عملی تربیت بھی حاصل کر رہا تھا اور ساتھ ہی چھوٹے بڑے کام کر دیا کرتا اس کے علاوہ مجھے ان کے ہاں سے کتابیں بھی پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔ ایک درزی مراد بخش دیوانہ سے بھی دوستی تھی جو کہ شاعر بھی تھا اور اس کے دروہرے دو ہڑے کافی اثر رکھتے تھے۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان جو کہ ایک سیاسی لیڈر تھا اور حیات خان کا سرپرست بھی تھا، کی بیٹی اس کے مطلقہ عشق میں مبتلا ہو گیا اور اپنی فلی کیفیت کا مجھ سے اظہار کیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا اور اپنے عشق کی روداد سے مجھے آگاہ کرتا رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نہر دار حیات خان کے علاوہ اس کا کزن دریا خان اور اس کا بھائی سردار بخت خان بھی تھا جو سب سے الگ تھلک رہتا تھا۔ دریا خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اس کی طبیعت خراب ہوئی تو ہر کارہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ مریض کو اسپتال لایا جائے جس پر دریا خان سخت چراغ ہوا اور اس کی حکامدانہ ناکوخت ٹھیس پکٹی۔ چونکہ وہ ایک متمم مزاج شخص تھا اس لیے مجھے خدشہ تھا کہ وہ کوئی انتقامی سازش ضرور کرے گا جو کہ شاہ جی کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے کھالے سے مشورہ کیا اور ہم دونوں نے شاہ جی کی رہائش گاہ کی گمرانی کی لیکن شاہ جی بھی غافل نہیں تھا انہوں نے پیش بندی کر رکھی تھی، یہ سازش ناکام ہوئی جس میں بخت خان معاون ثابت ہوا۔ اس کے بعد میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا۔ اس تمام واقعات کے تناظر میں دریا خان نے شاہ جی سے میری حمایت پر مجھے سرزنش کی لیکن میں نے بھی انہیں صاف لفظوں میں جواب دے دیا جس پر انہوں نے میری بہت بے عزتی کی۔ میں نے سوچا کہ حیات خان سے ان کی شکایت کروں گا لیکن انہوں نے دریا خان کی سائنڈلی اور مجھے سخت ستائیں یہاں تک کہ مجھے تھوڑا مار دیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ میں شاہ جی کی صحبت چھوڑ دوں۔ گاؤں کے ماسٹر جی کی بیٹی جس کے پیر میں تنگ تھا اور وہ شاہ جی کے زیر علاج رہی تھی، ان کے عشق میں مبتلا ہو گئی اور جب ماسٹر جی اس کا رشتہ لے کر شاہ جی کے پاس آئے تو شاہ جی نے انہیں سخت ستا کر انکار کر دیا۔ پھر ریناں نے ایک خط جو اس نے شاہ جی کو لکھا تھا مجھے دیا۔ میں نے شاہ جی کو وہ خط دے دیا لیکن شاہ جی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ شاہ کے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف کا ایک رقعہ کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ جو کہ انہی جوانی کی خطرناک عمر سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہار الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب گرا تو پیچھے رکھے صندوق کی ٹوک میری ریزہ کی ہڈی میں چھبی اور میرا سارا جسم مفلوج ہو گیا۔ اسی دوران کھالا بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو مجھ پر چڑھ دوڑا۔ میں مدافعت میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے میرے جسم کو خنجر کے ذریعے زخمی کر دیا اور آخری وار کرنا چاہتا تھا کہ اسے میری حالت کا احساس ہوا اور وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا جہاں میرا کچھ مرے علاج ہوا۔ سارے گاؤں میں یہ خبر دوڑ گئی، سب کھالے پر لعن طعن کر رہے تھے اور وہ پشیمان تھا کہ میں نے اسے معاف کر دیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیکس جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد اور سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا اور یہ کام سونپا کہ ہم اس کی جاسوسی کریں۔ سائیکس کا پینڈول جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ بخت خان نے ہی مجھے معقول معاوضے پر اپنی بیٹی ملکہ کو پڑھانے پر مامور کر لیا۔ یہ معاملات جاری تھے کہ کھالے نے بتایا کہ اس نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔ ہم دونوں وہاں پہنچے تو اساد ہاں موجود تھی کھالے نے مجھے وہیں رکے کو کہا اور خود اس سے ملنے چلا گیا اسی دوران لمبے بالوں والا ہیر وٹا سب لوگوں کو جان و ہاں آ گیا اور ان لوگوں کے درمیان کسی بات پر بحث شروع ہو گئی جو لڑائی میں تبدیل ہو گئی یہ معاملہ اتنا بڑھا کہ معاملہ خون خراشے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران کھالے کے ہاتھوں اس نوجوان مولی کا کل ہو گیا۔ کھالا تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن مجھے خبر نہیں تھی کہ وہ زخمی ہے یا نہیں، بہر حال میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھانے پہنچا دیا گیا جہاں میری ملاقات مخصوص لب ولہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میر شاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑوالے گی اور ہوا بھی یہی، میڈم ٹھیکہ نے مجھے چھڑوالیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم ٹھیکہ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر و رسوخ بہت تھا۔ میں نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی وہ نور پور کے حالات سے بھی واقف تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کر لیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر نور پور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منتظر تھا۔ چاچی نے روتے ہوئے بتایا کہ پردین غائب ہے۔ میری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔ کھالا بھی لاپتا تھا، ایسے میں دیوانے نے مجھے دلاسا دیا اور امیرنواز پر فک کا اظہار کیا کیونکہ وہ بھی غائب تھا۔ میں میڈم ٹھیکہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ میڈم نے مجھ سے کہا کہ اس سلسلے میں دل جیت بتا سکتا ہے اور یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں اس سے کس طرح اگلوں ہوں۔ میر شاہ نے مجھے ہتھیار فراہم کیے اور میں زمانہ طالب علمی کی ٹرینگ آ زمانے کے لیے دل جیت کے ٹھکانے پر پہنچ گیا لیکن وہ بہت سخت جان ثابت ہوا۔ میں نے اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا اور فل کانٹان مٹانے کے لیے اس کی لاش کو ڈیرے پر جلاؤ والا۔ دل جیت کے انکشاف کے مطابق پردین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ لیکن اس تمام مرحلے میں، میں اپنے والدین کے قتل کو نہیں بھولا تھا۔ شاہ جی کے مطابق اس کے ڈانڈے میری تھمال شاہ جمال میں تھے لیکن مجھے یقین نہیں تھا۔ میڈم کے اڈے پر میری ملاقات سونیانا لڑکی سے ہوئی جس نے مجھے میڈم کے متعلق منفی اطلاعات فراہم کیں لیکن میں یہ ماننے پر تیار نہیں تھا۔ سونیانا نے بتایا کہ وہ مجھے ایک چیز دکھانا چاہتی ہے اور اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہاں ایک لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو چونک گیا، وہ اساتھی، سردار حیدر خان کی بیٹی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا اور مختلف محاذوں پر اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگی کہ اسے اطلاع ملی کہ اڈے پر حملہ ہو گیا ہے۔ میں اس سے ملنے پہنچا تو وہ کپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ اس کے چہرے کا رخ جب واضح ہوا تو میں اسے دیکھ کر شدت سے چونک اٹھا۔

گیا۔ یہ آٹھ ضرب دس فٹ سائز کا بکس نما کمر تھا جس میں آرام کرنے کے جملہ لوازمات موجود تھے۔ میں سنگل بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ملازم نے دروازے کے قریب نصب شدہ سوچ بورڈ پر چند بٹن پیش کیے۔ روشنی پھیل گئی۔ پھر اُس نے مودبانہ انداز میں کہا: ”یہاں کوئی آپ کو ڈسٹرب نہیں کرے گا، آرام کریں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ بٹن دبا دیجئے گا۔“ اُس نے انگلی کے اشارے سے سوچ بورڈ میں نصب ایک سوچ کی نشاندہی کی اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی متصلہ بڑے کمرے سے آتی ہوئی ملی جلی آوازیں ایک دم معدوم ہو گئیں۔ یہ بکس نما کمر اٹھل طور پر ساؤنڈ پروف تھا۔

میں نے کمرے کا بغور جائزہ لیا۔۔۔۔۔ چھوٹا سا کمر اپنے اندر تمام تر جاذبیت رکھتا تھا۔ لی وی، پورٹیل فریج، آرام دہ کرسی، چھوٹی سی ٹیبل میز اور انیچڈ ہاتھ..... سمجھ میں آنے والی بیسیوں چیزوں کے درمیان ایک نہ سمجھ میں آنے والی چیز بھی دکھائی دی۔ کمرے کی عقبی دیوار پر بڑا سا سوچ ٹیبل نصب تھا۔ اس قدم آدم جیم ٹیبل پر اُن گنت سوچ، لیور اور ایک چودہ انچ کی روشن اسکرین موجود تھی۔ اسکرین پر ایک گیلری کا خاموش اور ٹھہرا ہوا منظر روشن تھا۔

میں تھکا ہوا نہیں تھا مگر فراغت کے سبب موٹے فوم والے بیڈ پر دراز ہو گیا۔ میری آنکھیں بند تھیں لی وی کی سیاہ اسکرین کے عین وسط میں نظر آنے والے روشن بلب کے چمکدار عکس پر مرکوز ہو گئی اور سوچوں کی وسیع بساط سج گئی۔ میڈم، عورت کا نہیں، کسی نہ سمجھ میں آنے والے گورکھ دھندے کا نام تھا۔ کسی لمبی اور محتاط منصوبہ بندی کے بغیر میں سائیں دل جیت شاہ کو اُس کے انجام تک پہنچا کر نور پور سے نکلا تو اپنی جنم بھومی سے کٹ کر رہ گیا۔ خبر نہیں تھی کہ میرے بعد وہاں کیا حالات جنم پذیر ہوئے تھے۔ قتل جیسے بھیانک جرم کا ارتکاب کرنے کے بعد بھی پروین تاحال میری دسترس سے دور تھی۔ ابھی یہ بھی طے نہیں ہوا تھا کہ وہ سردار حیدر خان کے پاس تھی، یا دل جیت نے مجھے چمکے دیا تھا۔ ابھی یہ یقین نہیں تھا کہ میڈم سردار حیدر خان کے چنگل سے میری پروین کو نکال لینے میں کامیاب ہو پائے گی یا نہیں.....

کھالے کے بارے دل فکر مند رہتا تھا، اب کچھ دلاسا ملا تھا۔ شکر تھا کہ وہ یا خیریت نظر آ گیا۔ میڈم نے بظاہر میری درخواست مان لی تھی، خدا جانے اُس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والی تھی۔ ایک اور سوال میرے ذہن میں سانپ کی طرح پھیلانے بیٹھا تھا کہ امیر نواز کہاں گیا تھا؟ اگر

پروین کے ساتھ آنے والے حالات و واقعات کے پیچھے اُس کی ذات کا رفرمانہ نہیں تھی تو پھر اس کی نور پور سے عین موقع پر عدم موجودگی کو کیا نام دیا جاسکتا تھا؟ میرے بعد ڈاکٹر شاہ جی اور بخت خان کن حالات سے گزر رہے تھے؟ یہ ایک وقت پانچ افراد، سائیں دل جیت شاہ، امیر نواز، کھالا، میں اور میری بہن پروین، کے نور پور کے منظر نامے سے اوچھل ہونے پر لوگوں کا رد عمل کیا تھا؟

میڈم کے بقول، کوٹھی پر حملہ آور ہونے والا جتھہ کسی استاد بھونامی بد معاش کا بھیجا ہوا تھا، تو سوچنے کی بات یہ تھی کہ کھالے کی رسائی استاد بھونامی کیسے ہوئی؟ موٹی کوٹھل کرنے کے بعد کون سے واقعات رونما ہوئے تھے جو اُسے ہانک کر جرائم کی دنیا میں لے گئے تھے؟ کیا وہ میری طرح جان بچانے کے ترزد میں تھا؟ یا کوئی اور بات تھی..... مجھے ایک لمحے کو شک گزرا، کہیں وہ پہلے سے ہی اس گینگ میں شامل تو نہیں تھا کیونکہ اُس کی دیدہ دلیریاں اور پھرتیاں معمولی نوعیت کی نہیں ہوا کرتی تھیں۔

کچھ دیر پہلے میڈم نے عجیب انداز کی دفاعی حکمت عملی اختیار کی تھی۔ گھنٹیں کا اندھوں پر اٹھا کر آنے والوں کو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ ڈنکے کی چوٹ پر آنے والے قانون کے ہاتھوں میں دو لاشیں، میڈم کے حوالے ایک جیٹا جاکتا ہرکارہ گروی رکھنے کے بعد شرمناک انداز میں پسپائی اختیار کرنے کے بعد ڈم دبا کر بھاگ چکے تھے۔ میڈم نے ڈنک لگے نہ پھٹکری، رنگ بھی جو کھا آئے، کا کامیاب طریقہ اپنایا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ پولیس بھی بھی مخالف گروپ پر فائر نہیں دے گی جب تک پولیس کا کوئی آفیسر زخمی یا ہلاک نہیں ہوگا۔ تبھی اُس نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے پولیس پر فائر داغ دیا تھا جس کے بعد پولیس کے مفادات پس پشت چلے گئے تھے اور کاغذی جنگ کی دستاویز پر جذباتی رنگ غالب آیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کھالے کی نسبت کسی بڑے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ میڈم چہرے مہرے سے بڑی نرم، عام مزاج کی خوب صورت اور معصوم سیرت لڑکی دکھائی دیتی تھی مگر حقیقت میں وہ ایسی نہیں تھی۔ اتنا نرم خور انسان کس طرح اتنی بڑی اور خون خوار فورس کو قابو میں رکھ سکتا ہے؟

میں اپنے تئیں عام شکل و صورت والا شخص تھا۔ میرے پاس کوئی اضافی خوبی نہیں تھی۔ نہ جانے کیا دھن تھا، جس کے بارے میں مجھے معلوم نہیں تھا، مگر وہ میڈم کے نزدیک بہت اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ جتنی اہمیت وہ مجھے دینے لگی تھی، وہ میرے نزدیک ناقابل یقین نہیں تھی۔ میرا شاہ کے بقول وہ

مجھ پر ریشہ خلی ہو گئی تھی۔ دل نہیں مانتا تھا کیونکہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے میں نے خود سے کہیں زیادہ خوب رو اور اسٹارٹ مردوں کو قاتلین پر بیٹھے دیکھا تھا۔ ویسے بھی، جتنی دولت اُس کے پاس موجود تھی، جتنے اختیارات اس کی شخصیت کا خاصہ بن چکے تھے، وہ دنیا کے خوب سے خوب رو جوان کو زیر دام لا سکتی تھی۔ کہیں وہ مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہی تھی؟ کہیں وہ مجھ سے کوئی ایسا خطرناک کام لینے والی تو نہیں تھی جس میں کسی اور کو جھوٹا نہ چاہتی ہو؟.....

انسانی ذہن بھی عجیب احتیاجی رویوں کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ میرے چاروں طرف تفکرات، اندیشے اور دہشت کے پھن پھیلانے ناگ پھنکار رہے تھے۔ میرا مستقبل داؤ پر لگا ہوا تھا۔ زندگی کا واحد خوشی رشتہ جان کنی کے عالم میں کہیں ٹرپ رہا تھا اور میں اُس تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایسے میں مجھے کھالے، امیر نواز اور مراد بخش دیوانے کی یادیں ستانے لگی تھیں۔ ہم نے زندگی کے بھرپور لمحات باہم گزارے تھے۔ میرے نیم سوختہ لبوں پر ایک عجیب طمانیت آمیز مسکراہٹ تیر گئی۔ زندگی کی ایک یاد نے اچانک مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

یہ کوئی دو سال پہلے کی بات تھی کہ ایک شام مراد بخش دیوانہ تیز تیز چلتا ہوا ہمارے پاس آیا تھا۔ ہم پانچ چھ لڑکے اس وقت نور پور کی اکلوتی کرکٹ کی بیچ پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ دیوانے کی غیر متوقع آمد پر چونک کر متوجہ ہوئے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا اشتہار اور سفید رنگ کا لفافہ پکڑا ہوا تھا۔

کھالے نے دبے دبے لفظوں میں کہا: ”آج خیر نہیں لگتی، لگتا ہے کسی نے دنگل پر مدعو کیا ہے دیوانے کو!“ چونکہ دیوانہ لاغر پن کی حد تک ڈبلا پتلا اور کمزور تھا، اس لیے سبھی لڑکے کھالے کی بات سن کر ایک دم ہنس پڑے۔ دیوانے نے تاڑ لیا، دور سے ہی ہاتھ لہرا کر بولا: ”میں کھیلنے کے لیے گراؤنڈ میں نہیں آیا بلکہ ایک خاص کام سے آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں۔“

ہم خاموش ہو گئے۔ اُس نے ہمارے دائرہ نما حلقے میں اپنی جگہ بنا لی اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ہم سب استغہامیہ نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگے۔ اُس نے گردن اکڑا کر سبھی کو باری باری ایک نظر دیکھا، اشتہار کو پھیلا کر بیچ پر بچھایا اور بولا: ”محمود کوٹ میں کل شام کو بہت بڑا مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ ملتان، میانوالی، بھکر، جھنگ..... پتا نہیں کہاں کہاں سے شاعر منگوائے جا رہے ہیں۔ یہ اشتہار دیکھو:“

چارپائی کے جتنا تو ہے۔“

ہم نے اشتہار پر ایک نظر ڈالی۔ کھالا اُکھا کر بولا: ”وہ تو ٹھیک ہے مگر ہم کیا کریں؟“

”آپ لوگ میرے ساتھ وہاں چلیں۔“ مراد بخش دیوانہ کی گردن پھرا کر گئی۔

ایک لڑکا بولا: ”ہم وہاں جھک ماریں گے، کیا کریں گے؟ بول ناں!“

دوسرا منہ بنا کر بولا: ”پچھلے سال تمہارے ساتھ گیا تھا۔ ساری رات ہانگوں کی طرح بیٹھا رہا۔ نہ جائے، نہ پانی..... اور تو اور..... کہیں سے ایک ڈبیا کے ٹوٹلٹر سگریٹ کی ٹپیں ملی تھی۔ ہمیں معاف ہی رکھو شاعر صاحب!“

”دھت تیرے کی!“ دیوانے نے آنکھیں دکھائیں۔ ”سب کھلایا پلایا حرام کر دیا تو نے کم بخت انسان!“

”کم بخت“ قرار پانے والا لڑکا پھر گیا۔ ضد کرنے لگا کہ محفل میں کھل کر بتایا جائے کہ اُسے کیا کچھ کھلایا پلایا گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اُس کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور دیوانے کی جان چھوٹی۔ میں نے دیوانے سے پوچھا: ”وہاں کیا خاص بات ہوگی؟“

مراد بخش دیوانہ نے بڑی لے دے کے بعد قدرے شرماتے ہوئے اپنا مدعیان کیا: ”دراصل وہاں بڑے اعلیٰ پائے کے استاد شاعر اپنا اپنا کلام پڑھیں گے۔ مجھے بھی دعوت کلام دی گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب لوگ میرے ساتھ جائیں اور جب میں اپنے دو بڑے سناؤں، آپ لوگ خوب کھل کر داد دیں۔ آپ لوگوں کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی تالیاں بجانے لگیں گے۔“ ساتھ ہی اس نے موقف کے پھیکے پن پر روایت کا شہد اندیلا۔ ”یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ سبھی شاعر ایسا ہی کرتے ہیں۔ خاص کر، استاد شاعروں کے ساتھ تو شاعر دوں کی فوج ظفر موج ہوتی ہے جو اچھل اچھل کر داد و تحسین کے جھوٹے ڈھول پیٹ دیتی ہے۔“

ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سمجھ میں آنے لگا کہ اپنے نور پور کے شاعر کی عزت کا سوال ہے۔ کافی بحث کے بعد دیوانے کے حق میں فیصلہ سنا دیا گیا اور گفت و شنید کے بعد یہ بھی طے پا گیا کہ دیوانہ بہ طور رشوت، محمود کوٹ پہنچے ہی ہمیں مٹھائی اور دودھ پتی پلائے گا۔ جو لڑکے سگریٹ نوش تھے، انہیں سگریٹ خرید کر دے گا۔ دیوانے نے ہماری تمام جائز و ناجائز شرائط پر سر تسلیم خم کیا۔

”لیکن پیارے“

تھا؟ کیا پروین کے ساتھ پیش آنے والے اس غیرت پاش واقعے کی تمام تر ڈوریں اُس کے ہاتھ میں تھیں؟ یہ بعید نہیں تھا کہ اُس کی خواہش پر سردار حیدر خان اور سائیکس دل جیت شاہ نے میرے گھر میں نقب لگائی ہو۔ امیر نواز اور ہمارے گھرانے میں بہت بڑی معاشی خلیج حائل تھی۔ اس نے اپنے گھر میں پروین سے شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہوا اور اُس کا باپ حیات خان اُس کی فرمائش پوری کرنے پر تیار نہ ہو، یہ بھی ممکن تھا کہ پروین نے کسی موقع پر اُس کی حوصلہ شکنی کی ہو..... میرا سر پھٹنے کو آگیا۔ ریشم الجھ کر کانٹوں کی شکل اختیار کر گیا تھا اور میری انگلیوں کو زخمی لگا تھا۔

عجیب طرح کی تھکن رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ اضطرابی کیفیت کو مندل کرنے کے لیے ریٹائرنگ روم سے نکلا۔ بڑا کرا خالی تھا۔ کبھی رخصت ہو چکے تھے۔ شاید کوٹھی کے حالات ٹھیک ہو گئے تھے۔ میڈم کے کمرے میں جھانکا۔ وہ بھی غائب تھی۔ سونیا کا کمرہ آباد تھا۔ وہ سونے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے براجمان تھی۔ گود میں بڑے سائز کا فیشن میگزین کھلا ہوا تھا اور وہ پورے انہماک سے مطالعے میں غرقاں تھی۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر مسکرائی اور میگزین سونے پر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے کمرے کے اکلوتے بیڈ پر ہنوز دنیا و مافیہا سے غافل لیٹی اسما کو دیکھا اور قدم بڑھا کر سونیا کے قریب آ گیا۔ ”سونیا! یہ جب سے یہاں آئی ہے، بے ہوش پڑی ہے۔ کوئی انجکشن دے رکھا ہے؟ کیا؟“

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا۔ ”کس نے؟“

وہ بولی۔ ”میں نے، میں یہاں آنے سے پہلے اسپتال میں زنگ کیا کرتی تھی۔“

”اسے کچھ کھلایا یا پلا یا بھی ہے؟“

”ہاں..... جب ہوش میں آتی ہے تو گلوکز پلائی ہوں۔ اس کے لئے سیدھے سوالوں کے جواب دیتی ہوں اور پھر ٹیکا لگا دیتی ہوں۔“ وہ میرے قریب سونے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں اس کی فکر کیوں ہے؟“

میں نے فوراً کہا۔ ”مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ اُسے جب بھی دیکھا، زندگی اور موت کے درمیان معلق دیکھا۔ کبھی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھ لیا۔“

وہ کھسک کر میرے قریب آ گئی۔ اُس کے وجود اور لباس سے پھوٹی ہوئی مہو کن خوشبو میرے قلب و دماغ کے گرد اپنا جوار کھینچنے لگی۔ وہ آنکھوں میں عجیب سا تاثر مترشح

دیوانے کی گردن اکڑ گئی اور کان سرخ ہو گئے۔ کھالا اُس کی دکان سے نکلا تو بھڑکا ہوا تھا۔ اُس کی شیطانی کھوپڑی نے فوراً ہی پلان بنالیا۔ دو چار دنوں کے بعد، ایک شام علم وین پٹواری سردار حیات خان کے دارے پر فریاد کناں تھا۔ اُس نے تین عدد دکان خان کی جھولی میں بیچ دیے۔ ”یہ دیکھیں خان جی! وہ منحوس شاعر، وہ کانگریسی عاشق، میرے گھر میں رقعے پھینکتا ہے۔ دیکھیں! آپ نے ڈھیل دے رکھی ہے اُسے ورنہ اُس کیسے کی اتنی جرأت کہاں کہ وہ میری بیٹی کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے۔“

خان بھونچکا رہ گیا۔ فوری طور پر تحقیقات کا حکم صادر کر دیا۔ پھر مجھے بلا گیا اور کاغذ دکھا کر پوچھا گیا کہ یہ کس کی تحریر ہے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ دیوانہ کھالے کو اپنے دوہڑے لکھ کر دیا کرتا تھا اور دونوں کے تعلقات ان دنوں کشیدہ ہیں، ورنہ میں کچھ نہ کچھ ڈنڈی ضرور مار لیتا۔

لکیر دار کاپی کے تینوں اوراق پر بھر و ناامیدی کے جذبات سے پُر سرائیکی دوہڑے لکھے ہوئے تھے۔ آخری مصرعوں میں دیوانہ کے لفظ کے اوپر ’مخلص‘ والی لڑکھی بالخصوص موجود تھی۔ میں نے فیصلہ سنایا کہ یہ مراد بخش دیوانے درزی کے ہاتھ کی ہی لکھائی ہے۔

نور پور میں ہا ہا کار مچ گئی۔ دیوانے کو مجرموں کی طرح پھانسی میں پیش کیا گیا اور اُس پر فرد جرم عائد کر دی گئی۔ اُس نے لاکھ منت سماجت کی، تمسکین کھائیں اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے صفائیاں پیش کیں مگر اُس کی ایک نہیں سنی گئی۔ جب خاصی درگت بن چکی، تب اُس کے چودہ طبق روشن ہوئے اور وہ پھوٹ پڑا۔ ”یہ دوہڑے تو میں نے کھالے استاد کو لکھ کر دیے تھے۔ مجھے نہیں پتا کہ چاچے علم دین کے گھر کیسے پہنچے؟“

کھالے کو بھی طلب کر لیا گیا۔ مجھے اُس کی شکل دیکھتے ہی پتا چل گیا کہ یہ حرامزدگی اُسی نے کی تھی۔ کھالے نے دیوانے کو جھوٹا قرار دیتے ہوئے اپنی جان تو چھڑا لی مگر میری طرح حیات خان نے بھی تاڑ لیا تھا۔ اُس نے سخت ست کہہ کر دیوانے کو بھگا دیا۔ کوئی ایک مہینے بعد امیر نواز کی مخلصانہ کوششوں کے نتیجے میں دونوں کی ’صلح‘ ہوئی اور تعلقات معمول پر آئے۔

میں ریٹائرنگ روم کے بیڈ پر، دونوں ہاتھ گردن تلے رکھے، ٹی وی اسکرین میں بلب کے روشن عکس کو گھور رہا تھا اور کھالے اور امیر نواز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُس کے کردار کا تعین کرنا بہت مشکل تھا۔ کیا وہ سردار حیدر خان کا ہمراہ

تھے۔ وہ ہمیں مطمئن اور چاک چوبند رکھنے کے لیے بار بار یہ نقطہ سمجھا رہا تھا کہ بڑے شعرا کو سب سے آخر میں پڑھایا جاتا ہے۔ یہ اعلیٰ درجے کے مشاعروں کا بنیادی اصول ہے، وغیرہ وغیرہ۔ سب سے آخری شاعر بھی اپنا کلام سنا کر اسٹیج سے اتر گیا اور مقامی ایم پی اے، جو مشاعرے کی صدارت کر رہا تھا، الوداعی خطاب کرنے لگا۔ پھر وہ بھی ڈاکس سے اتر گیا اور سامعین پنڈال چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔

ہم بھی بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔ دیوانے کا برا حال تھا۔ ہمیں یا اپنے دل کو سمجھانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ”میرا خیال ہے کہ اسٹیج سیکرٹری میرا نام لسٹ میں لکھنا ہی بھول گیا تھا۔“

اس تاویل کو کارگر خیال نہ کرتے ہوئے اس نے پانسہ پلٹا، بولا۔ ”قریشی چوک والا مجید احقر تو ایک نمبر کا دشمن ہے میرا۔ وہ مجھ سے پہلے یہاں پہنچا ہوا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اُسی نے حرامزدگی کر کے میرا نام کٹوا دیا ہے۔“

کھالا اور فریدن بڑے مشتعل تھے۔ پنڈال خالی ہو گیا تو دونوں نے دیوانے کو بازوؤں سے پکڑ لیا اور گھسیٹ کر باہر لے آئے۔ راستہ چکنی مٹی کی دھول سے بری طرح آٹا ہوا تھا۔ ہم سب نے دیوانے کو اُس دھول میں دوڑتک گھسیٹا، ہنسی مذاق میں اُس کی خاصی درگت بنا کی اور ”الو کا پٹھا“ بنا کر نور پور لائے۔ اُس دن کے بعد وہ کسی بھی مشاعرے میں ہمیں یا نور پور کے کسی بھی آدمی کو اپنے ساتھ لے کر نہیں گیا۔ گاؤں میں ہمارے تبصروں اور چغلیوں نے اُس کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا کر رکھ دی تھی۔

اُس نے کھالے کو یہ رعایت دے رکھی تھی کہ وہ جب چاہتا، گھر وندے پر آ کر دوہڑے مایے سن سکتا تھا۔ کھالے کی پسند کا دوہڑا کاغذ پر لکھ کر پیش بھی کر دیتا تھا۔ اس کے بدلے میں کھالا بغیر کرایہ لیے اسے قریشی موڑ تک لے جاتا تھا اور مفت واپس بھی لے آتا تھا۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ مراد بخش دیوانہ کالر، بکرم اور مٹن وغیرہ خریدنے کے لیے قریشی موڑ جایا کرتا تھا۔

دیوانے نے سودوزیاں کا حساب کئے بغیر مشاعرے سے لوٹتے ہی کھالے کو اپنی دکان پر بلا کر کہہ دیا۔ ”دیکھ بھئی کھالے استاد! آج سے تیری میری یاری ختم۔ آئندہ تم میرے پاس دوہڑے مایے سننے کے لیے نہیں آؤ گے۔“

کھالے نے جل بھن کر کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ تم بھی کرایہ جیب میں ڈال کر دیکھن پر چڑھو گے۔ اور ہاں! آئندہ میرے ہاتھ یہ بیٹی کالر وغیرہ بنگلوانے کی کوشش بھی نہ کرنا۔“

دیوانے متانے! یہ دھیان رکھنا کہ اسٹیج پر چڑھ کر گردن نہ اکڑانا ورنہ ہم دیدار کے بغیر جوتے بچھڑ جائیں گے۔“

محفصل گل و گلزار بن گئی۔ دیوانہ جھینپ کر بولا۔ ”یار! میں کوئی جان بوجھ کے تھوڑا اکڑاتا ہوں۔ خدا نے کوئی ایسا سر یافت کر رکھا ہے کہ جو نبی کوئی مزے کی بات ہوتی ہے، گردن خود بہ خود اکڑ جاتی ہے۔“

”اصل بات یہ ہے ہمارے شاعر کی ہڈیوں پر ماس کی مقدار بہت تھوڑی ہے۔ ہڈیاں قابو میں نہیں رہتیں اور موقع بے موقع اینٹھ جاتی ہیں۔“ کسی نے توجیہ پیش کی۔

اُس شام دیوانے سے ہم نے بہت سے قیمتی دوہڑے اور غمگین اشعار سنے۔ سینکڑوں مرتبہ کے سنائے ہوئے ’تازہ دوہڑوں‘ کو بھی سنا اور دیوانے کا دل رکھنے کو داد سے نوازا۔

دیوانے کے کرایے خرچے پر ہم سب مقررہ شام کو سات بجے محمود کوٹ میں قدم رنجہ ہوئے۔ میرے اور کھالے کے علاوہ کسی کو بھی اس مشاعرے سے غرض نہیں تھی۔ ہم صرف نور پور کے اکلوتے شاعر کی شان و شوکت بڑھانے اور کھانے پینے کی غرض سے یہاں آئے تھے۔

اُس نے ہماری شرائط پوری کیں اور ہوٹل پر بٹھا کر خوب عیاشی کرائی۔ سگریٹ کے کئی پیکٹ خرید کر بلا امتیاز بانٹے اور زریں ہدایات سے نوازا۔ ”تم لوگوں نے پنڈال میں الگ الگ جگہوں پر بیٹھنا ہے۔ میرا دوہڑا ختم ہوتے ہی کھڑے ہو کر، ہاتھ لہرا لہرا کر مقرر، مقرر کے نعرے لگانے ہیں اور خبردار! کوئی آدمی منے گا نہیں ورنہ میرا موٹن ٹوٹ جائے گا۔“

مشاعرہ کے لیے سجائی سنواری گئی جگہ پر جاتے ہوئے بھی وہ اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتا رہا اور ہم ہر ہدایت پر سر خم کرتے رہے۔ وہاں پہنچنے پر انسانوں کا ہجوم دیکھنے کو ملا۔ بہت اچھے انتظامات کیے گئے تھے۔ ہمیں بہ مشکل بیٹھنے کی جگہ میسر آئی۔ عید ملن مشاعرے کے منتظمین نے جنوبی پنجاب بھر کے شعرا کو اکٹھا کر رکھا تھا۔ باقاعدہ آغاز ہونے پر شعراء اسٹیج پر باری باری آنے لگے اور اپنا کلام پیش کرنے لگے۔ چونکہ حاضرین کی غالب اکثریت سرائیکی تھی، اس لیے سرائیکی کلام پیش کرنے والوں کو داخل رہی تھی۔ دیوانے نے بھی عوامی رجحان کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ صادر کیا۔ ”میں بھی بس سرائیکی شاعری ہی پیش کروں گا۔ اردو کا ماحول نہیں بن رہا۔“

ہم نے تائید کی۔ رات کا ایک بج گیا، پھر دو..... پھر چار بج گئے مگر اسٹیج سیکرٹری نے مراد بخش دیوانے کا نام نہیں پکارا۔ ہم بری طرح جھک چکے تھے اور جھانپناں لے رہے تھے۔

سونیا نے جھٹ کہا۔ ”اس کا نام اکبر عدیل ہے، تھانہ حرم گیٹ میں انسپکٹر ہے۔“

”یہ یہاں کیوں آیا ہے؟“ اس کے لہجے میں خوف سمٹ گیا اور میری جانب انگلی کا اشارہ کر کے بولی۔ ”مگر اس کی شکل خالد کے دوست شہر یار سے کیوں ملتی جلتی ہے؟“

میں نے سونیا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میں نے گشت پر نکلتا ہے، پھر کسی وقت چکر لگاؤں گا۔ کیا یہ لڑکی ایب نارل ہے؟“

میں نے اپنی آواز میں ہمدردی کی دبیز چادر پھیلا دی۔ سونیا نے کہا۔ ”نہیں۔ ہے تو نارل ہی، مگر کافی دیر تک بے ہوش پڑی رہی ہے۔ حواس بحال ہونے میں کچھ دیر لگے گی۔“

میں نے ایک بھانک غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ گھبراہٹ کے عالم میں ارد گرد دیکھتے بغیر تیر کی طرح ریٹائرنگ روم میں آیا۔ یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا کہ میڈم اسی بیڈ پر نیم دراز تھی جس پر تھوڑی دیر پہلے میں لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دروازے میں دیکھ کر وہ ایڑیوں کے بل تھوڑا اوپر کھسکی اور بیڈ کے عقبی تختے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”میڈم! ڈسٹرب کرنے پر معذرت چاہوں گا، وہ دراصل.....“

”کہاں گئے تھے؟“ اُس نے میرا متوجیانہ جملہ نظر انداز کر دیا۔

”مم..... میں سونیا کے کمرے میں گیا تھا۔ اکیلا بور ہو گیا تھا۔“

اُس کے لبوں پر بڑی تازہ اور معافی خیز مسکراہٹ ابھری۔ بولی۔ ”کے دیکھا، اس کا کیا سونیا کو؟“

مجھے خاموش پا کر متفسر ہوئی۔ ”کیا بات ہے؟“

”وہاں اس کے بے ہوش پڑی تھی جبکہ سونیا جاگ رہی تھی۔ میں سونیا کے پاس چند لمحے ٹھہر گیا۔ اسی دوران اس نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔“

وہ بولی۔ ”تو پھر کیا ہوا؟“

بے پروائی سے سترے ہوئے ہونٹ اچانک داہو گئے، چونک کر تیز لہجے میں بولی۔ ”یہ تم نے کیا حماقت کر ڈالی؟“

”جب میں کمرے میں گیا، وہ بے ہوش تھی۔“ میں نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

”کیوں اور کیسے ہوا، مت بتاؤ، یہ سوچو کہ اسے کیا ہوگا؟“ وہ متشکر ہو گئی۔ توجہ پوری طرح میری طرف مبذول

کی طرف دیکھا، بجلی کی سی تیزی سے اٹھی اور بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

سونیا بولی۔ ”تم کب بیدار ہو گئی؟“

اس کی خمار آلود آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”پتا نہیں..... تم لوگ مجھے کیوں اٹھا کر لائے ہو؟“

سونیا نے نرم لہجے میں کہا۔ ”کہا تو ہے، میں نہیں جانتی۔“

مجھے فوری طور پر کمرے سے نکل جانا چاہیے تھا مگر اُس گھڑی دھیان نہیں رہا اور میں کامل انہماک سے اُسے دیکھنے لگا تھا۔ اُس کا چہرہ اور آنکھیں سو جن زدہ تھیں۔ بال بکھر کر

چہرے پر پھیلے ہوئے تھے اور دائیں رخسار پر گہرے سرخ رنگ کی ڈیڑھ انچ چوڑی پٹی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ غالباً کافی دیر تک کلائی پر گال لٹکائے پڑی رہی تھی۔ ایک ہی وقت

میں وہ رنجیدہ، خوابیدہ اور کم دکھائی دے رہی تھی۔ اچانک اُس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ چند لمحوں تک خالی خالی نظروں سے گھورتی رہی پھر ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔

اُس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات سمٹ آئے۔ دو تین مرتبہ آنکھیں جھپکانے کے بعد بے اختیار بولی۔ ”شہر یار تم؟“

تم نے مجھے اغوا کر لیا ہے؟“

کانو تو بدن میں لہو نہیں، کے مصداق میں جہاں کا تہاں رہ گیا۔ وہ ہوش میں نہیں تھی تو خیر تھی۔ ہوش میں آنے پر خیر نہیں گزری تھی۔ اُس نے بلا تاثر مجھے پہچان لیا تھا۔ میری طرف بڑھی تو سونیا نے کلائی تھام لی۔ پیار سے بولی۔ ”نہیں جانم! ادھر بیڈ پر ہی بیٹھی رہو۔ اُس کے قریب نہ جاؤ، یہیں بیٹھ کر باتیں کرو۔“

اُسے اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”تم بولتے کیوں نہیں ہو؟“

میرے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ میں اپنی بے وقوفی میں خود پر نور پور کے دروازے بند کر بیٹھا تھا۔ وہ اگر یہاں سے آزاد ہو کر اپنے گھر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی، جو اک نہ اک دن ہونا ہی تھا، تو مجھ پر زمین تنگ کر دیتی۔

میں نے کہا۔ ”کون شہر یار؟ میرا نام شہر یار نہیں ہے۔“

میرے مضبوط انکار اور آنکھوں میں چھائی مصنوعی بے گامگی نے اُس کے ماتھے پر تشکیک کی سلوٹوں کا جال بن دیا مگر یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ وہ بولی۔ ”اگر تم شہر یار نہیں ہو تو پھر تم کون ہو؟“

سوال پر چونک کر بولا۔ ”جو مل جائے، کھا لیتا ہوں۔“

وہ ہنسی اور ٹھوکر لڑ بولی۔ ”اتنے ندیدے ہو؟“

تب تک مجھے اُس کے سوال کی سمجھ آ چکی تھی۔ جلدی سے شرمسار ہو کر میں نے اپنی سمجھ کی۔ ”نہیں، نہیں! جس بھوک کی تم بات کر رہی ہو، وہ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی۔“

وہ استہزاء سے انداز میں ہنسنے لگی۔ پھر میری ران پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”سچ کہہ رہے ہو؟“

اُس کا کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو۔ ”نہیں! تم سراسر جھوٹ بول رہے ہو۔“

جذبات اور پانی اپنا راستہ خود بنا لیتے ہیں۔ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر اپنا راستہ بنا رہی تھی۔ میں نے غزالہ سے محبت کی تھی مگر اُس محبت نے بدن کی طرف پیش قدمی کرنے کا اشارہ نہیں کیا تھا۔ بلو نے مجھے ایک نئی سلطنت کی فتح یابی پر اُکسایا تھا۔ مگر ان تحریکوں میں اتنی جان نہیں تھی یا میرے اندر تلاش اور انتقام کی آگ اتنی زیادہ تھی کہ وہ ہر جذبے کو نمونہ کے ابتدائی لمحات میں ہی نگل لیتی تھی کہ میں بدن شناس نہیں ہوا تھا۔ اُس کا ہاتھ بڑی آہستگی سے میری ران پر پھسل رہا تھا اور آنکھیں میرے چہرے پر لکھی کوئی نادیدہ عبارت پڑھنے اور مفہوم اخذ کرنے میں مشغول تھیں۔ میں نے کہا۔ ”کیا تمہیں اپنے کام سے گھن نہیں آتی؟“

وہ چونگی، بولی۔ ”گھن آئے بھی تو نوٹوں کی مہک میں کہیں دب کر سو جاتی ہے۔ جانتی ہوں کہ میڈم کی کوئی سے نکلوں گی تو کہیں شب بھر کی پناہ میسر نہیں آئے گی۔ اس دنیا میں لاکھوں یار ملتے ہیں، ایک یار نہیں ملتا۔ اُس کی تلاش بے سود ہے، اس لیے ہر شب ایک نئے دوست کا انتظار کرتی ہوں۔“

میں نے کھسک کر فاصلہ کرنا چاہا مگر ناکام رہا۔ میں پہلے ہی سونے کے بازو کے ساتھ چٹنا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ”کیا تم نے کسی سے محبت کی، زندگی میں؟“

ایک طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر طلوع ہوئی، مجھ بھی گئی، بولی۔ ”ہاں! میں نے نثر اسپتال میں نرسنگ کا کورس کیا۔ ڈیوٹی کے پہلے دن ہی مجھے ایک ہاؤس جاب کرنے والا ڈاکٹر نظر آیا، بڑا وجیہ، اتنا کہ میں نے اپنا دل اُس کے قدموں پر دھر دیا۔ اُس نے میری وارفتگی کو زبان دی اور مجھے محبت کے سنگھاسن پر براجمان کر دیا۔ میں نشے میں تھی۔ جب خمار اُترا تو دیکھا کہ بھونرا رس چوس کر نئی چینی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔“

ایسے ہی وقت میں ہم دونوں، بے یک وقت، چونک گئے۔ کمرے میں ایک مخصوص آواز ابھرنی لگی۔ اکلوتے بیڈ

کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ سردار حیدر خان کی بیٹی ہے۔ گزشتہ دو برسوں سے میڈم اس پر ہاتھ ڈالنا چاہ رہی تھی مگر حیدر خان کے گرگے استاد بلو کی وجہ سے ہاتھ نہ ڈال سکی۔ اب نہ جانے کون سی طاقت میڈم کو مل گئی کہ اُس نے بغیر کسی پیش بندی کے اسے اغوا کر لیا۔“

میں نے کندھے اُچکائے، اُس کی کریدتی نظروں کی لپک سے پہلو تہی برت لی اور کہا۔ ”مگر میرا اس قصے سے کیا تعلق؟“

وہ مسکرائی۔ ”میں یہ تو نہیں جانتی، مگر یہ ضرور جانتی ہوں کہ اسے میڈم نے تمہاری وجہ سے کڈنیپ کر دیا ہے۔“

”میری وجہ سے؟“ میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ ”مگر میں تو اسے جانتا تک نہیں ہوں۔ تم نے بتایا کہ یہ کسی سردار حیدر خان کی بیٹی ہے، یہ نام بھی میرے لیے نیا ہے۔“

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ معافی خیز انداز میں مسکرانے پر اکتفا کیا۔ میں سمجھ گیا کہ اُس نے میرے پرتیقن انداز اظہار کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم یہاں کیا کام کرتی ہو؟“

”میں نے بتایا تو تھا۔“

”کیا؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”میں میڈم کے اشاروں پر ناچتی ہوں۔“

”ناچنے سے کیا حاصل ہوتا ہے؟“

”مجھے ڈھیر سارا روپیہ ملتا ہے جس سے میرے گھر والے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ سوسائٹی میں ناک اونچی رکھ کے معزز زندگی گزارتے ہیں۔“ وہ عام سے لہجے میں بولی۔ ”بظاہر میں اُن کے لیے مرجھاتی ہوں، اُن سے میل و ربط استوار نہیں کر سکتی مگر میرے گناہوں سے لٹھڑے ہوئے نوٹ انہیں بہت مرغوب ہیں۔“

”میڈم کو کیا ملتا ہے؟“ میں نے دلچسپی لی۔

”سرکاری افسر اور عوامی لیڈر اُس کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ اُسے تحفظ دیتے ہیں۔ جو کہتی ہے، بغیر کچھ سوچے سمجھے اُس پر عمل کرتے ہیں۔“ اُس کے لہجے میں ہلکی سی کڑواہٹ کھل گئی۔ ”یہاں جنسی بھیڑیوں کا شکم بھرنے کے لیے میڈم نے کئی دسترخوان سجا رکھے ہیں۔ یہاں ہر ذائقہ موجود ہے۔ میٹھا بھی ہے، ترش اور تمکین بھی..... بالی دی دے! تمہیں کون سی ڈش پسند ہے؟“

میں بڑی توجہ سے اُس کی باتیں سن رہا تھا، اُس کے چہرے کی سچ جلد پر نظریں گاڑے گلاب گون لبوں کی خوب صورت ارتعاش ملاحظہ کر رہا تھا، بے ساختگی میں کہنے لگے۔

”یہی وہ وقت ہے، ہم دونوں، بے یک وقت، چونک گئے۔ کمرے میں ایک مخصوص آواز ابھرنی لگی۔ اکلوتے بیڈ

102

102

102

102

102

102

ہوگئی۔ ”چونکہ ہم نے اس کے بدلے میں تمہاری بہن کو حاصل کرنا ہے۔ اس اُس کے باپ کے حوالے کرنی ہے، یہ مصیبت تو جاتے ہی تمہارا نام بک دے گی اور حیدر خان تمہارے خاندان کو سٹخوں پر پرد کر بمون ڈالے گا جبکہ پردین کہیں بھی محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ یہ تم نے کیا کر دیا شہر یار!“

وہ درست کہہ رہی تھی۔ میرا دل واہموں اور اندیشوں کی آماجگاہ بن گیا۔ ابھی تک اس کے اغوا کے سلسلے میں میرا ذکر نہیں بھی نہیں آیا تھا۔ اس کے گھر پہنچتے ہی میرے خاندان پر سردار حیدر خان بھوکے بھیڑے کی طرح چڑھ دوڑے گا۔ عین ممکن تھا کہ اس نے دے میں سائیں دل جیت کے قتل کا معرہ بھی حل ہو جاتا اور میں سلاخوں کے پیچھے چلا جاتا۔ میری ایک چھوٹی سی احمقانہ حرکت کی وجہ سے میری اور میڈم کی ساری ریاضت اکارت جانے والی تھی۔

مجھے دروازے میں منتظر تھا ہوا دیکھ کر بولی۔ ”ادھر آؤ، یہاں بیٹھو.....“

اُس نے بیڈ کی کٹر پر بیٹھنے کا حکم دیا تھا۔ میں بیٹھ گیا تو اُس نے کہا۔ ”پریشانی کو چہرے تک آنے سے روکو، ہمارے فیلڈ میں یہ اچھی علامت نہیں سمجھی جاتی۔ دل کی دنیا زیر و بر ہو، دماغ میں ایک سے بڑھ کر ایک بھونچال اٹھے مگر چہرے پر سکون اور شائقی رقص کرتی نظر آئے۔ کیا ہوا؟ تمہیں اسانے دیکھ لیا۔ وہ جا کر اپنے گھر بتا دے گی کہ اُس کے اغوا میں شہر یار کا ہاتھ بھی تھا۔ یہی پر اہم ہے نا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اُسے مدد طلب نظروں سے دیکھا۔ وہ بڑے طمانیت آمیز انداز میں ہنس پڑی۔ پھر پاؤں سمیٹ کر بولی۔ ”تو کیا سردار حیدر خان کو، جس نے اتنے قلیل عرصے میں نہ صرف یہ جان لیا کہ اس کو نیازی نے اغوا کیا ہے بلکہ وہ اُسے اٹھا کر اپنے اڈے پر لے گیا اور اُس کے منہ سے میرا نام اگلوانے میں کامیاب ہو گیا، اس نکتے تک نہیں پہنچ سکے گا کہ اس سارے ڈرامے کا مرکزی کردار کون ہے؟ جب اُس سے اس کے بدلے میں پردین مانگی جائے گی، تب اُسے نہیں پتا چلے گا؟ تب کیا وہ راضی ہوتا؟..... نہیں شہر یار! تمہاری دشمنی سردار حیدر خان پر عیاں ہو چکی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ اُس کا دوست راست سائیں دل جیت شاہ قتل ہو چکا ہے اور وہ بھی تمہارے ہاتھوں..... اس کا خاندان ہے۔ بہت کچھ کر سکتی ہے۔ مگر تب، جب وہ یہاں سے جائے گی جبکہ حیدر خان کا گرگا استاد بھلو اب بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔“

وہ مجھ سے کہیں زیادہ ذہین اور زیرک تھی۔ میں نے

واقعتاً اس رخ سے نہیں سوچا تھا ورنہ اتنا پریشان نہ ہوتا۔ میں نے کہا۔ ”میڈم! کیا میری پردین مل جائے گی؟“

مجھے خود احساس ہوا کہ میرے لہجے میں کتنی بڑی التجا چھپی ہوئی تھی۔ وہ بولی۔ ”تمہیں کہنا تھا کہ وہ تمہیں ضرور ملے گی۔ میں جس کام کا تہیہ کر لیتی ہوں، سر انجام دے کر ہی سکون کی سانس لیتی ہوں۔ اب ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہیں۔ سردار اگر تمہاری بہن پر کسی ظلم کا بوجھ لادے گا تو اُس کی بیٹی بھی اتنے ہی بڑے پتھر تلے دب جائے گی۔ وہ نادان نہیں ہے کہ اتنی سانس کی بات پردھیان نہ دے۔“

میں نے کہا۔ ”میڈم! آپ میری سوچ سے بھی زیادہ ذہین اور اثرورسوخ والی ہیں۔“

وہ بولی۔ ”ہاں! ایسا ہی ہے۔ تم مجھ سے بھی زیادہ خوش قسمت ہو۔ میں زمانے کو اپنی مٹھی میں رکھتی ہوں۔ تم نے میرا دل اپنی مٹھی میں جکڑا ہوا ہے۔“

میں نے چونک کر میڈم کو دیکھا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سے رنگ ثبت تھے۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”جی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

وہ مجھ پر آنکھیں چپکائے بولی۔ ”کیا کوئی یونہی اتنی بڑی مصیبت کسی کے لیے مول لیتا ہے؟“

اُس نے درست کہا تھا۔ وہ جس حد تک مجھ پر مہربان تھی، اس حد پر کوئی بنا ضرورت کے نہیں پہنچتا تھا۔

میں نے کہا۔ ”آپ بہت اچھی ہیں۔“

وہ بولی۔ ”یہ جگہ جہاں ہم بیٹھے ہیں، سی ٹو کہلاتی ہے۔ یہ ایسا محفوظ قلعہ ہے جہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا، پہنچ بھی جائے تو کچھ نہیں کر سکتا۔ استاد بھلو بھی نہیں، قانون بھی نہیں..... میری کوئی، پوری کالونی بھی اگر تباہ ہو جائے تب بھی یہاں موت کے ہر کارے نہیں پہنچ سکتے۔ سی ٹو کے سبھی دروازے اندر سے، خاص میکینزم کو آن کرنے سے ہی کھلتے ہیں۔ باہر سے کوئی ان چور دروازوں کا سراغ لگا بھی لے تو کھول نہیں سکتا۔ سمجھے؟“ اُس کے لہجے میں کڑا یقین اور احساس تفاخر رچا ہوا تھا۔ ”میں استاد بھلو کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ جب تک سردار یارن خان یہاں رہا، یہ اس کے آگے پیچھے دم ہلاتا رہتا تھا، اب سردار حیدر خان کے سٹخوں کی گرد جھاڑتا ہے۔ اب اُسے منہ کی کھانا پڑی ہے مگر میں جانتی ہوں کہ وہ اتنی آسانی سے پیچھے ہٹنے والا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جانتا ہو کہ میں مورچہ زن ہوئی ہوں۔ مجھے نکالنے کے لیے اُس نے اپنے چند غنڈوں کو بھیجا ہوتا کہ انہیں بھگانے کے بعد

میں جو نبی مطمئن ہو کر کھجار سے باہر نکلوں، وہ خود حملہ آور ہو جائے۔ اسی لیے میں نے سبھی لوگوں کو کونٹھی پر بھیج دیا ہے۔ اس وقت ہم پانچ سات لوگ یہاں ہیں.....“

میری آنکھیں پھیل گئیں۔ بلاشبہ وہ عورت نہیں، شیطانی کھوپڑی رکھنے والی جان دار قیامت تھی۔ وہ ایسا بڑبڑا عقده تھا جس کی نظر میں آنے کے بعد ہر عقدہ خود بخود کھلنے کے لیے بے تاب ہو جاتا تھا۔

میرے استعجاب سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔ ”شہر یار! تھوڑا قریب آؤ۔“

میں ہچکچاتے ہوئے بیڈ پر اُس کی سمت تھوڑا سا کھسکا۔ وہ بولی۔ ”تم سردار حیدر خان کی زندگی میں نور پور جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے ہو۔ کیا میں نے درست کہا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”نہ ہی تمہاری بہن وہاں جاسکتی ہے۔ ہوں؟“

”جی!“ میں نے آہستگی سے کہا۔ وہ بولی۔ ”تھوڑا اور قریب آؤ.....“

میں گھبرا گیا۔ اُس کی آنکھیں مجھے پکارنے لگیں۔ قریب آنے پر اکسانے لگیں۔ میں نے بے بسی سے دیکھا۔ وہ مسکرائی۔ ”کہنا تھا قریب آؤ.....“

ناچار مجھے اُس کی جانب کھسکا پڑا۔ وہ شرارت آمیز نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔ اُس کے داہنے پاؤں کی انگلیاں میرے پہلو میں تھرکتے لگیں۔ بولی۔ ”اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ تم اپنی بہن کو بازیابی کے بعد اسے ملتان میں ہی رکھنے کا پروگرام ترتیب دو۔ میں تمہارے لیے ایک گھر کا بندوبست کر دوں گی۔ کیا تم اپنے تمام اہل خانہ کو گاؤں سے ملتان شفٹ کر سکتے ہو؟“

میں نے کچھ سوچا، پھر نفی میں سر ہلادیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جا چا چراغ کبھی بھی میرے کہنے پر نور پور سے ملتان نقل مکانی کرنے پر رضامند نہیں ہوگا۔

وہ بولی۔ ”تو کیا تم ان لوگوں کو حیدر خان کے رحم و کرم پر دوہیں چھوڑ دو گے؟“

میں نے کندھے اُچکائے، کہا۔ ”اور کوئی چارہ کار بھی تو نہیں.....“

اُس نے تقیہی انداز میں سر ہلایا۔ اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا، حکم آمیز لہجے میں بولی۔ ”ہاتھ پکڑو اور اسے سہلاؤ، کی بورڈ نے تھکا دیا ہے۔“

میں نے شکوہ کناں نظروں سے اُسے دیکھا مگر اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں ناچار اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام کر

میں نے لاچارگی سے اُسے دیکھا۔ میرے پاس لا حاصل مباحثے کے لیے کائیاں مواد نہیں تھا، اس لیے ماسوائے خاموشی کے کوئی لائحہ عمل نہیں تھا۔

وہ بولی۔ ”شہر یار! محبت کبھی، کہیں اور کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ تمہیں میری نظر نے منتخب کیا ہے، دل نے پسندیدگی کی مہر ثبت کی ہے اور میرے ہاتھ نے تمہیں ڈالا ہے کہ تم

میں نے لاچارگی سے اُسے دیکھا۔ میرے پاس لا حاصل مباحثے کے لیے کائیاں مواد نہیں تھا، اس لیے ماسوائے خاموشی کے کوئی لائحہ عمل نہیں تھا۔

وہ بولی۔ ”شہر یار! محبت کبھی، کہیں اور کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ تمہیں میری نظر نے منتخب کیا ہے، دل نے پسندیدگی کی مہر ثبت کی ہے اور میرے ہاتھ نے تمہیں ڈالا ہے کہ تم

ہوئے ہوئے سہلانے لگا۔ ہاتھ کی ٹھکن عجیب برقی لہر بن کر میرے وجود میں سرایت ہونے لگی۔ اُس نے آنکھیں موند لیں، بولی۔ ”میرا شاہ سردار حیدر خان سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ رابطہ ہونے پر سودے بازی کا مرحلہ آئے گا۔ جو نبی میرا شاہ اُس سے تمہاری بہن کا مطالبہ کرے گا، وہ ٹھٹک جائے گا۔ نور پور اُس کی مونچھ تلے ہے۔ مونچھ کوئل دے گا تو تمہارا خاندان زیر عتاب آ جائے گا۔ تب کیا کرو گے، کیا بے بسی سے کبھی اپنوں کو بے موت مرتا ہوا دیکھتے رہو گے؟“

میرا ہاتھ ساکت ہو گیا۔ گردن پر چیونٹیاں ریگنے لگیں۔ چاچا، چاچی اور اُس کی اولاد کے چہرے آنکھوں میں ابھرنے لگے۔ کسی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ انہیں تو اپنی جانب بڑھتی ہوئی موت کی پرچھائیاں تک نظر نہیں آرہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ ”تو کیا میں نور پور چلا جاؤں؟“

”وہاں جا کر کیا کرو گے؟“

”سردار حیدر خان کے گرگوں کا مقابلہ کروں گا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ زیادہ ہوگا تو میں بھی اُن کے ساتھ مارا جاؤں گا۔ موت آئے تو آئے، مگر میری ذات پر نیک حرامی کا الزام نہ آئے۔“ میرے لہجے میں پتھر کی سی سختی تھی۔

”اپنے خاندان کے ساتھ ساتھ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں گے۔ پھر میرا کیا بنے گا؟“

میں نے چونک کر کہا۔ ”کیا مطلب؟“

”سیدھی سی بات ہے کہ میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔ تمہاری دوری برداشت نہیں کر پاؤں گی۔“ اس کے لہجے میں گہری یکسوئی اور کڑی سچائی پنہاں تھی۔ انہونی سی بات اپنی تمام تر سنگینی سمیت میرے سامنے کھل رہی تھی۔

میرے لیے یہ بات بھی نئی تھی کہ کوئی لڑکی اتنی دیدہ دلیری اور غیر رواجی عمویت سے اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”میڈم! آپ اپنے رتبے اور مقام کا خیال کریں۔ مجھے آپ کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکی، ہاتھ کھینچ کر بولی۔ ”کیا میں کسی ایسے عہدے پر فائز ہوگئی ہوں جہاں کسی کو پسند کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے؟“

میں نے لاچارگی سے اُسے دیکھا۔ میرے پاس لا حاصل مباحثے کے لیے کائیاں مواد نہیں تھا، اس لیے ماسوائے خاموشی کے کوئی لائحہ عمل نہیں تھا۔

وہ بولی۔ ”شہر یار! محبت کبھی، کہیں اور کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ تمہیں میری نظر نے منتخب کیا ہے، دل نے پسندیدگی کی مہر ثبت کی ہے اور میرے ہاتھ نے تمہیں ڈالا ہے کہ تم

میں نے لاچارگی سے اُسے دیکھا۔ میرے پاس لا حاصل مباحثے کے لیے کائیاں مواد نہیں تھا، اس لیے ماسوائے خاموشی کے کوئی لائحہ عمل نہیں تھا۔

وہ بولی۔ ”شہر یار! محبت کبھی، کہیں اور کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ تمہیں میری نظر نے منتخب کیا ہے، دل نے پسندیدگی کی مہر ثبت کی ہے اور میرے ہاتھ نے تمہیں ڈالا ہے کہ تم

میں نے لاچارگی سے اُسے دیکھا۔ میرے پاس لا حاصل مباحثے کے لیے کائیاں مواد نہیں تھا، اس لیے ماسوائے خاموشی کے کوئی لائحہ عمل نہیں تھا۔

وہ بولی۔ ”شہر یار! محبت کبھی، کہیں اور کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ تمہیں میری نظر نے منتخب کیا ہے، دل نے پسندیدگی کی مہر ثبت کی ہے اور میرے ہاتھ نے تمہیں ڈالا ہے کہ تم

میں نے لاچارگی سے اُسے دیکھا۔ میرے پاس لا حاصل مباحثے کے لیے کائیاں مواد نہیں تھا، اس لیے ماسوائے خاموشی کے کوئی لائحہ عمل نہیں تھا۔

میری دسترس میں ہو۔“

وہ بااختیار تھی، میں رہیں حالات اور اُس کے تابع تھا۔ وہ جو چاہتی کہہ لیتی، میں جو چاہتا تھا کہہ نہیں سکتا تھا۔ موبوم کی ندائے مزاحمت بلند کی۔ ”میڈم! میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔“

”کیا تم میری آنکھوں پر شک کر رہے ہو جنہوں نے تمہیں اپنے قابل جانا ہے؟“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں میڈم! میں نے یہ تو نہیں کہا۔ میں تو اپنی حیثیت اور مقام کو مد نظر رکھ کر سچ بیان کر رہا ہوں۔“

وہ آلتی پالتی مار کر بیڈ میں بیٹھ گئی۔ اچانک ہی موضوع بدل کر بولی۔ ”کیا تمہارا یار، کیا نام بتایا تھا تم نے اُس کا، ہاں..... کھالا..... کیا وہ تمہارے کہنے پر تمہارے گھر کے تمام افراد کو رازداری سے نور پور سے نکال کر یہاں لاسکتا ہے؟“

میرے ذہن میں ایک برق بلا کوندی، اُمید اور یقین کا ستارہ جھلکایا اور میں مسرت آمیز انداز میں بولا۔ ”اوہ کیوں نہیں میڈم؟..... کھالا آسانی سے یہ کام کر سکتا ہے۔ وہ کہاں ہے اس وقت؟“

”میرے آدمیوں نے اُسے زندہ و سلامت پکڑنے کے بعد رسیوں میں جکڑ کر سی وں میں رکھا ہے۔ بڑا چل رہا ہے، آزاد ہونے کے لیے اپنی سی کوشش کر رہا ہے۔“ وہ قدرے تفاخر سے بولی۔ ”تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہیں ملے اور آزادی پانے کے بعد کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا؟“

میں نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ ”ہاں میڈم! وہ بڑا یار پال انسان ہے۔ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔“

”سوچ لو، کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔“ اُس کے لہجے میں تشکیک کا عنصر نمایاں تھا۔

”کھالا کیا تھا؟ یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ میں نے میڈم کو یقین دلایا اور اُس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ایسے ہی وقت میں اُس کے موبائل فون کا بزر بجا۔ اُس نے کال ریسیو کی۔ چونکہ کمراساؤنڈ پروف تھا، کوئی شور نہیں تھا، اس لیے میں پیکیج سے پھوٹنے والی نجیف سی آواز بھی سن سکتا تھا۔ دوسری طرف میرو شاہ تھا جو میڈم سے کہہ رہا تھا۔ ”میڈم! ماڑا پیر حیدر خان کی دُم پر جا پڑے ہے، اپنے بال لوچے ہے اور چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھاوے ہے۔ باؤلا..... ماڑے کو یقین دلاوے ہے کہ اس کے بچرے میں پروین نام کی کوئی چڑیا بخر (نظر) نہ آوے ہے۔“

”میڈم! اُسے قند سے سخت انداز اختیار کیا، بولی۔ ”سیدھی“

سیدھی بات کرو، کیا پہیلیاں بھجوار ہے ہو میرو شاہ؟“ اُس کے کانوں پر جیسے جوں تک نہیں رہی تھی، بولا۔ ”ماڑے کو بولنے تو دیوے ہے ملکہ رانی! کیا کھا جاوے دنیا کو یہ میرو شاہ؟..... ماڑے کو پتا ہے کہ ماڑی میڈم اس وقت سی ٹو کے بچرے میں قید ہووے ہے، اُڑنے کو پر تو لے ہے۔ ٹھیک ہے، اپنی جان (زبان) کاٹ کر ہتھیلی پر رکھ لیوے ہے میرو شاہ..... اب پوچھ لیوے ماڑے سے جو پوچھنا مانگے ہے.....“

”اچھا بھئی..... بتاؤ، کیا بات چیت ہوئی؟“ میڈم نے ہار مانتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”ماڑے کو چکر دے کیا حرام جادہ (زادہ)۔“ میرو شاہ نے پھر کر کہا۔ ”ماڑے کو جگاڑی لاوے کہ ایسی کوئی لڑکی نہ ہووے ہے اس کے پاس.....“

”پھر کیا..... ماڑے نے صاف صاف کہہ دیوت ہے کہ نہیں ہے تو پیدا کرے..... لڑکی پیدا نہ ہووے تو سمجھے کہ اُس کی پٹی پوسی پٹی خون میں نہا جاوت ہے۔“ میرو شاہ کے لہجے میں غیظ کی کینٹی لہر چھپی ہوئی تھی، کہہ رہا تھا۔ ”میڈم! او ماڑی ملکہ رانی! وہ ماڑے سے پوچھے ہے کہ تیرے کو اُس چھوہر (لڑکی) سے کیا غرج (غرض) ہووے..... ماڑے کو چکر دیوے، پُر آپ ماڑے چکر میں آ جاوے ہے۔ ماڑے نے سمجھا دیوت ہے کہ بڑی پارٹی لگی ہووے، ٹکڑی رقم کا معاملہ ہووے.....“

”گڈ.....“ میڈم کے لبوں سے تحسین انگیز لفظ نکلا، تھوڑے توقف سے بولی۔ ”تم اس وقت کہاں ہو؟“

”ماڑا ڈیرہ ملتان میں ہی ہووے ہے میڈم! حکم دیوے ہے، کیا بات ہووے؟“

”کیا یہ بات کھل چکی ہے کیا سا میرے پاس ہے؟“

”ہاں میڈم! وہ حرام جادہ (غلظ) گالیاں، ماں بہن کی، دیوے تھا..... ماڑے سامنے ہوتا تو اُس کا منہ توڑ دیوت ہے پُر جور (زور) نہ چلت ہے۔“

میڈم کے ہونٹ سکڑے، پیشانی پر برہمی کے مظاہر مل نمودار ہوئے پھر پل بھر کے بعد غائب ہو گئے۔ بولی۔ ”تم کسی کو سردار حیدر خان کے ڈیرے پر بھیجو۔ اُس کے پیلے والے ٹھکانے کی ٹوہ لگاؤ۔ نقشہ بناؤ اور سکیورٹی کی تفصیلات اکٹھی کرو تا کہ ضرورت پڑنے پر ایک کر کے مال برآمد کرایا جاسکے۔ اگر کبھی سیدھی اگلیوں سے نہیں نکلتا تو پھر اگلیاں ٹیڑھی کرنا ہوں گی۔ اور ہاں! وہ استاد پہلو کہاں

غائب ہے؟“

”وہ بھوتی کا بچہ..... سال..... ایک دم باؤلا ہوا پھرت ہے۔ اپنے لونڈوں لپاڑوں کی فوجیں لے کر شہر میں مارا مارا پھرت ہے، جہیں تلاش کرت ہے۔“

”نور پور کی کوئی خبر؟“

”ناں میڈم! جابد (زاہد) کو بھیجا ہووے..... وہ گنجا جابد، جو میڈم کے دیدار کو رووے تھا، تمہارا عاشق..... پڑوہ ابھی واپس نہ آوے ہے۔ خبر ماڑے تک پہنچے تو میڈم تک پہنچے ناں۔“

میرو شاہ بڑی بے باکی سے میڈم سے بات چیت کرتا تھا۔ گنجے زاہد اور اس کی عاشقی کا حوالہ سن کر میڈم کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ ابھری۔ ”اچھا! ٹھیک ہے میرو شاہ!“

میڈم نے کہا۔ ”تم جو مناسب سمجھو، کر گزرو۔ مجھے شہر یاری بہن زندہ و سلامت چاہیے، ہر قیمت پر۔ حیدر خان سے جنگ چھڑ گئی ہے۔ جاتی ہوں کہ یہ کئی خون پی جائے گی۔ بھلے پی جائے، شکست قبول نہیں ہوگی۔ اوکے؟“

”جندہ (زندہ) رہوے میڈم..... جندہ باد.....“

اُس نے اپنے مخصوص انداز میں نعرہ لگایا تو میڈم نے فرط طمانیت سے مسکرا کر کال منقطع کر دی۔ فون بیڈ کے سر بالیں چوبی تختے پر رکھ دیا اور کھسک کر نیم دراز ہو گئی۔ آنکھیں موند کر کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ”میرو شاہ بڑے کام کا بندہ ہے۔“

”جی میڈم!“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”وہ تمہیں ماڑا غنچہ کہتا ہے۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے وہ!“

میڈم کے لہجے میں عمومیت کا عنصر غالب تھا۔

”جی.....“ میں نے کہا۔ ”کیا آپ کو یقین ہے کہ پروین سردار حیدر کے پاس ہی ہے؟“

اُس نے چونک کر سر اٹھایا، آنکھ کے اشارے سے قریب آنے کا حکم صادر کیا اور بولی۔ ”ہاں!“

میں نے اُس کے حکم کی تعمیل نہیں کی تھی۔ اُس نے میری ہچکچاہٹ بھانپ لی۔ بولی۔ ”تم مجھ سے کتراتے کیوں ہو؟“

میں نے گھبرا کر جلدی سے کہا۔ ”نہیں میڈم! دراصل مجھے اپنی اوقات نظر آتی ہے۔“

”کیا میرے پہلو میں بیٹھنے کے بعد بھی تمہیں اپنی اوقات کا شکوہ نہ ہوتا ہے؟“ اُس کی چھتی ہوئی نظریں مجھ پر

مرکوز تھیں۔ ”کہاں ناں! میرے قریب آؤ.....“

میں بادل خواستہ اُس کے پہلو تک کھسک گیا۔ اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میرا رخ بدل دیا۔ ماقبل اُس کا ہاتھ گلاب کی طرح میرے ہاتھ میں آتا تھا اور میرے پورے بدن میں سرسرا گیا تھا۔ اب میری آنکھیں حسن کی تمازت برداشت کرنے سے منکر ہونے لگیں اور میڈم کا گل آفریں چہرہ دھندلانے لگا۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور نہایت آہستگی سے منہ کھینچ کر اپنے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ زندگی کو آنکھیں شباب کا پہلا لہس عطا ہوا تھا۔ دل زور سے دھڑکنے لگا۔

اُس نے آنکھیں موند لیں اور میرے نیم جان ہاتھ میں روح پھونکنے کا عمل شروع کر دیا۔ میرا ہاتھ اُس کی گرفت میں حرکت کر رہا تھا اور سانسوں کی حدت سے لہجہ بہ لہجہ دھکتا جاتا تھا۔ میں نے آہستگی سے ہاتھ کھینچنا چاہا تو اُس نے اپنے سر کو دائیں بائیں مخصوص انداز میں حرکت دے کر مجھے ایسا کرنے سے منع کر دیا اور اپنی ترنگ میں بدستور بھکتی رہی۔ میں نے ہمت کی اور اُس کے چہرے کو دیکھا۔ پہلے گلابی تھا، اب دھک کر سرخ ہو گیا تھا۔ گالوں پر سرخ لکیریں تن لگیں تھیں اور آنکھوں کے پونٹے بھاری پن کا شکار ہو گئے تھے۔ اُس نے چند منٹوں میں ہی میرے بدن سے تمام تر خون نچوڑ کر میرے داہنے ہاتھ میں سمیٹ دیا تھا۔

اس میں کلام نہیں کہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اُس کا بدن شیشے کا وہ پیکر تھا جسے چھونے سے اس کے ٹوٹنے کا احتمال ہوتا تھا۔ آنکھیں سمندر کی تمام تر گیرائی سمیٹے ہوئے تھیں اور ہونٹوں پر عمودی مہین لکیروں کا جال اور دو ٹخنے ٹخنے چمک دار ابھار مردوں میں روح پھونکنے کا سا اعجاز رکھتے تھے۔ وہ اچانک پہلو کے بدل کر وٹ لے گئی۔ اب اُس کا واسطی بدن میری کمر سے جڑ گیا اور اُس نے میرا ہاتھ لبوں سے ہٹا کر اپنے بائیں گال پر رکھ دیا۔ میرے ہاتھ پر اُس کی گرفت لرزنے لگی اور سانسوں کی چال غیر معتدل ہو گئی۔ آنکھیں موندے قدرے بھاری آواز میں بولی۔ ”شہر یار! آئی لو یو..... تمہیں پہلی نظر دیکھ کر تمہیں پسند کرنے لگی تھی۔ اب وہ پسندیدگی کا جذبہ انتہائی حدوں کو چھو کر محبت بن گیا ہے۔ میں نے کیا کہا ہے شہر یار؟“

”جی..... جی میڈم..... میں سن رہا ہوں۔“ مجھے اپنی آواز کی لرزش نے حیران کر دیا۔

”ہاں..... تم سننے پر مجبور ہو۔ تم اپنی بہن کی وجہ سے میری باتیں سننے پر مجبور ہو۔ میرا حکم ماننے پر مجبور ہو۔ جب تمہاری بہن تمہیں مل جائے گی، پھر تم کچھ بھی سننا گوارا نہیں کرو۔“

187

سینس ڈائجسٹ

گے مگر میں تب تک تمہارے حواس پر چھا چکی ہوں گی۔ تم جانا چاہو گے مگر تمہارا بدن ساتھ نہیں دے گا۔ تم مجھے انکار کرنا چاہو گے مگر زبان تمہیں چھوڑ کر میرے راگ اپنے لگے گی۔“

وہ جواب سے بے نیاز اپنی ہی رو میں بہکتی جا رہی تھی۔ ”سنو! میں کہہ رہی ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ محبت کسے کہتے ہیں؟ جانتے ہو؟..... ہائے! دنیا میں ایسا کون ہے جو نہ جانتا ہو کہ محبت کس جذبے کا نام ہے۔ جہاں یہ ہوتا ہے، وہاں کوئی نہیں ہوتا..... اب یہاں عشق کا راج ہے، سمجھو! یہاں کوئی اور نہیں ہے..... ہوم! تم نے مجھ پر ایسا کیا جادو کر دیا ہے کہ میں عاشق اور تم معشوق بن گئے ہو۔“

وہ سن رہی تھی، سننا نہیں چاہتی تھی۔ اپنا دایاں ہاتھ میری گود میں رکھ کر ٹوٹے لہجے میں بولی۔ ”شہر یار! یہ ہاتھ ٹھنڈا ہے، اس کو آگ اچھی لگتی ہے، جلا دو۔ اپنے ہونٹوں سے لگا لو۔“

میرا ایک ہاتھ مفتوح تھا۔ دوسرا خود پر فاتح کا لیبل لگا کر میڈم کی دسترس میں جانے والا تھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے اس کا لرزنا ہوا نسخا سا گداز ہاتھ تھا اور لبوں سے لگایا۔

ایسے ہی وقت میں میرے مقابل غزالہ آن کھڑی ہوئی۔ میرے سینے پر انگلی تان کر کراہی۔ ”بس شہرے خان! تمہاری محبت دم توڑ گئی ناں!“

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ آنکھیں جھپکائیں، دیکھا، وہ سامنے آ کر دھندلانے لگی تھی۔ پھر جیسے تصور کے پردے پر ابھری تھی ویسے ہی ایک ساعت میں تحلیل ہونے لگی۔

میں نے سر جھٹکا اور میڈم کے ہاتھ کے ساتھ کھینچنے لگا۔ میں اس سے دور ہونا چاہتا تھا یا میں اس کے قرب کا خواہاں تھا، یہ سوال پہیلی بن کر رہ گیا۔ گلاب کے پھول نے ہونٹوں کو لمس عطا کر کے ساری تاب اپنے اندر سمو لی تھی۔ میں جن دنوں ملتان کے کالج میں پڑھا کرتا تھا، کئی لڑکیاں فریفتگی کی دیوار سے سر نکال کر مجھے اپنے پاس بلایا کرتی تھیں مگر میں انہیں نظر انداز کر کے کتاب کو سینے سے لگا لیتا تھا۔ عورت ذات کو شجر ممنوعہ سمجھ کر اپنی ہی جھونک میں آگے بڑھتا گیا۔ میں نے آج تک غزالہ کے علاوہ کسی شیبہ کو اپنی چشم تصور میں براجمان ہونے کا موقع نہ دیا تھا۔ آج غزالہ کے عشق کی وہ تاب، وہ تمکنت بے بسی کی عجیب نشہ آور کیفیت میں مصلوب ہو گئی تھی۔ میں یہ تعین بھی نہیں کر پایا کہ اگر میڈم اتنی باختیار نہ ہوتی، میں اس کے احسانات کے زیر بار نہ ہوتا تو کیا محض اپنے حسن کی جولانیوں سے وہ مجھے بے بس کرنے میں کامیاب ہو جاتی؟.....

ایسے ہی وقت میں غیر متوقع مدد آن پہنچی۔ اس کے موبائل فون کی بیل بجنے لگی اور وہ چونک گئی۔ پھر ایک نظر مجھے فاتحانہ اطوار سے دیکھتے ہوئے، میرا ہاتھ چھوڑ کر، اپنا چھڑا کر، فون سیٹ کی طرف متوجہ ہوئی اور اسکرین پر نظر ڈال کر بڑبڑائی۔ ”یہ کس کا نمبر ہے؟“

میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے بیڈ چھوڑ دیا۔ پانی پینے کے بہانے فریج کی طرف بڑھا۔ گلاس ہونٹوں سے لگایا تو اس کی شرارت بھری آواز کانوں میں پڑی۔ ”ہر آگ پانی سے نہیں بجھتی شہر یار!“

میں نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا تو ماہ رخ کی آفتابی کشش دل میں کھب گئی۔ دیکھتے رہنے کی خواہش نے سر اٹھایا جسے میں بہ مشکل چل کر پانی حلق میں اتارنے لگا۔ فون کی بیل بجتے رہنے کے بعد خاموش ہو گئی۔ پھر بول پڑی تو میڈم نے کال ریسیو کر لی اور سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ”یس! ہو! آؤں دی لائن؟“

فون میں ابھرنے والی کوئی شناسا آواز سن کر ایک دم ہنس پڑی۔ ہنسنے ہنسنے نخوت سے بولی۔ ”ارے استاد! میرا نمبر کہاں سے مل گیا تمہیں؟“

کمرے میں سپیکر سے پھوٹنے والی جھنجھٹ پھیل گئی۔ ایسے ہی میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھ سے پانی طلب کیا۔ میرے ہاتھوں سے پانی کا گلاس تمام کر اس نے مسکراتے ہوئے فون میں کہا۔ ”تمہیں استاد کہتی ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہاری عزت کرتی ہوں۔ تم بھی میری عزت کرو۔ ایسی باتیں کرو گے تو میری طرف سے بھی طعنے سننے کو ملیں گے۔“

وہ گھونٹ گھونٹ پانی پی رہی تھی۔ آنکھوں سے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے موبائل فون سیٹ کے کسی بٹن کو دبایا۔ فون کا لاؤڈر آن ہو گیا۔ ایک مردانہ آواز میری سماعت میں اُتری۔ ”میں جان چکا ہوں کہ تم اپنے مورچے ’سی ٹو‘ میں چھپی بیٹھی ہو۔ اب صرف یہ جاننا باقی ہے کہ ’سی ٹو‘ کہاں ہے۔ تم جتنی دیر کرو گی، اتنا ہی قرض کے بار تیلے آؤ گی۔“

میڈم بولی۔ ”تم نے یہ سوچ کر فون کیا ہے کہ میں تمہاری دھمکیوں سے ڈر کر اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے تمہارے اوڑھے پر حاضری دینے چلی آؤں گی؟“

”ہاں! کیونکہ اسی صورت میں تم زندہ رہ سکتی ہو۔“

اسپیکر سے برآمد ہونے والی آواز میں موت کی سی سردی پنہاں تھی۔

”استاد! بہتر یہی ہے کہ تم اپنے سردار کو سودے بازی پر رضامند کر لو۔ مفاہمت کی راہ اختیار کر لو۔ سچ کہتی ہوں کہ یہ تمہارے لیے گھائے کا سودا نہیں ہے۔“

”تمہارے لیے بہتری اسی میں ہے کہ سردار کی بیٹی میرے حوالے کر دو۔ اونچا اڑنے کی کوشش میں پر کٹو بیٹھو گی۔“

میڈم نے میری طرف دیکھا، مسکرائی اور فون میں بولی۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اتنی کمزور نہیں ہوں کہ شکست تسلیم کر لوں گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ایسا موقع آیا کہ مجھے اپنی جان جانی ہوئی محسوس ہوئی تو تمہارے سردار کی بیٹی کی بھی چھٹی کرا دوں گی۔ میری مطلوبہ لڑکی اتنی قیمتی نہیں ہے جتنی تمہاری..... اس لیے سوچ سمجھ کر بات کرو ورنہ میں ڈینگ کی بساط سمیٹ دوں گی۔ جس پارٹی کو وہ لڑکی دینی ہے، اُسے خانزادی تھا کر اپنی جان چھڑا لوں گی۔“

”میڈم! اپنا بنا بنایا گروپ ختم نہ کرواؤ، سیدھی طرح.....“

”ٹھیک ہے استاد! جب ضروری سمجھوں گی، تمہاری ہدایات پر عمل کر لوں گی۔ کچھ اور کہنا ہے تو کہہ لو، میں بہت مصروف ہوں۔“

”استاد کی آواز مزید سرد ہو گئی، بولا۔ ”یعنی تم مرنا چاہتی ہو؟“

”ایک نہ ایک دن تو مرنا ہی ہے ناں!“ میڈم کے لہجے سے جھلکتی بے پردائی میرے لیے حیرت انگیز تھی۔ ”اگر تمہاری یادداشت کام کرتی ہے تو سبق سیکھو اس دن سے جب تم طاقت کے گھمنڈ میں میری طرف آئے تھے، ہمارے گروپ آپس میں ٹکرائے تھے..... کیا ہوا تھا؟ تمہاری ایک بے وقوفی نے تمہیں جان کے لالے ڈال دیے تھے۔“

”وقت ایک سا نہیں رہتا میڈم! تم نے سردار کی بیٹی پر سپاری لگا کر اچھا نہیں کیا۔ ہماری دنیا کا یہ اصول بھی نہیں رہا۔ ہم دوسروں..... پر ہاتھ اٹھاتے ہیں مگر ایک دوسرے کی عزت پر میلی نگاہ نہیں ڈالتے۔ اگر تمہارا کوئی گھر بار ہوتا تو تمہیں اب تک اس حماقت کی سزا مل چکی ہوتی۔ خیر! اب بھی تم کہاں تک چھپی رہ سکتی ہو۔“

میڈم پر اس کی خنک آواز اور خطرناک دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا، تمکنت سے بولی۔ ”میرا شاہ کے عذاب سے بچ جاؤ تو بہتر ہے استاد بیلو! وہ ایک حد تک تمہاری گستاخیاں برداشت کرے گا پھر تمہارا جیتا دو بھر کر دے گا۔ تم عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پروین نامی لڑکی

میرے حوالے کر دو، اپنی اسما لے جاؤ..... اپنے سردار کو سمجھا دو کہ پروین اپنے چہرے پر جتنے تھپڑ سجا کر آئے گی، اسما اتنی چیخیں اپنے پلو سے باندھ کر رخصت ہو گی۔“

استاد بیلو بہت بنجیدہ مزاج آدمی تھا۔ وہ میڈم کو خطرناک دھمکیاں بھی کمال بنجیدگی سے سپاٹ لہجے میں دے رہا تھا۔ میڈم کی بات سن کر اس نے اچھا تو پھر انتظار کر دیا اور فون بند کر دیا۔ میڈم چند لمحے تک فون کی اسکرین کو گھورتی رہی پھر میرا شاہ کو کال کر کے استاد بیلو سے ہونے والی بات چیت دہرانے لگی۔ میرا شاہ نے بتایا کہ کونسی میں موجود افراد بھی پوری طرح چوکس ہیں اور کونسی کے باہر سیشل فورس تعینات ہے جو استاد بیلو کے استقبال کے لیے پوری طرح ہتھیاروں سے لیس ہے۔ اس نے میڈم کو بے فکر رہنے کا مشورہ دیا اور فون بند کر دیا۔

دس پندرہ منٹ تک میڈم آنکھیں موندیں ساکت پڑی رہی، میں کرسی میں بیٹھا ایک ٹک اس کے ماتھاب چہرے کو دیکھتا اور سوچتا رہا کہ..... اتنی نازک اندام عورت کس طرح اتنے بڑے نیٹ ورک کو کامیابی سے چلا سکتی ہے۔ اس کے سر پر موت کی پرچھائیاں منڈلا رہی تھیں مگر وہ دسبر کی جھیل کے ٹھہرے ہوئے خنک پانی کی طرح پرسکون تھی۔ کوئی تلامطم، کوئی بھنور، کوئی شور..... کچھ بھی تو نہیں تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ اس کے نزدیک معمول کے حالات ہوں جو اپنی روانتی چال سے آگے کی طرف بڑھتے جا رہے ہوں۔

میں نے ابھی تک اسے چیخا، چلاتا، رعب جمانا یا جھنجھلاتا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ یہ دیکھا تھا کہ اس کا رویہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ بڑا مشفقانہ تھا۔ وہ اپنی گفتگو، رکھ رکھاؤ اور حرکات و سکنات سے کسی طور پر بھی جراثیم پیشہ گروہ کی سرغنہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے ابھی تک جن لوگوں کو سی ٹو میں دیکھا تھا، وہ بھی شکل و صورت سے نہ تو غنڈے دکھائی دیتے تھے اور نہ ہی بدقاش..... یونیورسٹی لیول تک پڑھے لکھے ہوئے لوگوں کا گروہ میڈم کی منہمی میں تھا۔ میں نے جن بد معاشوں کی کہانیاں پڑھ سن رکھی تھیں، اخبارات میں جن پولیس مقابلوں کی روئیدادیں پڑھ رکھی تھیں، ان کے کردار ان کرداروں سے یکسر مختلف تھے۔

میرا شاہ اور میڈم شکیلہ کی باہمی گفتگو سے پتا چلا تھا کہ وہ منشیات کی سپلائی کا کاروبار کرتی تھی۔ سونیا نے ایک رُخ سے پردہ کشائی کی تھی کہ میڈم لڑکیوں کو بڑے سرکاری افسروں اور سیاست دانوں کے بستروں کی زینت بناتی تھی۔ وہ اور کیا کرتی تھی؟ یہ تو آنے والا وقت ہی مجھ پر عیاں کر سکتا

تھا۔ سردار حیدر خان اور اُس کے خونخوار گروے استاد بھلو سے ٹکر لینے کی جرأت کوئی عام عورت نہیں لے سکتی تھی، یہ میں نے حالات کی کروٹیں دیکھ کر اندازہ لگایا تھا۔ وہ بڑے دھڑلے سے حیدر خان کی موٹھیں اپنے پاؤں تلے دبائے بیٹھی تھی۔

اچانک اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ چونکہ میں بڑی محویت سے اُسے دیکھ رہا تھا، اِس لیے جھینپ گیا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، میں نے تمہیں یہ حق دے رکھا ہے۔“

”جی میڈم.....“ میں نے سر جھکالیا۔ وہ بولی۔ ”جب تم نے سائیں دل جیت کو قتل کیا، تب تمہیں کوئی ڈر نہیں لگا؟“

”نہیں میڈم..... تب میرا خون کھول رہا تھا۔ بعد میں، جب میں نور پور سے نکل رہا تھا، تب میرا دل خوف سے دھڑک رہا تھا۔“

”یقین نہیں آتا کہ تم نے اتنی آسانی سے سائیں جیسے طاقت ور شخص کو بے بسی کی موت مار دیا۔“ اِس کے الفاظ استعجاب آمیز تھے مگر لہجہ قطعی ساٹ تھا۔ ”کیا واقعی سائیں نے اپنی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں کر رکھا تھا؟“

”جی میڈم..... اگر اُس کا کوئی شخص پہرے پر تھا بھی تو میرے سامنے نہیں آیا۔“

”تم اسلحہ استعمال کر سکتے ہو؟“ ”جی..... کالج کے دور میں عرفان مرزا نے مجھے تربیت دی تھی۔“

”عرفان مرزا..... وہ کون؟“ ”وہ ایک اسٹوڈنٹ تنظیم کا لیڈر تھا۔ میں اُس کا نائب تھا۔“

”اوہ یس! وہ عرفان مرزا..... لمبے قد والا۔ تو تم ملتان میں ہی پڑھتے رہے ہو۔ یہ زیادہ پرانی بات تو نہیں..... عرفان مرزا تو بڑا چالاک اور مہذب پرست آدمی ہے۔“ اُس کے ہونٹ سکڑ گئے، بولی۔ ”ایک دو مرتبہ اس سے واسطہ پڑا ہے، جھکا کر دے کر نکل گیا۔ یہ بتاؤ! تم نے اس سے کیا کچھ سیکھا؟“

میں نے تفصیل سے آگاہ کیا تو خوش ہو کر بولی۔ ”ویری گڈ! وہی تربیت تمہارے کام آگئی اور تم نے سائیں دل جیت جیسے سائڈ کو پتھما ڈ کر رکھ دیا۔ ویسے بھی دل جیت کی زبان چلتی تھی، شراب نوشی اور زنا کی کثرت نے اُس کے ہاتھ پیر بھل کر دیے تھے۔ اُسے یہ سمجھ نہ تھا کہ کوئی اُس کی سلطنت پر حملہ آور نہیں ہو سکتا۔ یہی غرور اور بے پروائی اُسے اتنے ڈوبی اور تمہارا دل چلی گیا۔ کیا سائیں جیسے کسی اور نے

ہاتھی کو گرانا پڑے تو تمہارے بازو کام کریں گے؟“ میں نے کہا۔ ”مجھے یقین کی حد تک شبہ ہے کہ میری واپسی کی راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ لوٹوں گا تو بے موت مارا جاؤں گا۔ آگے بڑھوں گا تو مجھے راستے کے کانٹے صاف کرنا ہوں گے۔“

اُس نے میرے جملے سے اپنے مطلب کی بات اخذ کر لی اور کہا۔ ”اوکے! اب تم جاؤ اور اسکا کو میرے پاس لے آؤ۔“ ”کیوں؟“ کالفظ میرے لبوں سے پھسلنے پھسلنے آ نکلا گیا اور میں اٹھ کر ریٹائرنگ روم کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحوں بعد میں سونیا کے کمرے میں بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز اسکا کے سامنے کھڑا تھا۔ سونیا سونے پہ بیٹھی تھی، بولی۔ ”کیا بات ہے؟ میڈم نے کچھ کہا ہے؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں! میڈم نے حکم دیا ہے کہ میں اسکا کو اس کے کمرے میں لے جاؤں۔“

وہ کندھے اُچکا کر نیم بے پروائی سے بولی۔ ”تو لے جاؤ.....“

میں نے اسکا کو دیکھا۔ وہ جاگ رہی تھی اور بڑے غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”اٹھو! تجھے میڈم نے بلایا ہے۔“

اگر وہ کہیں اور ملی ہوتی تو میں اُسے اپنی خاندانی روایات کے مطابق ”اٹھو بی بی جی!“ کہتا۔ یہاں نہ تو وہ بی بی جی تھی اور نہ ہی میں نور پور کا دیہاتی نوجوان تھا۔

وہ چونکی، دھیرے سے بولی۔ ”کون میڈم؟“ میں نے کہا۔ ”میرے ساتھ چل کر دیکھ لو۔“

وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ”میں کہیں نہیں جاؤں گی، خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو مجھے.....“

سونیا اٹھ کر میرے عقب میں آن کھڑی ہوئی تھی۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”باتوں میں وقت ضائع نہ کرو ورنہ میڈم کا موڈ خراب ہو جائے گا۔“

”تو کیا کروں؟ وہ اٹھے تو تب ناں؟“ میں سونیا کی طرف پلٹا۔

ایک طنزیہ مسکراہٹ اُس کے لبوں پر چل گئی۔ بولی۔ ”کیا تمہیں خدا نے ہڈ پیر نہیں دے رکھے؟“

اُس کے انداز نے مجھے سمجھا دیا کہ اسکا اگر نہیں جانا نہیں چاہتی تو مجھے اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے اُسے میڈم کے قدموں میں لے جا کر پھینکنا ہوگا۔

میں نے قد سے درشت لہجے میں اسکا سے کہا۔ ”اٹھو،

پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپ کو تمام ڈائجسٹ

ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ

آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ

لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

مجھے اٹھانے پر مجبور کرو گی تو پچھتاؤ گی۔“

اُس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرزیں اور وہ ایک جھٹکے سے، پیچھے دیوار کی طرف کھسک گئی۔ دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا کر چیخیں۔ ”خدا کے لیے شہر یار! تم تو ایسا نہ کرو..... مجھے اس جہنم سے نکالو۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہی۔“

مجھے ایک جھٹکا سالگا۔ میرا اور سونیا کا سوا ٹنگ ناکام ہو گیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ میں شہر یار ہوں۔ میں نے ایک پاؤں بیڈ کے فوم پر رکھا اور اُسے کلائی سے پکڑ کر بے دردی سے کھینچ لیا۔ اس نے تڑپ کر میری گرفت سے لٹکنا چاہا مگر کامیاب نہ ہوئی اور قالین پر آن گری۔ چند لمحے قالین پر پڑی رہی پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر مجھ پر حملہ آور ہو گئی۔ اُس کے بائیں ہاتھ کے ناخن میرے رخسار میں گڑ گئے۔ اُس کی غیر متوقع حرکت اور تیز چھین نے مجھے اُس کی کلائی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ چیخ کر پھر مجھ پر حملہ کرنے کے لیے بڑھی۔ اس کے رد عمل نے مجھے بے حد برا بیخود کر دیا اور میں نے اپنی پوری قوت سے تھپڑ اُس کے چہرے پر جڑ دیا۔ وہ پیروں پر گھوی اور لڑکھڑا کر بیڈ پر پیٹ کے تل جا گری۔ بے اختیار میرا ہاتھ میرے رخسار تک گیا، پلٹا تو ہیلی پر خون کا بڑا ساداغ نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے ناخن جلد میں خاصی گہرائی تک کھب گئے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ تکلیف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

میں نے دانت پیس کر آدمی بیڈ پر، آدمی بیڈ سے نیچے، او دمی پڑی اسکا کودیکھا۔ پھر کی زوردار ٹھوکر سید کی اور کمر پر لہرائی ہوئی زلفوں کو مٹھی میں جکڑ کر جھٹکا دیا۔ اُس کے حلق سے دردناک چیخ نکلی اور وہ زخمی ناگن کی طرح تل کھا کر پلٹی۔ اس کا حملہ کار گرنے نہیں ہوا کیونکہ اب میں سنبھل چکا تھا۔ میں نے بالوں کو جھٹکا دیا تو وہ سنبھل نہ سکی اور کمر کے تل زمین پر گر گئی۔ اس کے منہ سے خون رسنے لگا تھا۔ نازوں پٹی ہوئی لڑکی پر میرا ہاتھ کچھ زیادہ ہی سخت پڑ گیا تھا۔

میں نے دو تین ٹھوکریں اُس کے پہلو میں ماریں اور گھسیٹنا چاہا۔ وہ کراہی اور میرے پیروں سے لپٹ گئی۔ ”خدا کے لیے شہر یار! مجھ پر رحم کرو..... مجھے مت مارو.....“

اُس کی آواز میں بہ یک وقت شدید رنج اور شکوہ غالب تھا۔ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اٹھو.....“

اُس نے میرا وہ ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں سختی سے دبوچ لیا جس میں اُس کے بال جکڑے ہوئے تھے۔ آہستہ سے اٹھی اور کراہتے ہوئے بولی۔ ”میں نے کیا بگاڑا.....“

”بکواس نہ کرو.....“ میں نے اپنا ہاتھ تھپڑ مارنے کے لیے لہرایا۔ اس نے ڈر کر سر پیچھے کیا۔ ایسے میں اُس کی آنکھیں

فرط خوف سے پھٹنے کو آ رہی تھیں۔ میں نے بال چھوڑ دیے اور کلائی تمام لی۔ اسے کھینچتے ہوئے سونیا کے کمرے سے نکالا اور ریٹائرنگ روم میں لے آیا۔ بیڈ پر نیم دراز میڈم کے سامنے پیش کر دیا۔ اُس نے یہ غور اسکا کودیکھا۔ ہونٹ پر ہونٹ چڑھا کر مسکرائی اور مستفسر ہوئی۔ ”یہ خون کیسا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”یہ آپ کے پاس آنا نہیں چاہ رہی تھی۔“

اسا چیخیں۔ ”مجھے کیوں یہاں رکھا ہوا ہے تم لوگوں نے، کیا تصور کیا ہے میں نے؟ تم جانتے نہیں ہو کہ میں کس کی بیٹی ہوں؟ میرا باپ تم لوگوں کو الٹا لٹکا دے گا۔“

میڈم کی آنکھیں اُس پر جھمی ہوئی تھیں۔ اُس کی دھمکیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے مخاطب ہوئی۔ ”میں اس کے باپ کا نمبر ملاتی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کی چیخ و پکار اپنے کانوں سے سن لے۔“

میں نے سر تسلیم خم کیا۔ وہ فون ہاتھ میں پکڑ کر اسما سے مخاطب ہوئی۔ ”تمہارے باپ کا موبائل فون نمبر کیا ہے؟“

اسا جلدی سے بولی۔ ”گاؤں میں موبائل فون نہیں چلتا۔“

”گھر کا نمبر؟“

اسا بولی۔ ”زیر و سکس.....“

وہ اٹک اٹک کر بولتی گئی، میڈم بٹن پیش کرتی گئی۔ کال مل گئی۔ اساکچھ کہنا چاہتی تھی مگر سسک کر چپ ہو گئی۔ میڈم کا فون پر رابطہ ہو گیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”سردار صاحب سے بات کروائیں۔ فوراً!“

ایسے ہی وقت میں اسما نے قدم بڑھایا۔ میڈم کی توجہ اُسی پر مرکوز تھی، فوراً بولی۔ ”اسے روکو، جب کہوں، تب اُس کے حلق سے چیخیں برآمد کرانا..... اوکے؟“

میں نے اسما کے بال مٹھی میں بھر لیے۔ وہ سسک کر پلٹی اور مجھے گھورتے ہوئے، دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔ ”چھوڑو میرے بال..... کیہنے.....“

میں نے ہاتھ اٹھایا۔ وہ سہم کر بولی۔ ”نہیں..... خدا کے لیے نہیں.....“

اُس کی آواز کی تندہی سسکیوں میں ڈھل گئی اور وہ بے دم سی ہو کر ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

میڈم کی آواز سنائی دی۔ ”سردار حیدر خان! کیسے ہو؟“

ملتان سے میڈم ٹھیکہ بات کر رہی ہوں۔“

سردار حیدر خان کی بات سن کر ایک زہر خند مسکراہٹ میڈم کے لبوں پر ثبت ہو گئی۔ بولی۔ ”انسانوں کی طرح

میری بات سنو۔ میں جانتی ہوں کہ تمہاری پہنچ بہت اورتک ہے۔ تمہیں شاید یہ بات کہتے ہوئے یاد نہیں رہا کہ اوپر والوں کے سر میرے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں نے تمہیں فون اس لیے کیا ہے کہ تم نے سیکڑوں معصوم لڑکیوں کی درد بھری چیخیں سن رکھی ہیں۔ ہزاروں فریادیں تمہارے کانوں کے پردوں پر ثبت ہیں۔ آج ایک نئی آواز سنو اور محسوس کرو.....“

اسی وقت اُس نے بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں پھیلائیں اور مخصوص انداز میں ہاتھ کو نیچا کر مجھے اشارہ کیا۔ میں نے اسما کے بالوں کو زوردار جھٹکا دیا۔ اسما کے ہونٹوں سے ایک سکاری نکلی۔ میڈم نے مایوسی سے سر ہلایا۔ میں نے اُس کا چہرہ اپنی جانب کیا اور اٹھنے کا تھپڑ اُس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ اُس کے حلق سے دردناک چیخ نکلی۔ میں نے پھر ہاتھ اٹھایا۔ دوسری چیخ پہلی سے کہیں زیادہ المناک تھی۔

میڈم نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور فون میں بولی۔ ”کیسی خوب صورت آواز ہے سردار صاحب! پہچانی؟“

سردار حیدر خان نے کیا کہا، علم نہیں مگر اُس کی بات سن کر میڈم کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ سرد لہجے میں بولی۔ ”ان دھمکیوں پر عمل کرنے کے لیے تمہارے پاس طویل وقت پڑا ہے سردار حیدر! لیکن اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے ملنے والی مہلت بہت کم ہے۔ فوراً میری مطلوبہ لڑکی میرے حوالے کر دو اور اپنی بیٹی وصول کرو ورنہ تمہاری بیٹی بھی انہی کوٹھیوں کی دہن بنے گی جن حویلیوں کے آگن تم نے آج تک آباد کیے ہیں۔ آج رات بارہ بجے..... اُس کے بعد..... اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی سودے بازی نہیں ہوگی۔“

جملہ مکمل ہوتے ہی اُس نے ہونٹ کھینچ کر کال منقطع کر دی۔ کچھ سوچ کر فون پاور ڈ آف کر دیا۔ اسما کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”خانزادی! اب گیند تمہارے باپ کے کورٹ میں ہے۔ چاہے تو نمبر حاصل کر لے، چاہے تو فاول کھیل کر پوائنٹ گنوالے۔“

اسما کا سر جھکا ہوا تھا۔ سسکیوں کی تال پر جسم جھٹکے لے رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ نڈھال انداز میں فرش پد چم رہی تھی۔ وہ ہوش میں تھی مگر اس کے بدن میں طاقت نہیں رہی تھی۔ میں نے اُسے کھینچ کر اٹھانا چاہا تو میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا، بولی۔ ”اسے اٹھا کر سونیا کے کمرے میں چھوڑ آؤ۔ خوبصورت چہروں کو اتنا بگاڑنا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ تھوڑا سہلا دینا.....“

اس کے لہجے سے جھٹکا ہوا طنز بڑا زہر ملا تھا۔ میں نے

اسما کو اٹھنے کا حکم دیا۔ وہ نفی میں سر ہلا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”تم ظالم لوگ ہو، تم انسان بھی نہیں ہو۔ ذلیل کرنے سے بہتر ہے تم مجھے مار ڈالو..... مجھے زندہ مت چھوڑو۔“

میں نے کہا۔ ”زیادہ باتیں نہ کرو، اٹھو..... جب مارنے کا وقت آئے گا، رعایت نہیں کی جائے گی۔“

وہ بدستور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں اٹھ نہیں سکتی۔“

میں نے جھک کر اُسے ہاتھوں میں بھر کر اٹھالیا۔ اس کے بدن میں حسن کی تمام تر تابناکیاں موجود تھیں مگر وزن نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں اُس کے بازوؤں کو چھوا تھا۔ کھالے کے رد عمل نے مجھے دنیا کا خوش قسمت مرد قرار دیا تھا۔ آج وہ میری ہاتھوں کے حصار میں، میری دسترس میں تھی مگر میرے پہلو میں دھڑکنے والا دل پہلے سے جذبات سے عاری تھا۔ اُسے ہاتھوں میں بھرے ریٹائرنگ روم سے نکلا۔ بڑے کمرے میں آیا۔ پاؤں قالین پر پڑے نیچے میں الجھا اور توازن برقرار نہ رکھ پاتے ہوئے اُسے لیے قالین پر جا گرا۔ وہ میرے نیچے دب گئی۔ اُس کے حلق سے چیخ نکلی، کراہی۔ ”ہائے! مر گئی.....“

میں جلدی سے اٹھا اور اسے گھسیٹ کر سونیا کے کمرے میں لے گیا۔ اس دوران اسما کی کراہیں میری سمع خراشی کرتی رہیں کیونکہ میں اتنا ظالم فطرت بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے بھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا، نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود ندامت، تکلیف یا رحم دلی کا کوئی جذبہ میرے سینے میں نمودیر نہیں ہوا تھا۔

میں نے اسما کو بیڈ کے پاس لا کر پھر ہاتھوں میں بھر اور اٹھا کر بیڈ پر بیٹھ دیا۔ وہ پہلو کے تل بیڈ پر گری اور بے جان انداز میں لیٹ گئی۔ اس کے ہونٹوں کے دونوں گوشوں سے خون رس رہا تھا اور رخساروں پر پھیل رہا تھا۔ آنکھیں مجھ پر ساکت انداز میں ثبت تھیں۔ اپنی بے توقیر فریاد زبان کے بجائے آنکھوں سے عیاں کر رہی تھی جسے نظر انداز کرنا میرے لیے ناگزیر تھا۔ میں اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

سونیا کے نزدیک جیسے اس واقعے کی کوئی اہمیت نہیں تھی، وہ سونے میں پھر کر بیٹھی میگزین پڑھ رہی تھی۔ نظریں اٹھائے بغیر بولی۔ ”گڈ شو مسٹر بینڈم! مارتے ہو، ہاتھوں میں بھر کر اٹھاتے ہو اور جوانی کی شراب پینے سے کتراتے ہو، کیا تضاد ہے؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو بولی۔ ”آب اس خونخوار بلی کا نقشہ بھی درست بھی کر دو۔ الماری میں کاشن،

خدارا © خدارا شوگر مریض ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبہ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دوا خانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0308-6627979

0547-521787

”تم نے نہیں، تمہارے باپ نے پنگا لیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میری میڈم کا کچھ لین دین ہے، نمٹ جانے پر تمہیں گھر پہنچا دیا جائے گا۔“ ”کیا وہاں سب کو میرے اغوا کا پتا چل گیا ہے؟“ اس نے اپنی غم آنکھیں مجھ پر مرکوز کر دیں۔ ”مجھے تمہارے وسیب کے بارے کچھ علم نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم شہر یار ہی ہونا؟“ اس نے اچانک بڑے معصوم انداز میں پوچھا۔

میں نے چہرے پر بیزاری کے آثار ثبت کئے، کہا۔ ”یہ شہر یار کون ہے جس کا تم بار بار نام لیتی ہو۔ کہہ چکا ہوں کہ میرا نام شہر یار نہیں ہے۔“ ”پھر تمہاری شکل اُس سے کیوں ملتی ہے؟“ ”یہ سوال تم اُس سے کرنا۔“ ”کیا وہ مجھے ملے گا؟“

”میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“ ایسے ہی وقت کمرے میں ٹیلی فون کی بیل بجی۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ کوئی فون سیٹ نظر نہیں آیا۔ بیل بدستور بج رہی تھی۔ میری سراسیمگی دیکھ کر اس سنگھار میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ..... انٹرکام بج رہا ہے.....“

سنگھار میز اور سونے کے درمیان دیوار پر نصب چوبی اسٹینڈ پر انٹرکام دھرا تھا۔ میں نے ریسپورڈ اٹھا کر کانوں سے لگایا۔ میڈم کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”شہر یار! تمہارا چھپنا بے محل ہے۔ اسما سے سیدھی سیدھی بات کرو۔ میں نے اُس کی آنکھیں پڑھ لی ہیں۔ وہ تمہارے کسی جھوٹ پر یقین نہیں کر رہی۔ اس لیے فضول کوششوں سے بہتر ہے کہ تم اُسے سردار حیدر کے کالے کرتوتوں سے آگاہ کرتے ہوئے اپنے لیے ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔“

”جج..... جی میڈم.....!“ فرط استعجاب سے میرے منہ سے لفظ برآمد نہ ہوئے۔ یہ عجب گورکھ دھندا تھا، عجائب خانہ انسان تھا۔ وہ دور پیچھے نہ صرف ہمارے مکالمے سن رہی تھی بلکہ اُس نے اسما کی آنکھوں میں موجزن قلبی یقین کی وارداتوں کا جائزہ بھی لے لیا تھا۔

میں نے کہا۔ ”جی میڈم..... آپ بہت ذہین ہیں۔“ ”تم نے میری ذہانت دیکھ لی، اچھی بات ہے۔ اب تم مجھے اپنی اہلیت دکھاؤ۔ میں بھی دیکھوں کہ تم بگڑی ہوئی خازن کو کسے اپنے دام میں لاتے ہو۔“ اس کی نفرت کی ہنسی میں ترغیب، چیلنج اور آزادی کی بخشش شامل تھی۔

زار میں آئے تھے..... جب موٹی اور اُس کے غنڈے میر تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے اور.....“ میں نے اپنے چہرے کو اسپاٹ رکھا اور قدرے غصے سے کہا۔ ”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ ”نہیں.....“ اُس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا، آنکھیں موند لیں اور بولی۔ ”میرا دماغ خراب نہیں ہوا۔ میری نظر کمزور نہیں ہے۔ میں تمہیں پہچان چکی ہوں کہ تم شہرے خان ہو۔ نور پور کے رہنے والے ہو۔ خدا کے لیے مجھے اتنا بتا دو کہ تم لوگوں نے مجھے کیوں اغوا کیا ہے؟ کیا تم لوگ مجھے قتل کر دو گے؟“

اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے میں ہاتھ روم میں نصب شدہ واش بیسن کی ٹونٹی سے پانی بھر لایا۔ پھر میڈیکل کٹ کھول کر سپرٹ، آسٹینٹ اور کاشن رول نکالا۔ سزر اور دوسرے ضروری آلات نکال کر کٹ کے کھلے ہوئے ڈھکن پر رکھے اور چاہا کہ اس کے چہرے اور گردن پر چپکنے والے خون کو صاف کر دوں مگر اس نے میرے ہاتھ کو جھٹک کر جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”میں نے کیا پوچھا ہے؟“ میں نے آنکھیں دکھائیں۔ ”کیا تم مجھے حتیٰ پر مجبور کر رہی ہو؟ میں نہیں چاہتا کہ تم پر ہاتھ اٹھاؤں مگر تم نجانے کس مٹی کی بنی ہو کہ تم پر اثر نہیں ہوتا۔“

میں نے اُس کی کلائی پکڑ کر جھٹکا دیا۔ وہ میرے چار حانہ روئے کو بھانپ کر خوف زدہ ہو گئی اور سسکتے ہوئے قریب ہو گئی۔ میں نے پانی میں بھیگی ہوئی روئی سے اُس کے رخسار اور گردن کی جلد کو صاف کیا۔ تازہ خون کے نیچے جما ہوا خون ذرا مشکل سے صاف ہوا۔ اُس کے ہونٹوں کو صاف کیا اور منہ کھولنے کا حکم دیا۔ ماؤتھ جیک کی مدد سے منہ کھولا اور رخساروں کی اندرونی جلد جو تھپڑ کے زور پر دانتوں سے ٹکرا کر کٹ گئی تھی، صاف کی اور کاشن کے ننھے ننھے سویب بنا کر جلد پر چپکائے۔ اُس کی خاموش آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ایک اینٹی بائیوٹک کپسول اور پونشان کی گولی کھلائی اور پانی سے بھرا گلاس لبوں سے لگا دیا۔

وہ بولی۔ ”جب مارنا ہی ہے تو پھر مرہم لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ بتاؤ، تم کیا چاہتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”میں کچھ نہیں چاہتا۔ میری میڈم چاہتی ہے کہ تم اس کے ساتھ تعاون کرو۔ جو کہا جائے، بلا جوں جوں اس پر عمل کرو۔ یہ مارا ماری میڈم کو پسند نہیں ہے مگر.....“

”مگر میں نے کیا بگاڑا ہے تمہاری میڈم کا؟“ وہ کراہی۔ منہ میں کاشن سویب رکھے جانے کی وجہ سے اُس کی قوت گوپائی متاثر ہوئی تھی۔

اسپرٹ اور گچھر وغیرہ پڑے ہیں۔“ ”کیا مطلب؟“ میں چونکا۔

”میڈم کو بد صورت لوگ اچھے نہیں لگتے ناں! فرسٹ ایڈ بکس نکالو اور اس کے زخموں پر اسپرٹ لگا کر کاشن سویب رکھ دو۔“ وہ پہلی سی بے پردائی سے بولی۔ ”کیا تمہیں میڈم نے کہا نہیں؟“

مجھے میڈم کا طنزیہ انداز میں کہا گیا جملہ ”ذرا سہلا دینا“ یاد آیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری میں جدید نوع کی میڈیکل کٹ پڑی تھی۔ اس میں موجود سامان کا سرسری جائزہ لیا۔ اس سے پہلے نور پور کے سرکاری اسپتال کی کٹ دیکھ رکھی تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی سے ابتدائی طبی امداد بہم پہنچانے کے بہت سے قاعدے ضابطے سیکھ رکھے تھے۔ سیکھا ہوا ہنر کام آنے والا تھا۔ کٹ اٹھائے بیڈ پر آیا۔ اُسے پکارا تو جواب نہ دار..... جھنجھوڑا تو اس نے بیزاری سے مجھے اور میرے ہاتھوں میں دبی میڈیکل کٹ کو دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

میں نے کہا۔ ”چہرہ ادھر کرو، زخم کی صفائی کر دوں۔“ میرے عقب میں سونیا کی آواز ابھری۔ ”تم اس کی بیڈ تچ کرنے کے ساتھ ساتھ نگرانی بھی کرو۔ میں آپریشن روم میں جا رہی ہوں۔“

لگتا تھا کہ وہ اسما کی نگرانی کے نام پر قید میں رہتے ہوئے بور ہو گئی تھی اور کمرے سے نکل کر چلنا پھرنا چاہتی تھی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ جونہی کمرے سے نکلے، اسما ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی اور میرا ہاتھ تھام کر بولی۔ ”یہ ڈراما بازی بعد میں کرنا، پہلے میرے سوالوں کا جواب دو؟“

میں نے اپنے لہجے میں درستی سموتے ہوئے کہا۔ ”کیا مطلب؟ کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“

”تم شہر یار ہی ہونا..... نور پور والے؟“ اُس کے لہجے میں دکھ آمیز امید کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ تن پر اتنا کچھ بیتیے کے بعد بھی اُس کی سوئی وہیں اُٹکی ہوئی تھی۔

میں نے دانت پیس کر کہا۔ ”میں نہ تو کسی شہر یار کو جانتا ہوں اور نہ ہی نور پور سے کچھ واسطہ رکھتا ہوں..... کچھ اور پوچھنا ہے؟“

اسے میری بے گامگی اور بدتمیزی سے دکھ پہنچا۔ مایوس ہو کر بولی۔ ”مانو یا نہ مانو، تم شہر یار ہی ہو۔ پہلی مرتبہ میں نے تمہیں چاچے دریا کی دمی (بیٹی) کی شادی پر بڑے غور سے دیکھا تھا۔ بدتمیزی میری تہہ دیکھا تھا جب تم خالد کے ساتھ چمن

میں نے انٹرکام کارسیور کرڈل پر رکھ دیا۔ پلٹ کر بیڈ پر سرائفندہ براجمان اسما کے پاس آیا۔ غربت نے آگاہ کیا کہ وہ گھنٹوں پر سر رکھے سسک رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”کیا رونے دھونے سے تمہیں نجات مل جائے گی؟“

اُس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ آنکھیں اشکوں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ بولی۔ ”تم کیوں نہیں مانتے کہ تم شہر یار ہو؟“

مجھے اُس کی ذہنی حالت پر ترس آیا۔ وہ سوچتی کچھ تھی، بولتی کچھ تھی۔ شاید وہ ڈوبتے ہوئے اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ میں اُسے سہارا دے کر پتھن پر لے جاسکتا ہوں۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اور تم کیوں اپنی بات منوانے پر بضد ہو؟“

”تم شہر یار ہی ہو..... مگر ڈر کے مارے مکر رہے ہو۔ تمہیں میرے بابا کا ڈر ہے۔ کوئی اور جانے، نہ جانے، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بابا تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”مجھے تمہارے باپ کا کوئی ڈر نہیں ہے۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”فرض کیا، میں ہی شہر یار ہوں، پھر؟“

”پھر..... پھر.....“ وہ بولتے بولتے الجھ گئی۔ اس نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ اگر میں واقعاً شہر یار ہوں تو مجھے کیا کہنا چاہیے؟ میرے لبوں پر ابھرتی ہوئی مسکراہٹ دیکھ کر ایک ذرا تلملائی، پھر سنبھل کر بولی۔ ”خالہ کہاں ہے؟“

مجھے اس سوال کی توقع تھی، کہا۔ ”میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ہم چمن زار کے گیٹ پر بچھڑے تھے، پھر آج تک ہم مل نہیں پائے۔“

اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک ابھری اور اس نے آنکھیں موند لیں۔ چند لمحوں تک بیٹھی الفاظ جمع کرتی رہی، پھر بولی۔ ”میں ناں کہتی تھی کہ تم وہی ہو..... ہاں! مجھے ’بی بی جی‘ کہتے تھے ناں تم؟ پھر اسی بی بی کو بھری دنیا میں بے عزت اور ننگا کر دیا..... ہیں؟ اب بتاؤ، میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ کیا تکلیف دی تھی؟“

میں نے سر جھکا لیا۔ اُس پر جھنجھلاہٹ کا دورہ پڑا۔ اُس نے بغیر سانس لیے کئی سوال کیے، کئی طعنے دیے اور اپنے طور پر ہی ان کے جوابات سے سرفراز کیا۔

جب وہ بول بول کر تھک گئی تو میں نے سر اٹھایا اور کہا۔ ”اسما! احترام ہمیشہ دو طرفہ ہوتا ہے۔ محبت کی شاہراہ بھی دور وید ہوتی ہے۔ تمہیں ’بی بی جی‘ کہا کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ میری بہن کو بھی احترام ’بی بی جی‘ ہی کہہ کر پکارا جائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہم ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ ایک ہی

خون..... ایک ہی جاتی..... کیا ہوا جو تمہارے بابا کے پار جاگیر اور روپیہ پیسہ آگیا اور ہم تہی دست رہ گئے۔“

میں نے بیڈ چھوڑ دیا۔ پشت پر ہاتھ باندھ کر مقابل کی دیوار تک گیا، پلٹا، کامل سنجیدگی سے بولا۔ ”سردار حیدر خان، تمہارا بابا، بیساکھیاں مانگنے نور پور آیا کرتا ہے۔ اُسے اسمبلی تک پہنچنے کے لیے ہم دیہاتوں اور غریب لوگوں کے ووٹ درکار ہوتے تھے۔ تب بھی ہم نے کبھی اُسے مانگنے کی اذیت سے دوچار نہیں کیا بلکہ اس کی آؤ بھگت کرتے ہوئے یقین دلایا کہ ہمارے ووٹ اُس کے انتخابی نشان سے چپکے ہوئے ہیں۔ بھلے وہ ہمیں کوئی گلی، تالی، پٹی یا سولنگ دے، نہ دے، ووٹ اُسے ہی ملیں گے۔ ملتے بھی رہے..... نور پور کے کسی لڑکے کو تمہارے پاپا نے آج تک نوکر نہیں لگوا یا۔ کسی بیٹی کے لیے جہیز فنڈ سے رقم نکلا کر نہیں دی، پھر بھی نور پور والے اُس کے جوتے سیدھے کرتے ہیں۔“

وہ آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہی تھی اور میرے لبوں سے برآمد ہونے والے زہر خند الفاظ انہماک سے سن رہی تھی۔ میں نے گلا کھنکار کر سلسلہ کلام جوڑا۔ ”اسما! تمہیں بی بی کہا کرتا تھا، مگر آج نہیں کہوں گا کیونکہ آج تم عامی لڑکی ہو جس کا نام ’اسما‘ ہے۔ میری نظر میں تم خاندادی نہیں رہی ہو بلکہ کمین زادیوں سے بھی بدتر لڑکی ہو۔ تمہارے باپ نے میری بہن کو اغوا کر لیا ہے۔ کیوں؟ جانتی ہو کیوں؟..... اس نے اپنی جنسی بھوک مٹانے کے لیے اپنی برادری کی غریب بیٹی کو، اپنی ہی بیٹی کو لقمہ بنایا ہے۔ وہ اب بھی اُس کی تحویل میں ہے۔ میں شاید کبھی بھی یہ حرکت نہ کرتا مگر تمہارے بابا کی کمینگی کی وجہ سے تمہیں یہ دن دیکھنا پڑا۔ تجھے اسی طرح اغوا کرنا پڑا جس طرح تمہارے بے غیرت باپ نے میری بہن کو جیتے جی بے غیرتی کی دلدل میں اتار دیا گیا۔ وہ اگر زندہ بچ بھی گئی تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گی۔ ہر انگ، ہر نگاہ..... تیر بن کر اُس کا بدن چھیدیں گی۔ جبکہ تم یہاں سے جانے کے بعد بالکل ویسی ہی ہوگی، جیسی یہاں لائے جانے سے پہلے تھیں کیونکہ کسی کو تمہارے بارے میں کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوگی۔“

اُس کے منہ سے ایک کلمہ حیرت تک نہیں نکلا۔ ایک تک مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے اُس کی جانب پشت کر لی اور درشت لہجے میں کہا۔ ”تمہارا باپ، مربعوں رقبے پر چھلی ہوئی جاگیر کا مالک، مل مالک، منہ کالا کرتا ہے تو اُسے کوئی نہیں پوچھتا کیونکہ وہ ہر محسب کے بازوؤں کو آستین سبت خرید لیتا ہے۔ اسے اپنی طاقت پر گھمنڈ ہے۔ بجائے شکست

تسلیم کرنے کے اُس نے اپنے پالتو غنڈے یہاں بھیج کر اعلان جنگ کر دیا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ پروین کو لوٹائے بغیر اپنی بیٹی کو حاصل کر لے گا مگر یہ اُس کی بھول ہے..... تم تب تک یہاں ہو، تب تک عذاب میں ہو جب تک میری بہن اُس کتے کی قید میں ہے۔“

میں اچانک پلٹا۔ تیز قدموں سے چلتا ہوا اُس کے پاس آیا، بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور کہا۔ ”مجھے تم سے، تمہارے بابا سے، خاندان بھر سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میری بہن قدم قدم موت کی طرف دھکیلی جا رہی ہے۔ تم بھی لمحہ لمحہ اذیت ناک اور عزت پاش انجام کی طرف لے جانی جا رہی ہو۔ کیا سمجھیں؟“

مارے تکلیف سے اُس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے، گردن اکڑی ہوئی تھی مگر آنکھیں بول رہی تھیں۔ اُس نے اپنے بال جھڑانے کی مطلق کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے غرا کر کہا۔ ”بولتی کیوں نہیں ہو؟ میں نے مان لیا ہے کہ میں شہر یار ہوں..... نور پور والا شہر یار..... یہ بھی بتا دیا ہے کہ میں نے تمہیں کیوں اغوا کر کے یہاں قید میں رکھا ہوا ہے۔“

اُس نے بدقت تمام کہا۔ ”اب کہنے کے لیے میرے پاس کیا بچا ہے شہرے خان! میرے بال چھوڑ دو، تکلیف ہو رہی ہے۔“

میں نے ہاتھ کو ایک جھٹکا دیا، وہ درد سے کراہی تو میں نے بالوں میں پھنسی ہوئی مٹھی کھول دی۔ وہ اپنے بالوں میں نقاہت سے انگلیاں پھیرتے ہوئے لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ میں نے بیڈ پر بیٹھ کر سر جھکا لیا اور اگلی پیش قدمی کے بارے میں سوچنے لگا۔

ایسے میں اُس کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”شہرے! کیا میری زندگی تمہاری بہن کی زندگی کے ساتھ مشروط ہو گئی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں! اسما! تمہارا بابا جو فصل بیجے گا، تمہیں کاٹنی پڑے گی۔“

”یعنی مجھے ناکر وہ جرم کی سزا دی جائے گی؟“ اُس کے لہجے کی غیر معمولی کاٹ نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ پڑھی لکھی اور بڑے گھر کی لاڈلی بیٹی تھی۔ جونہی میں نے اپنی حیثیت کو تسلیم کیا، وہ مل بھر میں مل کھا کر مستحکم ہو گئی، بولی۔ ”جو کچھ تمہاری بہن کے ساتھ کیا جائے گا، میرے ساتھ بھی کیا جائے گا، یہ طے کر لیا گیا ہے..... ہے نا؟“

میرے اعصاب تن گئے۔ ہونٹ بھیج گئے۔ ہم دونوں ایک ہی محاذ پر مقابل آن ٹھہرے تھے۔ وہ مجھے، میں اُسے

پسپا کرنے کے لیے تیار تھا، میں نے کہا۔ ”ظاہر ہے..... بہن سے بڑھ کر تو کوئی پیارا نہیں ہوتا۔“

”تم پڑھے لکھے ہو شہرے خان! کچھ سوچ کر بولو۔“

”تمہارا بابا ابھی پڑھا لکھا ہے۔ وہ سوچے سمجھے بنا قدم اٹھاتا ہے۔“

”مجھے بابا کا طعنہ نہ دو، میری بات کرو۔“

”تمہارا باپ غنڈہ ہے، بے غیرت ہے۔“

”ٹھیک ہے، ایسا ہی ہوگا۔ تم اپنے بارے میں کیا کہتے ہو؟“

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ بولی۔ ”اُس نے تمہاری بہن کی عزت پامال کرنے کے لیے اپنے اختیارات کو استعمال کیا۔ تم نے اُس کی بیٹی کو قوت بازو کے زور پر اٹھالیا۔ کوئی فرق؟“

”میں نے جوابا ایسا کیا ہے۔ مجھے میری بہن چاہیے۔ جونہی ملی، تمہیں یہاں سے نکالنے میں دیر نہیں کروں گا۔“

”جرم سوالا ہو یا جوابا، اُس کی حیثیت ایک سی رہتی ہے۔“

”تم کہہ سکتی ہو کیونکہ اس وقت تمہاری اور میری قلبی کیفیت جدا ہے۔“

”ہاں! میں اور تمہاری بہن ایک ترازو میں تل رہی ہیں۔ تم نہیں۔“

مجھے میڈم کا فکر تھا۔ وہ نظر آئے بغیر میری اور اسما کی بات چیت سن رہی تھی۔ میں شکست کا بوجھ کا ندھوں پر لا کر اُس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اسامہ بہ دم میرے پیروں تلے سے ریت کھسکائے جا رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ ”شہرے خان! میں جانتی ہوں کہ میرا بابا بظاہر بہت اچھا آدمی ہے مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ ہر وہ جرم دھڑلے سے کرتا ہے جو ہمارے معاشرے کے فیوڈلز کرتے ہیں۔ میں نے کبھی بھی بابا کی ان ایکٹیوٹیز کو پسند نہیں کیا۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ صدف نے تمہیں ڈاکٹر شاہ جی پر حملے کی پیشگی اطلاع دی تھی۔ یاد ہے نا؟ وہ خبر صدف کو کس نے دی تھی؟ تم نہیں جانتے۔ بتائے دیتی ہوں۔ میں نے ہی صدف کو تم تک یہ اطلاع پہنچانے کے لیے دی تھی۔ تم تک پہنچنے والا رقعہ صدف نے نہیں، میں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا۔“

میں بھونچکا رہ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی اور بخت خان آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ وہ رقعہ، جس سے غلط فہمی کی ڈور تھام کر بلو میرے سر پر سوار ہو گئی تھی اور مجھے کھالے کے ہاتھوں زخمی ہو کر ڈاکٹر شاہ جی کے پاس داخل ہونا پڑا تھا۔ تب میں نے

سمجھا تھا کہ وہ صدف کی بیٹہ رائنگ تھی۔ اب اسامیٹھی سمجھا رہی تھی کہ ان لفظوں کے تخلیق کار اُس کے ہاتھ تھے۔
میں نے تشکیک آمیز انداز میں پوچھا۔ ”کیا یہ سچ ہے؟“

اُس نے قدرے آزرده لہجے میں کہا۔ ”اگر یہ سچ نہیں ہے تو پھر سوچو، صدف کو بابا کے منصوبے کی خبر کیسے ہوئی؟“
اس کی بات جھٹلائے جانے کے لائق نہیں تھی۔
میں نے کہا۔ ”مگر.....“

”اگر مگر کچھ نہیں شہرے خان!“ وہ تھک سی گئی۔ ”میں رہائی کی بھیک نہیں مانگتی کیونکہ میرے خون میں میرا خاندانی وقار اور میری اُنا رچی بسی ہے۔ میں صرف اتنی سی درخواست کروں گی کہ جب یہ طے کر لیا گیا ہے کہ مجھے ناکردہ گناہوں کی سزا دی جائے گی تو اتنی رعایت ضرور دی جائے کہ مجھے قتل کر دیا جائے، میری لاش کو کسی ویرانے میں پھینک دیا جائے مگر میری عصمت دری نہ کی جائے۔ مجھے میری نظروں سے گرایا نہ جائے۔ شاید میرا بابا پروین کے ساتھ یہی کچھ کرے گا مگر چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ ایسا کچھ نہ کیا جائے۔“

اُس کے چہرے پر عجیب سا کرب اپنی تمام تر خشکی سمیت ابھرا تھا۔ مجھے دکھ ہوا، اُس کی درخواست پر ترس آیا مگر میں پروین کے ملنے تک اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔
وہ مجھ پر نظریں مرکز رکھتے ہوئے بولی۔ ”شہرے! میں نے تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔ میں نے تو خالد سے بھی نفرت نہیں کی۔ یہ جانتے ہوئے کہ میری اور اس کی راہیں متضاد ہیں، ابھی اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ کسی دل کو ویران کرنا بہت بڑا گناہ ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے سچی محبت کرتا ہے۔ مجھے دہوی مان کر میری پوجا کرتا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ بابا کو جو بھی ہماری ملاقاتوں کا علم ہوگا، وہ خالد کو زندہ درگور کر دے گا مگر میں پھر بھی اپنی سرشت پر قابو پانے میں ناکام رہتی ہوں..... کیا میرا کوئی عمل بھی لائق تحسین نہیں ہے؟ اگر ہے تو مجھے اُسی کا ثمر دیا جائے اور میری عزت پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔“

میری خاموشی کو اُس نے انکار تصور کیا اور میری جانب کھسک کر میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ تھکے تھکے لہجے میں بولی۔ ”کیا میری اتنی سی بات بھی نہیں مانی جاسکتی؟“

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ سو جن زدہ، روئی روئی سی..... نڈھال تاثرات لیے درخواست گزار آنکھیں مجھے بے بس کرنے لگیں۔ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”اسا! مجھے اس وقت دنیا میں سوائے پروین کے کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔ جا کر اپنی میڈم سے بات کرتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں

کہ تمہاری حیدر خان سے فون پر بات ہو جائے اور تم اُسے مجبور کرو کہ وہ پروین کو فوراً رہا کر دے۔ میں تمہاری باتوں کو حق مانتا ہوں، تم بھی میری مجبوری کو ناگزیر مانو۔“

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی، بولی۔ ”شہرے! تمہیں پروین کی بے بسی دکھائی دیتی ہے، میری نہیں۔ کیا اس سے پہلے تمہارے ساتھ کوئی ظلم نہیں ہوا؟ کیا تمہیں اپنے ماں باپ کا قاتل ملا ہے؟ کیا تمہیں اُس سبب کا پتا چلا ہے جس نے تمہارے جوان العمر والدین کو قتل کیا؟..... نہیں نا! اگر تمہیں پتا نہ چلتا کہ پروین کہاں ہے تو تم کیا کر لیتے؟ کیا پوری دنیا کی لڑکیاں یرغمال بنا لیتے؟..... انصاف کرو، خدا انصاف کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔“

”کیا تم اُسے جانتی ہو؟“
”کسے؟“ وہ چونکی۔

”میرے ماں باپ کے قاتل کو؟“
”نہیں تو.....“ وہ بولی۔

”پھر تم نے یہ کیوں کہا؟“

”میں نے تمہاری آنکھیں کھولنے کے لیے کہا ہے۔“
اُس نے میری دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ میں جلتے ہوئے روم میں نیرو کی بانسری تھا سے زندگی گزارتا آیا تھا۔ آج تک کسی نے یہ طعنہ نہیں دیا تھا۔ اُس نے دیا تو میں بلبلا اٹھا۔ تڑپ کر، اپنے ہاتھ چھڑا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”مجھے زندگی نے جو کچھ دیا ہے، وہی لوٹاؤں گا۔“

اس کا ہاتھ کالس کندھے پر محسوس ہوا تو پتا چلا کہ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلی آئی تھی۔ چونکہ مجھے اُس سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا، اس لیے میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور کہا۔ ”اسا! یہ سلطنت میری نہیں ہے۔ یہ میڈم کی ہے۔ میڈم کون ہے؟ میڈم میری محسنہ ہے۔ جس دنیا میں مجھے تک پر کسک عطا ہوئی، اُسی دنیا میں اُس کے لب و لہجے کے مرہم اور احسانات نے زندہ رہنے کی تقویت دی۔ وہ جو چاہے گی، میں کروں گا۔ اگر وہ کہے گی کہ میں تمہیں کتوں کے آگے ڈال دوں، دیر نہیں کروں گا۔ اگر کہے گی کہ تمہیں پھولوں میں جا دوں، ایک بل کو بھی نہیں سوچوں گا۔“

اس کی گلوگیر آواز میری سماعت میں پڑی۔ ”میں میڈم سے نہیں، ایک خاندان سے کے آگے ہاتھ جوڑ رہی ہوں۔“

”میں خاندانہ نہیں ہوں۔ اگر ہوتا تو میرے ماں باپ کو یوں بے دردی سے قتل نہ کیا جاتا۔ میری بہن کو بھرے

ہاؤس سے یوں اٹھانہ لیا جاتا۔“
میری بات سن کر وہ بجلی کی سی تیزی سے لپک کر میرے مقابل آگئی۔ دونوں ہاتھوں سے میرا گریبان تھام کر جھٹکے دینے لگی، وفور جذبات سے چیختے ہوئے بولی۔ ”کیا میں نے یہ سب کچھ کیا ہے؟ سردار حیدر خان نے کیا ہے تو جا کر اُس کی گردن پکڑو..... اس کی عزت و سبب میں اچھا لو۔ اگر تمہیں خاندانی غیرت کا کوئی پاس ہے تو مجھے چھوڑ دو اور اپنے مجرم کو پکڑو۔ پھر کہوں گی کہ شہر یا غیرت مند انسان ہے، انصاف پسند ہے..... وگرنہ تم میں، تمہاری میڈم میں اور میرے بابا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سب کہتے ہیں، سب خونی بھیڑیے ہیں جنہیں کھانے کو کچھ نہ ملے تو اپنی ماؤں بہنوں کا ماس کھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ آئی ہیٹ یو..... آئی ہیٹ یو.....“

میں نے بدقت اپنا گریبان چھڑایا۔ ایک آدھ ہٹن بھی ٹوٹ گیا۔ مجھے اُس کی حالت زار پر ترس آیا۔ وہ بری طرح لرز رہی تھی۔ آگے پیچھے ڈول رہی تھی۔ کسی بل بھی زمین بوس ہو سکتی تھی۔ میں نے اُسے شانوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا تو وہ لمبی لمبی سانسیں لیتی ہوئی کمر کے بل فوم پر گر گئی۔ آنکھوں پر بازو رکھ کر رونے لگی۔ ایسے میں اُس کا بدن ہچکیوں کے دم پر اوپر نیچے ہونے لگا۔ مجھے دل ہی دل میں شرمندگی کا احساس ہوا۔ کمرے سے نکلتا چاہا تو انٹرکام کی جلتنگ نے قدم تھام لیے۔ ریسورکانوں سے لگایا تو میڈم کی شوخ آواز سنائی دی۔ ”شہرے! اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اور میری طرف چلے آؤ۔“

میں نے انٹرکام کا چونکا کر بیڈ پر رکھا اور روتی ہوئی اس پر ایک اچھتی ہوئی نگاہ ڈال کر کمرے سے نکل آیا۔ ریٹائرنگ روم میں میڈم کو بیڈ پر آلتی پالتی مارے لی وی سکرین کو گھورتے پایا۔ لی وی پر سونیا کے کمرے کا پورا منظر روشن تھا۔ اسابستور بیڈ پر، آنکھوں پر بازو رکھے روتی نظر آرہی تھی۔ میڈم نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”تم ہار گئے، بڑی طرح ہار گئے۔ خاندانوں کے بعد خاندادی بھی اپنی چٹنی چڑی باتوں سے تمہیں شکست دینے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ کیا اپنی شکست کو فتح میں تبدیل کرنے کے لیے کچھ اور وقت چاہیے؟“

میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ”نہیں میڈم! مجھے انوس ہے کہ میں آپ کی توقعات پر پورا نہیں اُترتا۔“
وہ ہنسی۔ ”یہ تو ہوتا ہی تھا..... ہو گیا۔ اس کا موقف مضبوط تھا، تمہارا کمزور..... تمہاری شکست یقینی تھی۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اجازت حاصل کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بولی۔ ”خالد عرف کھالا تمہارا بچپن کا دوست ہے۔ بقول تمہارے، وہ تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جی میڈم!“
”میں اُسے سی ون سے یہاں بلواؤں؟“
”آپ بہتر جانتی ہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔
”شہر میں میرے اور استاد ببلو کے آدمیوں کے درمیان خونی آنکھ پجولی جاری ہے۔ سی تھری پر استاد نے حملہ کیا ہے اور میرے تین آدمی گرا دیے ہیں۔ شہر کے حالات بگڑتے دیکھ کر آئی بی اور پولیس متحرک ہو گئی ہے۔ جگہ جگہ چھاپے مارے جارہے ہیں اور پکڑ دھکڑ کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ ایسے میں کوئی خطرہ مول لینے پر تیار نہیں ہوں۔ یہ نہ ہو کہ کھالا یہاں آ کر کوئی گڑ بڑ پیدا کر دے۔“
اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

میں نے کہا۔ ”میڈم! مجھے یقین ہے کہ کھالا کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ پھر بھی، آپ مجھ سے کہیں زیادہ بہتر جانتی ہیں۔ اپنی سوچ سمجھ کے مطابق فیصلہ کریں۔“
وہ مجھے کریدتی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔ ”سردار حیدر خان ضد پڑٹ گیا ہے۔ وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ سودے بازی پر نہیں آ رہا بلکہ اُس نے خونی محاذ آرائی چھیڑ دی ہے۔ یہ جنگ ہم جیت بھی گئے تو پروین ہمارے ہاتھ نہیں آئے گی۔ کیا اس صورت حال میں خالد کوئی مدد کر سکتا ہے؟“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ کھالا میری کیا مدد کر سکتا تھا؟ اس نے چند دن قبل ہی سردار حیدر خان کے گینگ کو جائن کیا تھا۔ کیا اتنے مختصر سے دورانے میں وہ کوئی کارآمد معلومات دینے کے قابل ہو گیا تھا۔ شاید نہیں.....

میں نے نفی میں سر ہلایا، کہا۔ ”میڈم! میرا خیال ہے کہ وہ میری کوئی مدد نہیں کر پائے گا۔“
وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر موبائل فون کی بیل نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اُس نے کال اٹینڈ کی۔ پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیریں ابھر آئیں۔ ابھی فون رکھتا ہی چاہتی تھی کہ دوسری کال آگئی۔ وہ دو ٹوک اور مختصر الفاظ میں گفتگو کر رہی تھی۔ اوپر تلے آنے والی چار پانچ فون کالز نے اُسے متفکر کر دیا۔ میں نے اس کی گفتگو سے اندازہ کیا کہ سی تھری کی صورت حال مخدوش ہو گئی تھی۔ اُس کا فائٹر گروپ استاد ببلو کے مقابلے میں پسپا ہو رہا تھا۔ میرا شاہ ملتان میں نہیں تھا کیونکہ

سردار: ”پریتو! اک داری I Love You کہہ دے۔“
پریتو: ”نہیں کہوں گی۔“
سردار: ”صرف اک داری پلیز۔“
پریتو: ”نہیں! مجھے شرم آتی ہے۔“
سردار: ”دیکھ لے میری بہن نہیں ایک داری کہہ دے۔“

☆.....☆.....☆
بیوی شوہر (سردار) سے۔ ”بائیک آہستہ چلائیں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“
شوہر: ”تو تم بھی میری طرح آنکھیں بند کر لو نا۔“
☆.....☆.....☆
لڑکی۔ ”سردار جی آپ کو مجھ سے پیار ہے؟“
سردار: ”ہاں ہے۔“
لڑکی۔ ”لیکن آپ کو میری بالکل پروا نہیں ہے۔“
سردار: ”اوجھلیے! پیار کرنے والے کسی کی پروا نہیں کرتے۔“

☆.....☆.....☆
مریض سردار ڈاکٹر سے۔ ”ڈاکٹر صاحب مجھے دور سے نظر نہیں آتا۔“
ڈاکٹر: ”وہ آسمان پر کیا ہے؟“
مریض: ”سورج۔“
ڈاکٹر: ”اواما! ہو اس توں آگے فرشتے نو دیکھنا ای؟“

مرسلہ: محمد قدرت اللہ نیازی۔ خانیوال
☆.....☆.....☆
سردار نے لڑکی کو سائیکل مار دی۔
لڑکی نے کہا۔ ”بے وقوف، اندھے..... بریک نہیں مار سکتے تھے۔“
سردار نے کہا۔ ”پوری سائیکل تو مار دی ہے۔ اب وی ناراض او سوہیو.....“

مرسلہ: حجاب کول خان، ملکوال

وہ پورے دل سے مسکرائی اور اٹھ کر کمرے کی عقی دیوار میں نصب بڑے سے کنٹرول تختل کے سامنے جا کھڑی ہوئی، بولی ”تمہارے اس سوال کا جواب وقت آنے پر دوں گی۔ اب میں تمہارے دوست خالد کو یہاں طلب کرنے لگی ہوں۔ تم اس کے کمرے میں جاؤ۔ سونیا کو میرے پاس بھیج دو۔ دس پندرہ منٹوں تک خالد تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ اس کے ساتھ بات چیت کرو۔ تمہارے بقول، اُسے تمہاری بہن پر ٹوٹنے والی قیامت کی خبر نہیں ہے۔ اسے خبر دو، پھر اسما اور خالد کی ہمدردیاں حاصل کرو۔ دیکھو کہ زندگی کتنا بڑا سچ ہے۔ اسے گزارنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ خالد کے دل میں جا گزیر عشق کی گری کو مایو۔ دیکھو کہ یہ کتنا بڑا فریب ہے۔“

میں چونکا کیونکہ وقتی طور پر یہ بھول گیا تھا کہ کھالا اسما کو دیوانوں کی طرح چاہتا ہے، پھر دل نے تقویت دی کہ وہ کبھی بھی عشق کی آبیاری کے لیے دوستی کا خون نہیں کرے گا۔ میڈم مجھے متذبذب دیکھ کر بولی۔ ”جاؤ..... گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سی ٹو کی طنائیں میرے ہاتھ میں ہیں۔“

میں سونیا کے کمرے میں آ گیا۔ سونیا کو میڈم کے پاس بھیجا اور سونے پر بیٹھ گیا۔ اسما آنکھیں موندے لیٹی تھی۔

میں نے پکارا۔ ”اسما! کیا جاگ رہی ہو؟“
اُس نے آنکھیں کھول دیں، بولی۔ ”ہاں..... مگر میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔“

میں نے میڈیکل کٹ میں سے ایک ٹیلیٹ نکال کر اُسے تھمائی۔ پانی اس کے بیڈ کے قریب تپانی پر رکھا تھا۔ اُس نے گولی حلق سے اتاری، پانی پیا اور بولی۔ ”کیا بنا؟“

اُس کا اشارہ پروین کی طرف تھا۔ میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”تمہارا باپ اپنی انا کے مقابلے میں تمہیں داد پر لگا چکا ہے۔“

”کیا میری واپسی کی راہ کھلی ہوئی ہے؟“ اس نے استفسار کیا۔

”کیا مطلب؟“
”مجھے علم نہیں ہے کہ میرے بعد کیا ہوا؟ کیا میں وسیب میں بدنام ہو چکی ہوں؟“

میں نے کہا۔ ”میں نہیں جانتا کیونکہ میرا رابطہ نور پور سے کٹ چکا ہے۔“
”ہمیشہ کے لیے؟“

بدولت آپ کو اس وقت ڈسٹرب کر رہی ہوں۔“
اُس کے حد سے بڑھے ہوئے مؤدبانہ انداز نے مجھ کی تھی کہ فون پر اس کا مخاطب کوئی بہت بڑا آدمی تھا۔ نے نہایت مختصر اور محتاط الفاظ میں مدعا بیان کیا۔ پتا چلا کہ لمبے پیشتر موصول ہونے والی کال پولیس کے سینئر سپرنٹنڈنٹ کی تھی۔ اب اس کے کمرے میں بڑے سے اس کی زیادتی کا کوئی رہی تھی اور باور کر رہی تھی کہ سردار حیدر خان نے اُسے اسے سخت کارروائی کرنے کے لیے دباؤ ڈالوایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ انتظامیہ اس معاملے میں دخل نہ دے اور خاموشی سے تماشا دیکھے۔ یہ ممکن نہیں تھا مگر ممکن ہونے والا تھا کیونکہ اُس کے ہاتھ میں کچھ لو اور کچھ دو کی چابی دبی ہوئی تھی جس سے ہر قفل کھل جاتا ہے۔

میڈم پانچ سات منٹ کی طویل گفتگو کے بعد آواز کی لہروں کی بدولت منسلک ’بڑے آدمی‘ کو قائل کرنے میں کامیاب ہوئی اور اس نے ’تھینک یوسر‘ کہہ کر فون بند کر دیا۔ بڑبڑائی۔ ”اب دیکھتی ہوں استاد ببلو کی پھرتیوں کو.....“

اس نے جلدی جلدی کئی لوگوں سے رابطہ کیا اور احکامات صادر کیے۔ بظاہر نرم اور خوش دل دکھائی دینے والی میڈم ریفٹہ رفتہ رفتہ مجھ پر کھل رہی تھی۔ وہ بہت زیرک اور سفاک عورت تھی۔ اس نے نصف گھنٹے میں ہی ہاتھ سے نکلے ہوئے بازی کی تمام تر ڈوریں اپنی تھیلی پر لپیٹ لیں اور حملہ آوروں کو منہ کی کھانا پڑی۔ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا تھا، کیا کب جا رہا تھا اور کیا کیا جانے والا تھا مگر موبائل فون پر ہونے والی میڈم کی گفتگو سے اندازہ کر رہا تھا کہ جو بھی پولیس فورس نے اپنے تیر و ترکش سمیٹے، اُس نے استاد ببلو کے گروں پر فیصلہ کن وار کرنے کا حکم دیا تھا۔ اپنی ہدایات کی روشنی میں اُس نے استاد ببلو کی یلغار کو اُس کی گردن کی رسی بنا کر پھندے میں جکڑ لیا تھا۔ اپنا بہت سا نقصان کروانے کے بعد استاد ببلو نہ صرف پیچھے ہٹ گیا تھا بلکہ کہیں جھپٹے پر بھی مجبور ہو گیا تھا۔

کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے۔ وہ اپنی بچھائی ہوئی بساط کے مہروں کی اٹھک شیخ سے فارغ ہوئی تو تھکے تھکے انداز میں بولی۔ ”اب وہ الو کا پٹھا کسی ماں کی گود میں چہرا چھپائے جان کی امان مانگ رہا ہوگا..... حرا زادہ.....“

میں نے تحسین انگیز نظروں سے اُسے دیکھا اور کہا۔ ”آپ کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔“

”تم پر کھلتا چاہتی ہوں، تاکہ تم مجھے سمجھ جاؤ۔“
”مگر میں ہی اتنا خوش بخت کیوں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

اُس سے فون پر رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ سوائے ملتان اور مظفر گڑھ کے شہروں کے علاقے بھر میں سیلولر سگنلز موصول نہیں ہوتے تھے۔

میں نے میڈم کی سوچوں کے ارتکاز کو چھیڑنا مناسب نہیں جانا اور خاموشی سے اُسے دیکھنے لگا۔

وہ مجھے مخاطب کیے بغیر بولی۔ ”پولیس کو جہاں بلایا جاتا ہے، وہاں پہنچتی نہیں ہے اور جہاں اس کی ضرورت نہ ہو، وہاں ٹپک پڑتی ہے۔ شہر یار! تم ایسا کرو.....“

موبائل فون کے بڑرنے اس کی بات کاٹ دی۔ اُس نے جلدی سے اسکرین پر دیکھا اور فوراً کال ریسیو کر لی۔ ”مجھے آپ کی ہی کال کا انتظار تھا۔“

چونکہ میں کچھ فاصلے پر تھا، اس لیے موبائل فون کے اسپیکر سے پھوٹنے والی جھنجھٹا ہٹ سے کوئی مفہوم کشید نہیں کر سکتا تھا۔ یہ پتا چلتا تھا کہ بولنے والا مرد تھا۔ اس کی بات خاصی لمبی تھی جسے میڈم شکلیہ نے انہماک سے سنا۔ اس کے خاموش ہونے پر قدرے سخت لہجے میں بولی۔ ”میں آپ کی مجبور یوں کو سمجھتی ہوں مگر آپ بقا کے فلسفے کو مد نظر نہیں رکھتے۔“

جو باتیں آپ نے مجھے کہی ہیں، یہی آپ سردار حیدر خان سے کہیں۔ اُس نے پہل کی ہے۔ اب بھی اسی نے ہی کیے بعد دیگرے میری دو کوشیوں پر حملے کیے ہیں۔ یہ خون اور آگ کا کھیل ہے۔ یہاں جس نے بھی پسپائی اختیار کی، وہ مارا جائے گا۔ میں اگر اپنے آدمیوں کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیتی ہوں تو وہ بھی مارے جائیں گے۔“

لمحاتی توقف ایک مرتبہ پھر درپیش ہوا۔ میڈم جب بولی تو اُس کا لہجہ بے حد درشت تھا۔ ”مجھے ایک ہی وقت میں آئی بی، ایلیٹ اور سردار حیدر کے غنڈوں سے نمٹنا پڑ رہا ہے۔ آپ اپنی فورسز پیچھے ہٹالیں۔ میں دیکھتی ہوں کہ استاد ببلو کس کھیت کی مولی کا نام ہے۔“

فون کے اسپیکر سے برآمد ہونے والی آواز سننے کے بعد بولی۔ ”اگر آپ کو اوپر سے احکامات موصول ہوئے ہیں تو کیا ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہے؟ چند ہی منٹوں میں آپ کو دوسرے احکامات بھی موصول ہو جائیں گے۔ پلیز! چند منٹ انتظار کیجئے۔“

اس کے ساتھ ہی اُس نے کال منقطع کر دی۔ اس کے چہرے پر برہمی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے فون کی میموری میں محفوظ شدہ کسی نمبر پر کال کی۔ فون کانوں سے لگائے بیٹھی رہی۔ جونہی کال ریسیو کی گئی، نہایت مؤدبانہ انداز میں بولی۔ ”سر! ملتان سے شکلیہ بات کر رہی ہوں۔ ایمر جنسی کی

”یہ میں نہیں جانتا۔“

”تمہاری پھوپھی زاد، غزالہ، کیا وہ اس آگ کی لپیٹ میں نہیں آئے گی؟“

اس نے عام سے لہجے میں بہت بڑی دھمکی دی تھی۔ میں تڑپ کر اٹھا، اُس کے سینے کی طرف انگلی تان کر غرایا۔ ”اس پر اٹھنے والا ہاتھ کاٹ دوں گا۔ اگر سردار حیدر خان نے یہ حرکت کی تو میں اس کے خاندان کو تباہ و برباد کر دوں گا۔“

اس پر میری برہمی کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ طنز سے بھرپور ہنسی اچھال کر بولی۔ ”کیا وہ پروین سے زیادہ مقدس ہے؟“

وہ میری توقع سے کہیں زیادہ گہری تھی۔ ایک جملے میں آگ لگا دینے کی اہلیت رکھتی تھی۔ میں دانت پیس کر رہ گیا۔ وہ میری حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔ ”شہرے خان! تم نے نور پور کو اپنے لیے جہنم کدہ بنالیا ہے۔ کس کس آگ کو بجھاؤ گے؟“

میں نے جان چھڑانے کے سے انداز میں کہا۔ ”مجھے کسی آگ کی پروا نہیں ہے۔“

”تم اگر چاہو تو میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔“ اُس نے براہ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں ہنسا۔ ”تم کچھ بھی نہیں کر سکتی ہو خاندادی..... یہ آگ اور خون کا کھیل ہے۔ نہ کھیلنے والا بچتا ہے اور نہ ہی کھلانے والا زندہ رہتا ہے۔“

”تو کیا اب میں زندہ ہوں؟“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”کیا یہاں سے جانے کے بعد میں ویسی ہی رہوں گی جیسے یہاں لائے جانے سے پہلے تھی؟ نہیں شہرے خان! میرے دامن پر دھبے لگ چکے ہیں۔ دھونے میں عمر بیت جائے گی مگر داغ نہیں جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ طلوع ہونے والے آفتاب کے ساتھ ہی مجھے بھی بوجھ سمجھ کر کہیں پستی میں اتار پھینکا جائے۔ کوئی شاہ زور اپنی کمزوری کو سینے سے لگا کر نہیں رکھتا۔ میرا بابا بھی شاہ زور ہے۔ ایک مرتبہ کی پسپائی کے بعد مجھ سے ہمیشہ کے لیے جان چھڑانا چاہے گا۔“

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میرے عقب میں آہٹ ہوئی۔ گھوما تو دروازے میں کھالے کو کھڑے دیکھا۔ اُسے ایک آدی دروازے پر چھوڑ کر پلٹ رہا تھا۔ کھالے نے جونہی مجھے دیکھا، آنکھیں حیرت سے پھٹنے کی حد تک پھیل گئیں۔ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔ ”شش..... شہرے..... تت..... تم؟“

(مولا! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں)

میں نے قدم بڑھایا۔ اُسے والہانہ انداز میں بانہوں میں بھرتے ہوئے فرط مسرت سے چبچ کر کہا۔ ”تم خواب نہیں دیکھ رہے ہو، میں شہر یار ہوں..... تمہارا یار..... تم مجھے چھوڑ کر کہاں غائب ہوئے تھے؟“

ہم دونوں کا معافہ طویل ہو گیا۔ یہ ملاقات بڑی یادگار تھی۔ علیحدہ ہوئے تو اس کی نظر اسما پر پڑی۔ سونے کی طرف بڑھتے ہوئے ناگاہ ٹھٹک کر رُک گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسما کو گھورنے لگا، پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”شہرے! یہ تو بی بی جی ہیں..... اوہ میرے خدا! آج کیسا دن چڑھا ہے۔ خوشیاں ہی خوشیاں..... بی بی جی! السلام علیکم!“

اسے سلام کا جواب نہ ملا۔ اسے قلق نہیں ہوا بلکہ جذبات سے لرزتا ہوا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر سونے تک آیا۔ ہم دونوں جڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ بولا۔ ”شہرے! تم یہاں کیسے آئے؟“

وہ مجھے اور اسما کو غیر متوقع طور پر دیکھ کر اپنی حیثیت اور یہاں موجودگی کے جملہ اسباب کو بھول گیا تھا۔ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ ”مجھے یقین تھا کہ میں بی بی جی تک ضرور پہنچ جاؤں گا اور اسے آزاد کروالوں گا۔ مجھے بتاؤ، کس نے بی بی جی کو ہاتھ لگایا ہے، کس نے اسے یہاں قید کر رکھا ہے؟“

ایسے میں اسما کی آواز کرے میں گونجی۔ ”کیا کر لو گے اُس کا؟“

وہ چونکا، اسما کی طرف دیکھ کر ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا اور دانت پیس کر بولا۔ ”اُس حرامزادے کی گردن مردہ دوں گا جس نے آپ کو میلی نظر سے دیکھا ہے؟“

اسما معانی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ”تم یہاں تک کیسے پہنچے ہو؟“

کھالا اپنی عادت کے مطابق گریبان کے بٹن کھول کر کالر پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”میں غفار خان کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ مجھے اُس نے بتایا تھا کہ یہاں میری بی بی جی کو قید کیا گیا ہے۔“

جی کو اغوا کر رکھا ہے؟“

اُس کی مخصوص انداز میں اٹھی ہوئی انگلی کا نشانہ میں تھا۔

میں نے آہستگی سے سر ہلایا اور کہا۔ ”ہاں کھالے! بی بی میڈم کی تحویل میں ہے۔“

”کون میڈم! اُس کی تو ایسی کی.....“ وہ پھر گیا۔ میں نے کہا۔ ”میری میڈم..... اس جگہ کی مالکن ہے جہاں اس وقت ہم تینوں بیٹھے ہیں۔“

”تو کیا میں بھی اُس کی قید میں ہوں؟“

میرا جواب اثبات میں تھا۔ ”ہاں! اگر میری نظر تم پر نہ پڑی ہوتی تو اس وقت تک تمہیں گولی جاٹ چکی ہوتی۔“

وہ ہونٹوں کی طرح عجیب اُلجھے اُلجھے انداز سے مجھے اور اسما کو باری باری گھورنے لگا۔

اسما جھٹ سے بولی۔ ”تو تمہیں ابھی تک اتنی سی بات کا پتا بھی نہیں چلا، بہت بے وقوف آدمی ہو۔“

کھالے نے ایک نظر اسما کو دیکھا، پھر مجھ پر انگلی اٹھا کر بولا۔ ”تم لوگوں نے یہ ذلیل حرکت کیوں کی؟“

اس کا لہجہ بہت درشت تھا۔ میں نے کہا۔ ”بیٹھ کر تمیز سے بات کرو کھالے..... میں تمہارا نوکر نہیں ہوں۔“

وہ دانت پیس کر بولا۔ ”تمہیں علم ہے کہ بی بی جی مجھے کتنی پیاری ہے، پھر تم نے یہ حرکت کیوں کی؟“

میں بچپن سے کھالے کو دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ مجھے اُس کی ہر ادا کا علم تھا۔ میں نے اُس کی آنکھوں کی مخصوص چمک دیکھ کر فی الفور اندازہ کر لیا کہ عشق نے دوستی کو اپنے سرخ پنچے میں جکڑ لیا تھا۔ اس نے دوست اور محبوبہ میں سے محبوبہ کا انتخاب کر لیا تھا۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ”کھالے! ہوش کے ناخن لو۔“

ادھر آؤ، بیٹھ کر میری بات سنو۔“

اس نے میری بات پر دھیان نہیں دیا بلکہ اسما کی طرف مڑا۔ ”بی بی جی! سیدھی سیدھی طرح بتائیں، کیا شہرے نے یہ حرکت کی ہے؟“

وہ بولی۔ ”تمہیں جو کچھ نظر آ رہا ہے، یہی سچ ہے۔ جو کچھ تمہارا یار تمہیں اپنے پاس بٹھا کر دکھانا چاہتا ہے، وہ جھوٹ ہے۔“

کھالے کے آگ بگولہ ہونے کے لیے اسما کا یہی جملہ کافی تھا۔ حسب عادت سب کچھ بھول کر، کالر پیچھے کی طرف ڈال کر، سرخ آنکھیں لیے میری جانب بڑھا اور بولا۔ ”شہرے! چلو، اسے ابھی چھوڑو..... اسے گھر پہنچاؤ

مسافر

ورنہ میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا، کہا۔ ”یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر تم میری کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہو تو اس بات کو یہیں ٹھپ دو۔“

وہ بڑی طرح سخ پا ہو چکا تھا۔ میں چونکہ اس کی رگ رگ پہچانتا تھا، اس لیے اس کے برق رفتار ٹھپڑ سے پہلو کے بل سرک کر بچ گیا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں آگے بڑھا اور سونے سے ٹکرا کر قالین پر جا گرا۔

میں اچھل کر چند قدم دور ہو گیا۔ چبچ کر کہا۔ ”کھالے! عقل کے ناخن لو، میری بات سن لو، پھر جی میں جو آئے، کرنا۔“

اس نے اٹھنے میں دیر نہیں کی تھی اور نہ ہی مجھ پر حملہ آور ہونے میں تاخیر کی تھی۔ وہ ایک پیر پر گھوما اور اس کا پوری قوت سے گھوم کر آتا ہوا پاؤں میرے بائیں بازو پر پڑا۔ میں لڑکھڑا کر دیوار تک لڑھک گیا۔ اگر دیوار کا سہارا نہ

لیا ہوتا تو زمین بوس ہو چکا ہوتا۔ جونہی پلٹا، اُس کا مکا پوری قوت سے میری پیشانی پر پڑا۔ میری نظروں کے سامنے سورج آن چکا اور پورا کرا گھومتا دکھائی دینے لگا۔ میں نے اُسے روکنے کے لیے ہاتھ بڑھائے مگر اُس نے سنہلنے کا موقع دیے بغیر چند ہی لمحوں میں مجھے روٹی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ میں قالین پر دیوار کی جڑ میں آڑا تر چھالینا کھالا، کھالا، کرتا رہ گیا۔ اس کے طوفانی مئے نے میرے بدن کے تمام اعصاب شل کر دیے تھے۔

وہ میرے سینے پر اپنا پاؤں رکھ کر غرایا۔ ”تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی؟ کیا تمہیں علم نہیں تھا کہ کھالا اپنی بی بی جی کے لیے جان بھی قربان کر سکتا ہے۔ ہاں! کھالا تیرے جیسے یار مار کی جان لے بھی سکتا ہے؟“

کوشش کے باوجود میرے منہ سے کوئی کلمہ برآمد نہیں ہوا۔ اسی لمحے اسما کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوئے، تالی بجاتے ہوئے فاتحانہ انداز میں بولی۔ ”شہرے! اب تم بھی اسی انداز میں زندگی کی بھیک مانگو جس طرح کچھ دیر پہلے میں نے تمہارے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔“

وہ آگ لگا رہی تھی۔ کھالا دم بہ دم شعلے کی طرح بھڑک رہا تھا۔ میری چھاتی پر سے پاؤں ہٹائے بغیر پلٹا اور بولا۔ ”کیا کہانی بی بی جی؟ اس نے آپ پر ہاتھ بھی اٹھایا ہے؟“

اس نے اپنے سر کو اوپر نیچے حرکت دی۔ لبوں سے کچھ نہ کہا۔ کھالا جھکا اور میرے منہ پر ٹھپڑ مارتے ہوئے چیخا۔ ”تم نے مجھ پر ظلم کیا ہے خاندادے! تم نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ
ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

میں لٹھڑا ہوا چہرہ صاف کرتے ہوئے غرایا۔ ”خانزادے!
میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

میں نے جواب دینے کے بجائے اچھل کر زوردار
فلاننگ کک اس کے سینے پر رسید کی۔ میں کمر کے بل گرا اور
اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اس پر گرے دیکھا تو لمحہ بھر کی مہلت
ضائع کیے بغیر اس کی جانب بڑھا۔ اس نے میرے جارحانہ
طور سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں پیر اٹھا کر بیچ میں حائل
کر دیے۔ جونہی میری چھاتی اس کے دونوں پیروں پر ایک
لمحے کوئی، اس نے پوری قوت سے مجھے اچھال دیا۔ ’دھپ‘
کی زوردار آواز کے ساتھ میں کمر کے بل قالین پر جا گرا۔
میں نے اٹھنے میں سستی کا مظاہرہ نہیں کیا مگر وہ اپنے پورے
وجود کے ساتھ مجھ پر آن گرا۔ اس کے کھٹنے میرے پیٹ
میں آن لگے۔ درد کی ایک لہر پورے بدن میں سرایت کر
گئی۔ میں نے اسے خود سے اتار پھینکنے میں پوری توانائی
صرف کر دی مگر کامیاب نہیں ہو پایا۔ اس نے اپنی کہنی کی
ضرب میرے سر پر ماری جس نے میری سوچنے سمجھنے کی
صلاحیتیں ایک بل میں سلب کر لیں۔

پھر اس نے بغیر تعطل کے مجھے کہنی کی ضربیں لگانا
شروع کر دیں۔ ہر چوٹ پر ذہن بری طرح جھنجھٹا اٹھتا۔
مجھے احساس تھا کہ یہ خطرناک چوٹیں میری موت کا سبب بن
سکتی تھیں۔ میں نے اپنی تمام تر طاقت جمع کر کے اس کے
پہلو میں گھونسا مارا، پھر دوسرا، پھر میرے دونوں ہاتھ مشینی
انداز میں حرکت کرنے لگے۔ کوئی ایک چوٹ کا رگر رہی اور
وہ ہائے کی دردناک آواز نکال کر پہلو کے بل الٹ گیا اور
بے آب مایہ کی طرح تڑپنے لگا۔

اس نے اپنا ہاتھ پشت کی جانب پہلو پر سختی سے جما
رکھا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میرے کئے کا شر اس
کے گردے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ
کھالا مہلت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، میں فوری طور پر بدقت
کھڑا ہوا مگر لڑکھڑا کر نشست کے بل قالین پر گر گیا۔ پھر اٹھا
اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ کم بخت کی کہنی کی ضربوں
نے میرے حواس مختل کر دیے تھے۔ کوئی شے نظروں میں
نظر نہ آتا تھا۔ اسے نام نہیں لے رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں میری نگاہ
اسا پر پڑی۔ وہ دیوار کے ساتھ کمر ٹکائے پھٹی پھٹی آنکھوں
سے دیکھ رہی تھی۔

کھالا دونوں ہتھیلیاں قالین پر ٹکا کر کھڑا ہونے کی
کوشش کر رہا تھا جب میں نے پوری قوت سے لات اس کی
پسیلوں کے نیچے پہلو میں ماری۔ اس کے منہ سے ٹکٹنے والی چیخ

اس نے مجھے کالر سے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ میرا سر چکرا
رہا تھا۔ سوچیں گڈ مڈ ہونے لگیں مگر یہ احساس پوری توانائی
سے بیدار ہو گیا کہ کھالا اس وقت اپنے حواس میں نہیں تھا۔ وہ
جو کہہ رہا تھا، کرگزر سکتا تھا۔ میں نے سر جھٹکا اور پوری قوت
سے مکا اُس کے منہ پر دے مارا۔ میرے ہاتھ کو کرنٹ سا
لگا۔ ہاتھ غلط پڑ گیا تھا۔ کھالا مجھے چھوڑ کر ڈگمگاتا ہوا چند قدم
پیچھے ہٹا۔ جب اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا، تب مجھے پتا چلا
کہ میرا دار بڑا کارگر ثابت ہوا تھا۔ اس کے منہ پر رکھے
ہوئے ہاتھ کی انگلیوں کے بیچ میں سے خون جھلکنے لگا تھا۔ اس
نے آگ برساتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور اپنے
مخصوص انداز میں سانڈ کی طرح مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔

میں اس کے غصے کی تاب دیکھ چکا تھا۔ اس پر بھروسہ
نہیں کر سکتا تھا۔ جونہی وہ قریب آیا، میں جھکائی دے کر ایک
طرف نکل گیا۔ وہ اپنی جھونک میں دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے
اپنے ہاتھ بروقت بڑھالے تھے ورنہ اس کا سر دیوار سے ٹکرا
کر پھٹ جاتا۔ اُس کے پلٹنے ہی میں نے چھاتی پر کک رسید
کی۔ وہ دیوار سے ٹکرایا اور دیوار کی جڑ میں بیٹھ گیا۔ وہ اس
وقت میرا دوست نہیں تھا، اس کا عاشق تھا جو اُس کے لیے کچھ
بھی کر سکتا تھا اس لیے اُسے زیر کرنا ضروری تھا۔ میں نے
پاؤں جوڑ کر چھلانگ لگائی اور دونوں پیروں کی زوردار
ضرب اُس کے کاندھوں پر لگائی۔ وہ ’اوغ‘ کی آواز حلق
سے نکال کر ایک طرف گر گیا جبکہ میں پشت کے بل قالین پر
گر کر برقی مستعدی سے کھڑا ہو چکا تھا۔ اسے سنبھلنے کا موقع
نہیں دینا چاہتا تھا مگر جونہی میں نے اُسے ٹھوکر مارنے کی
کوشش کی، اُس نے میرا پیر پکڑ کر مروڑ ڈالا۔ میں سانپ کی
طرح بل کھا کر قالین پر جا گرا۔ ٹخنے میں ٹیس جاگی مگر یہ
وقت درد کی پروا کا نہیں تھا۔ میں نے فوراً کرڈٹ بدلی اور
دوسرے پاؤں کی نئی تلی ضرب اُس کی کہنی پر لگائی۔ اس کے
ہاتھ سے میرا پاؤں چھوٹ گیا اور میں سینے کے بل پھر زمین پر
گر گیا مگر اچھل کر کھڑا ہونے میں ایک لمحہ لگا گیا۔ وہ دونوں
ہاتھوں سے سر تھامے اکڑوں بیٹھا دکھائی دیا۔ میں نے اُسے
بالوں سے پکڑ کر کمرے کے وسط میں گھسیٹ لیا اور بیچ دیا۔
اس کے منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں نکل رہی تھیں۔

وہ رعایت کے لائق نہیں تھا کیونکہ موقع ملتے ہی اس
نے میرا ستیاناس کر دینا تھا۔ میں اسے فٹ بال کھیلنے کے سے
انداز میں ٹھوکر مارنے لگا۔ ایسے ہی وقت میں اچانک وہ
سپرنگ کی طرح اچھلا اور میرے مقابل کھڑا ہو گیا۔ اس کی
آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ کی پشت سے خون

اس نے ایک استہزائیہ مسکراہٹ میری طرف اچھالی، بولا۔ ”بھولے خان زادے! کیا تمہاری میڈم کو الہام ہوا تھا؟“

مجھے ایک چھٹکا سا لگا۔ اسے پروین پرٹوٹ پڑنے والی قیامت پر کوئی دکھ نہیں ہوا تھا۔ میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ”تمہیں میری بہن کا کوئی دکھ نہیں ہے؟“ وہ جلدی سے بولا۔ ”مجھے چند دن پہلے خبر ملی تھی۔ میں اس دکھ کو جھیل چکا ہوں۔ وہ نہیں، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری بلو (خالدہ) یا پھوری (غفور) نے یہ قیامت جھیلی ہے۔ مگر میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں کہ کسی پر لے (غیر متعلق) آدمی کے کہنے پر سردار حیدر خان کو اپنا مجرم مان لوں۔“

”مجھے یقین ہے کہ یہ کام حیدر خان نے ہی کیا ہے۔“ میرے لہجے کا یقین کامل تھا۔ ”کوئی ثبوت؟“

میں اس پر اس کی موجودگی میں سائیں دل جیت سے نبرد آزما کی کا خونریز مرحلہ آشکار نہیں کر سکتا تھا۔ کہا۔ ”میرے پاس ثبوت ہے۔“

وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسا۔ ایسے ہی وقت میں اس کی آواز کمرے میں ابھری۔ ”شہرے خان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے مگر میں مان لیتی ہوں کہ پروین میرے بابا کے پاس ہی ہے۔ مگر کھالے! تم اپنے دوست سے میرا قصور پوچھو..... ان لوگوں نے مجھے کیوں یہاں قید کر رکھا ہے؟“ میں نے جھٹ سے کہا۔ ”تم جانتی ہو۔ کھالا بھی نادان نہیں ہے۔“

کھالا ادھ کھلی آنکھوں سے ایک ٹک مجھے دیکھ گیا۔ عجیب بے تاثر، پشیمردہ اور متشعل آنکھیں..... کافی دیر تک ہم تینوں میں سے کوئی نہ بولا۔ یوں کہ جیسے ہمارے پاس کہنے کو کچھ رہا ہی نہ ہو۔ کھالے نے اس سکوت کو توڑا، نقاہت آمیز لہجے میں گویا ہوا۔ ”میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟..... بی بی جی پر جان قربان کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ پروین میری بھین (بہن) ہے۔ اس کی چنی (دو پٹہ) پر لگے ہوئے دھبے کو اپنی شاہ رگ کے خون سے دھونا فرض سمجھتا ہوں۔ مگر کیا کروں؟..... شہرے! تم ہی بتاؤ.....“

مجھ سے پہلے اس بول پڑی۔ ”کھالے! شہرے کی بہن کو بابا کی تحویل سے نکالو، میری فکر نہ کرو۔ میں شہرے کے پاس ہوں اور جانتی ہوں کہ شہرے بے غیرت نہیں ہے۔ اس کی رگوں میں سونے خان کا غیرت مند خون دوڑ رہا ہے۔ یہ مجھے قتل تو کر سکتا ہے مگر میری عزت پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا اور نہ کسی

اسے اپنے بندھے جانے کا احساس ہوا۔ اس نے فطری انداز میں ہاتھ پاؤں چلائے مگر ناکام ہو کر ہانپنے لگا۔ کراہ کر بولا۔ ”تم نے مجھے مارا، باندھ دیا..... تم اتنے طاقتور ہو گئے ہو شہرے خان؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تم آج تک یار بن کر زور آزمائی کرتے رہتے تھے۔ میں ہار جاتا تھا۔ آج مجھ پر میرے یار کھالے نے نہیں، خانزادی کے بے وقوف عاشق نے ہاتھ اٹھایا تھا، اسے اوقات دکھانی ضروری تھی۔“

اس کے ہونٹ بھنج گئے۔ بولا۔ ”پانی..... میرا حلق سوکھ رہا ہے۔“

میں نے تپائی پر پڑی ہوئی بوتل سے پانی بھرا اور گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔ پانی حلق سے اُترا تو حلق سے کراہ برآمد ہوئی۔ بولا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم نے مجھے مار مار کر بے ہوش کر دیا ہے۔“

میں نے بیزاری سے کہا۔ ”یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ کیا اب تم میری بات سنو گے؟“

اس کے لبوں پر ایک شاطرانہ مسکراہٹ ابھر آئی، بولا۔ ”اب تمہاری بکواس سننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”کھالے! تو میرا یار ہے۔ تجھ سے پیارا کوئی نہیں، میری نظر میں..... مگر تم نے یہ تو سنا ہی نہیں کہ مجھے کون سا گھاد لگا ہے؟“ میں نے اس کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا اور بات جاری رکھی۔ ”اسا کو میں نے نہیں، میری میڈم نے قید کر رکھا ہے۔ بڑی مشکل سے اس کو سمجھانے اور تم سے ملنے کی مہلت میڈم سے ملی ہے مجھے ورنہ وہ ان جھیلیوں میں پڑنے والی نہیں ہے۔ وہ گولیوں سے راستہ بناتی ہے اور سینہ تان کر دشمن کا گریبان پکڑتی ہے۔“

وہ بولا۔ ”میں نے تمہاری میڈم کو دیکھا نہیں ہے مگر اُس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ اپنی بات کرو۔“

میں نے گھٹنے کا زور اس کی چھاتی پر بڑھایا، کہا۔ ”انسانوں کی طرح میری بات سنو.....“

میری زبان ٹیپ پلیئر کی طرح چل پڑی۔ وہ آنکھیں موندے، بے تاثر چہرہ لیے میری کہانی سن رہا۔ میں نے اس کی موجودگی کی وجہ سے سائیں دل جیت شاہ والا قصہ سرے سے گول کر دیا تھا۔ جونہی میں اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوا، اس نے آنکھیں کھول دیں اور بولا۔ ”تمہیں کس نے کہا ہے کہ پروین کو سردار حیدر خان نے اغوا کر لیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”میڈم نے۔“

بدستور قالین پر بے ہوش اور اسما دیوار کے ساتھ ساکت و جامد پڑی رہی۔ اس کی آنکھیں آدمی کھلی ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی سیاہ پلکیں جھپک کر سدھ مندی ظاہر کر رہی تھیں مگر اس کا بدن بے جان انداز میں قالین پر آڑا تر چھا پڑا تھا۔ وہ اس وقت شدید ترین فرسٹریشن کی زد میں تھی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ کھالا کسی وقت بھی ہوش میں آ کر مجھ پر حملہ آور ہو سکتا تھا، اسے باندھنا ضروری تھا۔ ارد گرد نظر دوڑائی۔ الماری کھنگالی مگر رسی نہ ملی۔ اس کے گلے میں ہلکے نارنجی رنگ کا دوپٹا دکھائی دیا۔ میں نے دوپٹا کھینچ لیا۔ تب بھی اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ مزاحمت کے لیے دم خم نہیں رہا تھا۔

کھالے کو الٹا یا اور اس کی دونوں کلائیوں جوڑ کر پشت پر دوپٹے سے کس کر باندھ دیں۔ اس کی ٹانگیں باندھنے کے لیے کچھ نہ ملا تو میں نے میڈکل کٹ میں پڑی ہوئی کریپ بینڈیج کا مٹی رول کھول لیا۔ اچھی طرح لٹکی کرنے کے بعد میں نے کھالے کو سیدھا کیا اور اس کا خون سے لٹھڑا ہوا چہرہ گیلی روٹی کی مدد سے صاف کیا۔ اس کی فرسٹ ایڈ سے فارغ ہو کر اس کے عین سامنے قالین پر پیروں کے بل بیٹھ گیا۔

وہ آنکھیں جھپک کر مجھے خالی الذہنی کی سی کیفیت میں گھورنے لگی۔ میں نے کہا۔ ”کیا تم ہوش میں ہو؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اپنے عاشق کا انجام دیکھ لیا تم نے؟“ میرے لہجے میں از حد تلخی رچی ہوئی تھی۔

وہ آہستگی سے بولی۔ ”وہ ہار کر دل کو اچھا لگا، تم جیت کر پہلے سے بھی برے لگنے لگے ہو۔“

میرے لبوں پر زہر خند مسکراہٹ تیر گئی۔ کھالے کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ وہ عشق کی بارگاہ میں سرخرو ہو چکا تھا۔

میں نے کہا۔ ”تم دونوں احق ہو۔ اگر میں مر بھی جاؤں تب بھی تم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ عجیب فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے اس کا بازو ہوا میں بلند کیا، چھوڑ دیا۔ اُس نے اپنا بازو سنبھال لیا اور گرنے نہیں دیا۔

بولی۔ ”میں ٹھیک ہوں۔“

میں اس کی طرف سے بے فکر ہو کر اٹیچڈ ہاتھ سے پانی کا گگ بھر لایا۔ کھالے کے منہ پر چھینٹے مارے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ہوش میں آ گیا اور ہمیں کی طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ جونہی اُس کا ذہن پوری طرح بیدار ہوا، اس نے ایک جھٹکے سے اٹھنا چاہا مگر اٹھ نہ پایا۔ ایسے ہی وقت میں

بڑی دردناک تھی۔ میری اگلی ٹھوکر کا نشانہ بھی وہی جگہ تھی۔ وہ لڑھکھٹا ہوا سونے سے جالکا اور سر جھٹک کر اپنے اوسان بحال کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ ابھی اس نے شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ میں نے قریب پہنچ کر زوردار تھپڑ جڑے پر رسید کیا۔ اس نے منہ پھیرا۔ ادھر میرا لٹے ہاتھ کا تھپڑ اس کا منتظر تھا۔ اوپر تلے لگنے والے سات آٹھ تھپڑوں نے کھالے کی مت ماردی۔ میرے دونوں ہاتھ دکھنے لگے تو میں نے اس کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کے بیچ پاؤں کی زوردار ٹھوکر ماری۔ وہ بلبلا کر اچھلا اور تڑپ کر مرنے پر گر گیا۔ اس کا جسم تیزی سے جھٹکے لینے لگا۔ وہ بڑی قابل ترس حالت میں اپنے دونوں ہاتھ ٹانگوں میں دبائے اوندھے منہ پڑا بری طرح کراہ رہا تھا۔

میں نے اچھل کر زوردار کہنی اُس کی کمر کے درمیان، عین ریڑھ کی ہڈی پر ماری۔ وہ سیدھا ہوا پھر کمر کے بل سونے پر گر کر چت لیٹ گیا۔ میری کہنی کا اگلا وار اس کی پسلیوں کے نیچے پیٹ کے بالائی حصے پر لگا۔ اس نے ایک جھٹکا لیا اور ہاتھ کی لمبی آواز نکال کر ساکت ہو گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ پیر نہیں روکے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بے ہوش ہو چکا ہے، تو دانت پیس کر کھڑا ہو گیا اور پیچھے ہٹا ہوا دیوار تک اٹھ قدموں چلا گیا۔ دیوار سے پشت ٹکا کر لمبی لمبی سائیں لینے لگا۔

کھالا لوہار میرے ہاتھوں پٹ کر چت پڑا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اُس سائڈ کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا اور خون چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری فاتح نظریں اس کے بے حس و حرکت وجود پر سے پھسل کر سامنے والی دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑی اس کی طرف اٹھیں۔ اس کا چہرہ خوف سے سپید ہو گیا تھا۔ میری نظروں کی غضب ناک کو دیکھتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور بے جان انداز میں دیوار کی جڑ میں ڈھس گئی۔

میں اُس کی طرف بڑھا۔ میرا سر چکر رہا تھا۔ کھالے کی آہنی چوٹوں نے میرے بھی کس بل نکال کر رکھ دیے تھے۔ کم بخت کا جسم اور اعصاب فولادی تھے۔ اگر مجھے اپنی بقا خطرے میں پڑی محسوس نہ ہوتی تو شاید اس پر قابو نہ پاسکتا اور اس کے بجائے زمین پر پڑا اپنا خون چاٹ رہا ہوتا۔

میں نے دونوں ہاتھوں میں اپنے سر کو اچھی طرح جکڑا اور دائیں بائیں جھٹکے دیے مگر صورت حال جوں کی توں رہی۔ مجبوراً مجھے میڈکل کٹ سے دوپٹن لکڑیوں نکال کر حلق سے اتارنا پڑا۔ کئی منٹوں تک سونے پر بیٹھا رہا جبکہ کھالا

کو میرے قریب پھٹکنے دے گا، مجھے یقین ہے۔ پروین کی جان اور عزت دونوں خطرے میں ہیں.....“

میں نے ٹھنک کر اسما کو دیکھا۔ کہیں اُس کا دماغ خراب تو نہیں ہو گیا تھا؟..... وہ عجیب لڑکی تھی۔ میرے ہاتھوں پٹ کر، اپنے عاشق کی درگت بنوا کر بچ بول رہی تھی۔ پھر اپنا مدعا بیان کر کے گھنٹوں میں سر ڈال کر رونے لگی تھی۔ مجھے اس پر اس گھڑی ٹوٹ کر پیار آیا، ترس بھی اور جی چاہا کہ اُسے اسی وقت آزاد کر دوں مگر یہ میرے اختیار میں نہیں تھا۔

کھالا بولا۔ ”یار! میرے ہاتھ پیر تو کھول دو.....“

میں نے تشکیک آمیز لہجے میں کہا۔ ”تم بڑے کینے انسان ہو، ہاتھ پیر آزاد ہوتے ہی مجھ پر کتے کی طرح جھپٹ پڑو گے۔“

اس نے کہا۔ ”مجھے بی بی جی کی قسم..... جو کہو گے، وہی کروں گا۔ ویسے بھی اب تمہیں لڑنا بھڑنا آ گیا ہے۔ ڈرو نہیں۔“

اس کے ملتجیانہ انداز نے مجھے اس کی بات ماننے پر مجبور کر دیا اور میں نے اس کے ہاتھ پیر کھول دیے۔ وہ دونوں ہتھیلیوں کے بل بدقت تمام اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسما کا دوپٹا ایک کلائی سے بندھا رہ گیا تھا۔ میں نے کھولنا چاہا تو اس نے کراہتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ بی بی جی کا دوپٹہ ہے؟“

میں نے نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں!“

وہ بولا۔ ”تو پھر نہ کھولو یار..... کچھ دیر تو مجھے اس چٹی (دوپٹے) سے بندھا رہنے دو۔“

میں نے مسکرا کر ایک نظر اسما کی طرف دیکھا جو ہماری گفتگو سے بے نیاز گھنٹوں میں سر ڈالے سسک رہی تھی۔ میں نے کھالے کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور اسے قدم قدم چلاتے ہوئے سونے تک لے گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا وقت ہوگا؟“

میں نے کہا۔ ”علم نہیں۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں، سورج نہیں دیکھا۔ مجھے تو یہ اندازہ تک نہیں کہ اس وقت رات ہے یا دن.....“

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، لپائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”یار شہرے! مجھے معاف کر دے..... اصل میں یہ کہنے جب بی بی جی کو دیکھا تو یوں لگا کہ جیسے پوری دنیا میری دشمن ہے اور.....“

میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا، کہا۔ ”میں جانتا ہوں۔“

کن اکھیوں سے اسما کو دیکھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ رہی تھی۔ ہماری باتیں سن رہی تھی۔ کھالے کی بات سن کر اس کے

چہرے پر فخر کا رنگ جھلک گیا۔ کھالے نے کہا۔ ”کیا تم مجھ سے نہیں پوچھو گے کہ مجھ پر کیا ہوتی؟“

میں نے چونک کر کہا۔ ”کیوں نہیں..... بتاؤ ناں!“

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ ایسے ہی وقت میں انٹرکام کا بزر بجا۔ میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ ریسپور اُٹھایا۔ حسب توقع میڈم کی دل فریب آواز پردہ سماعت پر اُتری۔ ”ویری گڈ..... اب دونوں کو اپنے دل کی باتیں کرنے دو اور تم میرے پاس چلے آؤ۔“

میں کھالے کی آپ بیتی سننا چاہتا تھا مگر میڈم کے حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ کھالے اور اسما سے معذرت کر کے میڈم کے پاس پہنچا۔ وہ بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی جبکہ سونیا آپریشنل بیڈ کے سامنے، میری طرف پشت کئے کھڑی تھی۔

میڈم نے تالی بجاتی، خوش ہو کر بولی۔ ”آئی لو یو شہر یار..... تم نرے خوب صورت ہی نہیں ہو، دلیر اور طاقت ور بھی ہو۔“

میرا سینہ پھیل گیا۔

سونیا بولی۔ ”میڈم! میں جاؤں؟“

”ہاں! جاؤ مگر مین آپریشن روم میں..... مداخلت کے بغیر دونوں قیدیوں کی مانیٹرنگ کرو۔ ان کی گفتگو سنو۔ کوئی کارآمد بات ہو تو نوٹ کر لیتا۔ یہ ذہن میں رکھنا کہ وہ یہاں سے نکلنے کی کوشش میں تم پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔“

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ”تو کیا وہ یہاں سے نکل سکتے ہیں؟“

سونیا نے کہا۔ ”وہ تو رہے ایک طرف، تم بھی میڈم کی اجازت کے بغیر ہی ٹو سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے۔“

اس کے جانے کے بعد میڈم نے ستائشی نظروں سے مجھے سرتا پا دیکھا۔ اپنی کلائی میری جانب بڑھا کر کہا۔ ”پکڑو.....“

میں نے جھجکتے ہوئے کلائی تھامی۔ وہ بولی۔ ”زور سے.....“

میں نے اپنی انگلیوں کا دباؤ بڑھایا۔ نرم سی کلائی میں انگلیاں پیوست ہو گئیں۔ وہ بولی۔ ”اور زور سے..... پوری طاقت سے پکڑو۔“

میں نے اپنی پوری قوت صرف کی۔ ایک بار اپنی جان سے پیاری غزالہ کی کلائی تھامی تھی۔ زور لگانے پر بلبل اُٹھی تھی۔ شانوکا بازو تھامتا تھا، وہ رو پڑی تھی۔ میڈم شکیلہ کے چہرے پر بجائے تکلیف کے، عجیب سٹائش انگیز اثرات مثبت دیکھ کر حیران ہوا۔

وہ بولی۔ ”میرا اندازہ تھا کہ تم خالد کے ہاتھوں جبری طرح پٹ جاؤ گے۔ وہ دیکھنے میں تم سے زیادہ جسیم اور قوی نظر آتا ہے، مگر تم نے کمال کر دیا۔ میں بہت خوش ہوئی ہوں تمہارا فائننگ سپرٹ دیکھ کر۔“

”تھینک یو میڈم! میں ناکام ہونا نہیں چاہتا تھا۔“

”کھالا اسما سے بہت محبت کرتا ہے۔ ہے ناں؟“ اس نے ”کھالا“ لفظ پر خصوصاً زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اُسے طیش میں یاد تک نہیں رہا کہ یہاں پر اس کی اپنی حیثیت ایک قیدی کی سی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”جی میڈم! آپ کا کہنا بجا تھا کہ عشق کے سامنے کوئی اور جذبہ نہیں اٹھا سکتا۔“

وہ دوپٹی آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے گاؤں، نور پور کی تفصیلی رپورٹ موصول ہو گئی ہے۔ تم بڑے لگی ہو۔ تمہاری لگائی ہوئی آگ جہنم کی آگ ثابت ہوئی اور اس نے دل جیت کی ہڈیاں تک جلا کر بھسم کر ڈالی ہیں۔ سبھی کے نزدیک سامیں دل جیت دنیا والوں سے اوجھل ہو کر کوئی چلہ کاٹ رہا ہے۔ جلد یا بدیر نئی روحانی طاقتوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوگا۔“

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا اس کے گھر والوں کا بھی یہی خیال ہے؟“

اس نے مزہ لیا۔ ”ہاں تو..... یہ بات گھر سے ہی تو نکلی ہے۔“

”پروین کے بارے میں کیا چہ میگوئیاں ہیں؟“

”گاؤں والے متفق ہیں کہ امیر نواز اُسے بھگا کر لے گیا ہے اور اب تک اس نے پروین کے ساتھ عدالتی شادی رچالی ہوگی۔“

یہ فکر مندی کی بات تھی کہ امیر نواز ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ نور پور میں پھیلی ہوئی اس افواہ میں بھرپور صداقت ہو اور میری ٹانگ ٹوٹیاں رانگاں جانے والی ہوں۔ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر میڈم بولی۔ ”یہ درست ہے کہ تمہاری بہن کے اغوا میں امیر نواز کا کوئی کردار نہیں ہے مگر اس کا تعلق اس واردات سے ضرور ہے۔ کیا؟ یہ وقت آنے پر ہی عیاں ہوگا۔“

میں نے سوچ کر کہا۔ ”کہیں ایسا تو نہیں کہ امیر نواز کو اس ٹھکانے کا پتا ہو جہاں پروین کو رکھا گیا ہو، وہ اُسے ڈھونڈتا ہو اور وہاں پہنچا ہو اور اسے بھی روک لیا گیا ہو؟“

وہ بولی۔ ”ایسا ہو تو سکتا ہے مگر اس اندازے کو حتمی قرار نہیں دیا جاسکتا۔“

”اور میرے گھر والوں کا کیا حال ہے؟“

”وہ ٹھیک ہیں مگر پریشان ہیں کہ شہر یا کہاں گیا؟“

وہ عام سے لہجے میں بولی۔ ”البتہ سردار حیدر خان کی لڑکی کے اغوا کی خبر پورے وسیب میں پھیل چکی ہے۔ تمہارے گاؤں کے سبھی بڑے سردار حیدر خان کی کوٹھی پر پہنچ چکے ہیں، اپنے باس کا دکھ بانٹنے کے لیے۔“ بات کرتے ہوئے پل بھر کو ٹھہری، اکتائے اکتائے سے انداز میں بولی۔ ”اچھا..... چھوڑو ان باتوں کو..... ادھر آؤ، بیڈ پر وہ بن پش کرو جس پر اسپیکر کا مونو بنا ہوا ہے۔ سنو تو سہی، دونوں عاشق کیسی مایوس رومانوی گفتگو کرتے ہیں۔“

اس کا اشارہ کھالے اور اسما کی طرف تھا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ سوچ بیڈ پر مطلوبہ بن تلاش کر کے پش کر دیا۔ تین چار مرتبہ ”ٹو“ کی آواز کرے میں گونجی، پھر اسما کی آواز سنائی دی۔ ”مجھے شہرے خان سے خوف آنے لگا ہے۔ وہ بالکل باؤلا ہوا جا رہا ہے۔ اس سے کوئی بعید نہیں کہ وہ پروین کو نہ پا کر مجھے مار ڈالے۔“

کھالے کی آواز سنائی دی۔ ”بی بی جی! آپ کیسے یقین سے کہہ سکتی ہیں کہ پروین آپ کے بابا کے پاس ہے۔“

وہ دثوق سے بولی۔ ”یہ کوئی پہلی واردات تو ہے نہیں کہ شبہ کیا جائے۔ بابا نے نجانے کتنی لڑکیوں کو برباد کر کے بیچا ہے۔ ویسے بھی یہ میڈم نے اپنے طور پر یقین کرنے کے بعد ہی مجھ پر ہاتھ ڈالا ہے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ کھالے کی حیرت سے معمور آواز ریٹائرنگ روم میں گونجی۔

”میں سچ کہتی ہوں۔ ہم جہاں موجود ہیں، یہ بھی بابا کے قماش کے لوگوں کی پناہ گاہ ہے بلکہ یہ بابا سے بھی زیادہ خطرناک لوگ ہیں۔“ کچھ دیر خاموشی حامل رہی، پھر اسما کی آواز سنائی دی۔ ”کھالے! بابا کے پاس اشتہاری مجرموں کی بڑی کھیپ موجود ہے جو نہ صرف اس کے لیے دولت اکٹھی کرتے ہیں بلکہ اس کے سیاسی دشمنوں کو بھی مختلف محاذوں پر الجھائے رکھتے ہیں تاکہ وہ سیاسی میدان میں بابا کی ہم سری نہ کر پائیں۔ استاد بلو نام کا ایک بدنام اور خطرناک غنڈہ بابا کے تلوے چاٹتا ہے، اشارے پر حرکت میں آتا ہے اور آگ لگاتا جاتا ہے۔“

میڈم نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا، بولی۔ ”سن رہے ہو شہر یار؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جی میڈم! شاید اسما کی ذہنی حالت درست نہیں رہی ورنہ کوئی بیٹی ایسی باتیں اپنے

باپ کے بارے میں نہیں کرتی۔“

ابولی۔ ”اسا پڑھی لکھی ہے۔ حقیقت پسند ہے۔ جانتی ہے کہ اس وقت باپ کے کرتوتوں کی پردہ پوشی محض اپنے آپ کو دکھانے کے مترادف ہے۔“

کنٹرول سینٹرل پر لگے ہوئے اسپیکر سے دونوں کی آواز پھوٹی رہی۔ اسما حیرت بھرے انداز میں اس سے پوچھ رہی تھی کہ وہ اس کے پیچھے کس طرح یہاں تک پہنچا تھا۔ وہ ال رہا تھا مگر صاف عیاں تھا کہ وہ زیادہ دیر تک ایسا نہیں کر پائے گا اور اسما کے سامنے ریت کا محل ثابت ہوگا۔

میں ہمہ تن گوش تھا مگر میڈم جلد ہی بور ہو گئی، بولی۔ ”شہر پار! اسی بٹن کو جا کر پش کر دو۔ یہ الو کے پٹھے وہ باتیں تو کہی نہیں رہے، جو میں سننا چاہتی ہوں۔“

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ بٹن پش کرنے کے بعد پلٹا۔ ایسے میں وہ بیڈ سے اتری۔ میرے مقابل چند لمحوں کو ٹھہری، بغور دیکھتی رہی پھر اپنا داہنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”لو..... شکر یہ ادا کرو، پھر میں کچھ دیر آرام کرنا چاہوں گی۔“

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ سمجھ گئی۔ ہونٹ پر ہونٹ چڑھا کر، آنکھیں آدھی میچ کر، ثنرات آمیز لہجے میں بولی۔ ”کسی.....“

میں دم بخود رہ گیا۔ میرے لیے اس کی غیر معمولی وارفتگی اور محبت پاش اجازتیں ناقابل یقین تھیں۔ میں نے جھپکتے ہوئے ہاتھ تھا، گلاب کی طرح نازک اور خوب صورت ہاتھ کولہوں پر لگایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس گھڑی میں مسرت اور طمانیت کے اُس جھولے پر سوار تھا جس میں بیٹھنے والا اپنے حواس میں نہیں رہتا۔ اچانک اس کا ہاتھ پھسل کر دور ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو میڈم کو سینٹرل کے سامنے کھڑا دیکھا۔ ایک ادا سے پلٹ کر بولی۔ ”میں تھک گئی ہوں رسونا چاہتی ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانا آ جائے گا، کھا کر لیٹ جانا، نیند پوری کر لینا۔“

میں نے کہا۔ ”میڈم! وہ کھالے اور اسما.....“ وہ بولی۔ ”ان کی فکر نہ کرو۔ ان کے لیے بھی کھانا آ رہا ہے۔“

اس نے کنٹرول سینٹرل پر یکے بعد دیگرے تین بٹن پش کئے۔ پورے کا پورا سینٹرل کسی دروازے کی طرح کھلا اور چار ضرب اڑھائی فٹ کا خلا نمودار ہو گیا۔ سینٹرل کے عقبی حصے میں سیاہ اور سرخ تاروں کا جال ساتتا ہوا تھا۔ کئی تاریں لٹک رہی تھیں۔ میڈم شکیلہ اُن تاروں سے بچ کر خلا میں سے گزری اور

میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ چند لمحوں بعد سینٹرل خود کار انداز میں بند ہو گیا جبکہ میں پھٹی پھٹی نظروں سے گھورتا رہ گیا۔ اس عمارت نما عجائب گھر کے کسی بہت ذہین اور ماہر انجینئر نے اپنے تمام تر ہنر کو بروئے کار لاتے ہوئے تخلیق کیا تھا۔ میں نے تو آج تک دروازوں کو آپوں آپ کھلتے نہیں دیکھا تھا، یہاں تو دیواریں بھی ایک بٹن دبانے پر کھل جاتی تھیں۔ میڈم شکیلہ کوئی نو، میں تحفظ کا یقین تھا تو بے جا نہیں تھا۔ یہاں قدم قدم پر غیر متوقع صورت حال اور نہ سمجھ میں آنے والے میکروم موجود تھے جو کسی بھی شخص کو آن واحد میں درط حیرت میں مبتلا کر کے مفلوج کر سکتے تھے۔

میں نے سوچا، ہو سکتا ہے کہ اس دنیا میں یہ معمول کی باتیں ہوں جو مجھے جیسے دیہاتی کو بہت بڑی اور غیر یقینی لگ رہی ہیں۔

کچھ دیر بعد رسونا گتے کا ایک سرخ ڈبہ تھا میرے رینارنگ روم میں داخل ہوئی۔ مخصوص سائز کا ڈبہ بیڈ پر رکھ کر بولی۔ ”کسی چیز کی ضرورت ہو تو انٹرکام پر رابطہ کر لیتا۔ میڈم کا حکم ہے کہ دو چار گھنٹوں کی نیند لے لو۔ پھر نجانے کیسے حالات سے واسطہ پڑ جائے۔“

میں نے کہا۔ ”خطرہ ہے؟“ وہ بولی۔ ”ہے تو نہیں مگر کیا ہونے والا ہے، یہ علم بھی نہیں۔“

وہ گڈ بائی کہہ کر رخصت ہو گئی۔ میں نے بیڈ پر بیٹھ کر ڈبہ اپنی جانب کھینچ لیا جس پر شہر کے ایک بڑے ہوٹل کا مونو گرام اور نام چھپا ہوا تھا۔ اس میں بریڈ کے چار قتلے، چکن لیگ پیس اور کولڈ ڈرنک سمیت کئی لوازمات ترتیب کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ عرصہ پہلے جب میں عرفان مرزا کے ساتھ تنظیمی کاموں میں متحرک رہا کرتا تھا، ایسے ہی بیچ بکس ملتے رہتے تھے۔

میں نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔ کھالا کس طرح میڈم کی کوشی تک پہنچا تھا؟ وہ مولی کو قتل کر کے بھاگنے کے بعد کن حالات سے گزرا تھا؟ آگے کیا ہوگا؟ انہیں سوچوں کی گجنگ ادھیڑ بن میں، لیل و نہار کے گرداب میں میرا ذہن تھک گیا، چکر اگیا۔ تبھی آرام چاہتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں میری آنکھ لگ گئی اور میں دنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔

نہ جانے کس وقت میری آنکھ کھلی۔ میری بیداری کا سبب کوئی کھٹکا نہیں تھا بلکہ نیند پوری ہو جانے پر آپوں آپ بیدار ہوا تھا۔ میں نے فی الفور بیڈ چھوڑ دیا۔ بھرپور انگڑائی لی، رینارنگ روم کا طائرانہ جائزہ لیا، اپنے سوا کوئی دکھائی

نہیں دیا تو وال کلاک تلاش کرنے کے لیے نظریں دوڑائیں۔ کمرے میں کلاک نہیں تھا۔ اگر کلاک نصب ہوتا بھی تو میں یہ امداد نہیں کر سکتا تھا کہ میں کتنی دیر تک سویا رہا تھا کیونکہ میں نے سونے سے پیشتر وقت نہیں دیکھا تھا۔ زیر زمین ہونے کی بنا پر ’سی نو‘ میں شب و روز کا فرق معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر بڑے کمرے میں جھانکا۔ وہ بھی خالی تھا۔ میرے پاس سوائے ہاتھ لینے کے کوئی مصروفیت نہیں تھی۔

تازہ دم ہو کر انٹرکام کا ریسپورڈ اٹھا کر کان سے لگایا۔ علم نہیں تھا کہ کون سا بٹن پش کرنا ہے۔ اندازے سے ’ایک‘ کا بٹن دبا دیا۔ تھوڑی دیر بعد رسونا کی آواز سنائی دی۔ ”کیا بات ہے؟“

میں نے پوچھا۔ ”میڈم کہاں ہیں؟“ وہ بولی۔ ”میڈم تو چلی گئیں۔“ ”کہاں؟“ میں نے متعجب ہو کر استفسار کیا۔ ”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ سی نو سے چلی گئی ہیں۔ کہاں؟ یہ انہوں نے بتایا نہیں، میں نے پوچھا نہیں۔ کیا تم نے ہاتھ لے لیا؟“

”ہاں..... اب مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے۔“ ”ٹھیک ہے، انتظار کرو۔“ وہ بولی۔ ”میں کھانا بھجواتی ہوں۔“

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ”کیا وقت ہوا ہے؟“ وہ بولی۔ ”گیارہ بجے ہیں..... تم آٹھ گھنٹے سوئے رہے ہو۔“

”گیارہ دن کے، یارات کے؟“ وہ بولی۔ ”رات گزر چکی ہے۔“ مجھے حیرانی ہوئی۔ میں نے پوچھا۔ ”اسما اور خالد موجود ہیں؟“

”ہاں!“ وہ بولی۔ ”مگر تمہیں ان سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔“ ”میڈم نے کہا ہے؟“

”ہاں! تمہارے لیے میڈم کا حکم ہے کہ تم رینارنگ روم تک محدود رہو گے۔“ وہ ہنسی۔ ”ایک قیدی کی طرح!“ ”اچھا..... تو پھر ایک کرم کرو، آ کر سینٹرل کو آ پریٹ کرنا سکھا دو۔ اور نہیں تو میں وقت گزاری کے لیے ان دونوں کو دیکھتا رہوں۔“ میرا اشارہ اسما اور کھالے کی طرف تھا۔ ”سوری!“ اس نے کہا۔ ”اجازت نہیں ہے۔“ میں نے منہ بنا کر ریسپورڈ رکھ دیا۔ چونکہ میں میڈم کے

اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا، اس لیے سوائے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دل کو یہ تقویت بھی میسر آئی کہ وہ سی نو سے نکل کر میری بہن کی بازیابی کے سلسلے میں ہی مصروف ہوگی۔ رسونا آئی اور کھانا میرے سامنے بیڈ پر رکھ کر چلی گئی۔ کم و بیش پہلے سا ہی لُچ بکس تھا۔ میں نے شکم سیر کیا۔ چائے کی شدید طلب محسوس ہوئی۔ انٹرکام پر رسونا سے چائے کا مطالبہ کیا۔ وہ دس منٹ بعد چائے سمیت رینارنگ روم میں داخل ہوئی۔ میں نے چاہا کہ وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھے، ہم باتیں کریں مگر اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”نہیں شہر پار! میں بہت مصروف ہوں۔ پھر بھی سہی۔“

میں نے اصرار نہیں کیا اور چائے کی لطف کشیدگی میں محو ہو گیا۔ کافی دیر، میرے اندازے کے مطابق چار ساڑھے چار گھنٹے گزر گئے مگر کوئی تغیر واقع نہ ہوا۔ میں رینارنگ روم میں لیٹا، نہایت محدود جگہ پر چہل قدمی کی، کنٹرول سینٹرل پر موجود تمام بٹن دیکھے اور ان پر لکھے ہوئے ہر لفظ کو کئی کئی بار پڑھا مگر بوریت کا احساس فزوں تر ہوتا گیا۔ رسونا نے میری فرمائش پر دو تین مرتبہ چائے پلائی۔ جب میں نے انٹرکام پر اس سے وقت کے بارے دریافت کیا تو اس نے کہا۔ ”پانچ بجنے کو ہیں..... خیریت؟“

میں نے زچ ہو کر کہا۔ ”اب تو مجھ سے رینارنگ روم میں بیٹھائی نہیں جا رہا۔“ ”بیٹھا نہیں جاتا تو لیٹ جاؤ، لیٹا نہیں جاتا تو نہانے لگ جاؤ.....“

اس نے ہنستے ہنستے رابطہ منقطع کر دیا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد اس کی شکل دکھائی دی۔ اس کے ہاتھوں میں بڑا سیاہ رنگ کا شاپنگ بیگ دکھائی دیا جسے کرسی میں رکھتے ہوئے بولی۔ ”شہر پار! تمہاری قید ختم ہو گئی ہے۔ اس بیگ سے سوٹ نکالو، پیچ لو اور پوری طرح تیار ہو کر رینارنگ روم سے باہر آ جاؤ۔ ایک دھیان رکھنا، اس لباس کے اوپر اپنا یہی ڈھیلا ڈھالا لباس پہن لینا۔“

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بولی۔ ”میں کچھ نہیں جانتی۔ جو حکم ملا، تم تک پہنچا دیا۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے بیگ کو بیڈ پر الٹا دیا۔ سوٹ کے نام پر برآمد ہونے والے سامان کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ اس میں ڈارک گرے کلر کا باڈی ٹائٹ سوٹ، سیاہ شیشوں والی عجیب ساختہ گانگز، لیزر سرچ لائٹ، جرمین ساختہ

کسی گمشدہ میں اور ملک گمشدہ میں

9

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

کما سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

ہر کے کسی بھی شہریا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

انہی سالوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز ٹینس ہاؤس اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 ٹیکس: 35802551

جس پر مار کر سے ایک نقشہ بنایا گیا تھا۔ ہم چاروں بیڈ کے پائنتی والے تختے کے ساتھ بڑ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ نقشے کی مدد سے ٹارگٹ تک پہنچنے کی ہدایات دینے لگا۔ اسی دوران ظاہر خان چائے، غیر ملکی شراب کی سر یہ مہربوتل اور نقرئی گلاس ٹرے میں رکھے گیسٹ روم میں داخل ہوا۔ جسے جو درکار تھا، اُسے سر د کرنے کے بعد خاموشی سے واپس چلا گیا۔

کھالا پی رہا تھا۔ زندگی بھر کچی پر عیاشی کرتا آیا تھا۔ 'ولایتی' دیکھ کر اوقات سے نکلنے لگا تو میر و شاہ نے ہاتھ تھام لیا۔ بولا۔ "ابے ندیدے! یہ سے ہوش میں رہنے کا ہے، لہرا کر پھوٹ میں جندگی (زندگی) حرام کرنے کا نہیں ہودت ہے..... بس کر..... جیت کر آدے تو ڈرموں پر بٹھا دیوے ہے لاڈے کو....."

کھالا کھیا گیا۔ میر و شاہ نے از حد سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم چاروں میں سے ایک آدی کو گینگ لیڈر نامزد کیا۔ وہ کسرتی بدن والا کیم انسان تھا۔ چہرے مہرے سے بڑھا لکھا اور معصوم فطرت دکھائی دیتا تھا مگر میں اس کے اندر چھپی بربریت اور خون ریز فطرت کو بہ آسانی محسوس کر سکتا تھا۔ میر و شاہ نے اسے 'پیا' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اصل نام نجانے کیا تھا۔ میر و شاہ اسے آپریشن کے بارے میں سنہری ہدایات سے سرفراز کرنے کے بعد ہم سب سے مخاطب ہو کر بولا۔ "یہ دونوں جانت ہیں کہ ماڑی میڈم کیا چیچ (چیز) ہو دے ہے۔ تم دونوں غنچے نہیں جانت ہو۔ جان لیوے ہے کہ میڈم ہار کر آنے والے غنچوں کو اپنے ہاتھوں توڑ پھینکے ہے، نہ دیکھے کہ کون کتنا گھبرو ہو دے ہے..... جیت کر آدے تو راستے کھلے ہو دیں، ہار کر آدے تو صرف موت کا روٹ سواری مانگے ہے..... سمجھ گئے ناں غنچے؟"

میر و شاہ کی سرد آواز سن کر میری گردن پر چیونٹیاں سی رنگیں۔ یہی حال کم و بیش کھالے کا تھا۔ "کیا ان دونوں کو اسلحہ چلانا آتا ہے؟" پیا نے استفسار کیا۔

میر و شاہ نے جواب دینے کے بجائے مجھے اور کھالے کو باری باری دیکھا۔ پوچھا۔ "ہاں بھی غنچے؟"

ہلکے پھلکے ہتھیاروں سے شناسائی کی حد تک تعلق رہا تھا۔ یہاں نجانے کس قسم کا اسلحہ زیر استعمال تھا، علم نہیں تھا۔ پھر میری درخواست پر میر و شاہ اور پیا دونوں کمرے سے باہر گئے، واپس آئے تو ان کے ہاتھوں میں ایک ایک گن دبی ہوئی تھی۔ پیا نے مشاقانہ انداز میں ہمیں ان گنوں سے روشناس کرایا۔ کلیدی ہدایات دینے اور ہماری طرف سے

میرے سامنے والی دیوار نہایت بے آواز طریقے سے ہٹا شروع ہو گئی۔ جونہی خلا بڑا ہوا، میں نمودار ہونے والی گیلری میں داخل ہو گیا۔ یہ وہی کم روشنی والی گیلری تھی جس میں سے گزر کر میڈم شکیلہ کی معیت میں 'سی ٹو' پہنچا تھا۔ پانچ سات منٹ کے بعد میں میڈم کی کوٹھی کے گیسٹ روم میں تھا۔ میری توقع کے خلاف میر و شاہ کی شکل دکھائی دی۔ کمرے میں اس کے علاوہ کھالا اور دو توانا، جسیم اور کسرتی جیسوں والے افراد موجود تھے۔ میر و شاہ نے بڑے پر تپاک انداز میں میرا استقبال کیا اور سونے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ماڑے غنچے! جندگی (زندگی) اور موت کا کھیل شروع ہو جات ہے۔ اب تم اپنی جان بھلی پر رکھے اور نجر (نظر) اپنے شکار پر....."

"شکار؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے مستفسرانہ انداز میں اُسے دیکھا۔

وہ بولا۔ "شکار، وہی سالاحیدر خان..... ماڑی میڈم بولے کہ شہریار کے جسم میں آگ ہو دے ہے آگ..... ریچھ کی طاقت اور بجلی کی پھرتی ہو دے ہے تیرے پٹھوں میں۔ وہ بے غیرت..... کا بچہ! وہ حیدر خان..... تمہاری بہنا کو دینے سے انکاری ہو دے ہے غنچے! سمجھ میں آوے؟..... ہاں! اس مردود کے اڈے پر آج کی رات حملہ کرے اور سب کو تھس تھس کر کے رکھ دیوے ہے تم۔ یہ لونڈے تیرے ساتھ جاوے ہیں۔ کیا سمجھ ہے؟"

میں نے چونک کر پہلے میر و شاہ کو، پھر کھالے کو دیکھا، دونوں کے چہرے ساٹ تھے۔ میرادل دھڑکنے لگا۔ امتحان کی گھڑی سوالیہ نشان بن کر سر پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ میرے مختلف سوالوں کے جواب میں میر و شاہ نے بتایا کہ سردار حیدر شاہ نے اسما کے بدلے پردین کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے پردین کی اپنے ہاں موجودگی کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا تھا اور بہت خطرناک نتائج کی دھمکیاں دی تھیں۔ میر و شاہ نے اپنے طور پر یہ کھوج لگایا تھا کہ وہ اپنے 'شکار' کو دریاے سندھ کے کنارے پردافج نیلے والی حویلی میں رکھتا تھا۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ پردین کو بھی وہیں رکھا گیا تھا۔ چونکہ میڈم زیادہ دیر تک اسما کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتی تھی، اس لیے اس نے میری خوابیدگی کے دورانے میں ہی کھالے اور میر و شاہ سے مشاورت کے بعد ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میڈم نے کھالے سے کیا باتیں کی تھیں؟ کھالا کیونکر میرے ساتھ جانے پر تیار ہوا تھا؟ ان باتوں کا سردست کوئی علم نہیں تھا۔

میر و شاہ نے بیڈ پر ایک بڑا سا ایوری کارڈ پھیلا دیا

ریوالور اور بازو پر باندھے والا بلٹ بیلٹ..... ایسی ہی کچھ اور چیزیں بھی بیڈ میٹرس پر پڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں تامل نہیں ہوا کہ مجھے کسی خاص موقع کے لیے تیاری کا حکم دیا گیا ہے۔

چونکہ مجھے جلد تیار ہونے کا حکم صادر ہوا تھا، اس لیے میں پانچ سات منٹ میں پوری طرح تیار ہو گیا۔ تسلی کی خاطر میں نے ہاتھ روم میں نصب شدہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ لیدر کی چست پینٹ شرٹ، بڑے بڑے گاگنز، ایک بازو پر بندھے ہوئے چرمی بلٹ بیلٹ سے جھانکتی ہوئی کوئی درجن بھر گولیاں، پینٹ کے بیلٹ میں اڑسا ہوا سامان..... سیاہ جوتے نئے اور سائز میں کچھ چھوٹے تھے جو اس کے پیروں پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ مجھے اپنی کمانڈوز جیسی نئی وضع قطع عجیب لگی۔ ہم دیہاتیوں میں پینٹ شرٹ پہننا بھی معیوب خیال کیا جاتا ہے اور بے نام سی جھجک آڑے آتی ہے مگر چونکہ میں نے کالج کے زمانے میں پینٹ شرٹ پر مشتمل یونیفارم پہن رکھی تھی، اس لیے مجھے یہ لباس پہننا عجیب نہیں لگا تھا۔

میں نے بخوبی جائزہ لیا۔ مبادا کہ کوئی سامان جسم سے چپکنا بھول گیا ہوں پھر اپنی اتاری ہوئی شلوار قمیص پہن لی۔ سوائے گاگنز اور جوتوں کے، سب کچھ میرے ڈھیلے ڈھالے لباس کے نیچے چھپ گیا۔ میں نے اپنے گھر سے نکلتے ہوئے نوٹوں کی تقریباً آدھی گڈی جیب میں درپیش آنے والے ناگفتہ بہ حالات کے پیش نظر رکھ چھوڑی تھی۔ تھوڑی سی رقم کرایہ کی مد میں خرچ ہوئی تھی۔ باقی محفوظ رہی تھی اور ابھی میری جیب میں ہی تھی۔

رینارنگ روم سے نکلا تو بڑے کمرے میں سو نیا کو اپنا منتظر پایا۔ وہ بولی۔ "بہت دیر لگا دی تم نے..... میڈم دو مرتبہ پوچھ چکی ہیں۔"

میں کوئی جواب دیے بغیر اُس کے پیچھے چلتا ہوا لاؤنج نما گیلری میں آیا۔ جس کمرے میں کھالے اور اسما کو رکھا گیا تھا، وہ بند تھا۔ وہ مجھے گیلری کے آخری سرے پر ایک مخصوص جگہ پر بٹھرا کر بیٹھی، بولی۔ "میں آپریشن روم میں جا رہی ہوں تاکہ تمہیں 'سی ٹو' سے باہر نکالنے کے لیے راستے کھولوں۔ تم یہیں کھڑے رہو۔ جونہی راستہ کھلے، ناک کی سیدھ میں چلتے جانا۔ میڈم کے ساتھ یہاں تک آتے ہوئے تم نے راستہ دیکھ لیا تھا۔ اوکے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ مجھ پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے ایک کمرے میں گھس گئی۔ ایک آدھ منٹ بعد

’او کے رپورٹ ملنے کے بعد عقیل کے ہاتھ گتیں باہر گاڑی میں رکھوا دی گئیں۔

میر و شاہ ’پیا‘ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”ماڑے پیاجی! یہ غنچے ہو دیں، ابھی گلاب نہ بنت ہیں..... پر تم بنا دیوے، انعام پالیوے..... گاڑی اور مورکھ پستول و ستول باہر ہووے ہے، تم سب بارود اٹھا کے جاوے اور پیچھے مڑ کر مت دیکھے ہے..... گاڑی چوری کی ہووے ہے، جہاں مصیبت بنت، وہیں پھینک دیوے ہے۔ او کے؟“

اس نے نقشہ اٹھا کر پیا کے حوالے کر دیا اور کھڑا ہو گیا۔ یوں جیسے اس نے محفل برخواست کرنے کا اعلان کیا ہو۔ اچانک ٹھم کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”اڑے لاڈے! گاڑی میں مرہم پٹی والا ڈبار کھا ہووت ہے، کوئی گولی شولی لگ جاوے، کوئی ٹخم (زخم) لگ جاوے تو ڈاکٹری کر دیوے ہے۔ میڈم بولت ہے کہ تم نے ڈاکٹری سیکھ رکھی ہووت ہے۔“

میں نے حامی بھری۔ پھر وہ ہم چاروں کو باری باری گھورتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد پیا نے کہا۔ ”شہر یار! میرا نام سراج الدین ہے، یہاں مجھے بھی پیا کہتے ہیں۔ یہ عقیل ہے۔ قدرت نے پیدا کرتے ہی اس کی زبان پر قفل لگا دیا۔ جوان ہوا تو اس نے اپنے ہاتھوں کو بولنا سکھا دیا۔ اور عقیل! یہ خالد عرف کھالا ہے، زبردست ڈرائیور ہے۔ یہ شہر یار ہے..... ان دونوں کے بازوؤں میں کتنا دم ہے، نہیں معلوم مگر آج معلوم ہو جائے گا۔ کیا ہم چلیں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے ریسٹ ہاؤس سے باہر آئے۔ اس وقت شام گہری ہو رہی تھی۔ لمبے دورانیے کے بعد کھلے میں آنا عجیب سا لگا۔ ظاہر شاہ نے گیٹ پر کھڑے کھڑے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی کی نشاندہی کی۔ کوئی کی احاطی دیوار کے ساتھ سرو کے پودوں کے قریب گرے مگر کاچوڑے ٹائرز والا ڈبل کمین ڈالا کھڑا نظر آیا۔ سائڈ پر بڑا سا اسلکر چسپاں تھا۔ انگریزی حروف میں لکھا ہوا ’سرف‘ دور سے پڑھا جاتا تھا۔

پیا خوش ہو کر بولا۔ ”میڈم زندہ باد..... آج مزہ آئے گا۔“

پیا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور اس نے مجھے اگلی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب ہم سب بیٹھ گئے تو پیا نے مجھے مخاطب کیا۔ ”شہر یار! گاگز اتار کر جیب میں رکھ لو۔ اور ہاں! تم نے نقشے پر ٹارگٹ لوکیشن اچھی طرح سمجھ لی ہے ناں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں! مجھے یقین ہے کہ میں تمہیں وہاں

تک لے جاسکتا ہوں۔“

کھالے نے جھٹ سے کہا۔ ”میں نے سردار حیدر خان کی وہ حویلی دیکھ رکھی ہے جس پر ہم نے حملہ کرنا ہے۔“

”ویری گڈ..... ہم کتنی دیر میں وہاں پہنچ سکتے ہیں؟“ پیا نے پوچھا۔

”زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں.....“

”ابھی تو یہ مشکل آٹھ بجے ہیں۔ دو گھنٹوں بعد دس بجیں گے..... نہیں..... ہمیں ایک اور دو بجے کے درمیان وہاں پہنچنا چاہیے۔ کیوں عقیل؟“

اس نے بیک مرر میں جھانکا۔ عقیل کا سر اثبات میں ہلا۔ پیا نے کہا۔ ”ہم دو تین گھنٹے مظفر گڑھ کے ہوٹل میں گزاریں گے۔“

کھالے نے تائید کی۔ پیا نے سیٹی بجاتے ہوئے ڈالے کوریورس کیا، ٹرن لیا اور گیٹ عبور کر لیا۔ ڈالا بالکل نیا تھا اور پیا کو ڈرائیونگ پر غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ ملتان کی رش والی سڑکوں پر، جہاں کھوئے سے کھویا جھلٹا تھا، ڈالا مچھلی کی طرح سڑک پر پھسلتا جا رہا تھا۔ دریائے چناب کے پل پر گاڑیوں کی لمبی قطار دیکھ کر پیا بولا۔ ”افوہ! پھر وہی مصیبت..... پل بلاک ہے، نجانے کس وقت کھلتا ہے۔“

اس نے ٹرکوں اور بسوں کی طویل قطار میں جگہ بنائی اور ڈالے کو بریک لگا دیے۔ اس کی دیکھا دکھی میں بھی ڈالے سے اتر کر سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ روشنیوں کی طویل قطار..... کوئی ڈیڑھ میل لمبی لائن..... پیا لمبی سانس پھیپھڑوں میں اتار کر بولا۔ ”گھنٹا یا اس سے بھی زیادہ وقت یہاں ضائع ہوگا۔“

میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ ڈالے کا گھوم پھر کر جائزہ لینے لگا جبکہ میں کھلی ہوا میں، ٹھنڈی، نرم اور شوخ ہوا کو سینے میں اتارنے لگا۔ کھالا بھی اتر کر میرے قریب آن کھڑا ہوا۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”شہرے خان! آساں ٹھیک کریندے پئے ہائیں؟“

(شہرے خان! کیا ہم درست کر رہے ہیں؟)

میں چونکا، کھالے کا چہرہ سنولائی ہوئی فضا کا حصہ محسوس ہوا۔ میں نے کہا۔ ”خدا جانے.....“

وہ بولا۔ ”ہم جس راستے پر چل نکلے ہیں، اس میں واپسی نہیں ہوتی۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا، ایک قدم آگے بڑھ کر سڑک کے ڈھلوانی کنارے پر رُک گیا، بولا۔ ”کھالے! تم کہاں رہے اتنے دن؟ تم نے میری خبر تک نہیں لی کہ میں کس

مسافر

دل اور مزاحیہ طبیعت کا مالک شخص تھا۔ ہوٹل کے روشن ماحول میں مجھے احساس ہوا کہ کبھی میری طرح دوہرے لباس میں تھے اور کسی بھی ناگہانی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔ کھالا اور پیا بہت جلد ایک دوسرے سے فری ہو گئے۔

کھالے نے قدرے نیچی آواز میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ نقشے میں بتائے ہوئے راستے کی بجائے ہمیں غازی گھاٹ والا راستہ اپنانا چاہیے۔ وہ کچھ طویل تو ہے مگر بالکل محفوظ ہے۔ دریائی علاقہ رات کو سنسان ہو جاتا ہے۔ ہم کسی کی نظر میں آئے بغیر خان کی حویلی تک پہنچ سکتے ہیں۔“

پیا نے پوچھا۔ ”کیا تم نے وہ راستہ دیکھا ہوا ہے؟“

نور پور سے دریا کے پتن تک سارا علاقہ کھالے کا دیکھا بھالا تھا۔ اس نے فخریہ انداز میں چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”مجھ سے کیا چھپا ہے اس علاقے کا؟ چپہ چپہ چھانا ہوا ہے میں نے۔“

ہم کھالے کی ایما پر پونے بارہ بجے ہوٹل سے اُٹھے اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔ چوک قریشی سے آٹھ دس کلومیٹر آگے جا کر اُس نے دائیں ہاتھ مڑنے والی ایک ناپختہ سڑک پر مڑنے کا اشارہ کیا۔ پیا نے فوراً ڈالا کچے راستے پر ڈال دیا۔ تھوڑی دور جا کر رُک گیا۔ مجھے پیچھے جانے اور کھالے کو فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”ٹارگٹ سے تقریباً ایک کلومیٹر دور ہم گاڑی چھوڑ دیں گے۔ اب تم لوگ گاگز لگا لو۔“

ہم نے نشستوں کا تبادلہ کیا۔ میں نے جونہی گاگز آنکھوں پر لگائے، مناظر کی دیدگی میں واضح تغیر پیدا ہو گیا۔ پہلے اندھیرے میں صرف وہی کچھ دکھائی دیتا تھا جو ڈالے کی طاقت و رہیل لائٹس کی زد میں آتا تھا۔ اب اطراف کی جھاڑ جھنکار اور فصلوں کا سلسلہ بھی دکھائی دینے لگا تھا۔ یہ اس مخصوص ساختہ گاگز کے شیشوں کا کمال تھا۔

جھنکوں کی تال پر سفر آغاز ہو گیا تھا۔ ایک فرلانگ تک راستہ قدرے ہموار تھا جبکہ آگے اونچا نیچا اور تنگ تھا۔ فصلوں کے بیچ موڑ پر موڑ کاٹتے ہوئے ہم بلند قامت کوند اور جنگلی گھاس پھوس میں آدھے چھپے آدھے عیاں راستے پر آن پہنچے۔ یہ علاقہ چٹنی مٹی کا تھا۔ جہاں بھی زمین نرم ہوتی تھی، وہیں چپک جانے والا کیچڑ بن جاتا تھا۔ اگر ڈالا فور ویکل نہ ہوتا تو شاید اس راستے پر ہمارا سفر جاری نہ رہ پاتا۔ یہ دریائے سندھ کے نیلے کا سنسان اور ویران علاقہ تھا جہاں دن کو بھی خوف محسوس ہوتا تھا۔ دریا کے اس کنارے

حال میں ہوں۔“

وہ بولا۔ ”نہیں شہرے! میں ایک رات چوروں کی طرح نور پور گیا تھا۔ وہاں تمہیں باخیریت دیکھ کر لوٹ آیا۔ موبی کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ بہت بڑے گینگ لیڈر تھا۔ مجھے علم ہوتا تو میں اس سے پنکا نہ لیتا۔ جب پتا چلا تب میرے پاس سوائے موبی سے بڑے گینگ لیڈر کی چھتری تلے جانے کے، کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرے پیچھے پولیس اور موبی کے کتے لگے ہوئے تھے۔ استاد ببلو نے مجھے ان سے بچا لیا ورنہ وہ میری ٹکا بولی کر دیتے، زندگی ملتی بھی تو سلاخوں کے پیچھے گزر جاتی۔“

میں چونکا۔ ”استاد ببلو نے؟“

وہ بولا۔ ”ہاں یار..... وہ تمہاری میڈم سے بھی بڑا خبیث ہے۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”مگر میری میڈم تو خبیث نہیں ہے۔“

”تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔ وگرنہ دنیا اسے بہت شاطر اور ظالم عورت قرار دیتی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اس مشن سے فارغ ہو جاؤں، پھر تمہیں تفصیل بتاؤں گا۔ میں نے بہت تھوڑے عرصے میں بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔ تم وہ سب کچھ شاید تمام عمر میں نہ دیکھ سکو گے۔“

پیا کی آمد پر ہماری گفتگو کا سلسلہ رک گیا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد کہیں جا کر رستہ کھلا اور رنگ برنگ روشنیاں چیونٹی کی سی چال سے پل کے اوپر رینگنے لگیں۔ یہ پل اپنی نوعیت کا منفرد پل تھا۔ ایک ڈیڑھ کلومیٹر لمبائی والا یہ پل دوہرا تھا۔ نیچے والے پل پر ریلوے ٹریک بچھا ہوا تھا۔ اس کے اوپر، ہوا میں معلق، دو روہ سڑک تھی جس پر چھوٹی بڑی ٹریفک کا غیر معمولی رش ہر وقت دکھائی دیتا تھا۔ شاید اپنی معیاد پوری کر چکا تھا بھی لرزتار ہوتا تھا، ڈرا دادے کر سمجھاتا تھا کہ ٹریفک کا دباؤ بڑھنے پر نیلا پل تعمیر کرنا ضروری ہے۔

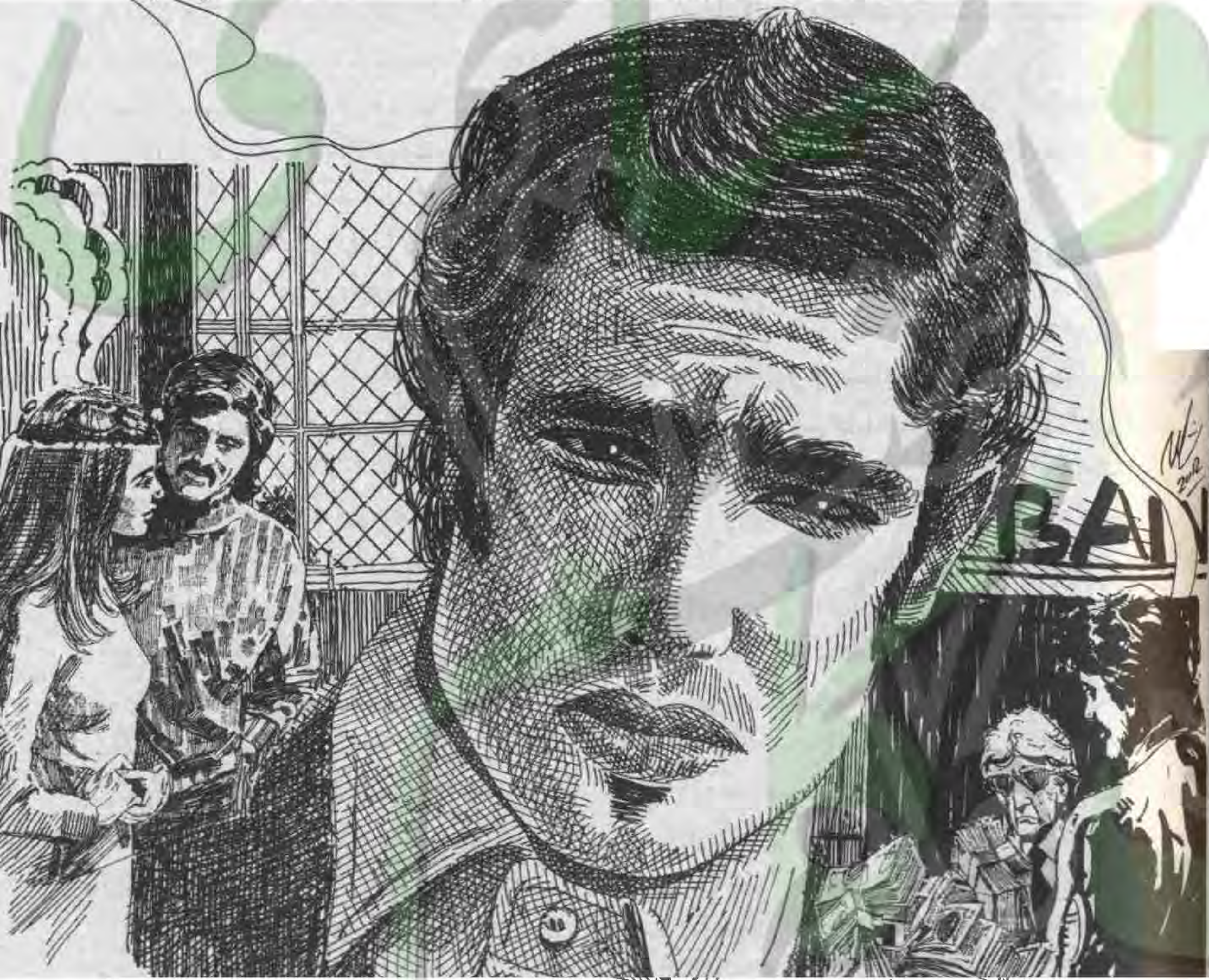
پیا نے ہمیں آواز دے کر گاڑی میں بٹھایا اور سست روی سے دو ٹرکوں کے بیچ سرکنے کا عمل شروع ہو گیا۔ تیسری موڑ پر پہنچ کر پیا نے ڈالے کو علی پور بائی پاس والی سڑک پر ڈال دیا۔ شاید وہ شہر میں داخل ہونے والی سڑک پر پیریر لگائے کھڑے پولیس کے سست الوجود اہلکاروں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا یا اس نے وقت گزاری کو مد نظر رکھا تھا۔

پل پر ہمارا کافی وقت ضائع ہوا تھا۔ ایک گھنٹا ہم نے مظفر گڑھ کے ایک معیاری ہوٹل میں چائے اور سینڈوچ قلع سے اُتارنے میں صرف کیا۔ خوش گپیاں لگائیں۔ پیا بہت زندہ

امانت

نہیم

ایمان دار انسان کسی پیرے سے کم نہیں ہوتا مگر وہ تو نہ صرف بہ ذات خود پیرا تھا بلکہ کتنے ہی پیروں کا مالک بھی تھا پھر ایسے میں بھلا زمانہ کیسے دشمن نہ بنتا... لیکن اس کی بدقسمتی یہ کہ اس کا دشمن وہ نکلا جس پر اسے گمان تک نہ تھا... پھر ایسے ٹوٹے ہوئے حالات میں اس نے قدرت کا کرشمہ دیکھا کہ ایک مضبوط سہارا اس کا منتظر تھا۔



سیخاؤں کے روپ میں چند ستم گروں کا قصہ

آج کیس کو مکمل ہوئے صرف تین ہی دن گزرے تھے اور میں اپنے دفتر میں بیٹھا کھڑکی سے باہر برف باری کے رکنے پر گھروں سے نکلنے والے ہجوم کو دیکھ رہا تھا کہ دروازے میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص اندر داخل ہوا۔ جو ظاہری طور پر ایک باحیثیت شخص نظر آ رہا تھا۔ تاہم اس کی

حرکات و سکنات اس کی اندرونی پریشانی و بے چینی کی غماز تھیں۔ اندر آتے ہی اس نے کپڑوں اور جوتوں سے برف جھاڑی اور پریشان کن انداز میں بغیر کچھ کہے ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ میرا دفتر ایک آٹھ منزلہ عمارت کی تیسری منزل پر واقع تھا اور آنے والے کے بھاری بھر کم جسم کے لیے تیسری

سرگوشی کی۔ ”پیاجی! اہ کتا نہیں، اہ تاں تاہر ہے۔“ (پیاجی! یہ کتا نہیں، یہ بھیڑیا ہے۔) بکھیاڑی نسل کا کتا اور اس علاقے میں پایا جانے والا بھیڑیا ایک جیسی قامت اور شکل و صورت کے مالک ہوتے ہیں۔ عام نظر میں بھیڑیا بکھیاڑی کتا ہی دکھائی دیتا ہے۔ کتے کی دم چھوٹی جبکہ بھیڑیے کی خاصی موٹی اور لمبی ہوتی ہے۔ آوازوں کی نوع سے بھی دونوں میں تمیز کی جاتی ہے۔

وہ بھیڑیا ہی تھا جو کسی چیز کو کھینچ کر جھاڑیوں سے باہر لانے میں مصروف تھا۔ ہماری موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ پلٹ کر ہماری جانب متوجہ ہوا۔ کھالے نے گن کی تالی کا رخ اُس کی جانب کیا۔ پیانے فوراً تالی پر ہاتھ رکھ کر گن کو نیچے جھکا دیا اور سرگوشی کی۔ ”بھگولی چلانے کی حماقت نہ کرنا۔“ وہ اس دوران چاقو نکال چکا تھا مگر بھیڑیا ہم میں سے کسی پر حملہ آور ہونے کے بجائے دانت نکوستا ہوا جست لگا کر ایک طرف بھاگ گیا اور لمحوں میں ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ کھالہ اُس گھنی جھاڑی کی طرف بڑھا جہاں چند لمحے پیشتر بھیڑیا دکھائی دیا تھا۔ وہ جونہی جھک کر جھاڑی کے نیچے گھسا، اُس کے لبوں سے ذہنی ذہنی چیخ برآمد ہوئی۔ میں نے لمبی زقند بھری اور کھالے کے پیچھے پہنچا، پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“ وہ پلٹا اور بولا۔ ”لاش پڑی ہے شہرے!“

میں نے جھک کر اُس کے کندھوں کے اوپر سے جھاڑی کی جڑوں میں دیکھا۔ اوندھی پڑی ہوئی لاش کا نچلا آدھا دھڑ نظر آ رہا تھا۔ کھالہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ میرے عقب میں پیاجی کی سرگوشی ابھری۔ ”لاش کو کھینچ کر باہر نکالو۔“ کھالہ اب تک ابتدائی ذہنی جھٹکے کی ٹرانس سے نکل کر کافی حد تک سنبھل چکا تھا۔ اُس نے پیٹ کے بل پڑی ہوئی انسانی لاش کو دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا۔ اس اثنا میں پیاجی اور عقیل بھی ہمارے قریب آ گئے۔ کھالے نے جونہی لاش کو سیدھا کیا، پیانے سرج لائٹ کی روشنی سے لاش کا چہرہ روشن کر دیا۔ میں لاش کے پیروں کی سمت زمین پر بیٹھا تھا۔ دیکھنے کے لیے کہ وہ کون بد قسمت تھا، تھوڑا سا اوپر اٹھا۔ جونہی میں نے لاش کا چہرہ دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل نے اچانک دھڑکن بند کر دیا ہو۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

پر کوندرا اور جنگلی گھاس کے وسیع علاقے میں جنگلی جانوروں کی بہتات تھی جن کے خوف سے لوگ ادھر کو کم نکلتے تھے۔ تین چار میل کے بعد راستہ مزید دشوار ہو گیا۔ آخر ایک ڈھلانی جگہ پر ڈالا پھسل کر گھاس میں پھنس گیا۔ ہم تینوں کو اتر کر دھکا لگانا پڑا۔ بہ دقت تمام ڈالا اپنے ٹریک پر چڑھا اور ہمارا سفر شروع ہوا۔

خدا خدا کر کے کھالے نے رکنے کا اشارہ کیا، بولا۔ ”خان کی حویلی دائیں طرف کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ یہ راستہ ہمیں چھوڑنا ہوگا کیونکہ یہ حویلی کی طرف نہیں جاتا۔“ کھالے کی مشاورت سے پیانے راستہ چھوڑ دیا اور نسبتاً زیادہ گنجان گھاس کی طرف گاڑی بڑھائی۔ مشاقانہ انداز سے ٹرن لیا اور ڈالے کو واپسی کے سفر کے لیے بالکل تیار حالت میں کھڑا کر کے ہیڈ لائٹس بجھا دیں۔ اندروالی بتی روشن رہنے دی۔ ہم نے اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس اتار کر گاڑی میں رکھ دیے اور مستعدی سے نیچے اتر آئے۔ پیانے ڈالے کی عقبی نشست اٹھائی۔ جدید طرز کی ایک دس بائیس کی رگر گن اور اضافی میگنیزین نکال کر مجھے تھمائی۔ مجھے گیٹ روم میں اس گن کو چلانے کی سرسری ٹریننگ دی گئی تھی۔ اس کا وجود مختصر تھا مگر وزن کافی تھا۔ کھالے کو کرکومنی اسالٹ رائفل دی جبکہ اس نے اپنے اور عقیل کے لیے روسی ساختہ کلاشن کوف ٹینس نکالیں۔ گاڑی کی اندر والی بتی گل کی اور ہمیں دھیمی آواز میں سمجھایا۔ ”ہماری گنیں اور پستول گولیاں اگلنے کے لیے بالکل تیار ہونی چاہئیں مگر گولی انتہائی ناگزیر حالت میں چلائی جائے گی۔“

اس نے چند اور مفید ہدایات دیں۔ پھر کھالے کی سربراہی میں ہم چاروں پر مستقل قافلہ گھنی گھاس کے بیچ ناہموار اور کیچڑ آلود زمین پر چل پڑا۔ رات کے دبیز اندھیرے میں گھنی گھاس کے اندر سمت کا اندازہ نہیں ہوتا تھا مگر گاکلر اور نفیسی سرج لائٹس کی مدد سے ہم بہ آسانی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہم دریا کے کنارے سے خان کی حویلی کی طرف یعنی مشرق کی جانب سفر کر رہے تھے۔

کوندرا اور جنگلی جھاڑیوں کی سرسراہٹ، کہیں جانوروں کے اٹھ بھاگنے سے پیدا ہونے والی آوازیں، دل کی دھڑکنوں کو لمحہ بہ لمحہ تیز کیے دے رہی تھیں۔ ہم ایک قطار میں چل رہے تھے۔ اچانک جھاڑیوں کے بیچ ایک بڑی قامت والا کتا اُلٹے قدموں زور لگا کر کچھ کھینچتا ہوا دکھائی دیا۔ کھالارک گیا۔ اُس نے کتے پر لائٹ ڈالی پھر

منزل تک سیرھیوں کی چڑھائی اچھی خاصی ورزش ثابت ہوئی تھی۔ چند منٹ تک وہ اپنی پھولی ہوئی سانسوں کو قابو کرتا رہا پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”مسٹر میکلم۔ مجھے میرے بزنس پارٹنر سر ڈگلس نے آپ کا پتا دیا ہے کہ میرے مسئلے کو آپ حل کر سکتے ہیں۔ میرا نام الیکزینڈر ہولڈر ہے اور میں لندن کے مرکزی بینک کاسینئر پارٹنر ہوں۔ سبھی بینکوں کی طرح ہمارا بینک بھی منافع کے کسی موقعے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور اگر صاحب حیثیت لوگ ضرورت کے تحت اپنی قیمتی چیزیں گروی رکھ کر قرض لینا چاہیں تو انہیں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں کیونکہ کامیاب بینکاری کے لیے یہ سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ میرے ساتھ جو سانحہ پیش آیا ہے اس کا تعلق اسی قسم کے لین دین سے ہے۔ کل صبح میں بینک میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام میں مصروف تھا کہ ایک کلرک میرے پاس ایک وزیٹنگ کارڈ لایا۔ کارڈ ملک کی ایک مشہور و معروف ہستی کا تھا۔ میں نے خود بڑھ کر اسے خوش آمدید کہا اور اپنے دفتر میں لے آیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس کے لیے کسی توضیح کا اہتمام کرنا وہ کاروباری گفتگو شروع کر بیٹھا۔

”مسٹر ہولڈر مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا بینک لوگوں کو قرضے دیتا رہتا ہے۔“

”جی ہاں! اگر بینک کو تحفظ اور مناسب گارنٹی مل جائے تو قرضے پر رقوم مہیا کر دی جاتی ہیں۔“

”مجھے فوری طور پر پچاس ہزار پاؤنڈ زرکار ہیں۔“ اس نے بھی دھیمی سی آواز میں مجھ سے کہا۔ چند لمحے توقف کے بعد اپنی گفتگو کو بڑھاتے ہوئے اپنی مشکل کے بارے میں بتانے لگا۔ میرے لیے یہ رقم اپنے دوستوں سے قرض لینا قطعاً مشکل نہیں لیکن کسی کا احسان لینے سے میری موجودہ حیثیت متاثر ہوتی ہے اور تم سمجھ سکتے ہو کہ میری حیثیت کے آدمی کے لیے کسی کا زیر احسان ہونا کس قدر غیر دانش مندانہ ہوتا ہے۔“

”آپ کو یہ رقم کتنے عرصے کے لیے درکار ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اگلے سو موار کو مجھے ایک بڑی رقم ملنے والی ہے اور میں اسی دن یہ رقم مع سود کے لوٹا دوں گا لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ مجھے پچاس ہزار پاؤنڈ زرکار اسی وقت درکار ہیں۔“

”آپ کی شخصیت کو مد نظر رکھتے ہوئے میں یہ رقم اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے بھی دینے کو تیار ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح میرے پارٹنر کی حق تلفی ہوگی۔ لہذا میں آپ کے معاملے میں بھی تمام کاروباری تقاضے پورے کرنا پسند کروں گا۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے کہ معاملے کو ذاتیات سے نکال کر کاروباری شکل دے دی جائے۔ مسٹر ہولڈر! تم نے ہیروں کے اس جڑاؤ تاج کے متعلق تو سنا ہوگا جو شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس معزز شخص نے ایک سیاہ ڈبے کو کھول کر میرے سامنے کر دیا۔ میرے سامنے جیولری کا شاہکار نمونہ پڑا ہوا تھا۔ اس میں انتالیس بیش قیمت ہیرے جڑے ہوئے تھے اور میرے اندازے کے مطابق اس کی قیمت ایک لاکھ پاؤنڈ زر سے کسی طور بھی کم نہیں تھی۔ میں نے ڈبے کو ہاتھ میں لے کر تاج کا بہ غور معائنہ کیا۔

”کیا تمہیں اس کی بالیت پر شبہ ہے؟“ میرے موکل نے پوچھا۔

”ہرگز نہیں!“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے صرف یہ اندیشہ ہے کہ کیا آپ واقعی سو موار تک اسے واپس لینے میں کامیاب رہیں گے؟“

”تمہیں اس کے متعلق فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر مجھے اس بات کا ذرہ برابر بھی خدشہ ہوتا کہ میں سو موار تک اسے واپس نہ لے سکوں گا تو میں ایسا سودا ہرگز نہ کرتا اور تمہیں بھی اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ میں نے یہ شاہی ملکیت تمہارے حوالے کر کے جس اعتماد کا اظہار کیا ہے اسے تمہیں نہ لگنے پائے۔ اس کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام ہونا چاہیے کیونکہ اس کے گم ہونے یا خراب ہونے سے جو اسکیئنڈل بنے گا وہ شاہی خاندان کی نیک نامی کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔ اگر تم مطمئن ہو تو رقوم میرے حوالے کرو کیونکہ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“

میرے اطمینان کے لیے اس کی شخصیت ہی کافی تھی لہذا میں نے کیشئر سے پچاس ہزار پاؤنڈ زر لانے کو کہا اور رقم اپنے موکل کے حوالے کر کے اسے رخصت کر دیا۔ دفتر میں تنہا ہوتے ہی مجھے اپنی اس ذمہ داری کا احساس ہوا جو کہ تاج کی میرے پاس موجودگی سے مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ تاج ایک طرح سے قومی ملکیت تھی اور اس کو کسی قسم کا نقصان مجھے تباہ کر سکتا تھا۔ تاہم اب تو میں نے اس ذمہ داری کو قبول کرنا ہی تھا۔ میں نے احتیاط کے ساتھ اسے اپنے ذاتی سیف میں بند کر دیا اور ایک بار پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ شام کو گھر جاتے ہوئے مجھے خیال ہوا کہ ایسی قیمتی چیز کو خود سے دور اکیلا چھوڑنا مناسب نہیں۔ بینکوں کے سیف عموماً توڑے جاتے رہے ہیں، ایسا نہ ہو کہ میں گھر میں سوراہا ہوں اور کوئی ہاتھ صاف کر جائے۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگلے چند روز تک میں اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھوں گا۔

چنانچہ میں اسے گھر لے گیا اور بالائی منزل پر ڈریسنگ روم میں نصب پرانے سیف میں بند کر دیا۔ اور اب اس سے پہلے کہ میں اپنی بد نصیبی کی اصل روداد بیان کروں بہتر ہوگا کہ میں اپنے گھریلو ماحول کو واضح کر دوں تاکہ آپ حالات کو مکمل طور پر سمجھ سکیں۔

میرے پاس تین نوکر ہیں اور تینوں ہی صنف نازک سے متعلق ہیں۔ ان میں سے دو تو کئی سال سے میرے ساتھ ہیں اور ان کی ایمانداری کسی شبہ سے بالاتر ہے۔ تیسری ملازمہ ایک خوب صورت لڑکی ”لوسی پار“ ہے جو صرف تین ماہ قبل ملازم ہوئی ہے۔ اب تک اس کے کردار میں کسی قسم کی غامی سامنے نہیں آئی سوائے، اس کے کہ اس کے چاہنے والے عموماً میرے گھر کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ میرا اپنا خاندان مختصر ہے اور اس کے کوائف بیان کرنے میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوگا۔ عرصہ ہوا میری بیوی ایک لڑکے کو جنم دے کر مجھے تنہا چھوڑ گئی اور میں نے آج تک اس بچے کی دیکھ بھال پوری توجہ سے کی ہے تاہم جوان ہو کر اس نے مجھے مایوس کر دیا ہے۔ سبھی کہتے ہیں کہ آرتھر کو میں نے خود بگاڑا ہے اور یہ ہے بھی درست کیونکہ جب سے میری بیوی مری ہے میں نے اس کے چہرے سے مسکراہٹ ایک لمحے کے لیے بھی معدوم نہیں ہونے دی، کبھی اس کی کسی خواہش کو رد نہیں کیا۔ اگر میں کچھ سختی برتاؤ تو شاید یہ ہم دونوں کے لیے بہتر ہوتا۔ میں چاہتا تھا کہ آرتھر بینک کے کام میں میرا ہاتھ بٹائے لیکن اس میں ٹی اور تندہی کچھ زیادہ ہی ہے اور میرے کاروبار کے لیے کل مزاحمتی پہلا زینہ ہے جس پر قدم رکھ کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوا جاسکتا ہے۔ درحقیقت میں خود زیادہ بڑی رقوم کا لین دین اس کے ذریعے کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ جب وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا تو وہ ”ارٹھو کریک کلب“ کا ممبر بن گیا اور اپنی دولت کے بل بوتے پر بہت سے غیر پسندیدہ لوگوں کا دوست بن گیا جن کی صحبت نے اسے جوئے کی لعنت میں مبتلا کر دیا۔ وہ اپنے ماہانہ الاؤنس کے علاوہ بھی مہینے میں کئی مرتبہ رقوم کا تقاضا کرنے لگا تھا۔ میرے سمجھانے پر کئی بار اس نے کلب کے دوستوں سے پیچھا چھڑانا چاہا لیکن ہر مرتبہ اس کا دوست ”سر جارج برین ویل“ اسے واپس گھسیٹ لے جانے میں کامیاب ہو جاتا۔ آرتھر پر سر جارج اس بری طرح اثر انداز ہوا ہے کہ وہ سر جارج کو اپنے گھر بھی لے کر آتا رہا ہے۔ وہ آرتھر سے کافی بڑا ہے اور ہرے اندازے کے مطابق وہ دنیا کو اپنی انگلیوں پر نیچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی گفتار میں شربتی اور کشش کو

دیکھتے ہوئے میں سمجھ سکتا ہوں کہ وہ آرتھر پر اس قدر اثر انداز کیوں ہے۔ میرے خاندان کی آخری فرد میری بیٹی ”میری“ ہے اور پانچ سال پہلے جب میرا بھائی اسے اس دنیا میں تنہا چھوڑ گیا تو میں نے اسے اپنا لیا۔ وہ میرے گھر کی رونق ہے اور کسی گڑباز کی طرح وہ میرا دل بہلاتی ہے۔ وہ چوبیس سال کی ایک خاموش طبع لڑکی ہے اور سارے گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ آرتھر کئی مرتبہ یہ مطالبہ کر چکا ہے کہ اس کی شادی میری سے کر دی جائے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا لیکن ہر مرتبہ میری انکار کرتی رہی۔ شاید وہ میری بات مان لیتی لیکن انفس اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب یہ خواب بھی پورا نہ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اپنے گھریلو پس منظر کو بالکل واضح کر دیا ہے اب میں اپنی بد قسمتی کی داستان بیان کرتا ہوں۔

رات کے کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں کافی پیتے ہوئے میں نے آرتھر اور میری کو اپنے آج کے تجربے کے متعلق بتایا اور یہ بھی بتا دیا کہ میں وہ قیمتی تاج گھر لے آیا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جب میں یہ باتیں کر رہا تھا تو لوسی پار جو کہ کافی لائی تھی کمرے سے جا چکی تھی لیکن مجھے یہ یقین نہیں ہے کہ کمرے کا دروازہ بند تھا یا نہیں۔ میری اور آرتھر نے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور تاج دیکھنے کی خواہش کی لیکن میں نے اسے مناسب نہ سمجھتے ہوئے انہیں ٹال دیا۔

”ڈیڈی آپ نے اسے کہاں رکھا ہے؟“ آرتھر نے پوچھا۔

”بالائی منزل کے سیف میں۔“ میں نے جواب دیا۔ آرتھر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آج رات کوئی ڈاکو ہمارے گھر قسمت آزمائی نہ کرنے آجائے۔“

”برخوردار وہ سیف میں بند ہے۔“ میں نے دہرایا۔ ”ڈیڈی اس پرانے سیف کو تو کوئی بھی چابی کھول سکتی ہے۔ جب میں چھوٹا تھا تو میں نے اسے اسٹور روم کی چابی سے کھول لیا تھا۔ کسی ڈاکو کے سامنے اس کی کیا حقیقت ہے، چونکہ آرتھر کی بڑائی ہانکنے کی عادت سے میں واقف تھا اس لیے میں نے اس کی بات کا سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا۔ رات گئے آرتھر میرے کمرے میں چہرے پر سنجیدگی طاری کیے ہوئے آیا اور بولا۔ ”ڈیڈی کیا آپ مجھے دوسو پاؤنڈ زر دے سکتے ہیں؟“

”نہیں، ہرگز نہیں۔ میں پہلے ہی تمہیں احقانہ حد تک فیاضی سے رقوم دیتا رہا ہوں۔“

”ڈیڈی میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ مجھ پر بہت مہربان ہیں، تاہم ایک مہربانی اور کریں اور مجھے دوسو پاؤنڈ زر دے دیں

دور نہ میں کلب میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔
”اور یہی سب سے اچھی بات ہوگی۔“ میں نے غصے سے جواب دیا۔

”لیکن ڈیڈی میں اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر آپ نے مجھے رقم نہ دی تو مجھے کوئی دوسری راہ دیکھنا پڑے گی کیونکہ مجھے ہر حال میں رقم چاہیے۔“ چونکہ اسی مہینے وہ پہلے بھی دو مرتبہ مجھ سے رقم لے چکا تھا اس لیے میں نے غصے میں صاف انکار کر دیا۔ میرا اٹل فیصلہ سن کر وہ ایک لفظ کہے بغیر کمرے سے باہر چلا گیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے سیف کھولا اور تاج کو باہر نکال کر یہ تسلی کرنے کے بعد کہ وہ محفوظ ہے دوبارہ سیف میں لاک کر دیا۔ اس کے بعد میں نے سارے گھر کی کھڑکیاں اور دروازے چیک کرنے کے لیے ایک چکر لگایا حالانکہ یہ ڈیوٹی عموماً میری بھیجی سرانجام دیا کرتی تھی۔ جب میں سیڑھیاں اتر رہا تھا تو میں نے میری کوہال کی بڑی کھڑکی میں کھڑے دیکھا مگر جب تک میں اس تک پہنچتا اس نے کھڑکی بند کر کے کٹدی چڑھا دی اور بولی۔

”انکل! کیا آپ نے آج رات لوسی پار کو گھر سے باہر جانے کی اجازت دی ہے؟“
”ہرگز نہیں۔“

”وہ ابھی پچھلے دروازے سے واپس آئی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ سائنڈ گیٹ تک کسی سے ملنے گئی تھی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے اور اس سلسلے کو ختم ہونا چاہیے۔“
”صبح میں اس سے بات کروں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا تمام کھڑکیاں اور دروازے وغیرہ بند ہیں نا؟“
”جی ہاں انکل!“

یہ سن کر میں میری کوشب بخیر کہہ کر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا اور جلد ہی سو گیا۔ میں آپ کو ہر تفصیل بتا رہا ہوں تاہم کوئی بات وضاحت طلب ہو تو پوچھ لیجیے گا۔ میں ہمیشہ سے جنگی نیند سوتا ہوں اور موجودہ حالات میں چونکہ میرے ذہن میں خدشات موجود تھے اس لیے میں مزید چوکنا تھا۔ تقریباً دو بجے رات گھر میں کسی قسم کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میرے خیال میں کھڑکی آہستگی سے بند کی گئی تھی۔ میں پوری طرح چوکنا ہو کر ہر آواز سننے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے دوسرے کمرے میں چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں فوراً بستر سے نکل کر ڈرینگ روم میں پہنچا۔ ڈرینگ روم کے دروازے سے میں نے آر تھر کو کمرے کے وسط میں تاج ہاتھ میں لیے کھڑے دیکھا وہ تاج کو موڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”آرتھر!“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”تمہیں اس تاج ہاتھ لگانے کی جرأت کیسے ہوئی؟“

میری آواز سننے ہی اس کا رنگ زرد ہو گیا اور اس نے تاج ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ اس کا ایک کونہ تین ہیروں سمیت غائب تھا۔
میں نے غصے میں چلا کر کہا۔ ”تم نے اسے تباہ کر دیا ہے۔ تم نے مجھے ہمیشہ کے لیے رسوا کر دیا ہے۔ بتاؤ تم نے جو ہیرے چرائے ہیں وہ کہاں ہیں؟“

”ہیرے چرائے ہیں؟“ وہ حیرانی سے بولا۔
میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا ”دو تین ہیرے غائب ہیں اور تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہیں۔ میں تمہیں چور کے علاوہ جھوٹا بھی کہوں گا۔ میں نے خود تمہیں تاج کو توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ آستین کے سانپ بتا، ہیرے کہاں ہیں؟“

”ڈیڈی آپ نے مجھے کافی گالیاں دے لی ہیں اور میں مزید گالیاں برداشت نہیں کر سکتا۔ اب میں منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہوں گا اور صبح گھر چھوڑ دوں گا۔“
”اس سے پہلے کہ تم یہ گھر چھوڑ دو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“ میں غصے کی زیادتی کی وجہ سے پاگل ہو رہا تھا۔

”ڈیڈی آپ یا پولیس مجھ سے کچھ معلوم نہیں کر سکتی۔“ آر تھر نے ایسے استقامت سے بھرپور لہجے میں کہا جس کی میں آر تھر جیسے کھلنڈرے انسان سے توقع نہیں کر سکتا تھا۔ اس قدر ٹھہراؤ اور صبر کا مظاہرہ کرنا اس کی فطرت میں ہرگز نہیں تھا۔ غصے کی زیادتی کی وجہ سے چونکہ میں خاصی بلند آواز میں بول رہا تھا اس لیے سارا گھر جاگ گیا تھا۔ سب سے پہلے میری کمرے میں داخل ہوئی۔ جونہی اس کی نظر تاج پر پڑی وہ صدمے سے بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ میں نے ایک ملازمہ کو پولیس بلانے کے لیے کہا۔ معاملے کو فوراً ان کے سپرد کرتے ہوئے میں نے انسپکٹر کو ساری تفصیل بتادی۔

آر تھر نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”ڈیڈی میں پانچ منٹ کے لیے گھر سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے۔“

”تا کہ تم فرار ہو سکو یا جو کچھ تم نے چرایا ہے اسے چھپا سکو۔“ یہ کہتے ہوئے مجھے اپنی خطرناک پوزیشن کا احساس ہوا جس میں، میں تین ہیروں کے گم ہو جانے کی وجہ سے گھر گیا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ ”بیٹے اگر تم مجھے بتاؤ کہ گمشدہ ہیرے کہاں ہیں تو میں اب بھی سب کچھ بھول کر معاف کرنے کے

لیے تیار ہوں۔“
”اپنی معافی ان لوگوں کے لیے بچا کر رکھیے جو اس کے طلب گار ہیں۔“ آر تھر نے سخت لہجے میں کہا۔

یہ جواب سن کر میں نے اسے انسپکٹر کے حوالے کر دیا۔ انسپکٹر اور کانسٹیبل نے مل کر نہ صرف آر تھر بلکہ اس کے کمرے کی بھی مکمل تلاشی لی۔ لیکن کچھ دستیاب نہ ہو سکا اور نہ ہی اس نے اپنی زبان کھولی۔ پولیس اب اسے مزید پوچھ گچھ کے لیے پولیس اسٹیشن لے گئی ہے۔ لیکن پولیس نے مجھے یہ کہہ کر باپس کر دیا ہے کہ فوری طور پر وہ کچھ کرنے سے معذور ہیں۔ ”مسٹر ٹیکم۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ہر قسم کے اخراجات سے بے پروا ہو کر آپ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیں۔ میں پہلے ہی اس سلسلے میں ایک ہزار پاؤنڈز کا انعام مقرر کر چکا ہوں۔ میری بد نصیبی کا اندازہ کیجیے کہ میں ایک ہی رات میں اپنا وقار، دولت اور اپنے بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔“

مسٹر الیگزینڈر ہولڈر نے آخری فقرہ ایسے درد بھرے انداز میں کہا کہ میری تمام ہمدردیاں اس کے لیے وقف ہو گئیں۔

”مسٹر ہولڈر! براہ کرم میرے چند سوالوں کا جواب دیں۔ کیا آپ وسیع سوسائٹی رکھتے ہیں؟“

”ہرگز نہیں۔ صرف میرا پارٹنر اور اس کی فیملی یا میرے بیٹے آر تھر کا دوست سر جارج برن ویل ہمارے گھر آتے ہیں۔“
”کیا گھر سے باہر آپ وسیع حلقہ احباب رکھتے ہیں؟“

”آر تھر یقیناً وسیع حلقہ احباب رکھتا ہے لیکن میں اور میری زیادہ تر وقت گھر پر گزارتے ہیں۔“

”مسٹر ہولڈر کیا یہ بات میری جیسی جوان لڑکی کے لیے غیر معمولی نہیں ہے اور آپ نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس نے اس واقعے کا بڑا شدید اثر لیا ہے اور وہ تاج کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھی۔“

”جی ہاں۔ وہ تو مجھ سے بھی زیادہ متاثر ہوئی ہے۔“
”مسٹر ہولڈر میرے خیال میں آپ کو اپنے بیٹے کے بھڑکی کرنے پر پورا یقین ہے۔“

”یقین کیسے نہ ہو میں نے خود تاج اس کے ہاتھوں میں دیکھا ہے۔“

”یہ چور ہونے کا پختہ ثبوت نہیں ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ تاج کے اس حصے کو جو کہ آر تھر کے ہاتھ میں تھا کوئی

حضرت رابعہ بصری
بادشاہ وقت کی کنیز تھیں،

خوف خدا

ایک دن وہ اس کا نرم و گداز بستر صاف کر رہی تھیں کہ چند لمحوں کے لیے اس قیمتی آرام دہ اور نرم و گداز بستر پر سو گئیں، اوپر سے حاکم وقت آگیا، غصے کے عالم میں اس نے انہیں چایک سے مارنا شروع کر دیا۔ پہلے تو آپ روئیں پھر مسکرائیں لگیں۔ بادشاہ نہایت حیران ہوا اس نے کہا۔ ”رابعہ! مسکرا کیوں رہی ہو؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”بادشاہ سلامت، میں تیرے بستر پر صرف چند لمحوں کے لیے سوئی اور مجھے اتنی سخت سزا ملی۔ سوچ رہی ہوں کہ تو جو ساری عمر اس بستر پر سوتا رہا ہے۔ اللہ تمہیں کتنی سزا دے گا۔“ یہ سن کر بادشاہ تھر تھر کانپنے لگا اور اس نے حضرت رابعہ بصری کو آزاد کر دیا۔

مرسلہ: حجاب کنول خان، ملک وال

نقصان پہنچا تھا؟“

”ہاں وہ مڑا مڑا ہوا تھا۔ وہ خود اسے موڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔“
”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اسے سیدھا کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔“

”آپ آر تھر کی حمایت میں جو جی چاہے مفروضے قائم کریں، میں اس کی بے گناہی کا یقین نہیں کر سکتا۔“
”پھر آپ ہیروں کے غائب ہونے کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ وہ آر تھر سے کیوں نہیں ملے؟“

”پولیس والے ابھی تک تلاش جاری رکھے ہوئے ہیں انہیں امید ہے کہ وہ ہیرے ڈھونڈ نکالیں گے۔“
”کیا انہوں نے گھر سے باہر بھی انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے؟“

”ہاں انہوں نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے باغ کا چپا چپا چھان مارا لیکن تمام تلاش بے سود ثابت ہوئی۔“

”مسٹر ہولڈر تمام روداد سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ اسے جس قدر آسان اور سیدھا سادا کیس

پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپ کو تمام ڈائجسٹ
ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

”سر!“ اب میری نے مجھے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
”مجھے یقین ہے کہ آپ آر تھر کو بے گناہ ثابت کرنے میں
کامیاب ہو جائیں گے۔“

”میں تمہارے اس خیال کی تائید کرتا ہوں اور اسے
ثابت کرنے کے لیے چند سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔“
”بڑی خوشی سے پوچھیے۔ اگر میں آر تھر کو بے گناہ
ثابت کرنے میں کسی قسم کی مدد کر سکتی ہوں تو اس سے بڑھ
مسرت کی کیا بات ہو سکتی ہے؟“

”گزشتہ رات تمہاری آنکھ کیسے کھلی؟“
”میں چچا کی آواز سن کر بیدار ہوئی تھی۔“
”پچھلی رات آپ نے تمام دروازے اور کھڑکیاں
اچھی طرح مقفل کر دی تھیں تو کیا صبح بھی وہ سب بند تھیں؟“
”جی ہاں۔“

”کیا یہ سچ ہے کہ ملازموں میں سے ایک رات آپ
اپنے چاہنے والے سے ملنے باہر گئی تھی؟“
”جی ہاں اور یہ وہی ملازمہ ہے جو ہمارے لیے
ڈرائنگ روم میں کافی لے کر آئی تھی۔ ہو سکتا ہے اس نے تازہ
کے متعلق سن لیا ہو۔“

”تم یہ تو نہیں کہنا چاہتیں کہ اس نے تاج کے متعلق
کر اپنے محبوب کو بتایا اور پھر دونوں نے اسے چرانے
منصوبہ بنا لیا۔“

”یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔“ مسٹر ہولڈر نے ڈر
اندازی کرتے ہوئے کہا۔ ”جب میں نے آر تھر کو خود اپنے
آنکھوں سے تاج تھامے ہوئے نہ دیکھا ہوتا۔“

”مسٹر ہولڈر آپ تھوڑا صبر کریں۔ ہم اس طرف
آ رہے ہیں۔ ہاں تو مس ”میری“ کیا ملازمہ پچھلے دروازے
سے واپس آئی تھی؟“

”ہاں وہ پچھلے دروازے سے اندر آئی تھی۔ میں نے
اس کے محبوب کو بھی دیکھا تھا۔“
”کیا آپ اس شخص کو جانتی ہیں؟“

”ہاں وہ ایک سبزی فروش ہے جو ہمارے ہاں سبزی
سپلائی کرتا ہے۔ اس کا نام فرانسس ہے۔“
”کیا وہ گیٹ کے پاس بائیں طرف کھڑا تھا؟“

”جی ہاں۔ وہ گیٹ سے کافی دور بائیں جانب کھڑ
تھا۔“
”مس میری شاید آپ کو علم ہو کہ اس کی ایک ٹانگ
لکڑی کی ہے۔“

”آپ تو جادوگر معلوم ہوتے ہیں۔“ وہ حیرت ادا

سمجھ رہے ہیں یہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور الجھا ہوا ہے۔
آپ کے نظریے کے مطابق آر تھر نے آپ کے سیف والے
کمرے میں داخل ہو کر سیف کھولا اور تاج نکال کر اس کا
ایک حصہ توڑ کر باہر جا کر کہیں چھپا دیا اور باقی ماندہ تاج لے
کر دوبارہ آپ کے کمرے میں آیا۔“

”اگر یہ ایسے نہیں ہے تو پھر کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔“
مسٹر ہولڈر نے مایوسی سے کہا۔

”یہ میرا کام ہے کہ میں وہ طریقہ ڈھونڈ نکالوں۔ اب
میں آپ کے ساتھ جا کر موقع واردات کا معائنہ کرنا پسند
کروں گا تاکہ کوئی نتیجہ خیز صورت حال سامنے آ سکے۔“

مسٹر ہولڈر کا گھر سفید پتھر کی دو منزلہ شاندار عمارت
تھی جس کے چاروں طرف باغ بنا ہوا تھا تاہم برف باری کی
وجہ سے ہر چیز پر برف کا سفید پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے
سارے گھر کے گرد ایک چکر لگایا اور اپنی دلچسپی کی کئی باتیں
نوٹ کیں۔ اس کے بعد ہم ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ ابھی
گفتگو کا آغاز ہوا ہی تھا کہ اندرونی دروازے سے ایک
جوان سال لڑکی داخل ہوئی۔ وہ درمیانے قد کی دہلی پتلی لڑکی
تھی۔ زرد چہرہ، تھکے نقوش، چمکدار آنکھیں جو رونے سے
سرخ ہو رہی تھیں۔ میری موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے
وہ سیدھی مسٹر ہولڈر کے پاس پہنچی اور بولی۔

”انکل آپ نے آر تھر کو رہا کرنے کے لیے کہہ دیا
ہے نا؟“

”نہیں میری جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی یہ ممکن
نہیں۔“ مسٹر ہولڈر نے جواب دیا۔

”لیکن انکل مجھے یقین ہے کہ آر تھر بے گناہ ہے اور
آپ کو بعد میں پچھتاوا ہو گا کہ آپ نے اس پر اس قدر سختی
کیوں کی۔“

”اگر وہ بے گناہ ہے تو خاموش کیوں ہے؟“
”شاید وہ اس بات سے ناراض ہے کہ آپ نے اس
پر شک کیا۔“

”میں اس پر شک کرنے پر حق بجانب ہوں کیونکہ
میں نے اپنی آنکھوں سے اسے تاج تھامے ہوئے دیکھا ہے
اور میں اس معاملے کو اس وقت تک ختم نہیں ہونے دوں گا
جب تک ہیرے بازیاب نہیں ہو جاتے۔ آر تھر سے انصاف
کی وجہ سے تم یہ بھول رہی ہو کہ ہیروں کی گم شدگی میرے
لیے کس قدر تباہی کا باعث بنے گی۔ میں ان صاحب کو اسی
معاملے کی چھان بین کرنے کے لیے لایا ہوں۔“ مسٹر ہولڈر
نے آخری فقرہ میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

خوف کے طے جلے تاثرات کے ساتھ بولی۔ ”آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ واقعی اس کی ایک ٹانگ لکڑی کی ہے؟“

”میں اب اوپر جانا چاہتا ہوں۔“ اس کے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے میں مسٹر ہولڈر سے مخاطب ہوا۔ پھر ایک خیال کے تحت میں نے پہلے باہر جانا پسند کیا۔ باہر جا کر میں نے ہر کھڑکی اور دروازے کے باہر برف میں بنے ہوئے نشانات کا بغور معائنہ کیا اور مطمئن ہو کر بالائی منزل پر گیا۔

مسٹر ہولڈر کا ڈریسنگ روم جس میں کہ سیف نصب تھا، سادہ سے فریج اور ہلکے براؤن قالین سے سجا ہوا تھا۔ میں نے سیف کے تالے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مسٹر ہولڈر اس کو کھولنے کے لیے جو چابی استعمال کی گئی ہے وہ کہاں ہے؟“

”میں نے وہ چابی یہاں ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی ہے۔“

ڈریسنگ ٹیبل سے چابی لے کر میں نے سیف میں آزما کر سیف بغیر کسی آواز کے کھل گیا۔ میں نے سیاہ رنگ کا وہ ڈبا جس میں باقی ماندہ تاج تھا، اٹھا کر کھولا۔ تاج واقعی کاریگری کا اعلیٰ نمونہ تھا لیکن تین ہیروں کی عدم موجودگی نے اس کے حسن کو غیر متوازن کر کے رکھ دیا تھا۔ تاج اس قدر مضبوط بنا ہوا تھا کہ ایک عام آدمی کی طاقت اسے توڑنے سے قاصر تھی۔

میں نے ٹینکر کو جانا طلب کر کے کہا۔ ”مسٹر ہولڈر آپ ذرا اس تاج کو توڑنے کی کوشش کیجیے۔“

یہ سن کر بھاری بھر کم ٹینکر کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ بولا۔ ”میں ایسا کرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو میں ایسا کرنے لگا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے تاج کو دونوں ہاتھوں سے توڑنے کی کوشش کی لیکن بے سود! تاج درحقیقت ٹھوس اور مضبوط تھا۔ مسٹر ہولڈر حیرت کی زیادتی کی وجہ سے منہ کھولے مجھے تاج توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

”آپ نے دیکھا مسٹر ہولڈر۔ تاج کافی مضبوط ہے اور کوئی غیر معمولی قوت ہی اسے توڑ سکتی ہے اور جب اتنی مضبوط چیز ٹوٹتی ہے تو خاصی زوردار آواز پیدا ہوتی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ سب کچھ آپ سے چند قدموں کے فاصلے پر ہوا اور آپ کچھ نہ سن سکیں۔“

”آپ کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں مسٹر میکلم۔“

”مسٹر ہولڈر آپ یہ بتائیں کہ جب آپ نے اپنے

بیٹے کو تاج سمیت دیکھا تھا تو کیا وہ ننگے پاؤں تھا؟“

”جی ہاں۔ تاہم اس نے سلیپنگ سوٹ پہنا ہوا تھا۔“

”مسٹر ہولڈر جہاں تک سوالات کا تعلق ہے اب میں یہ سلسلہ بند کرتا ہوں آپ نے اور مس میری نے میری جس قدر مدد و تعاون کیا ہے اس سے میں یقیناً اس معاملے کو نمٹانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں ایک بار پھر باہر کا معائنہ کرنے جا رہا ہوں۔ امید ہے آپ مجھے تنہا جانے دیں گے کیونکہ زیادہ لوگوں کی موجودگی برف پر بنے ہوئے نشانات مٹا سکتی ہے۔“

اور جب میں واپس آیا تو کبھی کچھ جان چکا تھا سوائے اس کے کہ گمشدہ ہیرے کہاں ہیں۔

”مسٹر ہولڈر اب ہمیں جدا ہونا چاہیے۔ تاکہ میں اس کی باقی ماندہ کڑیاں بھی تلاش کر لوں۔ اگر آپ کل صبح نو اور دس بجے کے درمیان میرے دفتر آجائیں تو میں آپ کو ساری تفصیل سے آگاہ کر دوں گا۔“

”لیکن ہیرے؟“ ٹینکر نے تجسس سے پوچھا۔

”مسٹر ہولڈر اگر آپ کے ہیرے حاصل کرنے میں کچھ رقم خرچ کرنا پڑے تو کیا آپ اس کی کوئی حد مقرر کرنا چاہیں گے؟“

”میں اپنی ساری پونجی دے کر بھی اس اسکیڈل سے بچنا چاہتا ہوں۔“

”اچھا تو میں چلتا ہوں۔ ممکن ہے اگلے چند گھنٹوں میں پھر یہاں آؤں۔“

دفتر پہنچ کر میں نے ایک لوفر کا بھیس بدلا، دو سیٹھنچ جیب میں ڈالے اور اپنے آج کے مشاہدات کی تصدیق اور ثبوت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

اگلی صبح ٹھیک نو بجے مسٹر ہولڈر دفتر آ پہنچا۔ وہ کل سے کہیں زیادہ تھکا ہوا اور بوڑھا نظر آتا تھا۔

مسٹر ہولڈر نے دل گرفتہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔

”مسٹر میکلم نہ جانے مجھ سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہو گیا ہے کہ ایک کے بعد دوسری مصیبت میں مبتلا ہوئے چلا جا رہا ہوں۔ پہلے میری عزت و وقار داؤ پر لگا۔ دولت سے ہاتھ دھوئے۔ اپنے بیٹے کو کھویا اور اب میرا آخری سہارا میری بیٹی بھی مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ جاتے ہوئے وہ یہ رقعہ چھوڑ گئی ہے جو میں آپ کے ملاحظہ کے لیے لے آیا ہوں۔“

میں نے رقعہ پڑھنا شروع کیا۔

”میرے پیارے چچا جان!

میں یہ خیال کرتی ہوں کہ اس ساری مصیبت کی ذمہ دار

میں ہوں۔ آپ نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر میں نے آرٹھر سے شادی کر لی ہوتی تو شاید آرٹھر سدھر چکا ہوتا اور یہ المیہ ناک واقعہ کبھی پیش نہ آتا۔ چونکہ میں اپنے آپ کو قصور وار سمجھتی ہوں۔ اس لیے میرے لیے اس چھت کے نیچے رہنا مشکل ہو رہا تھا لہذا میں آپ کو چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ آپ میرے مستقبل کے لیے فکر مند نہ ہوں۔ کیونکہ ہر ذی روح اپنا مقدر ساتھ لے کر آتا ہے اور نہ ہی مجھے تلاش کرنے کی کوشش کیجیے گا کیونکہ ہر تلاش بے سود ثابت ہوگی۔“

”آپ کی بیٹی..... میری۔“

”کہیں وہ خودکشی نہ کر لے۔“ مسٹر ہولڈر نے کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی مشکلات ختم ہونے کا وقت آ گیا ہے۔“

”کیا آپ کو کچھ معلوم ہو گیا ہے؟“ مسٹر ہولڈر نے جوش میں کرسی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”ہیرے کہاں ہیں؟“

”مسٹر ہولڈر کیا آپ وہ ہیرے ایک ہزار پاؤنڈ فی ہیرا خریدنے کے لیے تیار ہیں۔“

”میں اس سے کتنی بلکہ تین گنا قیمت دینے پر تیار ہوں۔“

”تو پھر آپ چار ہزار پاؤنڈ کا چیک بنا دیجیے۔ تین ہزار ہیروں کے اور ایک ہزار انعام کے۔“

مسٹر ہولڈر نے بغیر ایک لمحہ ضائع کیے چیک لکھ کر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے دراز سے تاج کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا نکال کر مسٹر ہولڈر کی طرف بڑھا دیا۔

مسٹر ہولڈر نے اسے جھپٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ کو کہاں سے ملا؟“

”یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا پہلے آپ اپنے بیٹے کی رہائی کا انتظام کریں کیونکہ وہ بالکل بے قصور ہے۔“

”اگر آپ کو اس کی مصیبت کا یقین ہے تو آئیے جلدی کریں۔ میں اپنے پیارے بیٹے سے معافی مانگ لوں گا۔ معلوم نہیں وہ مجھے معاف بھی کرے گا یا نہیں؟“

”آپ فکر مند نہ ہوں مسٹر ہولڈر، میں اسے سب کچھ سمجھا کر آ رہا ہوں۔“

”میں آپ کا احسان زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ ویسے اگر آپ مجھے تفصیل سے آگاہ کر دیں تو نوازش ہوگی۔“

”میں عموماً اپنے موکل کو تمام تر تفصیل سے آگاہ کر دیا کرتا ہوں لیکن آپ کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ میں خود ہچکچاہٹ محسوس کر رہا ہوں اور نہیں چاہتا کہ آپ مزید

پرسشان ہوں۔ مسٹر ہولڈر میں نہ چاہتے ہوئے بھی یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ کی بیٹی اور سر جارج برن ویل آپس میں غیر اخلاقی روابط رکھتے تھے۔“

”میری بیٹی.....! ناممکن۔“ ٹینکر نے غصے سے جواب دیا۔

”بد قسمتی سے یہ بالکل درست ہے۔ جب وہ پہلی بار آپ کے گھر آیا تھا تو آرٹھر یا آپ کو بالکل علم نہ تھا کہ وہ کیسے کردار کا انسان ہے۔ حقیقت میں وہ انگلیٹنڈ کے خطرناک لوگوں میں سے ایک ہے۔ وہ ایک ہارا ہوا جواری ہے جو اپنی قسمت سنوارنے کے لیے ہر داؤ لگانے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ آپ کی بیٹی اس کے بیٹھے لہجے اور پروقار شخصیت سے مرعوب ہو کر ہر رات اس سے ملتی رہی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ سر جارج کے دل پر صرف اسی کا قبضہ ہے۔“

”مجھے اس بات کا ہرگز یقین نہیں اور نہ ہی کبھی یقین کروں گا۔ میں اپنی بیٹی کے کردار سے خوب واقف ہوں۔“

مسٹر ہولڈر غصے سے سرخ ہو کر بولے۔

”مسٹر ہولڈر آپ تمام رو وادامن کر یقیناً اپنا خیال تبدیل کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس رات جب آپ کی بیٹی یہ سمجھتے ہوئے کہ آپ اپنے کمرے میں سونے چلے گئے ہیں اپنے محبوب سر جارج سے کھڑکی میں بات چیت کرنے لگ گئی۔ کھڑکی کے باہر برف میں بنے ہوئے قدموں کے نشانات کی میں نے پیمائش کر لی جو بعد میں سر جارج کے قدموں سے ملا کر دیکھے گئے اور وہ سر جارج کے قدموں کے نشان ہی ثابت ہوئے۔ بات چیت کے دوران میری نے اسے تاج کے متعلق بتایا تو سر جارج کی شیطانی سوچ نے فوراً اسے جمانے کا منصوبہ بنالیا۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ آپ کی بیٹی اس پر فوراً راضی نہیں ہوئی ہوگی۔ تاہم آخر کار اسے راضی ہونا پڑا۔ عورتوں میں ایک کمزوری یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ سارے رشتوں میں سے محبت کے رشتے کو ترجیح دیتی ہیں۔ وہ ابھی یہ مشکل اس کی ہدایات سن پائی تھی کہ آپ نیچے آ گئے اور اس سے کھڑکیوں وغیرہ کے بند ہونے کے متعلق پوچھنے لگے۔ اس نے آپ کی توجہ ملازمہ کے باہر جانے کی کہانی سنا کر دوسری طرف مبذول کرا دی اور یہ بھی حقیقت۔ ملازمہ بھی اپنے نکلنے والے عاشق کو ملنے گئی تھی۔ اب اپنے بیٹے کی سنیے۔ آرٹھر آپ سے دو سو پاؤنڈ زہنہ ملنے کے غصے اور کلب میں قرضہ نہ چکانے پر ہونے والی بے عزتی کے متعلق سوچتا ہوا بستر میں کروٹیں بدل رہا تھا کہ اس نے اپنے کمرے کے باہر کسی کے دبے پاؤں چلنے کی آواز سنی۔ وہ

سپینس ڈائجسٹ 225 اگست 2012



جب سے تخلیق کائنات عمل میں آئی ہے اور انسان کو دنیا میں اتارا گیا ہے... تب سے انسانیت اصلاحی مدارج طے کرتے ہوئے معراج انسانیت کی طرف گامزن تو ہے مگر... اصلاح اعمال کے لیے اللہ نے بعثت کا سلسلہ جاری کیا تاکہ خالق و مخلوق کے درمیان پہچان کا رشتہ قائم رہے... ان ہی برگزیدہ بندوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا بھی شمار ہوا۔ جنہیں اپنے والد حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح بادشاہت کے ساتھ ساتھ نبوت بھی عطا ہوئی اور جن و انس، چرند پرند آپ علیہ السلام کے تابع ہوئے... اور ایسا عظیم الشان دربار نصیب ہوا کہ کبھی کسی اور کے حصے میں نہ آیا کہ جہاں ہر مخلوق ہاتھ باندھے کھڑی تھی... سبحان اللہ۔

حضرت سلیمان علیہ السلام

رضوانہ ساجد

ایک عظیم بادشاہ اور عظیم پیغمبر حضرت سلیمان کی روداد حیات

ہوا کو حکم ہوا کہ جب تک دعوت چلتی رہے ہو ان کے تخت کو معلق رکھے تاکہ آپ انتظامات کی نگرانی کرتے رہیں۔ آپ لوگوں کو جمع ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ابھی کھانا شروع نہیں ہوا تھا کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ ایک بڑی مچھلی دریا سے نکلی اور ہوا میں بلند ہو کر آپ کے تخت کے قریب آگئی۔

نشانات کی راہنمائی میں اس جگہ جا پہنچا جہاں یہ دونوں نشانات آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے اور یہ وہی جگہ تھی جہاں آرتھر اور سرجارج میں تاج چھیننے کی کوشش ہوئی تھی۔ ننگے پاؤں برف میں چلنے کی وجہ سے آرتھر کے پاؤں کیلے ہو گئے تھے چنانچہ جب وہ دوبارہ کھڑکی میں سے اندر داخل ہوا تو فریم پر ننگے پاؤں کا نشان بن گیا جس کا رخ ظاہر کرتا تھا کہ کوئی ننگے پاؤں اندر داخل ہوا ہے جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں بڑی مدد ملی کہ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا۔

دفتر پہنچ کر میں نے ایک لوفر کا لباس پہنا اور سرجارج کی رہائش گاہ پر گیا وہاں اس کے ملازم سے واقفیت نکال کر معلوم کر لیا کہ پچھلی رات اس کے مالک کے سر پر چوٹ لگ گئی ہے اور وہ پاؤں ڈنڈا خرچ کر کے سرجارج کا ایک پرانا جوتا حاصل کیا اور اس جوتے سمیت میں ایک بار پھر آپ کے گھر گیا اور کھڑکی کے سامنے موجود نشانات کا موازنہ سرجارج کے جوتوں سے کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس سارے دھندے کے پیچھے سرجارج ہی کا ہاتھ ہے۔ میں سرجارج سے ملا اور اس سے تاج کے متعلق استفسار کیا۔ پہلے تو وہ صاف مکر گیا لیکن جب میں نے اس سے ساری حقیقت بیان کی اور دھمکایا کہ پولیس نے اس کے قدموں کے نشانات محفوظ کر لیے ہیں اور اس کو پھنسانے کے لیے صرف نام لے دینا ہی کافی ہے تو اس نے دیوار پر ٹنگی ہوئی تلوار اتار کر مجھ پر حملہ کرنا چاہا لیکن میں نے اس سے قبل ہی پستول اس پر تان لیا۔ اس پر وہ کچھ دھیمّا پڑا اور جب میں نے اسے ایک ہزار پاؤں ڈنڈا ہیرا خریدنے کی پیشکش کی تو وہ پاگلوں کی طرح میرا منہ دیکھنے لگا۔ پھر مایوسی سے بولا کہ اس نے کسی کے ہاتھ تینوں ہیرے سات سو پاؤں ڈنڈا میں بیچ ڈالے، میں بڑی جدوجہد کے بعد خریدار کا نام معلوم کر کے اس کے پاس پہنچا اور اس سے کافی تنگ دو دو کے بعد تین ہزار پاؤں ڈنڈا میں تینوں ہیرے خریدنے میں کامیاب ہو گیا۔

مسٹر ہولڈر یہ ہے ساری رام کہانی۔ اب آپ کو اپنے بیٹے کی رہائی کا بندوبست کرنا چاہیے۔ ہاں ایک حقیقت اور سن لیجیے۔ جب آپ کے بیٹے نے پانچ منٹ باہر جانے کی اجازت طلب کی تھی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ باہر جا کر تاج کے ٹکڑے کو ڈھونڈنا چاہتا تھا جو اس کی دانست میں وہیں کہیں گر گیا تھا۔

میری کے متعلق صرف یہ کہوں گا کہ اب نہ تو سرجارج برن ویل آپ کو اس شہر میں ملے گا اور نہ ہی میری۔“

ننگے پاؤں باہر نکلا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری چوروں کی طرح آپ کے ڈریسنگ روم میں داخل ہو رہی ہے۔ وہ بھی چھپتا چھپاتا وہاں پہنچ کر کپڑوں کی الماری کے پیچھے ریگ گیا۔ میری نے سیف کھول کر تاج نکالا اور سیدھی کھڑکی کی طرف جا کر تاج باہر کھڑے ہوئے سرجارج کو پکڑا دیا۔ یہ دیکھ کر آرتھر کو صورت حال کا اندازہ ہوا۔ اور وہ میری کے واپس جانے کے فوراً بعد کھڑکی میں سے باہر کود گیا۔ میری کو اس کے باہر جانے کا قطعاً علم نہیں ہو سکا۔ آرتھر نے کھڑکی سے کچھ دور ہی سرجارج برن ویل کو جا پکڑا اور اس سے تاج چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ دونوں تاج کو پکڑے ہوئے ایک دوسرے سے چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ دونوں کی اس زور آزمائی میں تاج ایک طرف سے ٹوٹ گیا۔ خوش قسمتی سے تاج کا بڑا حصہ آرتھر کے ہاتھ میں رہا اور وہ یہ سمجھتے ہوئے کہ اس نے تاج چھین لیا ہے واپس بھاگ لیا۔ کھڑکی سے کود کر وہ اندر پہنچا اور یہ کودنے کی آواز ہی تھی جس نے آپ کی نیند میں خلل اندازی کی تھی۔ جو بھی آرتھر کمرے کی روشنی میں آیا اس نے محسوس کیا کہ تاج کچھ ٹیڑھا ہو گیا ہے، وہ اسے سیدھا کرنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ آپ آن پہنچے اور آپ نے اسے اس وقت گالیوں اور چور اور اسی نوع کے القاب سے نوازا جبکہ وہ آپ کی پدرانہ شفقت اور شکرے کا حق دار تھا۔ لہذا اس نے غصے میں چب سادھ لی اور دوسری بات یہ بھی تھی کہ اس نے میری کے متعلق، جس سے وہ پیار کرتا تھا کچھ کہنے سے گریز کیا۔ یہ بھی واضح کر دوں کہ میری یہ دیکھ کر کہ تاج دوبارہ آپ کے قبضے میں ہے بے ہوش ہو گئی تھی اور یہی ایک نقطہ اس کے ملوث ہونے کا پختہ ثبوت ہے۔ جب میں آپ کے گھر پہلی بار گیا تھا تو میں نے سب سے پہلے گھر کا چکر لگایا تھا۔ جب میں پچھلے دروازے پر پہنچا تو میں نے ایک عورت اور ایک مرد کے قدموں کے نشانات دیکھے یہ آپ کی ملازمہ اور سبزی فروش کے نشانات تھے۔ میں نے صرف ایک پاؤں اور دوسرے پاؤں کی جگہ گول گول گہرے نشانات دیکھتے ہوئے اندازہ لگالیا کہ مرد کی ایک ٹانگ لکڑی کی ہے۔ جب میں بڑی کھڑکی کے سامنے سے گزرا تو میں نے سفید برف کی سطح پر لکھی ہوئی داستان چند لمحوں میں پڑھ لی۔ کھڑکی کے عین سامنے دو قدموں کے نشانات تھے۔ ایک جوتوں والے قدم اور دوسرے ننگے پاؤں کے نشانات۔ مجھے احساس ہوا کہ ننگے پاؤں والا بعد میں اس راستے پر چلا ہے۔ کیونکہ کہیں کہیں جوتے کا نشان ننگے پاؤں کے نیچے دبایا ہوا تھا۔ میں ان

حضرت سلیمان (علیہ السلام) اور پرندے

ایک روز حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے سارے پرندوں کو حکم دیا کہ میرے دربار میں حاضر ہو کر ہر پرندہ بتائے کہ اس میں کیا کمال ہے۔

چنانچہ سب پرندے حاضر ہوئے۔ مور، کبوتر، ہد، کوا، وغیرہ۔ ہر پرندہ حاضر ہو گیا۔ سب اپنا اپنا کمال بیان کرنے لگے۔ ہد کی باری آئی تو اس نے کہا۔ ”حضور! مجھے یہ کمال حاصل ہے کہ چاہے کتنا اونچا اڑتا ہوں اور زمین سے کتنی ہی دور ہو جاؤں۔ میری نظراتی تیز ہے کہ میلوں دور اوپر سے میں زمین کے ذرے ذرے کو دیکھ لیتا ہوں۔ نہ صرف یہ کہ سطح زمین کی ہر چیز کو دیکھ لیتا ہوں بلکہ زمین کے اندر جہاں پانی ہو وہ بھی دیکھ لیتا ہوں اور پھر حضور اس پانی کا ذائقہ بھی معلوم کر لیتا ہوں کہ کڑوا ہے یا میٹھا۔ حضور! آپ مجھے اپنے ساتھ رکھا کیجئے۔ آپ اپنے تخت پر تشریف فرما کر ہوا پر سیر فرماتے ہوئے جہاں بھی جائیں مجھے ساتھ رکھیں۔ میں زمین پر نگاہ رکھا کروں گا۔ جہاں بھی زمین کے اندر میٹھا پانی نظر آیا کرے گا میں بتا دیا کروں گا۔ آپ اپنا تخت وہاں اتار کر اپنا دربار لگا لیا کیجئے۔“

حضرت سلیمان (علیہ السلام) اس کا یہ کمال سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا: ہم نے تمہیں اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دی۔ کوا ہد کا یہ کمال اور اس کی عزت افزائی سن کر حسد کے مارے جل بھن گیا اور کہنے لگا۔ ”حضور! ایک میری بھی عرض سن لیجئے۔ ہد ہد نے بالکل جھوٹ بولا ہے۔ اس میں ہرگز یہ کمال نہیں ہے جو اس نے بیان کیا۔ اتنی دور آسمان پر اڑتے ہوئے اگر یہ زمین کی سطح کی چیزیں بھی دیکھ سکتا ہے تو شکاری کے جال میں بھی نہ پھنستا۔ جال کے اندر جو دانہ پڑا ہوتا ہے اس کو کھانے کے لیے کود پڑتا ہے اور جال اسے نظری نہیں آتا۔ اگر اتنا ہی باکمال ہوتا ہے تو اسے دانے کے ساتھ جال بھی نظر آ جاتا۔“

حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے ہد سے فرمایا ”سنا کوئے کا اعتراض؟ تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟“

ہد نے کہا۔ ”حضور! یہ حاسد ہے اور حسد میں میرے کمال کا انکار کر رہا ہے۔ آپ میرا امتحان لے لیجئے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اگر سچ نہ ہو تو ابھی میرا سرتن سے جدا کر دیجئے۔ حضور! نظر تو میری واقعی تیز ہے۔ لیکن جب اس پر قضا کا پردہ پڑ جاتا ہے تو پھر مجھے جال نظر نہیں آتا۔ اس حاسد کو میرے کمال پر اعتراض کرنا تو سوجھا لیکن اسے تقدیر و قضا کی حقیقت نہ سوجھی۔ (حیاۃ النبیون)

ہو جاتے ہیں اور جنگ کی تیاری شروع کرتے ہیں اور یہ جو دوشیر تم دیکھ رہے ہو یہ حق اور انصاف کے داعی ہیں جب دو فریق کوئی دعویٰ لے کر آتے ہیں اور بادشاہ کو فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون ہے تو دونوں فریقوں کو شیروں کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ان شیروں کی خاصیت یہ ہے کہ جو فریق جھوٹا ہوتا ہے، یہ شیر اسے چیر پھاڑ ڈالتے ہیں۔“

”تو نے پوچھا تخت پر بیٹھنے والیاں کون تھیں۔ کیا وہی اس عجیب و غریب شہر کی حکمران ہیں۔“ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جن سے پوچھا۔

”حضور، ان میں ایک تو بادشاہ کی بیوی تھی دوسری اس ملک کی شہزادی۔“

”پوچھنے کی بات تو تو نے پوچھی ہی نہیں، اس شہر کے رہنے والوں کا مذہب کیا ہے۔“

”میں نے پوچھا تو نہیں لیکن اس لوٹڈی نے خود ہی بتا دیا تھا۔ ان لوگوں میں یہ دستور ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی پرستش کرتے ہیں۔“

”تم نے اس سے کہا نہیں کہ یہ سراسر گمراہی ہے؟“

”میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔“

”تم نے اس سے کچھ نہیں کہا لیکن ہم اس کے بادشاہ سے ضرور کہیں گے۔ اسے مجبور کریں گے کہ وہ دعوت حق قبول کرے۔ اگر وہ نہ مانا تو اسے سزا دیں گے۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس بادشاہ کے خلاف جہاد کا حکم دے دیا۔ اس حکم کے ملتے ہی تمام لشکری تیار ہو گئے۔ آپ نے ہوا کو حکم دے دیا کہ ان سب کو شہر صیدون پہنچا دے۔ لشکر کو راستہ بتانے کے لیے سمندون جن آگے آگے چل رہا تھا۔

صیدون کے برج اور مینار چننے لگے۔ ”خبردار، ہوشیار۔ بادشاہ سلامت! فوج کو باہر نکالیں۔ دشمن کی فوج جنگ کے لیے آرہی ہے۔“

شہری اور سپاہی ان آوازوں کا مطلب خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے تیاری کی اور شہر سے باہر نکلے۔ زمین خالی پڑی

”آپ نے مجھے بلایا نہیں مگر میں پھر بھی آپ کی دعوت میں شامل ہونے آئی ہوں۔“

”ہم نے دریا کی مخلوق کو نہیں بلایا تھا لیکن ایسی کوئی پابندی بھی نہیں۔ تو آگئی ہے تو ایک طرف بیٹھ جا۔ جب سب کھانا شروع کریں تو تو بھی کھا لیتا۔ تیرا کھانا ہی کتنا ہوگا۔“

”مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ میں بہت بھوکی ہوں۔ مجھے تو ابھی کھانا چاہیے ہے۔ تیرے مہمان بعد میں کھاتے رہیں گے۔“

”اچھا جا، جتنا تجھے کھانا ہے کھا لے۔“

یہ سنا تھا کہ مچھلی کھانے کی طرف چل دی۔ یہ کوئی عام مچھلی نہیں تھی۔ یہ تو حضرت سلیمان علیہ السلام کا امتحان لینے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ اس کا اندازہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس وقت ہوا جب وہ ہزاروں آدمیوں کا کھانا، تنہا ایک لقمے میں چٹ کر گئی اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

”سلیمان، میرے لیے اور کھانا فراہم کر دے۔ میں اب بھی بھوکی ہوں۔“

”ہزاروں آدمیوں کا کھانا اکیلی کھا گئی اور اب بھی کہتی ہے بھوکی ہوں۔ میرے مہمان اب کیا کھائیں گے۔ تو نے تو کھانا ہی ختم کر دیا۔“

”اچھی دعوت ہے تیری۔ اتنے لوگوں کو کھانا کھلانے چلا ہے اور ایک کا پیٹ نہیں بھر سکا۔ اللہ تعالیٰ مجھ کو ہر روز کھانے کے لیے تین لقمے مہیا کرتا ہے اور یہ جو اس وقت میں نے کھایا ہے وہ میرے لیے صرف ایک لقمہ تھا۔ ابھی دو لقموں کی کسر ہے۔ رزق پہنچانا مکمل نہیں ہے جس کا دعویٰ تم لے کر اٹھے تھے۔“

یہ سنتے ہی سب کچھ عیاں ہو گیا۔ اتنا کچھ دے کر بھی اللہ تعالیٰ کے پاس کتنا کچھ ہے۔ میں کسی کو ایک لقمہ بھی نہیں دے سکتا اور وہ اتنی مخلوق کو کھلا رہا ہے۔ اب اللہ کا نبی رو رہا تھا اور خدا سے عاجزانہ کہہ رہا تھا ”خدا یا! میں نے بہت بڑا قصور کیا۔ میں نے یہ گمان کر لیا کہ میں تیری مخلوق کے کچھ حصے کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا سکتا ہوں۔ مجھ عاجز کو معاف کر دے۔ میں توبہ کرتا ہوں روزی دینے والا صرف تو ہی ہے اور سارے جہان کا تو ہی پیٹ پال سکتا ہے۔ میں مسکین ہوں تو تو اتنا ہے۔“

اسرائیلی قصوں میں ایک قصہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ایک روز حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک جن کو بلایا۔ اس کا نام سمندون تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے پوچھا۔ ”اے سمندون! تو نے کوئی ایسی جگہ بھی دیکھی ہے جو عجیب و غریب بھی ہو اور دنیا کی نظروں سے اب تک پوشیدہ بھی ہو۔“

سمندون جن کچھ دیر سر کھاتا رہا جیسے کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا ہو پھر جواب دیا۔ ”حضور! یہاں سے مغرب کی طرف ایک جزیرہ ہے اور اس میں ایک عظیم شہر موجود ہے۔ میرا اس شہر کی طرف سے گزر ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے اڑنا بھول گیا۔ ایسا خوبصورت شہر میں نے اس سے پہلے بھی نہیں دیکھا تھا۔ میں دیکھتا پھر رہا تھا کہ ایک مکان پر نظر پڑی۔ یہ مکان سنگ مرمر سے بنایا گیا تھا۔ مکان کے اوپر بلند مینار تھا جس پر پتھر کے دوشیر بنے ہوئے تھے۔ ان کی شکلیں انسان جیسی تھیں۔ اس شیر جیسی دوسری بہت سی مورتیاں تھیں۔ مجھے تجسس ہوا تو میں محل کے اندر بھی گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ محل کے بیچ میں ایک عظیم الشان تخت بچھا ہوا ہے۔ اس تخت پر ایک عورت اور ایک لڑکی نہایت حسین بیٹھی تھیں۔ کچھ دیر بعد لڑکی تخت سے اتر گئی اور ایک حجرے کی طرف چلی۔ اس کے تخت سے اترتے ہی بے شمار لوٹڈیاں حرکت میں آ گئیں۔ میں فوراً ایک لوٹڈی کے پاس پہنچا اور خود کو ظاہر کر دیا۔ میں نے اس لوٹڈی سے اس کا نام پوچھا تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔“

”اے شخص! تو کون ہے اور اس طلسم کدے میں کیسے چلا آیا؟“

”میں جو بھی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تو میرے سوالوں کے جواب دے۔“

”پوچھ کیا پوچھنا ہے؟“

”مجھے اس شہر اور اس محل کے بارے میں کچھ بتا اور یہ بتا کہ تخت پر بیٹھی عورت کون ہے اور جو ابھی حجرے میں گئی ہے وہ کون ہے۔“

اس لوٹڈی نے مجھے بتایا۔ ”اس شہر کا نام صیدون ہے۔ یہاں جو شکلیں اور مورتیاں تجھے نظر آرہی ہیں وہ سب جادو کے کرشمے ہیں۔ جب کوئی دشمن ہماری طرف بڑھتا ہے تو یہ مورتیاں آوازیں دے دے کر دشمن کی آمد کی خبر دیتی ہیں۔ ہم ہوشیار

تھی۔ انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور ان کے دل دھک سے رہ گئے۔ ایک شہر تھا جو ہوا میں اڑتا چلا آ رہا تھا۔ یہ کیسا لکڑ ہے؟ لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے اور پھر وہ اٹنے قدموں شہر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

”اے بادشاہ! ذرا باہر نکل کر تو دیکھ۔ ایک عجیب و غریب فوج ہم نے دیکھی ہے جو ہوا میں اڑتی چلی آرہی ہے۔ ایک شہر ہے جو ہوا میں اڑتا ہوا آ رہا ہے۔ اس فوج کا ہم کیسے مقابلہ کریں گے۔ یہ فوج تو ہمارے صیدوں کو تباہ کر دے گی۔“ بادشاہ کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ کوئی لشکر ایسا بھی ہو سکتا ہے جو ہوا میں اڑتا ہو لیکن جب وہ خود باہر نکلا اور دیکھا تو اس کے بھی ہوش اڑ گئے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر زمین پر اتر آیا تھا۔ صیدوں کے بادشاہ کی آنکھیں کھل جانی چاہیے تھیں کہ جو لشکر ہوا میں اڑ سکتا ہے وہ کیسا طاقتور ہو گا لیکن موت اس کے انتظار میں تھی۔ وہ اپنی فوج کو لشکر کے مقابل لے آیا۔ تنکے اور طوفان کا کیا مقابلہ۔ معمولی سے معرکے کے بعد فیصلہ ہو گیا۔ صیدوں پر حضرت سلیمان علیہ السلام کا قبضہ ہو گیا۔ اس جنگ میں شاہ صیدوں بھی مارا گیا۔

کل سے زندہ بچ جانے والی شہزادی کو حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے ساتھ یروشلم لے آئے۔ یروشلم پہنچ کر جب وہ شہزادی آپ کے سامنے پیش ہوئی تو سخت گستاخی سے پیش آئی لیکن آپ نے اس کی باتیں یہ کہہ کر نظر انداز کر دیں کہ اس کا باپ اور خاندان مارا گیا ہے۔ اس کا شہر تباہ ہوا ہے، اتنا غصہ کرنا تو اس کا حق ہے۔ جب اس لڑکی کا غصہ اتر گیا تو آپ نے اسے سمجھایا۔

”دیکھ لڑکی! تیرا باپ سخت گمراہی میں مبتلا تھا۔ لوگوں سے اپنی پرستش کر داتا تھا۔ اللہ نے مجھے حکم دیا کہ اس گمراہ کو سزا دی جائے۔ وہ میرے مقابل آیا اور مارا گیا۔“

”میں جانتی ہوں تو ہوا میں اڑنے والا بادشاہ ہے۔ طاقتور ہے لیکن مرنے والا میرا باپ تھا۔ میں اس کے لیے ماتم کیوں نہ کروں؟“

”تیرا باپ مارا جا چکا۔ اب تجھے چاہیے کہ تو ایک خدا پر ایمان لے آ۔“

”میں آپ کے کہنے پر ایک خدا پر ایمان لے آؤں گی لیکن اس سے پہلے میں اپنے باپ کی شکل دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”میں اس کی شکل تجھے کیسے دکھا سکتا ہوں۔ وہ تو مر چکا۔“

”اس کا کٹا ہوا سر ہی مجھے دکھا دے۔ اگر تو ایسا نہ کر سکا تو میں ایمان لانے والی نہیں۔“

اس کا دل ایمان کی طرف راغب نہیں ہوا تھا۔ اسی لیے وہ ایسی شرطیں رکھ رہی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس کے باپ کا سر نہیں لاسکیں گے اور وہ ایمان لانے سے بچ جائے گی لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ کوئی اور نہیں حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے کسی جن کو حکم دیا کہ شاہ صیدوں کا کٹا ہوا سر لایا جائے۔ چشم زدن میں وہ سر لے آیا۔ شہزادی کی نظر جیسے ہی کٹے ہوئے سر پر پڑی وہ بے ہوش ہو گئی۔ اس کے بے ہوش ہونے میں شاید یہ صدمہ بھی شامل تھا کہ اب اسے ایمان لانا پڑے گا۔

اس شہزادی کا نام امینہ تھا۔

جب وہ ہوش میں آئی اور چند روز کی تسلیوں کے بعد اسے اپنی حالت پر صبر آ گیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے خدائے واحد پر ایمان لانے کی تلقین کی۔ وہ دل سے تیار نہیں تھی لیکن اب اس کے سامنے کوئی اور راستہ تھا بھی نہیں۔ وہ ایمان لے آئی اور حضرت سلیمان علیہ السلام سے شادی کر لی۔

اس کے دل میں اب تک باپ کی پرستش کا خیال کروٹیں لیتا رہتا تھا۔ وہ بے چین رہتی تھی کہ باپ تو ہے نہیں۔ پرستش کس کی کرے۔ انسان جو کچھ سوچتا ہے ویسے ہی حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ شیطان بھی اسے بہکا تا ہے جو بہکنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ امینہ کے دل کی کمزوری شیطان پر ظاہر ہو گئی۔ اس نے بزرگ کا روپ دھارا اور محل میں داخل ہو گیا۔ امینہ کے سامنے پہنچا تو وہ ایک اجنبی کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”آپ کون ہیں اور یہاں کیسے چلے آئے؟“ امینہ نے پوچھا۔

”میں تیرے باپ عجبو شاہ صیدوں کا دوست ہوں۔ جن دنوں صیدوں پر تباہی آئی، میں صیدوں سے باہر تھا، اب

مجھے معلوم ہوا کہ سلیمان تجھے اٹھالیا ہے اور تجھ سے شادی کر لی ہے تو میں تجھ سے ملنے آ گیا۔“

”آپ کو اندر آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟“

”مجھے کچھ جادو آتا ہے لہذا میں نے خود کو چھپا لیا تھا۔“ اس کے بعد شیطان نے کہنا شروع کیا۔ ”میں نے سنا ہے تو سلیمان کے خدا کی پرستش کرنے لگی ہے جبکہ تیرا باپ تو خود خدا تھا۔ تجھے اس کی پرستش کرنی چاہیے۔“

”میں اس کی پرستش کیسے کر سکتی ہوں۔ وہ تو مر چکا۔“

”تو پریشان کیوں ہوتی ہے۔ میں تیرے باپ کا مجسمہ بنا کر تجھے دے دوں گا۔ تو اس کی عبادت کیا کرنا۔“

”آپ کیا سمجھتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام مجھے اس کی پرستش کرنے دیں گے؟“

”حضرت سلیمان علیہ السلام کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ تو اسے ایسی جگہ چھپا کر رکھنا کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔“

شیطان نے مجسمہ لا کر دے دیا۔ امینہ اس مجسمے کی پرستش کرنے لگی۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کی سزا کے طور پر اسرائیلی روایات کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کچھ مدت کے لیے تخت سے محروم کر دیے گئے اور شیطان قابض ہو گیا۔ آپ کی انشعری جس پر اسم اعظم کنندہ تھا شیطان کے ہاتھ لگ گئی تھی جس کے زور پر وہ حکومت کرتا رہا پھر جب مدت ختم ہوئی تو انشعری شیطان کے ہاتھ سے دریا میں گر گئی اور پھلی اس کو نکل گئی اور وہ پھلی حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس شکار ہو کر آئی اور اس طرح اس کے پیٹ سے انشعری نکال کر انہوں نے اپنا ملک واپس لیا۔

تورات سلاطین 1 باب 11 میں بھی اس روایت سے ملتا جلتا ایک قصہ مذکور ہے اور اس میں بیویوں کی خاطر حضرت سلیمان علیہ السلام کا بت پرستی تک کرنا موجود ہے (العیاذ باللہ)

”خداوند سلیمان سے ناراض ہوا کیونکہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے پھر گیا تھا جس نے اسے دوبار دکھائی دے کر اس کو اس بات کا حکم کیا تھا کہ وہ غیر معبودوں کی پیروی نہ کرے پر اس نے بات نہ مانی جس کا حکم خداوند نے دیا تھا۔“

”اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر لیا اور اس کا دل اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا جیسا کہ اس کے باپ داؤد علیہ السلام کا دل تھا۔“

ان روایات میں ایک اولوالعزم پیغمبر کی جانب جس قدر خرافات اور ذلیل واقعات کی نسبت کی گئی ہے ایک عام آدمی بھی بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ ایسی روایات کا اسلام کی تعلیمات سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک پیغمبر کے گھر میں بت پرستی ہوتی رہے اور اسے بذریعہ وحی بھی معلوم نہ ہو سکے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک پیغمبر بیویوں کی خوشنودی کے لیے بت پرستی کی طرف مائل ہو جائے۔

یہ سب اس لیے ممکن ہو سکا کہ بنی اسرائیل نے اپنی الہامی کتب میں تحریف کر دی تھی اور اپنی اغراض و نیوی کی خاطر ان میں ہر قسم کا رد و بدل کر دیا تھا چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے معاملے میں تو اس درجہ جرات اختیار کی کہ ان کی نبوت و رسالت سے بھی انکار کر کے ان پر طرح طرح کے الزام اور بے ہودہ بہتان لگائے۔ ان کے نزدیک حضرت سلیمان علیہ السلام ایک پیغمبر نہیں بلکہ جادوگر تھے اور جادو ہی کے زور پر جن و انس اور وحش و طیور کو مسخر کیے ہوئے تھے۔ (نعوذ باللہ)

قرآن مجید نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے بنی اسرائیل کے لگائے ہوئے اس بہتان کی مدلل تردید کی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی پیغمبرانہ عظمت کو نمایاں اور روشن کیا۔ اس نے بتایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا دامن جاوہ کی نجاست سے پاک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کو گمراہ کرنے کے لیے شیاطین نے سحر کو سکھایا اور اس کو مدون کیا اور بنی اسرائیل کتاب اللہ (توریت و زبور) کو پس پشت ڈال کر جادو سیکھنے اور سکھانے لگے اور جب بعض نیکوکاروں نے اس کی مخالفت کی اور سمجھایا کہ یہ گمراہی ہے تو انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا سکھایا ہوا علم ہے۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس گمراہی کو روکنے کے لیے شیاطین کے ان تمام نوشتوں کو حاصل کر کے اپنے تخت کے نیچے دفن کر دیا تا کہ جن و انس کسی کو وہاں تک پہنچنے کی جرأت نہ ہو سکے اور ساتھ ہی یہ فرمان جاری کر دیا

یہ بوس حرر سے یا بوس سے سیدہ سے بوسوں میں ہوا ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مدفون ذخیرے کو نکال لیا اور بنی اسرائیل میں یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ جادو کا یہ علم حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم ہے اور وہ اس کے زور پر جن وانس اور ہوا پر حکومت کرتے تھے اور اس طرح جادو کو پھر بنی اسرائیل میں رائج کر دیا۔

قرآن حکیم نے اس تاریخی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

”اور جب ان (بنی اسرائیل) کے پاس اللہ کی جانب سے رسول آیا جو قصد یق کر رہا ہے ان الہامی کتابوں کی جو ان کے پاس ہیں تو جو لوگ کتاب (توریت) سے نوازے گئے تھے انہوں نے اللہ کی کتاب (توریت) کو پس پشت ڈال دیا اور آپ کی صداقت کی بشارت کے متعلق ایسے ہو گئے گویا وہ جانتے ہی نہیں۔ انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ایسی چیز کی پیروی اختیار کر لی جو شیاطین پڑھتے تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا تھا شیاطین نے کفر کیا تھا کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔“



قرآن مجید نے نہایت صاف اور واضح طور پر یہ بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا قصہ بد پرندہ تھا۔
”اور پرندوں کا جائزہ لیا تو کہنے لگا کیا وجہ میں بد کو نہیں پاتا..... سلیمان نے کہا ہم اب دیکھتے ہیں کہ تو (بد پرند) اپنے قول میں سچا ہے یا جھوٹا ہے۔ لے یہ میرا خط لے جا اور ان کی طرف ڈال دے۔“

ابہام کی کوئی گنجائش نہیں لیکن ایسے لوگوں نے جو معجزات کو خلاف عقل قرار دیتے ہیں طرح طرح کی تاویلات پیش کرنی شروع کر دیں چنانچہ اول پرندے کا بات چیت کرنا خلاف عقل قرار دیا گیا اور پھر زیر بحث واقعہ سے متعلق آیت کے خود ساختہ معنی بیان کیے گئے اور کہا گیا کہ پہلے زمانے میں یہ دستور تھا کہ مشرکین اکثر اپنی اولاد کے نام دیوتاؤں کے نام پر رکھ لیا کرتے تھے جن میں حیوانات کے نام بھی تھے لہذا اس جگہ بھی بد پرندہ مراد نہیں ہے بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا قصہ ”انسان“ مراد ہے جس کا نام غالباً بد پرندہ ہوگا۔

جب یہ اعتراض وارد ہوا کہ ترجمہ تو یہ ہے کہ ”پرندوں کا جائزہ لیا گیا“ تو ایک مفسر نے اس کی یہ توجیہ پیش کی کہ ”طیر“ کے معنی فوج کے ہیں۔

”ان کے یہ معنی بے سند اور عربی لغت کے پیش نظر باطل ہیں اور یہ مسلم ہے کہ لغت میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے بلکہ وہ اہل زبان کے استعمال کے تابع ہے اور اہل عرب حقیقی اور مجازی کسی معنی کے اعتبار سے بھی ”طیر“ بہ معنی نہیں استعمال کرتے بلکہ صرف پرندے ہی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔“ (قصص القرآن)

سید سلیمان ندوی نے بھی اس کے بین بین راستہ اختیار کیا ہے۔

”قرض کر لو کہ نامہ بر کیو تروں کی طرح تربیت یافتہ نامہ بر بد پرندہ ہوگا اور اس کے بولنے سے مقصود اس مضمون کا خط اس کے پاس ہونا سمجھ لو جیسا کہ خود اس موقع پر قرآن مجید میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط دے کر اس کو ملکہ سبا کے پاس بھیجا۔ اسی طرح پہلے بھی خط لے کر آیا ہوگا۔“

عجب ہے کہ جبکہ قرآن مجید ”نملہ“ (چیونٹی) اور بد پرندہ کے واقعات کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے عظیم الشان نعمت اور احسان ظاہر کر رہا ہے اور قرآن مجید کا سیاق و سباق ان واقعات کو ایسے انداز میں ہونا بیان کرتا ہے جس سے بد پرندہ ہو کر حضرت سلیمان علیہ السلام سے باتیں کرنا صاف صاف اور صریح معلوم ہوتا ہے تو پھر وحی کے دیے ہوئے علم کے انکار پر تاویلوں کی لکیریں کھینچنے کا کیا فائدہ۔

ملکہ سبا کے تخت کا معاملہ بھی مفسرین میں زیر بحث رہا ہے۔ کسی نے کہا یہ منگوا یا نہیں گیا تھا بلکہ تحفے کے طور پر آیا تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے خاص طور پر بنوایا گیا تھا۔ کسی نے کہا منگوانے کے معنی یہ تھے کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے توشہ خانے میں تھا، ملک یمن سے نہیں منگوا یا گیا تھا۔

”عربی محاورے میں کتاب اکثر ”خط“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خود اسی جگہ قرآن میں دو جگہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس لیے آیت کا مقصود یہ ہے کہ درباریوں میں سے ملکہ سبا کے مضمون خط کا جس کو علم تھا وہ بہ طور تحفہ اپنے ساتھ ایک تخت لائی ہے۔ اس نے کہا۔ ”میں ابھی لاتا ہوں۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کا تخت جس خاص طریقے سے منگوا یا وہ ایسا طریقہ ہے جس کو موجودہ علوم ابھی

حضرت سلیمان (علیہ السلام) پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے

تفسیر ”مواعب علیہ“ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) کو پرندوں کی زبان کی تعلیم فرمائی تھی۔ اس لیے وہ ہر پرندے کی بولی سمجھتے تھے۔ تفسیر ”مدارک“ میں ہے کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے فرمایا۔

☆..... فاختہ بولتی ہے: لیت الخفس لم یخلق ”کاش کہ دنیا پیدا نہ ہوئی ہوتی۔“

☆..... مور بولتا ہے: کما تدین تدان ”جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔“

☆..... سنگ خوردہ کہتا ہے: من سکت سلم ومن سلم نجا ”جو شخص خاموش رہا، سلامت رہا۔ جس شخص کو سلامتی حاصل ہوئی اس نے بھائی نائی۔“

☆..... گرگٹ کہتا ہے: یا ابن آدم مش باصف اخرک الموت ”اے ابن آدم! دنیا میں جب تک جی چاہے جیسا کہ انجام کار موت آئے گی۔“

☆..... بد پرندہ کہتا ہے: من لا یرحم لا یرحم ”جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا..... اے کتاہ گاروں اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرو۔“

☆..... قمری کہتی ہے: سبحان ربی الاعلیٰ۔ ”پاک ہے میرا بلند رب۔“

☆..... طوطا بولتا ہے: کل جی موت کل جدید بال ”ہر زندہ کو موت ہے اور نئی چیز ایک دن بوسیدہ ہو جائے گی۔“

☆..... چیل بولتی ہے: کل شیء حاکم الا دھر۔ ”رب کے علاوہ ہر شے نے فنا ہونا ہے۔“

☆..... بلبل کہتی ہے: سبحان الخالق الدائم۔ ”پاک ہے وہ پیدا کرنے والا ہمیشہ رہے گا۔“

☆..... کوا چلی اور ککس وصول کرنے والوں پر لغت بھیجتا ہے۔ تفسیر ”وسیط“ میں سند صحیح ہے۔

خطاف (لبے باز دوں والا، چھوٹے پاؤں والا، سیاہ رنگ کا پرندہ) کی بولی سن کر کہا کہ یہ کہہ رہا ہے: ”نکی کے کام کر دتا کہ آگے ان کی جڑ پاؤں“

بھٹ تیری آواز سن کر کہا کہ یہ کہہ رہا ہے ”جو خاموش رہا وہ سلامتی میں رہا۔“

مرغ کی آواز سن کر فرمایا ”یہ کہہ رہا ہے: اے غافلوا! اللہ تعالیٰ کو یاد کرو۔“

گدھ کی آواز سن کر فرمایا ”یہ کہہ رہا ہے: اے انسان! جتنا چاہے زندہ رہے آخر تجھے موت آنی ہے۔“

عقاب کی آواز سن کر کہا کہ یہ کہہ رہا ہے: ”لوگوں سے دور رہنے میں ہی اس ہے۔“

قرآن مجید میں ہے:

ترجمہ ”انہوں نے کہا۔ اے لوگوں! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی اور ہر چیز میں سے ہم کو عطا ہوا۔ بے شک یہی ظاہر فضل ہے۔“

(ماخوذ از روح المعانی و مدارک)

تک نہیں پاسکے اور تخت کا یہ واقعہ صریح طور سے ثابت ہے۔ خارق عادات معجزات کا جب ثبوت موجود ہے تو انکار اور بے دلیل انکار سے کیا فائدہ۔ اس لیے کہ قوانین قدرت کا جو خالق ہے اس کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ قدرت کے کسی عمل کو توڑ پھوڑ دے۔ اس کے لیے یہ مشکل نہیں کہ وہ پلک جھپکنے میں ملک یمن سے تخت منگوا لے۔

مفسرین نے اس مسئلے پر بھی بحث کی ہے کہ یہ شخص انسانوں میں سے تھا یا قوم جن سے۔ اکثر کا یہ قول ہے کہ وہ انسانوں میں سے تھا۔

مفسرین کہتے ہیں کہ جس شخص کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ اس کے پاس کتاب علم تھا اس کا نام آصف بر خیا تھا اور وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا معتمد خاص اور کا تب (وزیر) تھا۔ مفسرین نے بغض اور نام بھی لیے ہیں لیکن آصف بر خیا پر ہی اتفاق ہے۔

قرآن میں ہے۔

”جس کے پاس کتابت کا علم تھا اس نے کہا میں تیری پلک جھپکتے اس کو حاضر کر سکتا ہوں۔“

یہ شخص آصف ہو یا کسی اور نام سے موسوم درحقیقت حضرت سلیمان علیہ السلام کا صحابی اور ان کا بہت مقرب تھا اور جس طرح حضور اکرم ﷺ کے صحابہ آپ کے تربیت یافتہ تھے اور ان میں سے بعض نمایاں تھے، آصف بر خیا بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کا تربیت یافتہ تھا۔ اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ اس کو تورات و زبور اور دوسرے اسرار حقائق کا زبردست علم حاصل تھا

چنانچہ جب جنوں میں سے ایک نے تخت سبا کو حاضر کرنے کا دعویٰ کیا اور یہ کہا کہ دربار کی برخاستگی سے قبل وہ تخت لے آئے گا۔ اگرچہ مقصد کے حاصل ہونے کے لیے یہ مدت کافی تھی لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام یہ چاہتے تھے کہ یہ عمل ”جن“ کے ذریعے نہیں بلکہ اللہ کے کسی خاص بندے کے ہاتھ سے ہونا چاہیے تاکہ ان کی پیغمبرانہ توجہ سے وہ عمل معجزہ بن کر ملکہ سبا کے سامنے پیش ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اسی نیت کو محسوس کرتے ہوئے آصف بر خیا نے فوراً خود کو پیش کیا کیونکہ اسے یقین

تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی مبارک توجہ اس اعجاز کو پورا کر دکھائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ اسی لیے آپ نے آصف کا نہیں اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ادا کیا۔

یہ سیرے پروردہ رہے۔ اور یہ بھی کہ اس تخت کے منگوانے اور اس کی ہیئت میں تبدیلی سے اپنی شان خود نمائی مقصود نہیں تھی بلکہ ملکہ سبا کو دین حق کی طرف راغب کرنا تھا۔ اسی لیے تبدیلی کے وقت آپؐ نے فرمایا تھا۔
”دیکھیں وہ اس واقعے سے متاثر ہو کر ہدایت قبول کرتی ہے یا گمراہ ہی رہتی ہے۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام سے متعلق نہایت دلچسپ اور عجیب و غریب واقعات مشہور ہیں جو سب کے سب اسرائیلی روایات (اسرائیلیات) سے ماخوذ ہیں۔ یہ قصے ان علمائے یہود کے ذریعے جو مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے، مسلمانوں میں بھی نقل ہو کر مشہور ہو گئے۔ مسلمان علمائے ان قصوں کو سچ سمجھ کر اپنی کتب میں داخل کر لیا۔ اسی لیے محققین کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ان قصوں میں سے صرف انہیں اہمیت دی جائے جو قرآن وحدیث کے مطابق ہوں۔

بنی اسرائیل کی روایات کا مدار بیشتر تورات پر ہے۔ تورات یا توریت کے علاوہ دوسرا سلسلہ نبیہم ہے۔ یہ عبرانی قاعدہ لغت کے اعتبار سے ”نبی“ کی جمع ہے۔ یہ بنی اسرائیل کے انبیاء کے مواظ، مراثی اور بنی اسرائیل کے کلام اور مختصر تاریخ کا ذخیرہ ہے۔ تیسرا حصہ ”ترکوم“ ہے۔ عربی زبان میں ترجمہ کو کہتے ہیں۔ یہودی علمائے توریت اور نبیہم کی آرامی زبان میں تفسیر کی ہے جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے یہ تفسیر انبیاء علیہم السلام سے سنی ہے۔ چوتھا حصہ مدارش ہے۔ اس کی حیثیت یہود کے یہاں وہ ہے جو اسلام میں حدیث کا درجہ ہے۔ پانچواں حصہ تالمود ہے۔ یہ بنی اسرائیل کا فقہ ہے اور ان سب کے علاوہ بعض وہ قصص وحکایات ہیں جن کو یہود سینہ بہ سینہ اپنی یادداشت سے مذہبی نقول کی طرح نقل اور بیان کرتے چلے آئے ہیں۔

ان سب کو اسرائیلیات کہا جاتا ہے۔

سورہ سبا میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے جنوں کی ایک بہت بڑی جماعت ایک عظیم الشان عمارت بنانے میں مصروف تھی کہ آپؐ کو پیغام اجل آپہنچا مگر جنوں کو ان کی موت کی خبر نہ ہوئی اور وہ اپنی خدمات میں مصروف رہے اور عرصے کے بعد جب دیمک نے ان کی لاشیں کو چاٹ کر اس توازن کو خراب کر دیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام جو لاشی سے ٹیک لگائے کھڑے نظر آتے تھے وہ گر گئے تب جنوں کو علم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔

”اور جب ہم نے اس (سلیمان) کی موت کا فیصلہ کر دیا تو ان (جنوں) کو اس موت کی کسی نے اطلاع نہیں دی مگر دیمک نے جو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی لاشی چاٹ رہی تھی اور جب حضرت سلیمان علیہ السلام گر پڑا تو جنوں پر یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ علم غیب رکھتے ہوئے تو اس سخت مصیبت میں مبتلا نہ ہوتے۔“ (سورہ سبا)

حضرت ابن عباسؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ سے مروی ہے آپؐ نے فرمایا جب اللہ کے نبی حضرت سلیمان علیہ السلام نماز ادا فرماتے تو سامنے ایک درخت لگا دیکھتے۔ آپؐ اس سے پوچھتے تیرا کیا نام ہے؟ وہ کہتا فلاں۔ آپؐ پوچھتے تو کس فائدے کے لیے ہے؟ نسل بڑھانے کے لیے یا کسی دوا کے لیے۔ تو ایک مرتبہ آپؐ نماز ادا فرما رہے تھے کہ آپؐ نے ایک درخت کو سامنے دیکھا تو اس سے پوچھا تیرا کیا نام ہے۔ عرض کیا خروبہ۔ آپؐ نے پوچھا کس چیز کے لیے ہے تو۔ عرض کیا اس گھر کی خرابی اور ویرانی کے لیے۔ آپؐ کو اشارہ مل گیا کہ آپؐ کی وفات قریب ہے۔ آپؐ نے دعا کی ”اے اللہ! سال بھر تک جنوں سے میری موت کو مخفی رکھنا تاکہ انسان جان لیں کہ جن غیب کا علم نہیں جانتے۔“

اسی سے ملتی جلتی ایک اور روایت بھی نقل کی گئی ہے۔

”حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس میں ایک ایک دو دو سال اور ایک ایک دو دو مہینے تنہائی میں بسر کرتے تھے اور کبھی اس سے کم و زیادہ مدت بھی رہتے تھے اور جس مرتبہ آپؐ نے وفات پائی آپؐ اس میں داخل ہوئے اور وفات کے آثار یوں شروع ہوئے کہ جب بھی آپؐ صبح کرتے تو بیت المقدس میں کوئی پودا اگا ہوتا۔ آپؐ اس سے پوچھتے تیرا کیا نام ہے۔ وہ نام بتا دیتا۔ ایک مرتبہ ایک نیا پودا اگا۔ اس سے پوچھا تیرا کیا نام ہے۔ اس نے بتایا۔ ”خروبہ“ یعنی خرابی پھر پوچھا کس کام کے لیے ہے۔ عرض کیا اس مسجد بیت المقدس کی ویرانی و خرابی کے لیے ہوں۔ حضرت سلیمانؑ نے فرمایا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں زندہ ہوں اور اللہ پاک اس بیت المقدس کو ویران فرما دیں لہذا اب میری وفات کا وقت قریب معلوم ہوتا ہے اور

تیرے چہرے پر میری ہلاکت اور مسجدی ویرانی لکھی ہوئی ہے۔ پھر آپؐ نے اس پودے کو اکھڑا اور اپنے ایک باغ میں لگا دیا۔ پھر آپؐ دوبارہ محراب میں داخل ہوئے اور اپنے عصائے مبارک کے ساتھ ٹیک لگا کر نماز میں مشغول ہو گئے اور اسی حالت میں کھڑے کھڑے وفات ہو گئی اور حالت ایسی رہی کہ شیاطین و جن کو آپؐ کی وفات کا قطعی علم نہ ہو سکا۔

شیطان تو شیطان ہوتے ہیں۔ یہ ایک جانب سے داخل ہوتے اور دوسری جانب سے نکل جاتے۔ اگر کسی کی نظر حضرت سلیمان علیہ السلام پر پڑ جاتی تو وہ جل کر راکھ بھی ہو جاتا مگر پھر بھی باز نہ آتے تھے۔ تو ایک شیطان اسی غرض سے داخل ہوا کہ دیکھوں آپؐ کیا کر رہے ہیں۔ یہ اندر گیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی کوئی آواز یا آہٹ سنائی نہ دی اور نہ ہی جلا تو ہمت کر کے اندرونی کمرے میں داخل ہو گیا دیکھا تو ان کا انتقال ہو گیا۔ شیطان فوراً نکلا اور سب کو خبر دی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو تو کب کی موت آچکی ہے لوگوں نے دروازہ کھول کر آپؐ کو نکالا اور دیکھا لاشی کو زینی کیڑا کھا گیا تھا۔ لہذا اس کیڑے کو ایک دوسری لاشی پر رکھا اور وہ کیڑا دن رات اس کو کھاتا رہا۔ پھر حساب سے پتا چلا کہ تقریباً ایک سال پہلے آپؐ وفات پا چکے تھے۔

عبدالرحمن بن زید سے مروی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملک الموت کو کہا جب تجھے میرے متعلق حکم ملے تو مجھے بتلا دینا تو ملک الموت ان کے پاس آیا اور کہا اے حضرت سلیمان علیہ السلام مجھے آپؐ کے متعلق حکم ملا ہے۔ اب آپؐ کی عمر سے تھوڑی سی گھڑی رہ گئی ہے تو آپؐ نے شیاطین کو بلایا اور اپنے گرد شیشے کی عمارت بنوائی جس کا دروازہ نہ تھا۔ پھر اس میں عصا پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے۔ پھر ملک الموت داخل ہوئے اور روح قبض کر لی۔ پھر اللہ نے کہن لگنے والے کیڑے (دیمک) کو بھیجا جو لاشی کو کھاتا رہا حتیٰ کہ اندر سے لاشی کھو کھلی ہو گئی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا بوجھ نہ سنبھال سکی اور آپؐ گر گئے۔ جب جنوں نے یہ صورت دیکھی تو فوراً بھاگ گئے اور کام کاج چھوڑ دیا۔

یہ اور اسی قسم کی روایات ہیں جو اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔ توریت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا واقعہ ایسی طرح ہے۔

”غرض ساری مدت کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یروشلم میں سارے اسرائیل پر سلطنت کی اور حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے باپ دادوں کے ساتھ سورہا اور اپنے باپ دادوں کے شہر صہون میں گاڑ دیا گیا اور اس کا بیٹا رجھام اس کی جگہ بادشاہ ہوا۔“

قرآن نے جس طرح اس واقعے کو بیان کیا ہے اس سے بنی اسرائیل کو ان کی حماقت پر متنبہ کرنا تھا کہ ان کے عقیدے کے مطابق اگر جن غیب داں ہوتے تو وہ عرصہ تک حضرت سلیمان علیہ السلام کے خوف سے تعمیر بیت المقدس یا کسی دوسرے شہر کی تعمیر کی صعوبتوں میں مبتلا نہ رہتے چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا جس صورت سے ان کو علم ہوا اس کے بعد خود شیاطین (جنوں) کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ہمارا دعویٰ غیب دانی قطعاً غلط ثابت ہوا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے توریت کے مطابق سات سو شادیاں کی تھیں اور تین سو حرمیں تھیں لیکن حضرت ابو ہریرہؓ کے مطابق رسول ﷺ نے فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی شہر بیویاں تھیں۔

انہوں نے چالیس سال حکومت کی۔ یہ تیرہ سال کی عمر میں بادشاہ بنائے گئے۔

ابن جریرؓ فرماتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی کل عمر پچاس سال سے چند سال اوپر تھی۔

اور آپؐ نے اپنی سلطنت کے چوتھے سال میں بیت المقدس کی بنیاد کی ابتدا کی۔

اور آپؐ کے بعد آپؐ کا فرزند رجھام سترہ سال بادشاہ رہا۔ ابن جریرؓ نے اس کو روایت کیا۔

اور فرمایا اس کے بعد بنی اسرائیل کی سلطنت پارہ پارہ ہو گئی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام شاعر بھی تھے۔ توریت کی 22 ویں کتاب کا نام ”غز الفزلات“ ہے اور اس میں اعلیٰ پائے کی تمثیلی شاعری موجود ہے۔ اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی چھ غزلیں ملتی ہیں۔

(عورت کا خطاب)

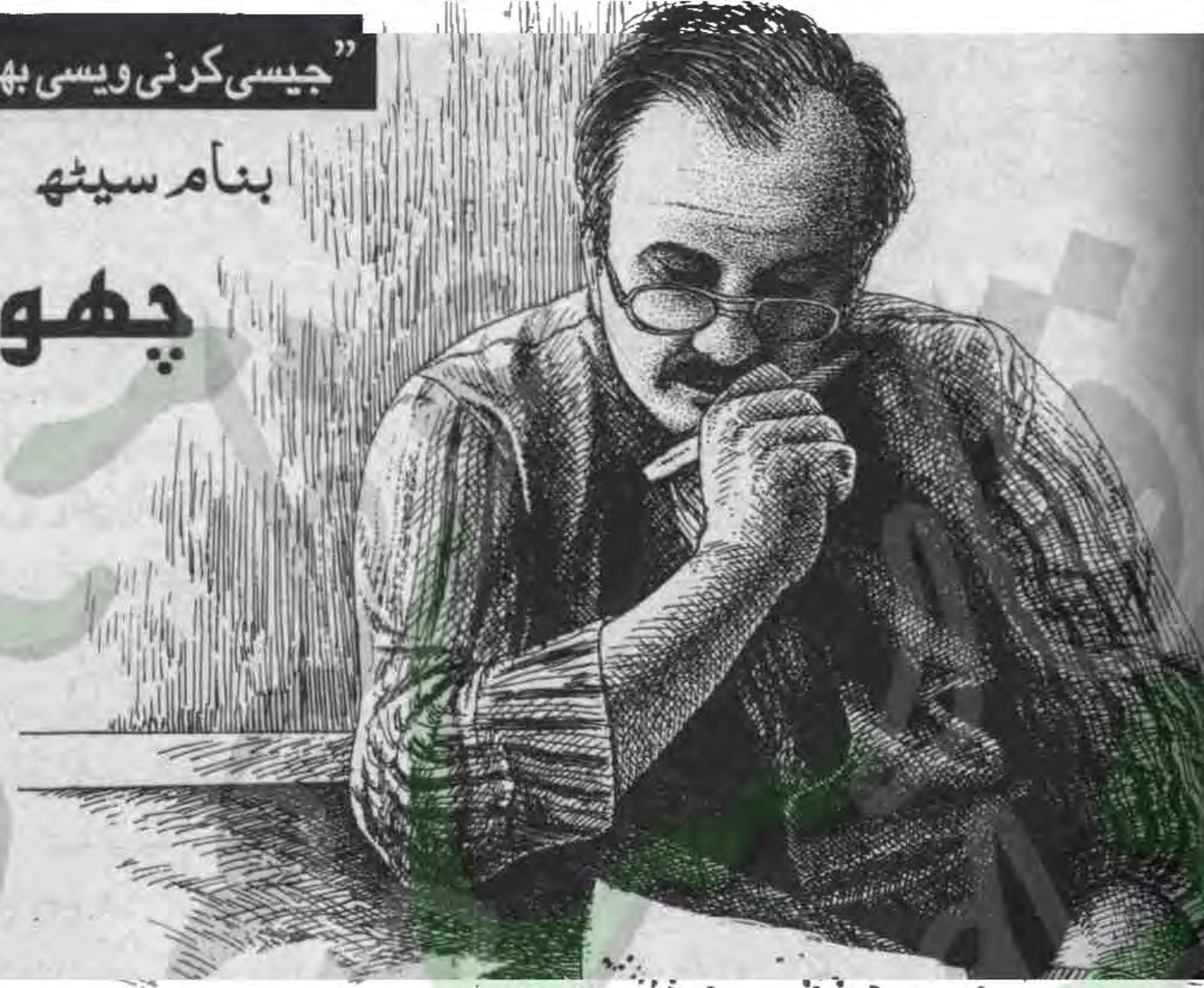
دیکھ تو ہی خوب صورت ہے اے میرے محبوب

بلکہ مرعوب خاطر ہے

بنام سیٹھ

چھوٹا بخش

نجمہ شکور



از دفتر فرشیہ مواصلات
شعبہ پراسرار۔ آسمان ۳
۱۰ جولائی

بنام سیٹھ موٹا بخش مولا

بخش

ایم اے جناح روڈ۔

کراچی

جناب من!

چوتھے آسمان سے موصول ہونے والی ہدایات کے مطابق آپ کو مطلع کیا جاتا ہے۔ آپ کی سخاوت، رحم دلی، کرم نوازی، ہمدردی، خلوص اور قربانی کو دیکھ کر آپ کا نام نامی یہاں کی اس کتاب میں جس کا عنوان ”انسانوں کے سنہرے کارنامے“ ہے، درج کر لیا گیا ہے۔ مجھے یہ کہنے کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ آپ کو جو اعزاز حاصل ہوا ہے وہ صدیوں اور قرونوں کے بعد اگلا انسان ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے قیام سے اب تک اس عظیم کتاب میں صرف پانچ نام درج کیے گئے ہیں اور پانچواں نام نامی آپ کا ہے۔

مجھ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ماہ جون میں آپ نے وقتاً فوقتاً جو دعائیں مانگی ہیں، ان کے بارے میں آپ کو مطلع کروں۔ چنانچہ حسب ہدایت عرض ہے کہ:

1- آپ کی وہ دعا جو آپ نے کاغذ کی قیمت میں پانچ

سو فی صد اضافہ کے لیے مانگی تھی قبول کر لی گئی ہے۔

2- آپ کی اس دعا کو بھی شرف قبولیت بخشا گیا جس میں آپ نے مزدوروں، قلیوں اور کلرکوں کی تنخواہ میں کاروبار مندا ہونے کے باعث کمی کی درخواست کی تھی۔

3- آپ کی وہ دعا زیر غور ہے جس میں آپ نے کہا ہے کہ کاغذ کی قیمت اور سونے کا بھاد ایک ہی ہونا چاہیے۔

4- آپ کی وہ دعا بھی زیر غور ہے جس میں آپ نے کہا ہے کہ آپ کے ملازمین تنخواہیں بڑھانے کے بارے میں کچھ نہ کہیں۔

5- آپ نے اپنے پڑوسی کے اس بچے کی موت کے بارے میں جس نے آپ کی بیٹی کی جانب پتھر پھینکا تھا جو بد دعا کی تھی، وہ منظور کی جاتی ہے کیونکہ آپ کے پڑوسی نے بھی آپ کی بیٹی سے تنگ آ کر اس کی موت کے لیے بد دعا کی ہے اور یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ آپ کی بد دعا تو قبول کی جائے اور آپ کے پڑوسی کی بد دعا کو شرف قبولیت نہ بخشا جائے۔

6- آپ کی یہ دعا کہ ماہ جون میں آپ کو صرف بائیس لاکھ کا منافع حاصل ہوا، اسے بڑھا کر جولائی کے لیے اسی لاکھ کر دیا جائے، بڑی حد تک قبول کر لی گئی ہے۔ ماہ جولائی میں آپ کو ستر لاکھ منافع ہوگا۔ تاہم اگر آپ اس منافع پر راضی نہ ہوئے اور گڑگڑا کر گڑا کر منافع بڑھانے کی دعائیں مانگتے رہے تو منافع میں بتدریج اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

7- آخرت کے بارے میں آپ نے جو رسمی دعا مانگی تھی

ہمارا پلنگ بھی سبز ہے
ہمارے گھر کے شہتیر و یودار کے ہیں
اور ہماری کڑیاں صنوبر کی ہیں
میں شادوں کی زرگس
اور وادیوں کی سوسن ہوں
(مرد کا خطاب)
جیسی سوش جھاڑیوں میں
وہی ہی میری محبوبہ کنوار یوں میں
(عورت کا خطاب)
جیسا سیب کا درخت بن کے درختوں میں
ویسا ہی میرا محبوب نوجوانوں میں
میں نہایت شادمانی سے اس کے سائے میں بیٹھی
اور اس کا پھل میرے منہ میں میٹھا لگا
وہ مجھے مے خانے کے اندر لایا
اور اس کی محبت کا جھنڈا میرے اوپر تھا
کنکاش سے مجھے قرار دو سیبوں سے مجھے
تازہ دم کرو
کیونکہ میں عشق کی بیمار ہوں۔

❖❖❖

توریت ہی میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے اقوال درج ہیں۔
خداوند کا خوف علم کا شروع ہے لیکن احمق حکمت اور تربیت کی حقارت کرتے ہیں۔
حکمت کو بچے میں زور سے پکارتی ہے
وہ راستوں میں اپنی آواز بلند کرتی ہے
وہ پھانکوں کے مدخل میں اور شہر میں یہ کہتی ہے
اے نادانو! تم کب تک نادانی کو دوست رکھو گے
احمق کب تک علم سے عداوت رکھیں گے
احقوں کی فارغ البالی ان کی ہلاکت کا باعث ہوگی
دغا کی روئی آدمی کو میٹھی لگتی ہے
لیکن آخر کو اس کا منہ کنکروں سے بھر جاتا ہے
آدمی کا ضمیر خداوند کا چراغ ہے
دولت بہت سے دوست پیدا کرتی ہے
پر مسکین اپنے ہی دوست سے بے گانہ ہے
کل کی بات پر گھمنڈ نہ کر
کیونکہ تو نہیں جانتا کہ ایک ہی دن میں کیا ہوگا۔

پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے ایک شاطر مجرم کی عیاری

وارث شرعی

وراثت ایک مثبت عمل سہی مگر طمع کے ہاتھوں مجبور... کتنے ہی لوگ موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے ہیں... وہ بھی ایسا ہی ایک وارث تھا جسے صرف اپنی وراثت سے غرض تھی یہ اور بات کہ ان دشوار گزار رستوں پر اسے کتنی آزمائشوں سے گزرنا پڑا... وہ جو چلتے چلتے تھک گیا تھا بالآخر ایک روز اسے وہ چال سوجھی جس کے سبب اس کے لڑکھڑاتے قدموں کی ساری تھکن دور ہو گئی...



سے گنجا ہور ہا تھا۔ اس کی بیوی جینی اس سے عمر میں کم از کم دس سال چھوٹی تھی لیکن اسے لباس اور میک اپ کی وجہ سے اور بھی چھوٹی لگتی تھی، اس کی آنکھیں بلی کی طرح سبز تھیں اور سنہرے ہنکریالے بالوں کی وجہ سے وہ اور بھی زیادہ حسین نظر آتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کیتھرین کا نو عمر لڑکا کھانے

اس روز بھی معمول کے مطابق اس کے گھر پر کاروباری ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ اپنے شوہر ہال کے بالقابل میز کے دوسرے سرے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دائیں جانب بل اور جینی بیٹھے ہوئے تھے۔ بل اس کے شوہر کا باس تھا اور تقریباً اس کا ہم عمر ہی تھا لیکن اس کا سر تیزی

کے انتقال پر بھی کچھ رقم بھیجی تو ساتوں آسمانوں کے گوشے گوشے میں آپ کی شہرت ہو گئی۔ ہر فرشتہ دوسرے فرشتے سے یہی کہتا نظر آتا تھا۔ ”تم نے سیٹھ چھوٹا بخش موٹا بخش مولانا بخش کی سخاوت کے بارے میں کچھ سنا؟“ آپ کی روز افزوں دریا دلی کے باعث ہر ہونٹ پر آپ ہی کا نام تھا۔ شاید آپ کو نہیں معلوم کہ سارے آسمانوں کے فرشتے خاص طور پر جمعہ کے دن اس وقت آپ کو جھانک جھانک کر دیکھتے ہیں جب آپ اپنی لمبی سی کار میں بیٹھ کر جامع مسجد میں فریضہ جمعہ ادا کرنے جاتے ہیں اور جب چندے والا اپنے ہاتھ میں گولک لیے ہوئے آپ کے پاس سے گزرتا ہے تو سب کے سب فرشتے چلا اٹھتے ہیں۔ ”دیکھو دیکھو کچھ سکے سیٹھ کی جیب سے نکل رہے ہیں۔“

آپ کی سخاوت اور دریا دلی اس وقت اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئی جب آپ کے چچا زاد بھائی کی نو جوان بیوہ نے آپ کو یہ تحریر کیا کہ اسے کچھ روپے مل جائیں تو وہ لاہور جا کر کسی پرائمری اسکول میں ملازم ہو جائے۔ جب آپ کو یہ خط موصول ہوا آپ اپنی ماہ جون کی بائیس لاکھ والی آمدنی کا حساب کر رہے تھے اور حیرت کر رہے تھے کہ کاغذ کی نایابی کے باوجود آپ کو اتنا کم نفع کیوں ہو رہا ہے اور سوچ رہے تھے کہ جولائی میں اتنی لاکھ کا منافع کیوں کر ہو سکتا ہے۔ مگر خط پڑھتے ہی آپ نے اپنی چیک بک اٹھائی اور چیک کاٹ کر اپنے منشی کو دیا کہ وہ فوراً حوالہ ڈاک کر دے۔ بس جناب، ہم آسمانوں والے آپ کے اس کارنامے پر جھوم اٹھے۔ ہم نے یہ بھی نظر انداز کر دیا کہ آپ نے آنکھ مار کر اپنی ٹائپسٹ کو اپنی گود میں بٹھالیا ہے۔ ایسا سچی دل، اتنا دریا دل اور اس قدر رحم دل شخص ہماری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خوشی کے باعث ہم سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہم نے ایک دوسرے کو گلے سے لگالیا اور ہم میں سے بہتوں نے کہا۔ ”اس کمینہ صفت بخیل انسان کی جیب سے چند روپے نکل جانا ایک ایسا عظیم الشان، رفیع الشان اور عالی شان کارنامہ ہے، جس کا آسمانوں اور زمینوں کی تواریخ میں کوئی ثانی نہیں ملتا۔“

اور تب ہم سب نے خلوص دل کے ساتھ طے کیا کہ جب آپ یہاں آئیں گے تو آپ کا بڑی شان سے استقبال کریں گے، آپ کے گلے میں ہار ڈالے جائیں گے۔ آپ کے اوپر پھولوں کی بارش کی جائے گی۔ پھر ہم سب مل جل کر آپ کو آپ کی منزل تک پہنچا دیں گے اور دوزخ منہ پھاڑ کر اپنے لال لال شعلوں والے سینے سے آپ کو چمٹالے گی۔

۵۵

دہ زیر غور ہے۔
8۔ حج کے بارے میں آپ کی مانگی ہوئی دعا کے متعلق یہ کہنا ہے کہ آپ نے ابھی نو سو چوبیس والی تعداد پوری نہیں کی۔

9۔ چوتھی شادی والی درخواست قبول کی گئی۔ اس سلسلہ میں آپ اپنی ٹائپسٹ کے باپ سے گفتگو کریں۔ لاپچی آدمی ہے چند ہزار لے کر اپنی لڑکی کی شادی آپ سے کر دے گا۔
10۔ ”اچھا زمانہ آجائے“ والی درخواست رد کی جاتی ہے۔ غالباً یہ دعا آپ نے انجانے طور پر مانگ لی تھی۔ آپ کے لیے تو ہر زمانہ اچھا زمانہ ہے۔

11۔ آپ کی یہ درخواست بھی رد کی گئی جس میں آپ نے اپنے حریف کے دیوالیا ہو جانے کا ذکر کیا ہے۔ اپنی اگلی دعا میں یہ ضرور بتائیں کہ آپ اپنی موٹاپی کیوں چاہتے ہیں۔ معقول وجہ معلوم ہونے پر ہو سکتا ہے آپ کی موٹاپی قائم کر دی جائے۔ اگرچہ مجھے یہ ہدایت نہیں کی گئی کہ میں آپ کو ذاتی طور پر کچھ لکھوں لیکن منع بھی نہیں کیا گیا اس لیے آپ کو آپ کی دعاؤں کی رپورٹ پیش کرنے کے بعد مناسب سمجھتا ہوں کہ کچھ راز کی بائیں آپ کو بتاؤں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ جیسا انتہا درجے کا کنجوس سخاوت کا کوئی کارنامہ انجام دیتا ہے تو اس کا بدلہ دس لاکھ گنا دیا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک عام آدمی اور خصوصاً نیک آدمی کو اس ذہنی کرب اور تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جس سے کنجوس لوگوں کو سابقہ پڑتا ہے۔ آسمانوں پر آپ جیسے لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کسی عورت کا بچہ جنما اور کسی کنجوس کا جیب سے ایک پیسا نکالنا برابر ہوتا ہے دونوں کو ایک ہی جیسی تکلیف ہوتی ہے۔

کئی سال قبل جب آپ صرف لکھ پتی تھے اور آپ نے اپنے چچا زاد بھائی کی بیوہ کی درخواست پر اسے چند ہزار دیے تھے، اُس وقت آسمانوں میں گئے چنے فرشتوں ہی کو آپ کی دریا دلی پر اعتبار آیا تھا۔ زیادہ تر ایسے فرشتے تھے جو اس خبر کو آپ کے حاشیہ برداروں کی اڑائی ہوئی بے پرکی سمجھتے تھے۔ کچھ فرشتے یہ بھی کہتے ہوئے پائے گئے کہ سیٹھ چھوٹا بخش موٹا بخش مولانا بخش نے جعلی رقم دی ہوگی لیکن آپ کا کردار روز بروز بلند ہوتا گیا۔ اس واقعہ کے ایک ہی سال بعد جب آپ نے اس بیوہ لڑکی کی اپیل پر مئی آرڈر فیس وضع کیے بغیر ایک معقول رقم ارسال کی تو چند احتیاط پسند فرشتوں کے علاوہ سبھی کو یقین آ گیا۔ کئی روز تک پہلے آسمان سے لے کر ساتوں آسمان تک آپ ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔

دو سال بعد آپ نے اس نو جوان بیوہ کے بڑے لڑکے

لے دوران اسے دیکھتے جا رہا تھا۔
 کیتھرین کو یاد آیا کہ کسی زمانہ میں اسے بھی لڑکے اسی طرح دیکھا کرتے تھے لیکن اس کے شوہر نے کبھی اسے وہ پیار اور توجہ نہیں دی جو بیوی ہونے کے ناتے اس کا حق تھا۔ شاید اسی لیے وہ اپنے شوہر سے نفرت کرتی تھی لیکن اس کی تمام بد اعمالیوں کے باوجود اسے برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ اس وقت بھی وہ کیتھرین کو نظر انداز کر کے جینی سے خوش گپیاں کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے آگے کی طرف جھک کر نہ جانے کیا کہا کہ جینی زوردار قہقہہ لگائے بغیر نہ سکی۔ اس کا شوہر ہل کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی طنزیہ انداز میں مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔

کیتھرین نے یوں دیکھا جیسے کوئی پرانی فلم دوبارہ دیکھ رہی ہو۔ وہ ہونٹوں کی جنبش سے اندازہ لگا سکتی تھی کہ ان کے درمیان کس قسم کی گفتگو ہو رہی ہوگی۔ کافی دیر بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ اس کے بارے میں ہی باتیں کر رہے تھے۔ ”یقیناً نہیں آتا کہ تمہاری شادی کو اتنا عرصہ گزر گیا۔“ اس کے کانوں میں جینی کی آواز آئی تو وہ چونک پڑی اور اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“
 ہال نے اس کے تیور بھانپ لیے اور آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”میں کہہ رہا تھا کہ اس سال جنوری میں ہم اپنی شادی کی بیسویں سالگرہ منا سکیں گے۔ مل اور میں سان مارکوس میں ایک ہوٹل کھولنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں مجھے اس سلسلے میں دو مہینے بعد وہاں جانا ہوگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ تمہاری سالگرہ کے لیے اس سے بہتر تحفہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ تم بھی ایک ہفتہ کے لیے میرے ساتھ چلو۔ بچوں کو میری بہن دیکھ لے گی، کیا خیال ہے؟“
 جینی سوچ رہی تھی کہ کیتھرین کتنی خوش قسمت ہے۔ کاش اس کی جگہ وہ وہاں جاسکتی۔ کیتھرین نے اس کے جذبات بھانپ لیے اور پلٹ کر اپنے شوہر کو حیرت سے دیکھنے لگی۔

ہال اپنی بات جاری رکھے ہوئے بولا۔ ”سان مارکوس بڑی خوب صورت جگہ ہے۔ وہاں کے ساحلوں کی سفید ریت آنکھوں کو بہت بھلی لگتی ہے اور وہاں ہر قسم کی مچھلیاں ملتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں سورج کی روشنی کتنی پسند ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ایک طرح سے یہ ہمارا ہی مون ہوگا۔“
 ”تم بہت خوش قسمت ہو۔“ وہ کیتھرین کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کاش میں بھی وہاں جاسکتی۔“

ہال نے اپنے سامنے رہے ہوئے سروپہ ایسا برا گھونٹ لیا اور بولا۔ ”سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہاں ایک چھوٹے سے ہوٹل کے ساتھ ایک عریاں ساحل بھی ہے۔ یاد ہے شادی سے پہلے تم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہمیں کسی دور دراز جزیرے پر جانا چاہیے جہاں اس طرح کا ساحل ہو۔“
 جینی منہ دبا کر ہنستے ہوئے بولی۔ ”میں بھی ایسا نہیں کر سکتی۔“

”کیا واقعی؟“ ہال نے اس کے جسم پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا تو وہ شرمائی اور سوچنے لگی کہ ان مردوں کی نظریں کتنی گندی ہوتی ہیں۔

کیتھرین کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ہال نے اپنی آواز نیچی کر دی جیسے وہ دونوں وہاں تنہا ہو اور اسے بتانے لگا کہ یہ سفر کتنا رو مینٹک ہوگا۔ کیتھرین کو اس کے لفظ کھوکھلے اور بے معنی لگ رہے تھے۔ وہ نیپکن منہ پر رکھ کر کھانسنے لگی۔ جینی سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ رشک آمیز لہجے میں بولی۔ ”شادی کو اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی تم دونوں اس قدر رومانٹک ہو۔“

کیتھرین سویٹ ڈش لانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھی اور کچن میں جا کر مین پر جھک گئی، اسے بڑے زور کی متلی ہو رہی تھی۔

رات کو اس کے پہلو میں لیٹا ہوا ہال کہہ رہا تھا۔ ”آج کا ڈنر بہت شاندار رہا۔ لگتا ہے کہ میں کچھ زیادہ ہی پی گیا۔ سب اور آلو ساتھ میں ہوں تو میرا ہاتھ نہیں رکتا۔“
 وہ ایک بے جان لاش کی طرح خاموش لیٹی اس کے سونے کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ ابھی سونے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”امید ہے کہ تمہیں جزیروں پر جانے کا آئیڈیا پسند آیا ہوگا؟“

جب اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ اسے اپنی جانب کھینچتے ہوئے بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ اس خوشی میں ان لمحات سے لطف اندوز ہوا جائے۔“

اب بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور یہ ظاہر کرنے لگی کہ وہ سو گئی ہے۔ اس نے کروٹ بدلی تو ہال کا ہاتھ کسی بے جان شے کی طرح بستر پر گر گیا۔ کیتھرین نے اپنا منہ نیچے میں چھپا لیا اور اس کے آنسو بہہ نکلے۔

دوسری صبح جب وہ بیدار ہوئی تو ہال کام پر اور لڑکے اسکول جا چکے تھے۔ اسے یہ تنہائی اچھی لگی۔ اس نے گرم پانی کا شاور لیا اور مارنگ واک پر جانے کے لیے لباس تبدیل کرنے لگی۔

دو مہینے بہت طویل عرصہ ہوتا ہے۔ اس دوران ہال کا ذہن تبدیل ہو سکتا تھا یا پھر وہ خود ہی اکیلے چلے جانے کا فیصلہ کر لیتا۔ وہ اسے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ اسے مارتا یا پینتا یا گھر سے نکال دیتا۔ یہ سوچ کر ہی اسے پسینا آنے لگا۔ اگر اس کی مرضی ہوئی تو اسے جانا ہی ہوگا۔ ان دونوں کے درمیان اسی طرح معاملات چل رہے تھے۔

اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولی۔ ”کم آن۔ ریڈ۔“

اس کا جرم نسل کتا چھلانگیں مارتا ہوا لینڈ کروزر کی طرف بڑھا جس کا دروازہ وہ پہلے ہی کھول چکی تھی، اس نے چند منٹ رک کر کافی شاپ سے کافی پی اور پھر کتوں کی ورزش والے علاقہ کی طرف بڑھ گئی جو جنگل کے ساتھ چالیس ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا، وہاں تقریباً ایک درجن لوگ گیٹ کے ساتھ کھڑے کافی پی رہے اور نہیں لگا رہے تھے۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر جوڑا اور بقیہ اس کی عمر کی عورتیں تھیں جبکہ ان کے کتے کھلی فضا میں دوڑتے پھرتے پھر رہے تھے۔

وہ ان سب عورتوں کو جانتی تھی۔ وہ کوئی کام نہیں کرتی تھیں اور نہ ہی ان کے چھوٹے بچے تھے۔ اس لیے صبح کے وقت وہ فارغ ہوتی تھیں۔ وہ زیادہ تر فلموں، گھر کی سجاوٹ اور خریداری سے متعلق باتیں کیا کرتی تھیں اور کیتھرین کو انہیں سننے میں مزہ آتا تھا۔

وہ ان کے درمیان کھڑی کافی کے ہلکے ہلکے گھونٹ لیتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اتنی دولت اور فراغت ہونے کے باوجود ان عورتوں کی زندگی بھی اس کی طرح بے معنی ہے لیکن کم از کم ان کی بے عزتی تو نہیں کی جاتی۔ اسے اپنے شوہر کی تازہ ترین فرمائش یاد آگئی اور وہ سوچنے لگی کہ کیا یہ عورتیں کسی پُرہجوم ساحل پر عریاں ہو کر چہل قدمی کرنا چاہیں گی۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنی قمیص کا کالر بند کر لیا۔

”آجاؤ۔ ریڈ!“ اس نے آواز لگائی۔
 وہ غالباً اسی آواز کا منتظر تھا۔ لپکتا ہوا آیا اور اس چھوٹی پہاڑی کی طرف بڑھنے لگا جو میدان کے بقیہ حصے کی طرف جاتی تھی۔

کیتھرین کے علاوہ اس راستے پر ایک عورت اور تھی جو اس سے کافی فاصلے پر اپنے سیاہ رنگ کے کتے کے ساتھ جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کا کتا ریڈ بھی اسے تنہا چھوڑ کر سیاہ رنگ کے کتے کا تعاقب کرتے ہوئے میدان میں دوڑنے لگا۔ ... دو روز پہلے کافی تیز بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے راستے میں کئی جگہ پانی جمع ہو گیا تھا۔ وہ باڑھ کے ساتھ ساتھ

گیلی گھاس اور بکھرے ہوئے پتوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔

وہاں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آ جاتی۔ اسے سخت زمین پر چلنے میں مزہ آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی گردن سے پسینا بہنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے فرحت کا احساس دلارہے تھے۔ اسی لمحے اس نے محسوس کیا کہ اس سے تقریباً بیس گز پیچھے ایک شخص اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس کی تصدیق کرنے کے لیے وہ چلتے چلتے اچانک رک گئی اور یوں ظاہر کیا کہ اس کی کوئی چیز گر گئی ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، وہ شخص بھی رک گیا تھا۔ اس نے سیاہ کوٹ اور سرمئی چٹون پہن رکھی تھی۔ اس کا رنگ گہرا اور جسامت کے لحاظ سے فربہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے بال کانوں تک لٹک رہے تھے اور ناک یوں چمکی ہوئی تھی جیسے ٹوٹ گئی ہو۔ اس عجیب و غریب حلیہ میں دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

اس نے کیتھرین کو نہیں دیکھا بلکہ اس کی نظریں میدان پر جمی ہوئی تھیں جیسے اپنے کتے کو تلاش کر رہا ہو۔ ریڈ چھلانگیں مارتا ہوا واپس آیا پھر اس نے آگے کی جانب دوڑنا شروع کر دیا۔ کیتھرین بھی اس کے پیچھے چل دی۔ ٹھنڈی ہوا سانس سائیں کرتی اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی جیسے کسی خطرے کا احساس دلارہی ہو۔ اس نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا اور جب تک وہ یارنگ لائٹ کے قریب نہ پہنچ گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ممکن ہے کہ درختوں کی آڑ میں گھات لگائے بیٹھا ہو یا پارکنگ لائٹ میں اس کا انتظار کر رہا ہوتا کہ گھرتی اس کا تعاقب کر سکے۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اپنی گاڑی تک پہنچی اور گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔ ”تو تم نے دوبارہ مصوری شروع کر دی؟“ ہال نے رات کو کھانا کھاتے ہوئے پوچھا۔

اس واقعے کو دو دن گزر چکے تھے اور کیتھرین نے اس کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا کیونکہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ شخص اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ بہت سے لوگ اس پارک میں آتے ہیں اور ان میں سے کئی ایک کے پاس تو کتے بھی نہیں ہوتے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہاں آنے والا ہر شخص اسی کا پیچھا کر رہا ہو۔ وہ ہال کو یہ قصہ سنا کر اپنے آپ کو کمزور ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”میں نے دیکھا ہے کہ تم نے پرانے کینوس اور رنگ کے ڈبے اسٹور سے نکال کر پورچ میں رکھ دیے ہیں۔“

”پرانے رنگ خراب ہوتے تھے۔ اس لیے مجھے نئے لانے پڑے۔“

”تمہیں دوبارہ مصوری کرنے کا خیال کیوں آیا؟“

”یہ تو نہیں معلوم۔ بس میں کچھ کرنا چاہ رہی تھی۔“ کیتھرین نے اسے ٹالنا چاہا۔

”کیا تم پورچ میں کام کر سکو گی۔ وہاں بہت سردی ہوتی ہے۔ کھڑکیاں پوری طرح بند نہیں ہوتیں۔ خزاں کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن سردیوں میں وہاں کام نہیں ہو سکے گا۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اتنی سردی برداشت کر سکتی ہوں۔“

”لو کے وہاں کھیلتے ہیں۔ اس طرح تمہاری چیزوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

”کچھ نہیں ہوگا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔“

وہ جانتی تھی کہ یہ بھی اسے بے عزت کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ اسے اعتراض تھا کہ پورچ میں سردی ہوتی ہے اگر وہ اس کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے اپنا سامان اندر لے آتی تو کہتا کہ رنگوں کی بو سے اس کا داغ پھٹا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک بار پھر اسے مصوری کا سامان اسٹور میں بند کرنا پڑتا۔ دراصل ہال نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوئی کام کرے۔

”تم کیا پینٹ کر رہی ہو؟“ اس نے آلو کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

کیتھرین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ وہ اس موضوع کو بھول کر کوئی دوسری بات کرے لیکن جب اس نے دوبارہ یہی سوال کیا تو وہ جواب دینے پر مجبور ہو گئی۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔ بس یونہی کچھ مشتق کر رہی ہوں۔“

ہال کو اس کے لہجے میں چھپی ہوئی تلخی کو محسوس کر لینا چاہیے تھا لیکن وہ محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔

دوسری صبح اس نے اپنے کتے کے ساتھ پارک کے دو چکر لگائے۔ جب اس کا سانس پھولنے لگا تو وہ گھر واپس چلی آئی اور پورچ میں بیٹھ کر تصویریں بنانے لگی۔ سارا دن یونہی گزر گیا۔ وہ اپنے کام میں اس قدر محو تھی کہ رات کا کھانا بنانا بھی یاد نہ رہا۔ مجبوراً ہال کو باہر سے فرائیڈ چکن لانا پڑا۔ اس کے چہرے سے گھبراہٹ اور پریشانی عیاں تھی جسے اس کے دونوں لڑکے بھی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ کھانے کے دوران اسے حیرت سے دیکھتے رہے لیکن زبان سے کچھ نہیں بولے۔

کھانا ختم کرنے کے بعد وہ دوبارہ پورچ میں چلی آئی اور دوبارہ تصویریں بنانے میں مصروف ہو گئی۔ خزاں کا موسم

ختم ہوا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی لیکن کیتھرین نے کھر کے اندر بیٹھ کر تصویریں بنانے سے انکار کر دیا تو ہال نے اصرار کیا کہ وہ پورچ میں بیٹھ لگوالے۔ اس کے باوجود سردی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

کیتھرین رات گئے تک اپنے کام میں مصروف رہتی اور صبح دیر تک سوتی رہتی۔ بعض اوقات تو وہ پورچ کے کونے میں رکھے ہوئے کاؤچ پر ہی سو جاتی۔ اس کا کتا بھی وہیں فرش پر لیٹا رہتا، گھر میں جو کچھ ہوتا وہی ناشتے میں کھا لیتی پھر وہ کتے کو لے کر پارک چلی جاتی۔ ٹھنڈی ہوا اس کے کان میں سرگوشیاں کرتی تو اس کے خون کی حدت تیز ہو جاتی اور یوں لگتا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔

اس کا وزن کم ہو رہا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ پرکشش نظر آ رہی تھی۔ ہال نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ وہ ہر شام پورچ میں آتا، اس کی بنائی ہوئی تصویروں کی تعریف کرتا اور اسے یہ یاد دلانا نہ بھولتا کہ اگلے مہینے وہ اس کے ساتھ سان مارکوس کے جزیرے جا رہی ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ کیتھرین اپنے جسم کو متناسب اور پرکشش بنانے کے لیے جو کوشش کر رہی ہے، یہ وہاں جانے کی تیاری کا حصہ ہے کیونکہ اس ساحل پر عورتیں آزادانہ عریاں ہو کر گھومتی ہیں اور اسی لیے وہ چاہتی ہے کہ دیکھنے میں وہ بھدی نہ لگے۔

اس سفر پر جانے سے کچھ دن پہلے ایک جمعہ کی شام وہ گھر پر اکیلی تھی۔ ہال کسی ڈز میننگ میں گیا ہوا تھا جبکہ دونوں لڑکوں کا بھی اپنے دوستوں کے ساتھ رات باہر گزارنے کا پروگرام تھا۔ یہاں تک کہ اس کا کتا بھی کچھ ست نظر آ رہا تھا اس لیے جلد ہی سو گیا۔ باہر برف گر رہی تھی جس نے پتوں اور درخت کی شاخوں کو پوری طرح ڈھانپ لیا تھا۔ وہ کام شروع کرنے کے ارادے سے ایزل کی طرف بڑھی اور اس نے اسی شخص کی تصویر بنانا شروع کر دی جسے اس نے جنگل میں دیکھا تھا اور وہ اس کی یادداشت میں محفوظ ہو گیا تھا۔ اب وہ اس سے پہلے کی طرح نہیں ڈرتی تھی بلکہ اس کے بارے میں جاننے کی خواہش مند تھی۔ چاہے اسے کوئی خطرہ ہی کیوں نہ مول لینا پڑے۔ خطرہ تو اس کی شیر جیسی آنکھوں اور مضبوط ہاتھوں کی تصویر کشی میں بھی تھا لیکن اب وہ اس ڈر سے باہر نکل آئی تھی۔

وہ شیر جیسی آزیں ہی تھی۔ رات کے سناٹے میں اس نے پتوں کے چرچرانے اور ایک ٹہنی کے ٹوٹنے کی آواز سنی۔ اس نے کھڑکی میں سے ایک سائے کو گزرتے دیکھا۔ جب

چاند کی روشنی اس پر پڑی تو وہ جان گئی کہ یہ وہی شخص تھا جسے اس نے پارک میں دیکھا اور وہ جس کی تصویر بنا رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ مکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ جم کر رہ گئی اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے اپنی جانب بڑھتا ہوا دیکھتی رہی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے ہاتھ میں کوئی لمبی اور نوکیلی چیز ہے۔ وہ خوف سے کانپنے لگی۔ اس نے کرسی کو پیچھے دھکیلا اور لڑکھڑاتے قدموں سے گھر میں چلی گئی۔ اسٹڈی میں پہنچ کر اس نے لائٹ آن کی اور مدد کے لیے پولیس کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس نے گھبراہٹ میں ہال کی میز کی دراز کھولی تو وہ نیچے فرش پر گر گئی۔ اس میں رکھی ہوئی چیزیں قالین پر بکھر گئیں۔ اسے ایک چھوٹی سی چھری نظر آئی جو خط کھولنے کے کام آتی تھی۔ اس نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور میز کے پیچھے چھپ گئی۔

وہ اس کی آمد سے خوفزدہ تھی اور یہ بھی چاہتی تھی کہ اسے قریب سے دیکھ سکے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے تصور میں اسے اندھیرے سے نکل کر اپنی طرف آتے دیکھا تو اس کے سامنے ساحل کا منظر آ گیا۔ وہ پانی سے نکل رہا تھا۔ دروازے پر دستک کی آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسٹڈی کی کھڑکی کے باہر کوئی ٹارچ کی روشنی ڈال رہا تھا پھر کسی نے زور سے چلاتے ہوئے کہا۔ ”پولیس!“

وہ اسے تلاش کرتے ہوئے اسٹڈی میں آ گئی۔ کیتھرین ابھی تک میز کے پیچھے چھپی خوف سے کانپ رہی تھی۔ وہ دیکھنے میں مہربان اور خوش اخلاق لگ رہے تھے لیکن نہ جانے کیوں کیتھرین کو ان کا آنا اچھا نہ لگا۔ اس کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ وہاں سے چلے جائیں۔ کاش اس نے انہیں فون نہ کیا ہوتا۔

”ہم نے یہاں کسی کو نہیں دیکھا۔“ ان میں سے ایک پولیس والا بولا۔ ”ایک پیٹرول کار علاقے میں گشت کر رہی ہے۔ تمہارا کہنا ہے کہ تم نے کسی شخص کو عبثی محن میں دیکھا تھا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میں نے اس جگہ کو اچھی طرح دیکھا ہے۔ وہاں کی لائٹس روشن ہیں۔ کیا اس وقت بھی وہاں روشنی تھی جب تم نے اس شخص کو دیکھا؟“

کیتھرین کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ خوفزدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”نہیں..... میں نہیں جانتی۔“

”اگر تم چاہو تو ہم تمہاری حفاظت کے لیے یہاں کسی کی ڈیوٹی لگا سکتے ہیں۔ تمہارا شو ہر کہاں ہے؟“

”تمہارا اتہار ہٹا ٹھیک نہیں۔“

”نہیں۔ میں نے کہا نا کہ اس کی ضرورت نہیں۔“

پولیس والے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے وہاں سے چل دیے۔ ان میں سے ایک آفیسر نے جاتے ہوئے کہا کہ وہ ایک پیٹرول کار کا بندوبست کر دے گا جو علاقے میں رات بھر گشت کرتی رہے۔

ان کے جانے کے بعد کیتھرین کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے دراز کو اپنی جگہ پر لگایا اور قالین پر بکھرے ہوئے کاغذات سمیٹنے لگی۔ ان میں ان دونوں کا پاسپورٹ، ٹکٹ اور ٹورسٹ گائیڈ بھی موجود تھی۔ اس کی نظر ایک کاغذ پر پڑی جس پر ہال نے کچھ لکھ رکھا تھا۔ اس میں کئی کالم بنے ہوئے تھے جن میں اس کے کاروباری منصوبوں کی تفصیل درج تھی اور دوسرے کالم میں ہر ایک کے سامنے نمبرز دیے گئے تھے جن میں زیادہ تر منفی تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے بیشتر کاروباری منصوبوں میں نقصان ہو رہا تھا۔

انہی کاغذات میں اس کی بیمہ پالیسی بھی تھی جو لفافے سے باہر گر گئی تھی۔ اسے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ پالیسی کتنی مالیت کی تھی۔ اس نے پہلی بار اسے تفصیل سے پڑھا پھر اس نے تمام چیزیں ترتیب سے دراز میں رکھیں اور پورچ میں آ کر دوبارہ مصوزی میں مشغول ہو گئی۔ جب ہال چند گھنٹوں بعد گھر واپس آیا تو اس نے کچھ دیر قبل پیش آنے والے واقعے اور پولیس کی آمد کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا۔ وہ جانتی تھی کہ ہال ہمدردی کرنے کے بجائے اس کا مضحکہ اڑائے گا اور ایسے ریمارکس دے گا جن میں اس کی توہین کا پہلو نکلتا ہو۔

ایک ہفتے بعد وہ چھٹیاں گزارنے کے لیے سان مارکوس روانہ ہو گئے، جہاز سے نیچے کا منظر بڑا خوب صورت تھا اور سان مارکوس کا ساحل ویسا ہی نظر آ رہا تھا جیسا وہ اپنے خواب میں دیکھا کرتی تھی۔ جیسے ہی وہ جہاز سے باہر آئے، گرم ہوا کے جھونکے نے ان کا استقبال کیا۔ نیلے سوٹ میں ملبوس ایک نوجوان شخص ان کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ وہ خوش شکل اور خوش گفتار ہونے کے ساتھ خوب صورت لہجے کا بھی مالک تھا۔ جب گاڑی منزل کی جانب روانہ ہوئی تو وہ پچھلی سیٹ کی طرف گردن موڑ کر بتانے لگا کہ اس وقت یہاں کے منصوبوں میں سرمایہ کاری کتنا مفید ثابت ہوگا۔ ہال نے کسی ناراضی شخص کی طرح اپنے ہونٹ بھیجنے لیے لیکن زبان

ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں سفر کرنے کے باوجود اس کا خلق خشک ہو رہا تھا۔ جب اس سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ بول پڑی۔ ”مجھے پیاس لگ رہی ہے، کہیں گاڑی روکنا کہ مجھے پینے کے لیے کچھ مل سکے۔“

وہ گئے کے کھیتوں کے پاس سے گزر رہے تھے اور سڑک کے کونے پر انہیں پھلوں کا کین نظر آیا۔ وہاں میز پر آم، امرود، سنگترے اور ناریل رکھے ہوئے تھے، ایک بوڑھے شخص نے ہسپانوی زبان میں ان کا استقبال کیا اور کیتھرین میز پر ہاتھ جما کر کین کا جائزہ لینے لگی۔

”میں اسے بتا چکا ہوں کہ تم پیاسی ہو۔“ ڈرائیور نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

اس بوڑھے شخص نے میز کی دراز سے ایک بڑا سا چاقو نکالا اور ناریل کے اوپری حصے میں سوراخ کر کے اس کا پانی بڑے سے کاغذ کے گلاس میں انڈیل دیا۔ کیتھرین نے گھونٹ لے کر اسے چکھا۔ وہ مشروب اسے خوش ذائقہ لگا اور وہ مزے لے کر اسے پینے لگی۔ تھوڑا سا پانی اس کی تھوڑی سی بہتا ہوا گردن تک چلا گیا۔ اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور بلی کی طرح اپنا چہرہ چائے لگی۔ ڈرائیور بھی ہنس دیا لیکن ہال کچھ نہیں بولا اور کار کی جانب بڑھ گیا۔

بوڑھے دکان دار نے ناریل کو میز پر رکھا اور چاقو سے اس کی بالائی سطح کو چھیلنے لگا پھر اس نے اسے قاشوں میں تقسیم کر کے کاغذ کی پلیٹ میں انہیں پیش کیا۔ کیتھرین اور ڈرائیور دونوں ہی اس کے ذائقہ سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ باقی کا سفر خاموشی سے گزرا، سارے راستے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ ان کا کرا ہوٹل کی اٹھارویں منزل پر تھا جہاں سے سمندر بالکل صاف اور واضح دکھائی دیتا تھا۔ ہال نے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور اسے بتانے لگا کہ وہ دوپہر کا کھانا اپنے پارٹنرز کے ساتھ کھائے گا۔

”تم گراؤنڈ فلور پر واقع ریسٹوران میں لچ کر سکتی ہو۔ چاہو تو تھوڑی دیر آرام کرلو۔ شام کو ہم کسی ایسے ریسٹوران میں جائیں گے جہاں عمدہ قسم کی مچھلی اور جھینگے ملتے ہوں۔“

اس کے جانے کے بعد کیتھرین نے لباس تبدیل کیا۔ بغیر آستین کے سرخ بلاؤز اور اس سے میچ کرتی ہاف پیٹ میں وہ اپنی عمر سے کہیں کم اور خاصی پرکشش لگ رہی تھی۔ اس کے بعد وہ ہلکا سا میک اپ کر کے ہوٹل سے باہر آگئی۔ وہاں تقریباً سارے ہی ہوٹل ایک جیسے کثیر المنزلہ تھے جن کے سامنے پام کے درختوں کی قطار اور دروازے پر مسکراتے

ہوئے دربان کھڑے ہوتے تھے۔ دو بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک نسبتاً چھوٹے ہوٹل کے سامنے کھڑی ہوئی تھی، اس کی سیڑھیوں اور سائبان پر رنگین ٹائل لگے ہوئے تھے جبکہ بیرونی دیواریں گہرے اور سبز رنگ کی تھیں، صدر دروازے پر ہوٹل کا نیون سائن جگمگا رہا تھا۔ ہوٹل بلیوس ڈیل سول اور اس کے نیچے ایک سختی لنگ رہی تھی جس پر لکھا ہوا تھا ”صرف مہمانوں کے لیے“ یہ وہی ہوٹل تھا جس کے بارے میں ہال نے اسے پہلی بار اس وقت بتایا تھا جب وہ یہاں آنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ یہ ان ہوٹلوں میں سے ایک تھا جن کے ساتھ عریاں ساحل تھے۔

وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ استقبال پر ایک لڑکی نیلا لباس پہنے ہوئے بیٹھی تھی۔ عین اسی وقت ایک جوڑا اس کے پاس سے گزرا، مرد کی توند لگی ہوئی تھی۔ وہ چپک کی قمیص اور سلیٹی رنگ کی پتلون پہنے ہوئے تھا جبکہ عورت بہت زیادہ دہلی تھی۔ اس گرم موسم میں اس نے گرم سوٹ اور تنکوں کا بنا ہوا ہیٹ پہن رکھا تھا اور دونوں کسی کارٹون فلم کا کردار لگ رہے تھے۔ شاید وہ دونوں صبح سویرے ساحل پر عریاں حالت میں سن باتھ لیتے رہے ہوں گے اور سورج کی کرنیں کسی محبوب کی طرح ان کے جسم کا نظارہ کر رہی ہوں گی۔ اس سے زیادہ بے شرمی اور کیا ہو سکتی تھی۔

کیتھرین نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ کچھ سوچ کر رک گئی۔ وہ اس ہوٹل کی مہمان نہیں تھی اگر کسی نے اس سے یہاں آنے کا مقصد پوچھ لیا تو وہ کیا جواب دے گی، لہذا اس نے اندر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور شہر کے پرانے حصے کی طرف چل دی۔ چند بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سڑکیں تنگ ہونے لگیں اور اسے تلی ہوئی مچھلی، بھنے ہوئے گوشت اور مختلف پھلوں کی خوشبو آنے لگی۔ ریڈیو پر تیز آواز میں مختلف دھنیں بج رہی تھیں اور چوڑے شانوں والے مرد، مختصر اسکرٹ میں ملبوس عورتوں کے ساتھ ان دھنوں پر رقص کر رہے تھے۔

وہ مختلف دکانوں کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھتی گئی۔ ان دکانوں میں انواع و اقسام کا سامان بھرا ہوا تھا۔ ان میں چاندی کے زیورات، ملبوسات اور شالیں وغیرہ بھی ہوئی تھیں۔ دروازوں پر کھڑے سیلز مین آوازیں دے کر اسے اپنی جانب متوجہ کرنے لگے۔ وہ ایک بیکری میں چلی گئی جہاں پھلوں، چینی اور دودھ سے بنی ہوئی رنگ برنگی پیسٹریاں سجی ہوئی تھیں، اس نے ایک پیسٹری لی اور وہیں کھڑے ہو کر کھانے لگی لیکن اس طرح اس کی بھوک ختم نہیں ہوئی لہذا وہ کسی ایسے ہوٹل کی تلاش میں چل دی جہاں کچھ کروہ لچ کر سکے۔

ایک موڑ سے گزرتے ہوئے اس نے پیچھے دیکھا۔ آدھے بلاک کے فاصلے پر ایک آدمی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اسے رکتے دیکھ کر وہ بھی رک گیا اور فوراً ہی ایک اسٹور میں چلا گیا۔ وہ طویل قامت اور گہرے سانولے رنگ کا تھا اور سڑک پر جو لوگ چل رہے تھے۔ ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں لگ رہا تھا۔ کیتھرین کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور وہ جلدی سے ایک ریسٹوران میں گھس گئی۔

وہاں ایک بار بھی تھا اور لکڑی کے فرش پر کچھ جوڑے رقص کر رہے تھے۔ کھڑکیوں کے ساتھ ساتھ لکڑی کی گول میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور چھت پر دو چمکے لنگ رہے تھے۔ کیتھرین ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور اس نے ٹوٹی پھوٹی ہسپانوی زبان میں چکن اسٹو اور بیئر کا آرڈر دیا۔ ویٹریس نے آرڈر کی تعمیل میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ کھانا لذیذ تھا، اس نے مزے لے لے کر کھایا اور ساتھ ساتھ بیئر کے گھونٹ بھی لیتی رہی۔ کھانا ختم کر کے اس نے منہ صاف کیا اور کرسی کی پشت سے لگ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

سڑک کے دوسری جانب ایک دکان کے باہر چاول اور دالوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جبکہ ایک موٹی عورت دروازے میں کھڑی کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ کیتھرین نے اپنے پرس سے پائل نکالی اور نیپکین پر اس عورت کا اسٹیج بنانے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ایک اور بیئر کا آرڈر دیا اور بار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگی، اسی دوران ایک جوڑا اندر داخل ہوا تھا۔ ان دونوں کی پشت اس کی جانب تھی۔ عورت نے سبز رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے لمبے سیاہ بال شانوں سے نیچے لنگ رہے تھے۔ وہ اپنے ساتھی سے زور زور سے باتیں کر رہی تھی۔ کیتھرین نے ایک اور نیپکین اٹھایا اور اس جوڑے کا اسٹیج بنانا شروع کر دیا پھر اچانک ہی اس عورت نے زوردار قہقہہ لگایا اور پیچھے کی جانب ہٹی تو اس کے ساتھی کا چہرہ بھی نظروں کے سامنے آگیا۔

یہ وہی شخص تھا جسے کیتھرین نے چند منٹ پہلے سڑک پر دیکھا تھا۔ وہ اس کو کیسے بھول سکتی تھی جس نے ڈاک پارک میں اس کا تعاقب کیا تھا اور اس کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ وہی کانوں پر لٹکتے ہوئے ٹنگریا لے بال، چھٹی ناک اور غار کی طرح کھلا ہوا منہ۔ اس شخص نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے کیتھرین کو نہ دیکھا ہو لیکن اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بل ادا کیا اور ریسٹورانٹ سے باہر چلی آئی۔ وہ تیز قدم بڑھاتی اپنے ہوٹل کی جانب چلی جا رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت اور تیز چلنے سے اس کا بلاؤز پسینے میں

بھیک گیا تھا۔ اسے یوں لگا کہ وہ راستہ بھول گئی ہے تاہم اسے ہوٹل کا نام یاد تھا۔ اس نے سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ایک خواجہ فروش سے وہاں کا پتا پوچھا تو اس نے بائیں جانب اشارہ کر دیا۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے اس طرف چل پڑی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اسے سمندر نظر آگیا۔ اس نے اپنی رفتار ہلکی کی اور ہوٹل کو جانے والے راستے پر قدم بڑھا دیے۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا لیکن کوئی شخص اس کا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔

کیتھرائن نے کمرے میں پہنچ کر دروازہ اندر سے لاک کیا اور نہانے کے لیے چلی گئی۔ اس نے اس شخص کے خیال کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ بند دروازے سے بھی اندر داخل ہو سکتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ جلدی میں تالا ٹھیک سے نہ لگا سکی ہو۔ اس خیال کے آتے ہی وہ وحشت زدہ ہوگئی اور گیلے بدن پر تولیا لپیٹ کر دروازے کی جانب بھاگی لیکن وہ پوری طرح مقفل تھا۔

باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر کیلری میں لگے ہوئے قد آدم آئینے پر پڑی۔ اس نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تصور میں اپنے آپ کو ریسٹوران میں بیٹھے ہوئے مردوں کے ساتھ رقص کرتے دیکھا۔ کیا وہ ان کے لیے پارٹنرز کی طرح قابل قبول ہوگی جو بیکلی کی طرح تھرکتی ہیں۔

اسے لگا کہ کوئی شخص دروازے کے تالے میں چابی گھما رہا ہے جبکہ اس نے اندر سے چٹنی چڑھا رکھی تھی۔ پھر اس کے کانوں میں ہال کی آواز آئی۔ ”دروازہ کھولو، یہ میں ہوں۔“

اس نے تولیا کو اپنے جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹا اور دروازہ کھولنے کے لیے چل دی۔ اس نے ہال کے اندر آنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور بستر پر چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ کیتھرین نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس وقت ہال کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ جب اس نے چند لمحوں بعد آنکھیں کھولیں تو وہ اس پر جھکا حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں غصے سے لال ہو رہی تھیں۔ ایسا اس وقت ہوتا جب اسے کاروبار میں نقصان ہو رہا ہو یا کسی سودے میں ناکامی ہوتی ہو۔

”تمہیں میری ذرا بھی پروا نہیں۔“ وہ غرایا۔ جب اس نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی تو وہ گھٹنوں کے بل جھکا اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔ ”تم نہیں جانتیں کہ ہم کتنی مشکل میں ہیں۔ اس سودے کو ہر حال میں کامیاب ہونا چاہیے ورنہ میں دیوالیا ہو جاؤں گا۔“

وہ بولتا رہا اور اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ وہ اس کی بات نہ سمجھ سکی اور اس کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس نے سختی سے اسے جکڑ لیا اور بولا۔

”جسمیں اس بات کی بالکل بھی پروا نہیں کہ میں کتنی محنت کرتا ہوں۔ تم میرا ذرہ برابر خیال نہیں رکھتیں۔“

یوں لگا جیسے وہ اسے مار ڈالے گا۔ کیا اسے اس جزیرے پر لانے کی یہی وجہ تھی۔ اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا جس پر وہ مزید بھڑک گیا جیسے ہی ہال کے ہاتھ اس کے گلے کی طرف بڑھے اس نے اسے زور سے دھکا دیا اور اپنے گھٹنے سے اس کی ٹانگوں کے درمیان ضرب لگائی۔ اس نے زوردار چنچ ماری اور وہ اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بستر کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اس کی نگاہ ہال کے چہرے پر گئی جس پر تکلیف کے آثار تھے اور آنکھوں میں غصہ جھلک رہا تھا۔ دونوں ہی زور زور سے سانس لے رہے تھے، اس کا تو لیا جسم سے ڈھلک گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اسے مضبوطی سے لپیٹا اور بالکل کوئی کی جانب بڑھ گئی اور سمندر کا نظارہ کرنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ شیر اپنے شکار کو کبھی نہیں چھوڑتا، وہ انتظار کر رہی تھی کہ ہال اسے کب بالکل کوئی سے دھکا دیتا ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بلکہ ہال نے اس سے یہ کہہ کر معافی مانگی کہ وہ زیادہ پی جانے کے سبب بہک گیا تھا اور اسے نہیں معلوم کہ نشے کی حالت میں وہ کیا کرتا رہا ہے۔ وہ کافی دیر تک اس کے پاس کھڑا سرگوشیاں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے معاف کر دینے کے انداز میں اپنا سر ہلاتا پڑا۔ اس نے بتایا کہ آج رات وہ اپنے پارٹنر کے ساتھ ڈنر پر مدعو ہے جو کہ ایک طرح کا کاروباری ڈنر ہے اور اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے لہذا وہ اپنے دل و دماغ کو سکون پہنچانے کے لیے ٹھنڈے پانی سے نہانا پسند کرے گا۔

وہ ہاتھ روم میں گیا تو کیتھرین نے وہ سرخ لباس زیب تن کر لیا جو شام کی پارٹیوں کے لیے مخصوص تھا اور جسے اس نے حال ہی میں خریدا تھا۔ دوران ڈنر ہال ایک عمر رسیدہ شخص سے کاروباری گفتگو کرتا رہا جس کا لہجہ جرمنوں جیسا تھا جبکہ اس کی بیوی جلدے ہوئے توس کی طرح خشک لگ رہی تھی۔ اس نے پلیٹ میں رکھے ہوئے چکن کو کئی ٹکڑوں میں کاٹا اور منہ میں ڈالنے سے پہلے ان کا بغور معائنہ کرتی رہی۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر کیتھرین کو اس کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا۔ دوسرا شخص وہی تھا جو انہیں ایئر پورٹ سے بلے کر

آیا تھا۔ اس کی بیوی کو انگریزی بولنا نہیں آتی تھی۔ اس لیے وہ ڈنر کے دوران خاموش رہی۔

نوجوان شخص نے کیتھرین کے لباس کی تعریف کی اور بار بار یہی کہتا رہا کہ وہ بہت خوب صورت اور جوان لگ رہی ہے۔ بعض اوقات اس کا ہاتھ کیتھرین کے بازو کو چھو جاتا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کے ساتھ فلرٹ کر رہا تھا اور شادی کے بعد پہلی بار کیتھرین کو احساس ہوا کہ وہ بھی کسی دوسرے مرد سے تعلقات استوار کر سکتی ہے۔ ہال بھی اسی جانب دیکھ رہا تھا۔ کیتھرین نے اس کی طرف دیکھا اور اسے جلانے کے لیے نوجوان شخص کی کسی بات پر زور سے قہقہہ لگایا جس طرح اس عورت نے دوپہر کے وقت اپنے ساتھی مرد سے گفتگو کے دوران قہقہہ لگایا تھا۔

اپنے ہونٹ کے کمرے میں واپس آنے کے بعد ہال نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ دونوں جہازی سائز کے بیڈ پر ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کر لیٹے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہال کے خزانے کو بچنے لگے۔ کیتھرین کو بھی نیند آرہی تھی لیکن سونے سے پہلے وہ اس نوجوان شخص کے ہاتھوں کے کس کونہ بھول سکی۔ اسے لگا جیسے وہ اب بھی اس کی نرم جلد پر اپنا ہاتھ پھیر رہا ہے۔

دوسری صبح وہ ہاتھ روم سے باہر آئی تو ہال کسی سے فون پر باتیں کر رہا تھا۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔

”اس مرتبہ پہلے سے بہتر کام ہوگا۔“

اسے دیکھ کر وہ کچھ گھبرا گیا اور اس نے جلدی سے فون بند کر دیا۔

”مجھے لچ کے بعد ایک میٹنگ میں جانا ہے۔“ اس نے کہا۔

”تمہارا صبح میں کیا پروگرام ہے؟“

”واک پر جاؤں گی۔ ممکن ہے کہ کچھ شاپنگ بھی کر لوں۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اچھا ہے میری ٹانگوں کی ورزش ہو جائے گی۔“

راستے میں ہال اس سے اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے ان کے درمیان کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ شہر کے پرانے حصے کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر راستے میں ہونٹ بیسوس ڈیل سول پر پڑی۔ ہال کا کہنا تھا کہ وہ آج سودا نمٹالے گا اور ان چھٹیوں کو وہ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ اس نے جب بھی کیتھرین کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی وہ اس کی گرفت سے پھلکی کی طرح پھسل گئی اور زیادہ تیزی سے چلنے لگی تاکہ اس تک پہنچنے کے لیے ہال کو بھی زیادہ تیزی دکھانا پڑے۔

راستے میں کئی دکانوں پر رکے۔ ان میں زیادہ تر آرٹ گیلری تھیں۔ وہ ہر گیلری میں جا کر سرسری انداز میں تصویریں دیکھتی اور واپس آ جاتی۔ ہال بڑے مبر کے ساتھ یہ ساری کارروائی دیکھتا رہا پھر وہ اسے ریسٹوران کے سامنے واقع ایک اسٹور میں لے گئی۔ یہ وہی ریسٹوران تھا جہاں وہ گزشتہ روز لچ کے لیے گئی تھی۔ کاڈنٹر کے پیچھے کھڑی ہوئی عورت نے ان کا استقبال کیا اور انہیں مختلف چیزیں دکھانے لگی۔ ان میں تازہ پھل، سبزیاں، ڈبوں میں بند خوراک، کپڑے اور مقامی موسیقی کے کیسٹ وی ڈیز شامل تھیں۔ ایک خانے سے اس نے سفید رنگ کی قمیص نکالی اور ہال کے سینے سے لگا دی۔

کیتھرین بولی۔ ”ٹھیک ہے، تم اسے پہن کر دیکھ لو۔“

ہال سر ہلاتا ہوا ٹرائی روم کی طرف چلا گیا۔ اس کی پشت کیتھرین کی جانب تھی۔ اس کے جاتے ہی کیتھرین تیزی سے چلتی ہوئی اسٹور سے باہر آ گئی۔ وہ اس سے دور ہونا چاہ رہی تھی۔ اسے یہ فکر نہیں تھی کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ سڑک آگے جا کر تنگ ہو گئی تھی اور وہاں بالکل سناٹا تھا۔

اس نے عقب سے ایک سایے کو اپنی جانب جھینٹے دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی۔ وہ اسے ایک گلی میں دھکیل چکا تھا۔ اس نے اسے دیوار کے ساتھ لگا دیا اور اس پر اپنا دباؤ بڑھانے لگا۔ یہ وہی شخص تھا جسے اس نے گزشتہ روز ریسٹوران میں دیکھا تھا اور جو اس وقت سے کیتھرین کا پیچھا کر رہا تھا جب سے وہ ڈاگ پارک میں اسے نظر آئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور یوں لگا جیسے اس شخص کے ہاتھ کیتھرین کے جسم پر رینگ رہے ہوں۔ وہ شخص اسے بری طرح جھٹکے دے رہا تھا اور وہ خود کو بادلوں کے درمیان تیرتا ہوا محسوس کر رہی تھی پھر اچانک ہی وہ اس سے الگ ہو گیا۔

”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ ہال چلاتے ہوئے بولا۔

یہ کہہ کر اس نے اس شخص کو زوردار ٹکرا ماری۔ وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑایا لیکن جیسے ہی ہال اس پر دوبارہ حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس شخص نے ہال کے پیٹ میں کوئی چمک دار شے گھونپ دی۔ دونوں ہی ایک ساتھ زمین پر گرے پھر اسے اپنے عقب میں ایک عورت کی چنچ سنائی دی۔

وہ جمع کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی اور اس پولیس والے کے پاس سے گزرتی چلی گئی جو اس عورت کی چنچ کی آواز سن کر اسی جانب چلا آ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو پرسکون

محسوس کیا جیسے اپنے کتے کے ساتھ ٹہلنے کے لیے باہر نکلی ہو اور اسے اپنی منزل کا پتا ہو۔ وہ اسی راستے پر واپس چل دی جہاں سے آئی تھی۔ ہونٹوں کی قطار سے گزرتے ہوئے وہ بیسوس ڈیل سول کی سیڑھیوں پر قدم رکھ رہی تھی۔ اندر جانے کے بعد اسے استقبال کا ڈنٹر پر کچھ سوالوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ انہیں جیسے تیسے مطمئن کر کے ساحل کی طرف بڑھ گئی۔

اس نے اپنے سینڈل اتار دیے۔ چشمہ ایک جانب اچھال دیا اور لباس کے اوپری بٹن کھولنے لگی۔ اس کے نرم پیر ساحل کی گرم ریت میں دھنس رہے تھے لیکن وہ اپنی دھن میں مست آگے کی جانب بڑھتی گئی۔ وہاں اور بھی کئی مرد اور عورتیں موجود تھیں جو چھتریوں کے نیچے لیٹی یا سمندر میں تیر رہی تھیں۔ کیتھرین نے بھی کپڑے اتار دیے اور پانی میں قدم رکھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پیچھے کی طرف جھک گئی۔ سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں جیسے اس کی بلائیں لے رہی ہوں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خود کو سمندر کی موجوں کے حوالے کر دیا۔ ذلت کی زندگی گزارنے سے بہتر تھا کہ وہ عزت کی موت کو گلے لگالے۔

وہ شروع سے ہی جانتی تھی کہ ہال اسے کس لیے یہاں لایا ہے۔ اس کا رو باری سودے کی تکمیل کا بہت کچھ دار و مدار اس پر وگرام پر تھا جو اس کا شوہر اپنے کاروباری دوستوں کے ساتھ ترتیب دے چکا تھا۔ وہ بے غیرت تھا جو دوسروں کے سامنے اپنی بیوی کو اس ساحل پر بے لباس کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے ہمیشہ ہی کیتھرین کی بے عزتی کی تھی جسے وہ اپنا گھر بچانے کی خاطر برداشت کرتی آرہی تھی لیکن اس بے عزتی کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے کئی بار چاہا کہ ہال کو چھوڑ کر کسی دوسرے شخص کے بازوؤں میں پناہ لے لے لیکن کبھی مرد ناقابل اعتبار تھے۔ اس کا پیچھا کرنے والا وہ پراسرار شخص بھی بالآخر ایک بھیڑیا ہی ثابت ہوا۔

دوسری طرف اسپتال کے بستر پر لیٹے ہوئے ہال کو جب کیتھرین کے ڈوبنے کی اطلاع ملی تو اس کا دل چاہا کہ زور زور سے قہقہہ لگائے لیکن اس طرح اس کے زخم کے ٹانگے ٹوٹ جاتے۔ لہذا اس نے مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ کیتھرین کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا جو جاتے جاتے اس کا نقصان پورا کر گئی تھی۔ اب وہ بے چینی سے اپنے صحت یاب ہونے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ واپس جا کر کیتھرین کے انشورنس کی رقم وصول کر سکے کیونکہ لڑکے ابھی نابالغ تھے اور وہ ہی اس کا حقیقی وارث تھا۔

طبقاتی نظام کی کشش، بکھرتی سوچوں کا انتشار اور محبت کے مہربان لمحات کا احوال

پانچواں ادھی ایک اقبال

یہ شک زندگی مجموعہ اضداد سہی، اس کے باوجود انہی تضادات میں رہ کر انسان کو اپنے لیے مثبت راہوں کا انتخاب کرنا پڑتا ہے... مگر اس نے اپنے لیے جن رستوں کو چنا سوئے اتفاق ان کے اختتام پر کسی منزل کا ڈیرا نہ تھا... اور جب پیروں کے آبلوں نے تھک کر طویل مسافت طے کرنے سے انکار کیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ کس قدر غلط سمت میں محو سفر تھا۔ شاید بدقسمتی کے ساتھ ساتھ خوش بختی بھی اس کے تعاقب میں تھی تب ہی ان ویرانوں میں اس کے بکھرے وجود کو محبت نے بڑے مان سے سمیٹ لیا... تباہ حال معاشرتی نظام نے ایسے جانے کتنے حوصلہ مندوں کو آزمائش میں مبتلا کیا ہوا ہے یہ اور بات کہ ہر ایک پر محبت کی دیوی مہربان نہیں ہوتی مگر... جن پر ہو جائے وہ مقدر کے بادشاہ کہلاتے ہیں اس حوالے سے اسے بھی کسی کے دل پر حکمرانی حاصل تھی اور وہ صرف اسی کے نام پر دھڑکتا تھا... اگرچہ اسے خبر نہ تھی اور اسی بے خبری میں جانے کتنے سنہرے دن ہوا ہو گئے... جب ادراک ہوا تو احساس ندامت نے چاہتوں کی سمت نظر اٹھنے ہی نہ دی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس کے تغافل کے آزار تلے خاک ہو جاتا، زندگی نے ایک خوبصورت موڑ لیا اور خواہشوں نے حقیقت کا روپ دھار لیا... اس بار محبت کی دیوی اس پر سچے دل سے مہربان ہوئی تھی۔

تو وہ ایک ملازم کو فارغ کر دیں لیکن بابر کی افتاد طبع کچھ اور تھی۔ وہ کسی بہت اچھی ملازمت کا متلاشی تھا اور ”بہت اچھی“ ملازمت کسی سفارش کے بغیر مل نہیں سکتی تھی۔ اسی لیے صحیح معنوں میں اس کا وقت ملازمت کے بجائے کسی ”سفارش کنندہ“ کی تلاش میں گزرتا رہا تھا۔

چھ ماہ قبل دو پہر کے کھانے پر سیف ہمدانی نے بابر سے کہا تھا۔

”کیا بات ہے؟ آج تم کسی گہری سوچ میں ڈوبے نظر آرہے ہو؟“

”آپ کا اندازہ غلط نہیں ہے ابا جان!..... دو سال سے میں آپ پر بوجھ بنا ہوا ہوں۔ اب مجھے اس پر شرم آنے لگی ہے۔“

”اولاد کبھی والدین پر بوجھ نہیں بنتی۔“ سیف ہمدانی نے سنجیدگی سے بیٹے پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ”اگر تم اسٹور پر میرا

وہ ایک چھوٹا اور معمولی سا میڈیکل اسٹور تھا جو سیف ہمدانی کی محنت، لگاؤ سے مشفقانہ طرز عمل اور ان کے نستعلیق انداز گفتگو کے باعث اوسط درجے کا ایک اچھا خاصا اسٹور بن گیا تھا۔ ابتدا میں سیف ہمدانی اسٹور پر اکیلے ہی ہوتے تھے لیکن اب انہوں نے دو ملازم بھی رکھ لیے تھے۔ اسٹور صبح دس بجے سے دو بجے تک اور شام کو چھ بجے سے رات ایک بجے تک کھلا رہتا تھا۔

دس سالہ محنت کے بعد اب وہ قدرے آسودہ مگر اطمینان بخش زندگی گزارنے لگے تھے، مگر کچھ دنوں سے ان کا اطمینان رخصت ہو گیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے بابر کی وجہ سے متفکر رہنے لگے تھے۔

بابر پولیٹیکل سائنس میں ڈگری لینے کے بعد دو سال سے ملازمت کی تلاش میں تھا۔ سیف ہمدانی کی خواہش تو یہ تھی کہ بابر میڈیکل اسٹور کے معاملات میں ان کا ہاتھ بٹائے



ہاتھ بٹانا شروع کر دو تو تمہاری یہ شرمندگی ختم ہو جائے گی۔“
 ”وہ میرے مزاج کے خلاف ہے ابا جان! بالکل اسی طرح جیسے آپ کو ملازمت کرنا پسند نہیں تھا۔“
 ”لیکن تم ملازمت بھی حاصل نہیں کر سکے!“
 ”سفارش کے بغیر کوئی اچھی ملازمت نہیں ملتی۔“
 ”چھوٹی ملازمت سے بھی بڑے عہدوں تک پہنچا جاسکتا ہے، اگر انسان میں صلاحیت ہو تو تم اپنے چچا ہی کی مثال لے لو۔ وہ محکمہ پولیس میں کیا تھا؟ صرف اے ایس آئی، مگر آج وہ اس شہر کی پولیس کا ڈی آئی جی ہے۔ صلاحیت تھی اس میں، سو وہ.....“
 ”جوڑ توڑ کی صلاحیت۔“ بابر نے بات کاٹ دی تھی۔
 ”کچھ بھی ہو! کچھ ہو تو سہی!“
 ”لیکن میں معمولی ملازمت حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ مجھ سے کم تعلیم حاصل کرنے والوں کو اچھی ملازمتیں ملی ہیں۔“
 ”اچھا۔“ سیف ہمدانی نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔
 ”تو ڈھونڈتے رہو سفارش..... لیکن یہ مت سمجھو کہ تم مجھ پر بوجھ ہو۔“
 ”لیکن اب میں سفارش تلاش کرتے کرتے بھی تھک گیا ہوں۔“
 ”تو پھر؟“
 ”آج کا معاشرہ۔“ بابر کے لہجے میں تلخی آگئی تھی۔ ”بڑا بے رحم معاشرہ ہے۔ کسی کو اس کا حق نہیں دیتا۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حق جب آسانی سے حاصل نہ ہو تو پھر جبر کرنا پڑتا ہے۔ اپنا حق چھیننا پڑتا ہے۔“
 اس جواب پر سیف ہمدانی نے چونک کر بیٹے کو دیکھا تھا۔ ان دونوں کی باتوں کے دوران میں سیف ہمدانی کی بیوی عذرا بیگم اور بیٹی عنبر خاموشی سے کھانا کھا رہی تھیں اور کبھی سر اٹھا کر باپ بیٹے پر اچھتی سی نظریں ڈال لیتی تھیں۔
 ”بابر!“ سیف ہمدانی نے بیٹے کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔ ”کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنا بیٹے کہ مجھے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔“
 اس بات کا بابر نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ سر جھکائے خاموشی سے کھانا کھاتا رہا تھا۔
 پھر کوئی ایک ہی مہینہ گزرا تھا کہ بابر کے جسم پر نہایت عمدہ کپڑے اور اچھی تراش کا سوٹ نظر آیا۔ دوسرے دن اس کے جسم پر جب دوسرا سوٹ بھی نظر آیا تو سیف ہمدانی چونک اٹھے تھے۔ وہ بابر کو جو ماہانہ جیب خرچ دیا کرتے

سلوا سکتا۔
 ”کیا تمہیں کوئی ملازمت مل گئی ہے؟“ سیف ہمدانی نے پوچھا تھا۔
 ”جی ہاں ابا جان! کوئی بہت اچھی ملازمت تو نہیں ملی مگر کچھ ایسی بری بھی نہیں ہے۔“
 ”اور تم نے مجھے بتایا نہیں؟“
 ”میں نے سوچا تھا کہ جب پہلی تنخواہ ملے گی تو بتاؤں گا۔“
 ”ابھی تنخواہ نہیں ملی؟“
 ”جی نہیں۔“
 ”اور تم اتنے قیمتی کپڑے بھی سلوانے لگے؟“
 ”دس ہزار روپے ایڈوانس مل گئے تھے۔“
 ”دس ہزار؟“ سیف ہمدانی چونکے۔ ”ایڈوانس؟“
 ”جی!“
 ”تنخواہ کتنی ہوگی؟“
 ”چالیس ہزار۔“
 ”اور تم اسے معمولی ملازمت کہہ رہے ہو؟“
 ”میں زیادہ آگے جانا چاہتا ہوں ابا جان..... اور وقت بہت کم ہوتا ہے انسان کے پاس! عمر چاہے سو سال کی ہو لیکن انسان کو جو کچھ بننا ہوتا ہے، وہ چالیس پینتالیس سال کی عمر تک بن جاتا ہے۔ اس حساب سے میرے پاس صرف پندرہ بیس سال بچے ہیں۔“
 ”تم ایک متوسط گھرانے کے فرد ہو بابر! اتنی اونچی پرواز کے بارے میں سوچنا تمہارے لیے خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔“ سیف ہمدانی کے لہجے میں سختی نہیں تھی۔ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔
 ”ابا جان!“ بابر نے کہا۔ ”انسان کو حق حاصل ہے کہ وہ اونچی سے اونچی پرواز کے بارے میں سوچے، خواہ اس کا تعلق پست ترین گھرانے سے ہو۔“
 ”میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔“
 ”زندگی بنانے کے لیے رسک تو لینا ہی پڑتے ہیں ابا جان!“ بابر نے کہا۔ ”اچھا اب میں چلتا ہوں ورنہ دیر ہو جائے گی۔“
 ان دونوں میں یہ باتیں دروازے کے قریب ہوئی تھیں۔ سیف ہمدانی بھی اپنے اسٹور جانے والے تھے۔ اسٹور گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سیف ہمدانی ٹہلے ہوئے بھی جاتے تو پندرہ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔

پھر وقت گزرنے کے ساتھ ان کی فکر مندی بڑھتی ہی چلی گئی۔ بابر کو جب تنخواہ ملتی تو وہ پندرہ ہزار روپے ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔ عذرا بیگم اس صورت حال سے بہت خوش تھیں اور عنبر تو نہال ہوئی جارہی تھی۔ ہر ماہ اس کے لیے دو ایک نئے جوڑے بننے لگے تھے۔ چھ ماہ بعد تو وہ بڑے ٹھاٹھاٹ سے کان لچ جانے لگی۔ وہ فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ ایک رات سیف ہمدانی نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”عذرا بیگم! ذرا اپنے لاڈلے سے پوچھیے تو سہی کہ وہ کہاں ملازمت کر رہا ہے۔ مجھے اس نے اپنی تنخواہ چالیس ہزار روپے بتائی تھی لیکن جس طرح کی زندگی وہ گزار رہا ہے، وہ چالیس ہزار کی تنخواہ میں ممکن نہیں۔ پندرہ ہزار تو وہ آپ ہی کو دے دیتا ہے۔“
 ”ترقی ہوگئی ہوگی اس کی!“ عذرا بیگم نے کہا۔
 ”اتنی جلدی؟..... اتنی ترقی؟ بات میری سمجھ میں نہیں رہی ہے۔ آپ اس سے پوچھیں۔“
 ”آپ خود پوچھ لیں۔“
 ”مجھے ڈر لگنے لگا ہے اب اس سے؟“
 عذرا بیگم ہنس پڑیں۔ ”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ بیٹے سے ڈر لگنے لگا آپ کو؟“
 ”ہاں۔“ سیف ہمدانی کمرے میں ٹہلنے لگے۔ وہ بہت زیادہ فکر مند نظر آرہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”میں محسوس کر رہا ہوں کہ گزشتہ چند ماہ میں بابر کے مزاج میں کچھ سرکشی آگئی ہے۔ آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ مجھے غصہ بہت کم آتا ہے اور جب آتا ہے تو پھر جیسے قیامت آجاتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ بابر کوئی ایسا جواب دے بیٹھے کہ مجھے غصہ آجائے۔“
 ان باتوں سے عذرا بیگم سنجیدہ ہو گئیں۔ ”اچھا! میں بات کروں گی اس سے۔“
 ”آنے کا کوئی وقت بھی تو نہیں رہا ہے اب اس کا!“
 سیف ہمدانی نے ٹھنڈی سانس لی اور بستر پر لیٹ گئے۔ ”بہی دن میں ہی آجاتا ہے اور بھی رات کو دو دو بجادیتا ہے۔“
 مگر اس وقت دن تھا۔ سیف ہمدانی اسٹور سے آکر کھانے کے بعد عذرا بیگم سے باتیں کر رہے تھے۔
 عنبر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ کھانے کے بعد وہ ایک گھنٹا آرام کر کے دو گھنٹے تک پڑھتی تھی۔ سیف ہمدانی دو تین گھنٹے کے لیے سو جاتے تھے مگر اس دن ان کی آنکھوں سے نیند بہت دور تھی۔ اس دن کوئی انجانا سا احساس انہیں خاصا پریشان کیے ہوئے تھا۔ وہ محسوس کر رہے تھے جیسے کوئی انہوں نے ہونے والی بات سے

پانچواں آدمی

چٹکلا

ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ باقی نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چار پائیوں کا اشتہار لگا ہوا تھا اور لوٹنے وقت تک اہالیان لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے چنانچہ اب وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ جہاں بہ حرف جلی ”محمد علی ودعان ساز“ لکھا ہے وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے ”خالص گھی کی مٹھائی“ امتیاز علی تاج صاحب کا مکان ہے۔ ”کرشنا بیوی کریم“ شالامار باغ کو اور ”کھانسی کا مجرب نسخہ“ جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔ (پطرس کے مضامین)

کیا واقعی دنیا گول ہے

اس لڑکے کا قصہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ آدھ سیر تیل لینے کے لیے کٹورا لے کر گیا تھا۔ کٹورا تھا چھوٹا، بھر گیا تو دکاندار نے کہا کہ ”باقی کس چیز میں ڈالوں۔“ برخوردار نے کٹورا اوندھا کر کے کہا۔ ”ادھر پیندے کے حلقے میں ڈال دو۔“ پیندا اوپر کر کے گھر گیا تو ماں نے کہا۔ ”میں نے آدھا سیر تیل لانے کو کہا تھا۔ بس اتنا سا؟ بس یہی؟“
 اس دانش مند نے اسے بھی الٹا کر کہا ”ادھر بھی تو ہے۔“

انتخاب: دنیا گول ہے..... ہر سلفر حان الفت، پلاڈ پور

عذرا بیگم کمرے سے چلی گئی تھیں۔ وہ اس وقت گھر کے کام کاج میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ بابر کی پندرہ ہزار کی اضافی آمدنی کے باعث کوئی ملازمہ بڑی آسانی سے رکھی جاسکتی تھی لیکن عذرا بیگم اسے فضول خرچی سمجھتی تھیں۔ وہ کہا کرتیں۔ ”میری صحت پر رشک کرتی ہیں پڑوس کی عورتیں۔ میں آسانی سے گھر کے سب کام دیکھ سکتی ہوں۔ ملازمہ کیوں رکھی جائے۔“

وہ صرف رات کے کھانے کی تیاری میں عنبر کو اپنے ساتھ رکھتی تھیں تاکہ اسے بھی اچھے سے اچھا کھانا پکانا آجائے۔ دن میں وہ موقع دیکھ کر عنبر کو سنا رہا تھا کہ

”آخر ایک دن پرانے گھر جانا ہے اسے!“ وہ سیف ہمدانی سے کہا کرتی تھیں۔ ”تعلیم کے ساتھ لڑکی کو گھر داری میں بھی طاق ہونا چاہیے۔“

سیف ہمدانی کو ان سے اتفاق تھا۔

اس دن عذرا بیگم گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر کمرے میں لوٹیں۔ انہوں نے سیف ہمدانی کو جاگتا دیکھا تو ان کی فکر مندی سمجھ گئیں۔ اسی لیے وہ ان کا ذہن بٹانے کے لیے بولیں۔ ”میں چاہتی ہوں، عنبر قریشیا کا کام بھی سیکھے لیکن اس سے وہ بھاگتی ہے۔“

”کیا کیا سیکھے! کیا کیا کرے؟“ سیف ہمدانی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہر وقت ہی مصروف رکھتی ہیں آپ اسے! کالج بھی جاتی ہے وہ۔ گھر میں بھی پڑھتی ہے۔ کپڑے سینا اور کھانا پکانا بھی آپ اسے سکھا رہی ہیں۔“

اس موضوع پر ان کی مزید بات اس لیے نہیں ہو سکی کہ کئی سائرنوں کی آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا تھا۔

سیف ہمدانی جلدی سے اٹھے۔ ”شاید کیف آیا ہے۔“ ڈی آئی جی کیف ہمدانی مہینے میں ایک آدھ بار اپنے بڑے بھائی اور بھانجے سے ملنے ضرور آتا تھا۔ ڈی آئی جی بننے کے بعد اس کی حفاظتی فورس بھی خاصی ہوتی تھی۔ ان دنوں شہر کے حالات بھی ٹھیک نہیں تھے۔ کیف ہمدانی کی کار کے ساتھ چار پولیس موبائلز ضرور ہوتی تھیں جن کے سائرنوں سے سیف ہمدانی اور ان کے گھر کے افراد کو کیف ہمدانی کی آمد کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

وہ دونوں کمرے سے نکلے ہی تھے کہ سامنے عنبر بھی اپنے کمرے سے باہر آتی نظر آگئی۔

”چچا جان ہوں گے۔“ وہ بہت خوش نظر آنے لگی تھی۔ ”میں کھولتی ہوں دروازہ۔“ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

اس وقت آنے والی گاڑیوں کے انجن بند کے جا چکے تھے۔ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ سیف ہمدانی کے گھر کے سامنے ہی رکی تھیں۔

”آج اس وقت کیسے آگیا وہ!“ سیف ہمدانی کے لہجے میں الجھن تھی۔ ”مہینے کے پہلے ہفتے کے دنوں میں آتا ہے۔“ ان دنوں مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔

”دل چاہا ہوگا ملنے کو!“ عذرا بیگم بولیں۔ ”بھائی ہے آپ کا! کسی دن بھی آسکتا ہے۔“

لیکن سیف ہمدانی کے چہرے سے الجھن کم نہیں ہوئی۔ کیف ہمدانی اپنی مکمل زندگی میں سامنے آگیا۔ عنبر اس

کے سینے سے لگی ہوئی آرہی تھی۔ چچا بھتیجی دونوں ہی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس کے برعکس باہر اپنے چچا سے ایسی قربت نہیں رکھتا تھا۔

ڈی آئی جی کیف ہمدانی نے بڑے بھائی اور بھانجے کو سلام کیا اور ان دونوں نے اسے دعا میں دیں۔ عنبر اب کیف ہمدانی کے سینے سے الگ ہوگئی تھی مگر اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔

کیف ہمدانی کو ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھایا گیا جہاں کی آرائش اور ساز و سامان میں سادگی تھی۔ سیف ہمدانی ایک بیٹی کے باپ بننے کی وجہ سے نہایت کفایت شعار تھے۔ ”آج کیسے آگئے کیف!“ سیف ہمدانی بولے۔

”بس یوں ہی..... دل چاہا ملنے کو!“ کیف ہمدانی نے جواب دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

اب عنبر جلدی سے اٹھ کر چلی گئی۔ عذرا بیگم کو یقین تھا کہ اس نے چچا کی خاطر مدارات کے لیے کچن کا رخ کیا ہوگا۔

”باہر دکھائی نہیں دے رہا ہے۔“ کیف ہمدانی نے اپنی بات میں اضافہ کیا۔ انداز سرسری سا تھا۔

”ہاں۔“ سیف ہمدانی نے طویل سانس لی۔ ”اب کوئی وقت مقرر نہیں رہا ہے اس کے آنے کا!“

”شاید اسے کوئی اچھی ملازمت مل گئی ہے۔“ کیف ہمدانی نے کہا۔ ”دو تین مرتبہ گھر آیا تھا۔ خاصے ٹھاٹھاٹ ہو گئے ہیں اس کے! چلیں اچھا ہے۔ بہت دن بیکار بھی تو رہا۔ بھائی صاحب آپ بھی میری بات مان لیتے تو کوئی حرج نہیں تھا۔ آخر چھوٹا بھائی ہوں آپ کا، غیر تو نہیں ہوں۔ اگر میں آپ کی کوئی خدمت کروں گا تو یہ میرا فرض ہوگا۔“

سیف ہمدانی اس کا مطلب سمجھ گئے۔ کیف ہمدانی پہلے بھی کہتا رہا تھا کہ سیف ہمدانی کسی فیشن ایبل علاقے میں کوئی بڑا میڈیکل اسٹور کھول لیں اور سرمائے کی فکر نہ کریں۔ کیف ہمدانی سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا لیکن سیف ہمدانی کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ چھوٹے بھائی کے مرہون منت ہوں۔

”کوئی اور بات کرو کیف!“ سیف ہمدانی اس وقت بھی اسے ٹال گئے۔ ”رخسار کیسی ہے؟ دلہن کا کیا حال ہے؟“

رخسار، کیف ہمدانی کی بیٹی کا نام تھا جو اس وقت بی اے کے آخری سال میں تھی۔

سیف ہمدانی، کیف ہمدانی کی بیوی کو دلہن کہا کرتے تھے۔ انہوں نے مشرقی اقدار کو کسی خود سے دور نہیں کیا تھا۔

ان کی باتوں میں کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ عنبر ایک

پانچواں آدمی

ٹرے لے آئی جس میں چائے اور کچھ لوازمات تھے۔ ”ابھی تو آپ کی صحت اچھی ہے بھائی صاحب!“ کیف ہمدانی نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ہمیشہ تو ایسا نہیں رہے گا۔ اس وقت میڈیکل اسٹور کو اتنا زیادہ وقت دینا آپ کے لیے مشکل ہو جائے گا۔“

”عنبر کی شادی کر دوں۔“ سیف ہمدانی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”اس کے بعد مجھے یہ فکر رہے گی بھی نہیں کہ میری صحت ٹھیک رہتی ہے یا نہیں! ہم میاں بیوی کی گزر اوقات ہر حال میں ہو جائے گی۔ رہ گیا باہر، تو اسے میں پڑھا لکھا چکا ہوں۔ وہ اب اپنا برا بھلا خود سوچ سکتا ہے۔ اب وہ جانے اور اس کا مستقبل!“

”بچے کتنے بھی بڑے ہو جائیں، ان کے مستقبل کی فکر ان کے بڑوں کو ہمیشہ رہنا چاہیے بھائی صاحب!“

سیف ہمدانی نے غور سے چھوٹے بھائی کو دیکھا اور نہایت سنجیدگی سے بولے۔ ”تم اتنی دیر سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے ہو لیکن کئی مرتبہ مجھے محسوس ہو چکا ہے کہ تم ذہنی طور پر کہیں کم ہو۔ مجھے گمان ہو رہا ہے کہ اس وقت تم دراصل باہر ہی سے ملنے آئے تھے۔ اگر تم آنے سے پہلے فون کر لیتے تو میں بتا دیتا کہ وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ کیف ہمدانی کھڑا ہو گیا۔ ”کل صبح اسے میرے دفتر بھیج دیجیے گا۔“

”بیٹھو نا کیف!“ عذرا بیگم بولیں۔ ”نہیں بھائی! اب میں چلوں گا۔“

”کیف!“ سیف ہمدانی سنجیدگی سے کہتے ہوئے کھڑے ہوئے۔ ”تم اسے دفتر میں کیوں بلانا چاہتے ہو؟“

”یوں ہی بھائی صاحب! ملنے کے لیے۔ بہت دن سے دیکھا نہیں اسے۔“

”کسی سے ملاقات کرنا ہو تو اسے گھر پر بلایا جاتا ہے۔“ سیف ہمدانی نے کہا۔ ”دفتر میں بلایا جائے تو مقصد کچھ اور ہوتا ہے۔“

”ارے نہیں بھائی صاحب!“ کیف ہمدانی نے کہا۔ ”آپ کو اندازہ ہوگا ہی کہ شہر کے حالات آج کل کیا ہیں! مجھے بہت مصروفیت رہتی ہے۔ کچھ طے نہیں ہوتا کہ میں کب گھر پر ہوں گا اور کب نہیں! کبھی بھی تو رات بھر گھر جانا نصیب نہیں ہوتا۔“

”چچا جان!“ عنبر بول پڑی۔ ”آپ وردی میں بہت اچھے لگتے ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ ایسی وردی پہنا کر دوں۔“

”پہلے تعلیم مکمل کر لو۔“ کیف ہمدانی نے ہنس کر عنبر کا

گال تھپتھپایا۔ ”پھر اگر تم بھائی صاحب سے اجازت لے لو گی تو لیڈی پولیس میں کروادوں گا۔ اچھا بھائی صاحب! خدا حافظ۔“

عذرا بیگم نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کیف ہمدانی کے جاتے ہی سیف ہمدانی نے عنبر کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم تہذیب سے دور کیوں ہوتی جا رہی ہو۔“

”کیا..... کیا ہوا اباجان؟“ عنبر شپٹا گئی۔ ”جب میں کیف سے بات کر رہا تھا تو تم بیچ میں کیوں بول پڑیں؟ کیا تم بھول گئیں کہ جب بڑے بات کر رہے ہوں تو بیچ میں نہیں بولنا چاہیے۔“

”جی!“ عنبر نے نظریں جھکا لیں۔ ”میں معافی چاہتی ہوں اباجان! بھول ہو گئی مجھ سے۔“

سیف ہمدانی ایک دم اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔ عذرا بیگم ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے بولیں۔ ”ذرا سی بات تھی اور آپ بگڑ گئے عنبر پر!“

”ذرا سی بات نہیں تھی، بدتمیزی تھی۔“ سیف ہمدانی نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”اس کے بول پڑنے کی وجہ سے میری بات بھی پوری نہیں ہو سکی۔ میں کیف سے معلوم کر کے رہتا کہ اس نے باہر کو اپنے دفتر کیوں بلایا ہے۔“

”اس نے بتا تو دیا تھا۔“

”غلط بتایا تھا۔“ سیف ہمدانی نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ ”بات کچھ اور ہی ہے۔ آپ کے صاحب زادے ضرور کوئی نامعقول حرکت کر بیٹھے ہیں۔ کیف نہیں چاہتا ہوگا کہ مجھے مکر کرے اس لیے مجھے ٹال گیا۔“

سیف ہمدانی کا جواب ایسا تھا کہ عذرا بیگم کے چہرے پر بھی سنجیدگی آگئی۔

دوسری صبح دس بجے کے قریب ڈی آئی جی کیف ہمدانی اپنے دفتر میں میز پر کھلی ہوئی ایک فائل پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس کے سامنے کی کرسی پر باہر بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد کیف ہمدانی نے فائل بند کر کے باہر کی طرف دیکھا۔ باہر نے نظریں جھکا لیں۔

کیف ہمدانی چند لمحے بڑی سنجیدگی سے باہر کی طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ”کیا اب میں تمہیں انگریزنگ مین کہہ کر حجاب کیا کروں؟“

باہر نے ہل بھر کے لیے سراٹھا کر کیف ہمدانی کی طرف دیکھا اور دوبارہ بازہ نظریں جھکا لیں۔

کیف ہمدانی بولا۔ ”کل رات تم نے ایم پی اے ناصر جمال کی پٹائی کی مٹی جس کے نتیجے میں تم اس وقت حوالات میں بھی ہو سکتے تھے۔“

بارنظریں جھکائے بیٹھا رہا۔
کیف ہمدانی نے ذرا سارک کر اپنی بات جاری رکھی۔
”مجھے اس کا علم بروقت ہو گیا تھا۔ میں فوراً اپنے ایک ایس ایس پی کو حرکت میں لایا۔ ناصر جمال سے اس کے ذاتی تعلقات ہیں۔ وہ ناصر جمال کو تمہارے خلاف ایف آئی آر کٹوانے سے بہ مشکل روک سکا۔“

بار کی نظر میں یہ دستور جھکی رہیں۔
کیف ہمدانی کی بات جاری رہی۔ ”ناصر جمال کا تعلق اپوزیشن کی ایک مضبوط پارٹی سے ہے اس لیے اس نے اخبارات میں یہ خبر آنے سے رکاوٹی۔ لی وی نیوز چینلز پر بھی ویڈیو ڈالا گیا تھا۔ اس سلسلے میں خود مجھے بھی کوششیں کرنا پڑی تھیں ورنہ خبر میں یہ بھی آ سکتا تھا کہ غنڈا گروہی کرنے والا نوجوان ڈی آئی جی کیف ہمدانی کا بھتیجا ہے۔“

بار کے لیے خاموش رہنے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔
کیف ہمدانی اپنی کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنی کرسی کے قریب رکالین کرسی پر بیٹھنے کے بجائے اس کے پیچھے کھڑا ہو کر بار کو گھورتے ہوئے بولا۔
”میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے اسے کیوں مارا تھا؟“

بار نے کچھ رک کر جواب دیا۔ ”کچھ بدتمیزی کی تھی اس نے۔“

”کیا بدتمیزی کی تھی؟“

”مجھے۔“ بار نے اس مرتبہ بھی ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس نے..... اس نے..... شوکت باجوہ کا چہرہ کہا تھا۔“

”شوکت باجوہ۔“ ڈی آئی جی کیف نے کہا۔ ”سابق ایم این اے؟“

”جی۔“

”گزشتہ دنوں میں نے تمہارے ٹھاٹھاٹ دیکھ کر اپنے طور پر تحقیق کروالی تھی۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم شوکت باجوہ کے ایڈوائزر بن گئے ہو۔ مجھے بھی سے تشویش تھی کہ نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا اور ایسا آخر ہو کر رہا۔ یہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ ناصر جمال کے ساتھ اس کے باڈی گارڈز نہیں تھے ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ تمہیں ناصر جمال پر جھپٹے دیکھ کر وہ تم پر گولی چلا دیتے۔ میری معلومات کے مطابق وہ ہوٹل میں مقیم کسی شخص سے ملنے گیا تھا۔ کیونکہ اس کی تصویر بھی

کسی اخبار میں نہیں چھپی اور وہ ٹی وی چینلز پر بھی کبھی نہیں آیا اس لیے اسے اطمینان ہوگا کہ کوئی اسے پہچان نہیں سکے گا۔“

”میں نے بھی اسے نہیں پہچانا تھا۔“ بار بولا۔ ”لیکن جب اس نے بدتمیزی کی تو میں سمجھ گیا کہ وہ باجوہ صاحب کی کسی مخالف سیاسی پارٹی کا آدمی ہوگا۔“

”اسی لیے تم نے جھپٹ کر اس کے جڑے پر گھونسا مار دیا۔“ کیف ہمدانی نے تیز لہجے میں کہا۔ ”غالباً تم نے سوچا ہوگا کہ تمہیں حق نمک ضرور ادا کرنا چاہیے۔“

بار خاموش رہا۔
اب کیف ہمدانی گھوم کر اپنی کرسی کے آگے آیا اور بیٹھ کر بار کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”میں نے رات کے واقعے کی مکمل تحقیقات کروائی ہے..... لیکن کیا تم بتاؤ گے کہ واقعہ کس طرح پیش آیا؟“

بار کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔ میں اسے بھی نہیں جانتا۔ اس نے آنکھوں سے میری طرف اشارہ کر کے ناصر جمال سے کچھ کہا تھا۔ جواب میں ناصر جمال نے ہنس کر کہا کہ اس کے علم کے مطابق باجوہ نے آج کل عجیبے جمع کرنا شروع کر دیے ہیں۔ اسی بات پر مجھے غصہ آ گیا۔“

”کیوں؟“ کیف ہمدانی نے تیز لہجے میں کہا۔ ”کیا تم باجوہ کے عجیبے ہو جو تم کو غصہ آیا؟ باجوہ نے تم کو اپنا ایڈوائزر بنایا ہے۔“

”لیکن اس نے جملہ مجھ پر ہی کسا تھا۔“

”ابھی تم کہہ چکے ہو کہ تم اسے جانتے نہیں تھے؟“

”جی۔“ بار نے کہا۔ ”کچھ لوگوں نے بہت تیزی سے بیچ بچاؤ کر دیا تھا اور انہی میں سے کسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپوزیشن کی ایک جماعت کا ایم پی اے ناصر جمال ہے۔“

”شوکت باجوہ کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟“

”وہ ایک سابق ایم این اے ہیں؟“

”سابق کیوں؟“

اس سوال پر بار خاموش رہا۔

”نہیں بتانا چاہتے؟“ کیف ہمدانی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”خیر! میں تو جانتا ہوں۔ وہ اگرچہ حکمران جماعت سے تعلق رکھتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ انتخابات میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے کامیاب ہوا تھا لیکن بعد میں حکومتی پارٹی کے ساتھ ہو گیا تھا۔ وہ دو سال تک ایم این اے رہا اور ایک سال قبل سابق ایم این اے ہو گیا۔ دو سال پہلے اس پر اپوزیشن نے کچھ سنگین الزامات عائد کیے تھے۔ کچھ

معاملات عدالت میں ابھی کسی وجہ سے التوا کا شکار ہیں لیکن ایک مقدمے میں سال بھر قبل ہائی کورٹ نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ اس فیصلے کے باعث اسمبلی سے اس کی رکنیت ختم ہو گئی۔“

”یہ معاملات اتنی وضاحت کے ساتھ میرے سامنے نہیں آئے۔ باجوہ صاحب نے مجھے اتنا کچھ نہیں بتایا۔“

”خوب!“ کیف ہمدانی کا لہجہ اب بھی طنزیہ تھا۔ ”تم اس کے ایڈوائزر ہو اور اس نے تمہیں وضاحت سے کچھ نہیں بتایا۔“

”انہوں نے مجھے صرف ایک کام سونپا ہے۔“

”وہ کیا؟“

”میں ان کی کیرئیر بلڈنگ کروں۔“

”واہ! اور تم اس کی کیرئیر بلڈنگ اس طرح کر رہے ہو کہ ایک ایم پی اے کے منہ پر گھونسا مار بیٹھے۔“

”وہ میرا ایک جذباتی قدم تھا۔“

”اس کی کیرئیر بلڈنگ تم کس طرح کر سکو گے؟“

”میں ایک اخبار میں اس کے لیے کالم لکھ رہا ہوں۔“

اس جواب نے کیف ہمدانی کو چونکا دیا۔ ”میں نے تمہارا نام کسی اخبار میں نہیں دیکھا۔“ اس نے کہا، پھر تیزی سے بولا۔ ”مگر ہاں..... ایک اخبار میں جاوید اشرفی کے نام سے ایک کالم چھپ رہا ہے جس میں شوکت باجوہ کے بارے میں، بلکہ اس کے کردار کے بارے میں کچھ مثبت باتیں ہوتی ہیں۔“

”وہ کالم فرضی نام سے میں ہی لکھ رہا ہوں لیکن یہ بات آپ سے پہلے میں نے کسی پر افشا نہیں ہونے دی۔ اخبار والے بھی نہیں جانتے کہ جاوید اشرفی کون ہے۔ میں مضمون تائپ کر کے میل کر دیتا ہوں۔“

”وہ تمہیں اس کا معاوضہ کیسے دیتا ہے؟ میرا مطلب ہے، وہ اخبار.....“

”میں معاوضہ نہیں لیتا۔ اگر لیتا تو مجھے کم از کم اپنا اکاؤنٹ نمبر تو دینا ہوتا اور اس طرح اخبار والوں پر میرا نام ظاہر ہو جاتا۔“

”مفت میں کالم لکھنے کے لیے بھی اتنے بڑے اخبار کے دروازے ہر ایک کے لیے نہیں کھلتے۔“

”مجھے علم نہیں کہ اس کا بندوبست باجوہ صاحب نے کس طرح کیا ہوگا۔ بس انہوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں کسی فرضی نام سے اس اخبار کو کالم بھیجنا شروع کر دوں۔ میں نے اپنی میل کی آئی ڈی اسی فرضی نام سے بنائی ہے۔ اسی سے اخبار کو مضمون بھیجتا ہوں۔“

”اور باجوہ تمہارے اس کام سے بہت خوش ہے۔“

پانچواں آدمی

کیف ہمدانی نے چپچپے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اسی لیے تمہیں اس نے نئی کار بھی دلوا دی ہے۔“

بار نے جلدی سے نظریں اٹھا کر کیف ہمدانی کی طرف دیکھا۔

”میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی کہ تم چونکو۔“ کیف ہمدانی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”تم اسی کار پر یہاں آئے ہو، بات یہ ہے کہ میں اس کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں لیکن مت بھولو کہ میں اس محکمے کا ڈپٹی انسپکٹر جنرل ہوں۔ مجھے یہیں بیٹھے بیٹھے بہت سی اطلاعات مل جاتی ہیں۔ یہ کار کل شام سے تمہارے پاس ہے۔“

بار خاموش رہا۔

ڈی آئی جی کیف ہمدانی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تم یہ بھی نہیں جانتے ہو گے کہ اسمبلی سے اس کی رکنیت کیوں ختم ہوئی اور اس پر کیا کیا الزامات ہیں؟“

”الزامات تو الزامات ہی ہوتے ہیں۔ مجرم کوئی اس وقت بتا ہے جب اس پر الزامات ثابت ہو جائیں۔“

”ایک الزام ثابت ہو چکا ہے جس کے باعث اسمبلی سے اس کی رکنیت ختم ہوئی۔“

”وہ ایک اخلاقی معاملہ تھا۔“

”بداخلاقی کا معاملہ تھا۔“ کیف ہمدانی نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اس کے علاوہ کروڑوں روپے کے دواسکیڈلز کا الزام بھی ہے اس پر..... اس کی دو شوگر ملز بھی ہیں۔“

”وہ اس کے بھائی کی ہیں۔“

”بھائی کی نہیں، بھائی کے نام پر ہیں۔“ کیف ہمدانی نے تلخی سے کہا۔ ”جب وہ ایم این اے نہیں بناتا تھا تو اس کے اور نہ اس کے بھائی کے مالی حالات اتنے اچھے تھے کہ وہ شوگر ملز قائم کر سکیں۔“

”معاملات ابھی عدالت میں زیرِ سماعت ہیں۔ وقت آنے پر ثابت ہو جائے گا کہ باجوہ صاحب پر لگائے جانے والے الزامات غلط ہیں۔“

کیف ہمدانی نے فوراً کچھ نہیں کہا۔ بس پچیس سیکنڈ تک بار کو گھورتا رہا، پھر بولا۔ ”خیر! میں اب اس معاملے میں تم سے زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتا لیکن تم بھائی صاحب کے اکلوتے بیٹے اور میرے بھتیجے ہو، اس لیے میں تمہیں خبردار ضرور کرنا چاہوں گا۔“

اب بار سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

کیف ہمدانی بولا۔ ”باجوہ کے مقدمات عدالت میں ہیں لیکن اس کے بارے میں مزید تفتیش بھی جاری ہے۔“

اس مرتبہ بابر نے ایس ایم ایس کرنے کے بجائے وہ نمبر ملا یا جس نمبر سے ایس ایم ایس آرہے تھے۔

دوسری طرف کھٹی بجتی رہی لیکن کال ریسو نہیں کی گئی۔ بابر نے منہ بنا کے رابطہ منقطع کیا اور موبائل ایک طرف ڈال دیا۔ اسے خیال آیا تھا کہ اس کا کوئی جاننے والا اپنا وقت گزارنے کے لیے یہ حرکت کر رہا تھا۔

رات ہو چکی تھی۔ بابر اپنے بستر پر لیٹا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ بیج ٹون پھر سنائی دی۔ بابر نے منہ بنا کے موبائل اٹھایا۔ اس مرتبہ یہ پیغام آیا تھا۔

”مجھ سے بات کرنے کی کوشش فصول ہوگی۔ تم مجھے کسی اجنبی نمبر سے رنگ کرو گے تب بھی میں کال ریسو نہیں کروں گا۔ ہم فی الحال صرف ایس ایم ایس کے ذریعے گفتگو کر سکتے ہیں۔“

بابر نے پھر منہ بنا کر موبائل ایک طرف ڈال دیا تھا۔ اسے اس قسم کی وقت گزاری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کچھ وقفے سے بیج ٹون پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ بابر نے موبائل اٹھا کر دیکھا بھی گوارہ نہیں کیا۔ دو تین منٹ بعد بیج ٹون پھر سنائی دی۔

بابر نے جھنجھلا کر موبائل اٹھایا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ میسج دیکھنے کے بعد وہ جواب دیے بغیر موبائل آف کر کے رکھ دے گا لیکن اس مرتبہ کی عبارت ایسی تھی جس نے بابر کو چونکا دیا۔

اسکرین پر حرف چمک رہے تھے۔ ”سوچ لو! تمہیں ایک کالم کے عوض دس ہزار روپے مل سکتے ہیں۔“

اس مرتبہ بابر کی ہلکیس تک نہیں جھپکیں۔ اس کی نظر پیغام پر جم کر رہ گئی تھی اور دماغ میں یہ خیال چکرانے لگا تھا کہ کوئی بھی اہم طاقت کسی بھی وقت کسی کو اپنا آلہ کار بنانے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔

خیالات سے باہر آ کر بابر نے پچھلا پیغام دیکھا۔ ”تمہیں ایک کالم کے عوض دس ہزار روپے مل سکتے ہیں۔ مہینے میں چار کالم! چالیس ہزار روپے۔“

ایک بار پھر بیج ٹون سنائی دی۔ بابر نے نیا پیغام دیکھا۔

”تم جواب نہیں دے رہے ہو۔ خیر! سوچ لو۔ قسمت کی دیوی دروازے پر بار بار دستک نہیں دیتی۔ تم اسے اگر مذاق سمجھ رہے ہو تو اب میں تمہیں میسج نہیں بھیجوں گا۔“

بابر نے تیزی سے سوچا۔ شاید یہ مذاق نہ ہو اور بات وہی ہو جو چند لمحے پہلے اس کے دماغ میں چکرانی تھی۔

ڈیٹی ایڈیٹر کو دیا۔ ڈیٹی ایڈیٹر کو اس لیے کہ ایڈیٹر یا چیف ایڈیٹر تک پہنچنے کے لیے کسی سفارش کی ضرورت تھی لیکن اس کا وہ مضمون بھی نہیں چھپا۔

اس کا پچا ڈی آئی جی تھا۔ اس کی سفارش سے بابر کو تعلیم مکمل کرتے ہی کوئی اچھی ملازمت مل سکتی تھی لیکن کیف ہدانی، بابر کے خیال کے مطابق ”تصورات کی دنیا کا اصول پرست“ تھا۔ سفارش کا سخت مخالف!

”میں خود کسی سفارش کے بغیر صرف اپنی صلاحیت کے بل بوتے پر اس عہدے تک آیا ہوں۔“ کیف ہدانی کا کہنا تھا۔

یہ بات درست ہو سکتی تھی لیکن بابر اپنے معاملے میں جن تجربات سے گزرتا رہا تھا، وہ اس کے لیے تلخ ہی تھے۔ اس کا مشاہدہ تھا کہ اس سے کم تعلیم یافتہ اور کم صلاحیت کے لوگوں کو سفارش سے اچھی اچھی ملازمتیں مل گئی تھیں۔ وہ اخبارات میں بھی پڑھتا رہتا تھا کہ حکومت میں جو بھی پارٹی آتی تھی، اس کے پسندیدہ لوگ کم تعلیم یافتہ اور کم صلاحیت ہونے کے باوجود بڑے بڑے منصبوں پر فائز ہو جاتے تھے۔

اس معاشرتی جی اور بے انصافی کو بابر محسوس کرتا رہا اور اس کے رگ دپے میں رہنے بسنے والی کٹی بڑھتی ہی رہی۔ کبھی کبھی تو اس کے دماغ میں یہ خیال بھی آ جاتا تھا کہ اگر کبھی اسے کسی غلط کام کے سہارے بھی اپنی زندگی بنانے کا موقع ملا تو وہ اسے گنوائے گا نہیں۔

زندگی کے اسی بحران میں اپنے موبائل پر وہ پیغام ملا تو اس نے اسی اجنبی نمبر پر جوابی پیغام بھیجا۔

”میں نے بھی کوئی اچھا مضمون نہیں لکھا۔ جبکہ مارتا رہا ہوں۔“

”نا قدری کا شکار ہوئے ہو تم۔“ پیغام آیا۔

”تم ہو کون؟“ بابر نے ایس ایم ایس کے ذریعے پوچھا۔

”تمہارا ایک قدر داں۔“

”کیا تم مجھے اسکول یا کالج کے زمانے سے جانتے ہو؟“

”نہیں۔“ جواب آیا۔ ”میں تمہارے لیے قطعی اجنبی ہوں۔“

”کسی اجنبی کو میرے معاملات سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟“

”اچھا سوال کیا تم نے، لیکن ابھی میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔“

کالم ہو جاتا تو ابھی سے ان کی جان آدمی ہو جاتی۔ میں نے تمہیں سب اونچ نیچ سمجھا دی ہے۔ تمہارے حق میں بہتر ہوگا کہ باجود سے اپنی جان چھڑالو۔“

بابر خاموش رہا۔

”بس۔“ کیف ہدانی نے کہا۔ ”اب تم جا سکتے ہو۔ میری باتوں پر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا۔“

بابر کھڑا ہوا اور سلام کر کے دروازے کی طرف مڑ گیا۔ کیف ہدانی تشویش زدہ نظروں سے اپنے بھتیجے کو جاتے دیکھتا رہا۔

بابر کی زندگی میں وہ انقلاب کچھ پراسرار انداز میں آیا تھا۔ ایک روز اسے اپنے موبائل پر ایک اجنبی نمبر سے میسج ملا۔

”تم بہت اچھے مضمون نگار ہو!“

بابر پیغام پڑھ کر بہت کچھ سے مسکرا دیا تھا۔ اسے خیال آیا تھا کہ پیغام بھیجنے والی ہستی اس کے اسکول یا کالج کے زمانے کا کوئی دوست ہو سکتا تھا اور وہ دوست یا شناسا کوئی لڑکی بھی ہو سکتی تھی۔ مضمون نگاری کا شوق بابر کو نو عمری ہی سے تھا۔ ساتویں جماعت کے زمانے ہی میں اس نے مضمون لکھنا شروع کر دیے تھے۔ وہ اسکول کے سالانہ جریدوں میں چھپے بھی اور انہیں سراہا بھی گیا تھا۔ کالج کے زمانے میں اس نے سیاست پر مضمون نگاری شروع کی تھی اور چاہا تھا کہ وہ بڑے اخباروں میں شائع ہوں لیکن بڑے اخبارات نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ چھوٹے موٹے اخبارات نے اس کے مضامین شائع تو کیے تھے لیکن اس طرح جیسے خالی جگہ رہ جانے کی صورت میں انہیں کام میں لایا گیا ہو۔ وہ مضامین بروقت شائع نہ ہونے کے باعث بے مزہ ہو گئے تھے۔ اس سے بابر نے دل شکستہ ہو کر مضمون نگاری چھوڑ دی تھی۔ پھر تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب وہ کسی اچھی ملازمت کی تلاش میں تھا تو اسے کالم نگاری کا خیال لوگوں کی یہ باتیں سن کر آیا تھا کہ بیشتر کالم نگاروں کو کسی سیاسی جماعت یا کسی سیاست داں کی پشت پناہی حاصل ہو جاتی تھی اور اس پشت پناہی کے باعث کالم نگاروں کو غیر معمولی آسودگی حاصل ہو جاتی تھی۔

بابر کو کسی بھی سیاست داں یا کسی سیاسی پارٹی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے خیال کے مطابق وہ کبھی مفاد پرست تھے۔ ملک و قوم سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن بابر نے سوچا تھا کہ وہ کسی کا بھی آلہ کار بن سکتا ہے۔ اسے صرف اپنی زندگی بنانے سے دلچسپی تھی۔ اس نے ایک روز ”کرنٹ افیئر“ کے حوالے سے ایک مضمون لکھا اور خود جا کر ایک اخبار کے

مجھے ڈر ہے کہ تم کسی خفیہ ایجنسی کی نظر میں آ جاؤ گے یا شاید آچکے ہو۔ ان لوگوں سے یہ بات بھی چھپی نہیں رہ سکے گی کہ تم ایک اخبار میں فرضی نام سے شوکت باجود کے بارے میں لکھتے رہتے ہو۔“

”فرضی نام سے کسی اخبار میں لکھنا کوئی جرم تو نہیں؟“

”ہاں یہ تو جرم نہیں لیکن خفیہ ایجنسی یہ ضرور سوچ سکتی ہے کہ تمہیں فرضی نام سے لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ خفیہ ایجنسی کے لیے یہ بات بھی چونکا دینے والی ثابت ہو سکتی ہے کہ تمہارے مالی حالات بہت تیزی سے بہتر ہو رہے ہیں۔ ایک ایڈوائزر کو باجود کا اتنا زیادہ نوازنا بھی ایجنسی کی نظر میں معنی خیز ہو سکتا ہے۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ باجود پر ایک غیر قانونی کام جاری رکھنے کا شبہ بھی کیا جا رہا ہے۔ اگر اس معاملے میں کسی بھی وجہ سے تم پر کوئی شبہ ہو گیا تو تم مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ اس صورت میں یہ نہ سوچنا کہ اس شہر کا ڈی آئی جی تمہارا چچا ہے۔ میں اس قسم کے معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا گا۔“

”اگر میں آپ کی بات مان لوں کہ باجود صاحب کوئی غیر قانونی کام بھی جاری رکھے ہوئے ہیں تو بہر حال اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔“

”اور باجود اپنے ایڈوائزر کو بارہ لاکھ کی کار بھی دلوا چکا ہے۔“

”آج کل سیاست داں صحافیوں کو اس سے کہیں زیادہ دے رہے ہیں۔ شاید ہی کوئی صحافی ہوگا جس کا دامن اس معاملے میں صاف ہو۔“

”تم بھی اپنا شمار انہی ضمیر فروشوں میں کروانا چاہتے ہو؟“

”میں نے اپنا ضمیر نہیں بیچا۔ مجھے اپنی صلاحیتوں کا معاوضہ مل رہا ہے۔ میرا کالم بہت مقبول ہو چکا ہے۔ عوامی سطح پر کافی لوگ میری ہی تحریروں کی وجہ سے یہ سوچنے لگے ہیں کہ شوکت باجود کسی سازش کا شکار ہوئے ہیں۔“

”مجھے ڈر ہے کہ اگر تم کسی سازش کا شکار ہو گئے تو بھائی صاحب کے وہ سارے خواب بکھر جائیں گے جو انہوں نے تمہارے لیے دیکھے تھے۔“

”میری کامیابیوں سے ان کے خواب بکھر جائیں گے؟“

”کامیابیوں کی نوعیت بھی دیکھی جاتی ہے۔ خیر! میں اب ان باتوں کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ میں نے تمہیں اپنے دفتر اس لیے بلا یا تھا کہ بھائی صاحب کو ان سب باتوں

”میں تمہاری بات پر کیسے یقین کر لوں؟“ بابر نے میسج بھیجا۔
 ”میں تمہارے اکاؤنٹ نمبر سے بھی واقف ہوں اور اس بات سے بھی کہ اس وقت تمہارے اکاؤنٹ میں چند سو روپے پڑے ہیں۔ تم کل ڈھائی بجے کے بعد اپنے بینک جا کر اپنا بیلنس معلوم کرنا۔“
 ”کیوں؟“

”تمہارے اکاؤنٹ میں دس ہزار روپے کا اضافہ ہو چکا ہوگا۔ یہ تمہارے ایک کالم کی ایڈوائس رقم ہوگی۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ بابر نے میسج کیا۔ ”میں کل بینک جا کر یہ جان لوں گا کہ مجھ سے مذاق کیا گیا ہے۔“
 لیکن وہ مذاق نہیں تھا۔ بابر نے دوسرے دن ڈھائی بجے اپنے بینک جا کر دیکھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں دس ہزار کا اضافہ ہو چکا تھا۔

بابر نے کاؤنٹر کلرک سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اس کے اکاؤنٹ میں اسی دن دس ہزار روپے کس نے جمع کرائے تھے لیکن اسے معلوم نہیں ہو سکا۔ اگر وہ بینک کا اہم اکاؤنٹ ہولڈر ہوتا، تبھی کاؤنٹر کلرک کو جمع کرانے والے کی شخصیت یاد رہ سکتی تھی۔ بابر کے اکاؤنٹ میں تو کبھی ایک ہزار سے زیادہ نہیں رہے تھے۔ اسے اپنے والد سے جیب خرچ کے لیے بھی اتنی زیادہ رقم نہیں ملتی تھی۔
 تین بجے بابر کے موبائل پر میسج آیا۔ بابر نے وہ بڑی بے قراری سے دیکھا۔ ”یقین آگیا؟“ پیغام کے ذریعے پوچھا گیا تھا۔
 ”ہاں۔“

”اب کیا ارادہ ہے؟“
 ”کیا لکھوانا چاہتے ہو؟“
 ”گڈ! اس کا مطلب ہے کہ تم تیار ہو..... ٹھیک! تم کل کا اخبار دیکھ کر کسی بھی اہم خبر پر کالم کی صورت میں اپنی سوچ کا اظہار کر دو۔“
 بابر کو اس جواب پر تعجب ہوا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق تو اس سے کسی خاص انداز میں لکھوانے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔

”خاموش کیوں ہو گئے؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔
 بابر نے جھوٹا جواب دیا۔ ”میں سوچنے لگا تھا کہ اس کالم کا ہوگا کیا؟ وہ کہیں چھپنے سے تو رہا!“
 ”چھپے گا۔“ دوسری طرف سے جواب آیا۔

”کہاں؟“

دوسری طرف سے ایک بڑے اخبار کا نام بتا کر لکھا گیا۔ ”اور کالم تم ایک فرضی نام سے لکھ کر اخبار کے دفتر میں ایڈیٹر گردیزی کے گھر فیکس کر دو گے۔ اس کا فیکس نمبر لکھ لو۔“ اس نے نمبر بتانے کے بعد پوچھا۔ ”تمہارے پاس کمپیوٹر تو ہے نا؟“
 ”ہاں، کمپیوٹر تو ہے۔“

”بس تو پھر.....! ہاں ایک کام اور کرنا۔ مضمون پر اپنے نام کے ساتھ معرفت گلاب شاہ ضرور لکھ دینا۔ پھر یہ نام ممکن ہے کہ پرسوں کے اخبار میں تمہارا کالم شائع نہ ہو۔“
 ”اس کے بعد؟“
 ”تمہارا کالم دیکھ لوں۔ اس کے بعد بات ہوگی۔“
 ”کیا تم سے ملاقات نہیں ہو سکتی؟“ بابر نے پیغام بھیجا۔

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔
 بابر نے کھوئے کھوئے سے انداز میں موبائل اپنی جیب میں ڈال لیا۔ بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکرارہے تھے۔
 اس نے دوسرے دن کے اخبارات کی خبریں دیکھیں اور ایک تنازعہ معاملے پر کالم لکھ کر فیکس کر دیا۔
 پھر اگلے دن اس نے اخبار دیکھا۔ اس کا مضمون اخبار میں تھا۔

ایک گھنٹے بعد اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ بابر یہ دیکھ کر چونک گیا کہ کال اسی نمبر سے آئی تھی جس سے ایس ایم ایس آتے رہے تھے۔

”ہیلو!“ بابر کی آواز جانے کیوں بھرا گئی۔
 ”بہت اچھا کالم لکھا ہے تم نے!“ دوسری طرف سے اردو ہی میں کہا گیا مگر لہجہ اہل زبان کا نہیں تھا۔
 ”شکریہ۔“ بابر نے کہا۔

”اب تم آج شام شوکت باجوہ صاحب سے مل لو۔ یہ نام تمہارے لیے اجنبی تو نہیں ہوگا۔“
 ”نہیں۔“ بابر نے طویل سانس لی۔ ”نامور سیاست دانوں کے نام سے کوئی بھی پڑھا لکھا شخص ناواقف نہیں ہو سکتا۔“

”بس تو آج شام ان سے مل لو۔“
 دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔
 شام کو بابر، شوکت باجوہ سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا۔ کلین شیو شوکت باجوہ خاصی بھاری بھر کم شخصیت کا

مالک تھا مین اس کی چھتیا درمیان سے صاف لی۔
 آنکھیں سیاہ اور چمک دار تھیں۔ بابر نے اسے بتایا کہ اسے گلاب خان نے بھیجا ہے۔

اسی وقت ایک مختصر میٹنگ میں طے پا گیا کہ آئندہ بابر کو کس انداز میں لکھنا ہے۔ اس کی تنخواہ بھی طے ہو گئی، پچاس ہزار!

بابر نے اپنے گھر والوں کو اپنی تنخواہ کم بتائی تھی۔ اس کے بعد کالم نگاری کا سلسلہ چل پڑا۔ شوکت باجوہ سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں۔

گلاب شاہ سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی۔ بابر کے خیال کے مطابق وہ کوئی غیر ملکی تھا جس نے اردو بولنا سیکھ لی تھی۔ یہ سمجھ کر بابر کو حیرت نہیں ہوئی تھی۔ پہلے ہی اس کا خیال تھا کہ اس کے ملک کے بیشتر سیاست دان کسی بڑی طاقت کے اشاروں پر کام کرتے تھے۔

بابر کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ کون کس کے لیے کام کر رہا تھا۔ اسے اپنے ملک کی مفاد پرستانہ سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی آسودگی کے لیے یہ کافی تھا کہ اب اس کی تنخواہ ستر ہزار روپے ہو گئی تھی اور وہ ایک کار کا مالک بھی بن گیا تھا۔

اس کے والد سیف ہمدانی ان حالات سے پریشان تھے۔

”یہ سب کچھ تمہارے پاس کہاں سے آرہا ہے بابر؟“
 انہوں نے ایک دن پوچھا تھا۔
 ”میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں شوکت باجوہ صاحب کا ایڈوائزر بن گیا ہوں۔“ بابر نے جواب دیا تھا۔
 ”ایڈوائزر کو اتنا نوازا جاتا ہے؟“

”اس سے کہیں زیادہ۔“ بابر نے جواب دیا۔ ”آج کی سیاست میں پیسا بہت اچھالا جاتا ہے۔“

”جہاں زیادہ پیسا اچھالا جاتا ہے، وہاں اچھے کام نہیں ہوتے..... مجھے ڈر ہے تم کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔“
 ”جہاں زیادہ پیسا اچھالا جاتا ہے، وہاں کوئی پھنستا بھی نہیں ہے۔ پھر یہ کہ میں شوکت باجوہ صاحب کو برا آدمی نہیں سمجھتا۔“

”ہمارے سیاست دانوں میں اب شاید ہی کوئی بے داغ ہو۔“

”باجوہ صاحب اچھے آدمی ہیں۔ انہیں پروپیگنڈا کر کے بدنام کیا گیا تھا لیکن اب آہستہ آہستہ عوام کو یقین آتا جا رہا ہے کہ باجوہ صاحب کے خلاف سازشیں کی گئی ہیں ورنہ

وہ ایسے آدمی ہیں۔“
 ”عوام کی رائے میں تبدیلی کا سب سے بڑا سبب جاوید اشرفی کے کالم ہیں۔“

اس بات پر بابر باپ سے نظر بچا کر زیر لب مسکرا دیا۔
 ”وہ غضب کا قلم کار سامنے آیا ہے۔“ سیف ہمدانی کہتے رہے۔ ”نہایت جاوید اثر فقرے لکھتا ہے وہ شوکت باجوہ کے حق میں! مجھے یقین ہے کہ اسی کی وجہ سے لوگ شوکت باجوہ کے حق میں ہوتے جا رہے ہیں۔“

بابر کو اسی بات سے یقین ہوا تھا کہ اس کے چچا کیف ہمدانی نے اس کا یہ ”راز“ اس کے باپ پر افشا نہیں کیا تھا کہ جاوید اشرفی کے نام سے کالم لکھنے والا وہی تھا۔

اپنی بہن عنبر کی فرمائش پر ایک خاص قسم کا ایمریشن جیولری سیٹ خریدنے کے لیے بابر شہر کے ایک بہت ماڈرن شاپنگ سینٹر میں داخل ہوا ہی تھا کہ رخسار سے آنا سامنا ہو گیا جو ڈی آئی جی کیف ہمدانی کی بیٹی تھی۔ اس کے ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھا۔ وہ کچھ خریداری کر کے جا رہی تھی۔
 ”ہائے بابر!“ رخسار اسے دیکھتے ہی پرجوش ہو گئی۔
 ”ہائے!“ بابر مسکرایا۔

دونوں آمنے سامنے رک گئے تھے۔
 ”کہاں ہوا تھے دن سے؟“ رخسار نے شکایت کرنے والے انداز میں پوچھا۔

کیف ہمدانی سے بات کرنے کے بعد بابر اس کے گھر نہیں گیا تھا۔ اس کی ہمت ہی نہیں ہو سکی تھی۔ وہ ہنس کر بولا۔
 ”ابھی پرسوں ہی تو تم آئی تھیں گھر! ملاقات تو ہوئی تھی۔“
 ”تم تو نہیں آئے نا.....! وہاں تو میں چچا جان اور چچی جان کے سامنے تم سے کوئی خاص بات نہیں کر سکتی تھی۔“

”کوئی خاص بات؟“
 ”ہاں۔ آؤ ذرا کینٹین میں بیٹھتے ہیں۔ تمہیں جلدی تو نہیں ہے؟“
 ”نہیں۔“

وہ دونوں شاپنگ سینٹر کی اوپری منزل پر بنی ہوئی خوب صورت کینٹین میں جا پہنچے۔ میز پر بیٹھتے ہی رخسار نے کافی کا آرڈر دے دیا۔ وہ جانتی تھی کہ بابر شام کے بعد کافی پینا پسند کرتا تھا۔

”اب بولو! اگر کوئی خاص بات تم ابا جان کے سامنے نہیں کرنا چاہتی تھیں تو مجھ سے موبائل فون پر بات کر سکتی تھیں۔ نمبر تو ہے نا تمہارے پاس!“

موباس پر کسی بات چیت کرنے سے بچے بہت الجھن ہوتی ہے۔" رخسار نے جواب دیا۔

"اچھا تو اب بتاؤ!"

"تم کسی بہت اچھی جگہ ملازم ہو گئے ہو؟"

"ہاں۔"

"ڈیڈی نے سرسری طور پر بتایا تھا مجھے! ویسے تمہارے حالات بھی سامنے ہی ہیں۔ کار بھی آگئی ہے تمہارے پاس!"

"ہوں۔" بابر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"خیر!" رخسار نے اپنی گھڑی پر نظر ڈال کر کہا۔ "مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے اس لیے میں تمہاری ملازمت کی نوعیت کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گی۔ صرف یہ بتاؤ کہ....." وہ ذرا سارکی، پھر نظریں جھکا کر بولی۔ "جب تم زیرِ تعلیم تھے، اس وقت تم مجھ سے کس طرح ملتے تھے؟"

اب بابر نے نظریں جھکا لیں۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ رخسار سے محبت کرتا تھا، اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات رخسار نے نہ صرف سمجھ لی تھی بلکہ وہ بھی بابر کو جاننے لگی تھی۔ اگرچہ اظہارِ محبت کی نوبت بھی نہیں آئی تھی لیکن اشاروں کنایوں میں ان دونوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ سن لیا تھا۔

بابر کو تو قہقہے کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسے کوئی بہت اچھی جاب مل جائے گی لیکن جب ایسا نہ ہوا اور بابر کو ٹھوکریں کھانا پڑیں تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ رخسار کا خیال اپنے ذہن سے نکال دے۔

رخسار اس کی چچا زاد بہن سہی لیکن ایک مال دار باپ کی بیٹی تھی جس نے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی۔ بابر اسے وہ عیش و عشرت کی زندگی تو کیا، آسودہ حالی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد ہی اس نے رخسار سے کٹنا شروع کر دیا تھا۔

اب کچھ عرصے سے بابر کے حالات ٹھیک ہو گئے تھے اور اسے مزید بہتر مستقبل کی توقع بھی ہو گئی تھی لیکن اب اس نے سوچا تھا کہ اس کی دو سال کی بے رخی محسوس کرنے کے بعد رخسار نے بھی اسے اپنے دل سے نکال دیا ہوگا۔ اسی لیے اس نے دوبارہ رخسار کی طرف جھٹکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

بابر کی وہ خاموشی اس لیے کچھ زیادہ طویل ہو گئی کہ اس کے دماغ میں ماضی کی وہ باتیں چکرانے لگی تھیں جو وہ اور رخسار ایک دوسرے سے کیا کرتے تھے۔ ویٹر کافی میز پر رکھ

رہا تھا تو بابر ان خیالات سے چونکا۔ رخسار نے بھی اتنی دیر تک خاموشی سادھے رکھی تھی۔ جب ویٹر چلا گیا تو رخسار بڑی سنجیدگی سے پیالیوں میں کافی بنانے لگی۔

کافی کی پیالی بابر کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "کافی پی کر ہم یہاں سے فوراً اٹھ جائیں گے۔ اگر تم میری بات کا جواب نہیں دینا چاہتے تو میں اصرار نہیں کروں گی۔ شاید مجھے اصرار کرنے کا حق بھی نہیں ہے۔"

"یہ بات نہیں رخسار!" بابر نے پہلو بدلتے ہوئے جذباتی انداز میں بڑی تیزی سے کہا۔ "تمہیں ہر بات کا حق ہے۔"

"تو پھر جواب دینے کے بجائے تم چپ کیوں ہو گئے؟"

"میں ماضی میں کھو گیا تھا۔"

"اس ماضی پر کچھ تار ہے تھے۔" رخسار پھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"تم پھر غلط سمجھ رہی ہو۔"

"تو صحیح کیا ہے، وہ سمجھا دو۔"

"میں..... میں....." بابر ذرا سا اٹکا لیکن اس کے بعد جذباتی انداز میں بولتا ہی چلا گیا۔ اس نے اپنے تمام خیالات رخسار پر ظاہر کر دیے۔

اس کی باتیں سنتے ہوئے رخسار کے چہرے کی افسردگی و حیرے دھیرے ختم ہوتی چلی گئی۔ بابر خاموش ہوا تو وہ بہت خوش نظر آنے لگی تھی۔ "اب کیا کہوں میں تمہاری اس بے ہنگم سوچ پر!" رخسار یکا یک ہنس پڑی، پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو کر جذباتی لہجے میں بولی۔ "میں تو قدم بہ قدم تمہارے ساتھ خارزار جنگلوں میں چلنے کے لیے بھی تیار ہوں بابر!"

اس جواب پر بابر اس شدت سے جذباتی ہوا کہ اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔ اس کے ہونٹ کپکپا گئے۔ نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

"بس ٹھیک ہے۔" رخسار نے اس سے نظریں ملائے بغیر مسکراتے ہوئے کہا۔ "کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے چہرے سے ظاہر ہو گیا کہ اب تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ ہم نے پہلے بھی کبھی زبان سے کچھ زیادہ نہیں کہا۔"

حقیقت یہی تھی۔ رخسار نے اس وقت کھل کر جتنا کچھ کہا تھا، ماضی میں وہ دونوں ایک دوسرے پر اتنے نہیں کھلے تھے۔

رخسار کی بات پر بابر مسکرا دیا۔

"چلو کافی ختم کرو۔" رخسار نے اپنی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے بتایا تھا تمہیں! اس وقت میں زیادہ

نہیں رک سکتی۔ گھر پر کچھ مہمان آنے والے ہیں۔ می نے مجھے تاکید کی تھی کہ جلدی لوٹوں۔"

"ایک مہینے بعد تمہارے امتحانات ہونے والے ہیں؟"

"بہت باخبر ہو!" رخسار شوخی سے مسکرائی۔

"تمہاری طرف سے بے خبر بھی نہیں رہا۔"

"تو سمجھ لو۔ اپنے بڑوں کو کچھ بتانے کے لیے ہمارے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔" یہ کہتے کہتے رخسار کی پلکیں جھک گئی تھیں۔

"ایک مہینہ بہت ہے اس کام کے لیے!" بابر بہت کھل کر مسکرایا۔

رخسار نے اپنے کالج کے کچھ دلچسپ قصے چھیڑ دیے۔ مقصد یہی تھا کہ ماضی کی طرح اب بھی کھل کر زیادہ باتیں نہ کی جائیں۔

کافی پی کر وہ دونوں کینٹین سے نکلے۔ بابر اپنے رگ وے میں مسرت کی لہریں دوڑتی محسوس کر رہا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ اسے کچھ خریداری کرنا تھی۔ وہ رخسار کے ساتھ شاپنگ سینٹر سے نکل آیا۔

"ارے!" رخسار ہی چونک کر بولی۔ "تم تو یہاں کچھ لینے آئے ہو گے نا؟"

"ہاں۔" بابر ہنس پڑا۔ "یاد ہی نہیں رہا۔ خیر چھوڑو۔ خرید لوں گا، پہلے تمہیں رخصت کر دوں۔ تمہاری گاڑی کہاں ہے؟"

"ادھر ہے۔" رخسار نے ایک طرف اشارہ کیا۔

"چلو۔" بابر نے اسی طرف قدم بڑھائے۔

"میں چلی جاؤں گی بابر! تم جا کے....."

"ارے چلو نہیں!" بابر نے اس کا بازو پکڑ کر اسے آگے بڑھایا۔ رخسار کا چہرہ یک لخت سرخ ہو گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب بابر نے اس کا جسم چھوا تھا۔ صرف بازو ہی سہی لیکن پہلے بھی وہ ایک دوسرے سے اتنا قریب بھی نہیں ہوئے تھے۔ فوراً ہی بابر کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ کیا کر بیٹھا تھا۔ اس نے جلدی سے رخسار کا بازو چھوڑ دیا۔ "سوری رخسار!" اس کے منہ سے نکلا۔

رخسار کچھ نہیں بولی۔ اسے بابر کی وہ حرکت بری نہیں لگی تھی لیکن پھر کار کے قریب پہنچنے تک وہ خاموش ہی رہی۔ "رات کو کسی وقت موبائل پر تم سے بات کروں گی۔"

اس نے کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں انتظار کروں گا رخسار!" بابر کا لہجہ خمار آلود ہو گیا۔

رخسار نے انجن اسٹارٹ کیا اور اسے اتنی احتیاط سے بیک کرنے لگی کہ دائیں بائیں کھڑی ہوئی کسی گاڑی سے نہ لگے۔ پارکنگ سے باہر نکل کر اس نے گاڑی سیدھی کی اور بابر کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ اس کے بعد وہ کار کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔

بابر مسکراتا ہوا واپس لوٹا۔ جب وہ دوبارہ شاپنگ سینٹر میں داخل ہو رہا تھا تو اس کے عقب میں بھگدڑ سی ہچی اور چینی ہوئی ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"بچاؤ۔"

بابر نے دیکھا کہ سڑک پر کھڑی ہوئی ایک کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور دو آدمی ایک لڑکی کو کار میں دھکیل رہے تھے۔ ان دونوں میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالتور تھا اور وہ اپنا ہاتھ اس طرح اوپر اٹھائے ہوئے تھا کہ ریوالتور وہاں موجود ہر شخص کو دکھائی دے جائے۔

ریوالتور ہی کی وجہ سے لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ "بچاؤ!" لڑکی ایک بار پھر چینی حالانکہ اسے کار میں دھکیلنے کے بعد ایک آدمی نے کار میں گھسنے کے بعد دروازہ بند کر لیا تھا۔ ریوالتور والے نے جلدی سے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھتے ہی کار بڑی تیزی سے حرکت میں آگئی۔

بابر سکتے کی سی حالت میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا۔ وہ بزدل تو نہیں تھا لیکن لڑکی کو بچانے کے لیے بے وقوفانہ بہادری بھی نہیں دکھا سکتا تھا۔ اس کا ارادہ بھانپتے ہی ریوالتور والا اس پر گولی چلا دیتا۔ کبھی لوگ تیزی سے منتشر ہونے لگے۔ ان دنوں شہر کے حالات کچھ ایسے ہی تھے۔ موبائل، موٹر سائیکلیں اور کاریں چھینی جارہی تھیں۔ بینکوں میں ڈاکے پڑ رہے تھے۔ اس قسم کی وارداتیں دیکھ کر لوگوں کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ جائے واردات سے دور نکل جائیں تاکہ انہیں پولیس کے بکھیرؤں میں نہ پڑنا پڑے۔

بابر اپنی کار کی طرف بڑھا۔ اس وقت اس کے ذہن میں تھوڑی سی خلش تھی۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ اس شخص کو پہلے کہیں دیکھ چکا ہے جس نے لڑکی کو کار میں دھکیلا تھا اور خود بھی اس کے ساتھ پچھلی ہی نشست پر بیٹھا تھا۔

بابر کو یاد نہیں آسکا کہ اس نے اس شخص کو پہلے کہاں دیکھا تھا۔ اس نے اپنی کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا۔

اور بہت سی کاریں بھی اسٹارٹ ہو رہی تھیں۔ جو لوگ شاپنگ سینٹر کے باہر تھے، وہ جلد از جلد وہاں سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔

بابر نے اپنی کار، پارکنگ سے نکالی۔ وہ بھی وہاں سے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپ کو تمام ڈائجسٹ
 ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
 ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
 ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔
 اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
 آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
 لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

آدی.....“
 پھر غالباً افروز کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا گیا تھا۔
 گردیزی نے مردانہ آواز سنی۔ ”اب بتاؤ گردیزی!“
 گردیزی اب کار کی طرف بڑھنے کے بجائے مرکز
 گھر کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے قدم بہت
 بوجھل تھے۔
 شوفر نے اسے واپس جاتے دیکھ کر تعجب سے سر ہلایا اور
 کار کا دروازہ بند کر دیا۔
 ”جواب دو گردیزی!“ اس مرتبہ مردانہ آواز میں سختی
 تھی۔
 ”نہ جانے کون ہو تم لوگ اور کیوں جاوید اشرفی کے
 بارے میں جاننا چاہتے ہو۔“ گردیزی اپنے خشک ہوتے
 ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا تھا۔
 ”اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔“ دوسری
 طرف سے کہا گیا۔ ”میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں، اس کا جواب
 دو۔“
 ”کیا جواب دوں میں تمہیں۔“ گردیزی اپنے گھر میں
 داخل ہو گیا تھا۔ ”میں نہیں جانتا کہ جاوید اشرفی کہاں رہتا
 ہے۔ میں بھی اس سے ملا ہی نہیں۔“
 ”ایسا جھوٹ نہ بولو، جس پر کوئی بچہ بھی یقین نہ کر سکے۔
 تم اس کے کالم چھاپتے ہو اور اسے جانتے بھی نہیں۔“
 ”یقین کرو، میں سچ کہہ رہا ہوں۔“
 گردیزی ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر اس طرح
 بیٹھا جیسے گر پڑا ہو۔
 ”گردیزی!“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”تمہاری
 بیٹی کو اغوا کرنے کے بعد ہم نے اب تک اسے کوئی تکلیف
 نہیں دی ہے لیکن تم اگر اپنی ضد پراڑے رہے تو پھر.....“
 ”خدا کے لیے میری بیٹی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں
 کرنا۔“ گردیزی کی آواز پہلے سے زیادہ کانپنے لگی۔ ”میں
 تمہیں قسم کھا کے بتا رہا ہوں کہ میں اس سے کبھی نہیں ملا۔ وہ
 اپنا مضمون ای میل کے ذریعے بھیجتا ہے۔“
 ”اور اپنا معاوضہ بھی ای۔ میل کے ذریعے لیتا ہے؟“
 طنز یہ انداز میں کہا گیا۔
 ”اس نے بھی معاوضے کی بات ہی نہیں کی۔ نہ کبھی اس
 نے مجھے فون کیا۔“ گردیزی نے اب اپنا حلق بھی خشک ہوتا
 محسوس کیا۔ ”اس کے مضمون بہت عرصے سے آرہے تھے۔
 مجھے پسند نہیں آتے تھے۔ پھر جب اس کے مضمون مجھے پسند
 آنے لگے تو میں نے چھاپنا شروع کر دیا۔“

دور جانا چاہتا تھا۔ اس وقت یہ بات اس کے سان کمان میں
 بھی نہیں آسکتی تھی کہ اس کے سامنے جو واردات ہوئی تھی، وہ
 خود اس کے لیے بھی ایک بڑی مشکل کھڑی کرنے والی تھی۔
 ✽✽✽
 اخبار پر اس کا نام کے، ایس گردیزی چھپتا تھا، اس کے
 اخبار نے کچھ ہی عرصہ پہلے تیزی سے ابھرنا شروع کیا تھا۔ وہ
 اس اخبار کا چیف ایڈیٹر بھی تھا اور مالک بھی! اسی کے اخبار
 میں بابر کا کالم جاوید اشرفی کے نام سے چھپتا تھا۔
 آٹھ بجتے والے تھے جب وہ اخبار کے دفتر جانے کے
 لیے اپنے بنگلے سے نکلا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے شوفر نے
 پورچ میں کھڑی ہوئی اس کی کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔ گردیزی
 اس کی طرف دو ہی قدم بڑھا تھا کہ اس کے کوٹ کی جیب میں
 پڑے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے موبائل
 جیب سے نکالا اور اسے آن کرتے ہوئے کان سے لگا لیا۔ بے
 دھیانی میں اس نے اسکرین پر نظر ڈال کر یہ نہیں جانتا تھا کہ کال
 کس کی تھی ورنہ ایک اجنبی نمبر دیکھ کر وہ کال ریسیو ہی نہیں
 کرتا۔ کچھ دن سے اس نے یہی رویہ اختیار کر رکھا تھا۔
 ”ییس!“ وہ ماڈتھ پیس میں بولا۔
 ”ڈیڈی!“ دوسری طرف سے اس کی بیٹی افروز کی چیختی
 ہوئی آواز آئی۔
 کار کی طرف بڑھتے ہوئے گردیزی کے قدم ٹھٹک کر
 رک گئے۔
 ”کیا بات ہے افروز؟“ وہ تیزی سے بولا۔
 لیکن اب اسے دوسری طرف سے اپنی بیٹی کے بجائے
 ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ”اب تو تمہیں بتانا ہی پڑے گا
 گردیزی کہ تمہارا کالم نگار جاوید اشرفی کہاں رہتا ہے۔ اگر تم
 نہیں بتاؤ گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ تمہاری بیٹی اس وقت
 میرے قبضے میں ہے۔“
 ”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ گردیزی کی آواز کانپ
 گئی۔
 ”اچھا تو پھر اپنی بیٹی کی آواز سن لو۔“
 گردیزی کا سارا جسم سنسنانے لگا تھا۔ اس نے افروز
 کی آواز سنی۔ ”انہیں بتا دیجیے نا ڈیڈی!“ وہ روہا سی آواز
 میں بول رہی تھی۔ ”ان لوگوں نے مجھے اغوا کر لیا ہے۔“
 ”کہاں ہو تم؟“ گردیزی کو خود ہی اپنی آواز کسی کنویں
 سے آتی محسوس ہوئی۔
 ”مجھے نہیں معلوم ڈیڈی! میری آنکھوں پر پٹی باندھ
 دی گئی تھی۔ اب میں ایک کمرے میں ہوں اور یہ تین

”ای میل ایڈریس کیا ہے اس کا؟“ طنزیہ انداز میں پوچھا گیا۔

گردیزی کو ای میل ایڈریس زبانی یاد تھا۔ وہ اس نے بتا دیا۔ لیکن بتاتے ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ پارکنز نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ جاوید اشرفی کے بارے میں کسی کو کبھی کچھ نہ بتائے مگر اس وقت اس کے اعصاب ٹوٹ رہے تھے، دماغ جیسے شل ہوا جارہا تھا۔ ایک باپ کے لیے یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ اس کی بیٹی کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ اس کیفیت میں وہ غلطی کر بیٹھا۔

”بہت خوب!“ دوسری طرف سے طنزیہ انداز میں کہا گیا۔ ”تم نے ای میل کے ذریعے اسے کبھی کوئی پیغام نہیں بھیجا؟“

”بھیجا تھا۔“ گردیزی نے جھوٹ بولا۔ ”میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ کبھی دفتر آ کے مجھ سے ملے۔“

”اس نے ای میل ہی کے ذریعے جواب دے دیا کہ اگر اس نے بھی مجھ سے ملنا ضروری سمجھا تو دفتر آ جائے گا۔“ ”تم مسلسل جھوٹ بولے جا رہے ہو گردیزی!“ دوسری طرف سے گرج کر کہا گیا۔ ”شاید تم اپنی بیٹی کی خیریت نہیں چاہتے۔“

”یہ بات نہیں..... یہ بات نہیں۔“ گردیزی جلدی سے بولا۔ ”تم ہی بتاؤ! آخر میں کس طرح تمہیں یقین دلاؤں کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔“

”اچھا کیا اس کے کالم چھاپنے کے لیے تم سے شوکت باجوہ نے کہا تھا؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ ”نہیں۔“ گردیزی نے جواب دیا۔

”وہ صرف شوکت باجوہ کے حق میں لکھتا رہا ہے، تمہیں اس پر اعتراض تو ہونا چاہیے تھا۔“

”میں نے اپنے کسی کالم نگار پر کبھی کوئی قدغن نہیں لگائی۔ جو جس کے لیے چاہتا ہے، لکھتا ہے۔ میں اس سے کوئی غرض ہی نہیں رکھتا۔ تم میرے اخبار کی ساری فائل دیکھ ڈالو۔ سب کالم نگار مختلف لوگوں کے حق میں لکھتے ہیں۔“

”تمہاری یہ بات تو سچ ہے گردیزی لیکن اس پر یقین نہیں کیا جاسکتا کہ تم جاوید اشرفی کے ای میل ایڈریس کے علاوہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

”میں کس طرح تمہیں یقین دلاؤں۔ سوچ سوچ کر میرا تو دماغ پھٹا جا رہا ہے۔“ گردیزی نے تھوک نکلنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کا حلق بالکل خشک ہو چکا تھا، کانٹے سے

پڑنے لگے تھے۔

”میں تمہیں ایک گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں گردیزی!“ دوسری طرف سے سرد لہجے میں کہا گیا۔ ”سوچ لو کہ تمہیں اپنی بیٹی عزیز ہے یا جاوید اشرفی کے بارے میں رازداری.....! ایک گھنٹے بعد تمہیں پھر فون کروں گا۔ اس وقت تک فیصلہ کر لینا۔ اگر پولیس سے رابطہ کرنا چاہو تو یہ شوق بھی پورا کر لینا۔ پولیس کو ہماری یا تمہاری بیٹی کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی۔“

دوسری طرف سے بولنے والے نے گردیزی کی مزید کوئی بات سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

گرمی نہ ہونے کے باوجود گردیزی کے چہرے پر پسینا چمکنے لگا تھا۔ افراد اس کی اکلوتی بیٹی تھی جو اس کی مرحوم بیوی کی نشانی تھی۔

گردیزی نے پانی لانے کے لیے ایک ملازم کو پکارا۔ جب پانی آ گیا تو اس نے ایک گھونٹ لینے کے بعد چند لمبی سانس لیں اور پھر باقی گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ گلاس واپس دے کر وہ رومال سے اپنے چہرے کا پسینا خشک کرنے لگا۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے صاحب؟“ ملازم نے تشویش سے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں، تم جاؤ۔“

ملازم سوچ میں ڈوبا ہوا سادھاں سے چلا گیا۔

گردیزی کا دماغ بری طرح چکرایا ہوا تھا۔ وہ فیصلہ کرنے میں دشواری محسوس کر رہا تھا کہ پہلے پولیس سے رابطہ کرے یا پارکنز کو حالات سے آگاہ کرے۔ اپنی بعض کمزوریوں کے باعث پولیس سے رابطہ کرنے میں اسے ہچکچاہٹ بھی تھی۔ پولیس والوں کے کسی سوال کے جواب میں اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل سکتی تھی جس سے اس کے لیے ایک اور پریشانی کھڑی ہو جاتی۔ آخر اس نے پارکنز سے ہی رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

”ہاں گردیزی! کیا بات ہے؟“ موبائل فون پر رابطہ ہو جانے کے بعد دوسری طرف سے انگریزی میں کہا گیا۔

”پارکنز!“ گردیزی کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”میری بیٹی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔“

”کیا!“ دوسری طرف پارکنز چونکا اور پھر اس نے تیزی سے پوچھا۔ ”یہ کیسے ہوا؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن اغوا کرنے والوں نے ابھی مجھے فون کیا تھا۔ مجھے افروزی خوف زدہ آواز بھی سنوائی تھی۔“

وہ مجھ سے جاوید اشرفی کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔“ ”تفصیل سے بتاؤ!“ پارکنز نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ”یہ تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں کہ ہفتہ بھر سے میرے پاس نامعلوم لوگوں کے فون آنے لگے تھے جو خود کو جاوید اشرفی کا مداح ظاہر کر کے اس کا فون نمبر یا گھر کا پتا جاننا چاہتے تھے۔“

”یہ بتاؤ کہ تمہاری بیٹی کو اغوا کرنے والے نے تم سے کیا کہا!“

گردیزی کو جو کچھ یاد تھا، وہ اس نے بتا دیا۔ اپنی اس غلطی سے بھی آگاہ کر دیا کہ اس نے اغوا کرنے والے کو جاوید اشرفی کا ای میل ایڈریس بتا دیا تھا۔

”یہ تم نے بہت بڑی غلطی کی۔“ پارکنز کے لہجے میں تشویش تھی۔

”اس اعتبار سے تو غلطی ہی ہے کہ تم نے کسی کو کچھ نہ بتانے کی تاکید کی تھی لیکن صرف ای میل ایڈریس بتانے سے تو.....“

دوسری طرف سے بات کاٹ دی گئی۔ ”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ کیا پولیس کو اطلاع دو گے؟“

”میں تم سے یہی مشورہ تو کرنا چاہتا ہوں۔“

دوسری طرف چند لمبے خاموشی رہی، پھر پارکنز نے کہا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ وہ دوبارہ تمہیں فون نہیں کرے گا۔ ہاں اگر فون آئے تو تم کہہ دینا کہ جو کچھ تم اس سے کہہ چکے ہو، وہ حقیقت ہے لیکن تم اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے کسی نہ کسی طرح کل صبح تک جاوید اشرفی کے بارے میں سب کچھ معلوم کر کے اسے بتا دو گے۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ فون نہیں کرے گا۔“ ”کسی وجہ سے مجھے شبہ ہے لیکن تم اس بارے میں سوچ کر اپنا دماغ نہ تھکاؤ۔“

”کیا مجھے پولیس سے رابطہ نہیں کرنا چاہیے؟“ ”کل صبح تک نہ کرو۔“

”میری بیٹی۔“ گردیزی کی آواز بھرا گئی۔

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ ان لوگوں کو صرف جاوید اشرفی سے دلچسپی ہے۔ وہ تمہاری بیٹی کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائیں گے۔“

”کیا تم ان لوگوں کو جانتے ہو؟“

”شاید.....! اچھا اب میں بند کر رہا ہوں۔ جلد ہی تم سے خود رابطہ کروں گا۔“

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

گردیزی موبائل فون ایک طرف ڈال کر رومال سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگا۔ اس کی سانسیں ناہمواری سے چل رہی تھیں اور سارا جسم اب بھی سنسنا رہا تھا۔ یہ بات اس کے لیے ناقابل فہم تھی کہ پارکنز اس کی بیٹی کو اغوا کرنے والوں سے شاید واقف تھا اور اسے یہ توقع بھی تھی کہ وہ اس کی بیٹی کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائیں گے کیونکہ دراصل انہیں صرف جاوید اشرفی سے دلچسپی تھی۔

صورت حال ایسی تھی کہ گردیزی دفتر جانا بھول گیا اور اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

گردیزی کو اخبار نکالے ہوئے صرف دو سال گزرے تھے۔ دو سال پہلے وہ ایک بڑے اخبار کا ڈپٹی ایڈیٹر تھا۔ چیف ایڈیٹر سے اس کے تعلقات میں کشیدگی رہتی تھی۔ وہ کیونکہ ایک بڑی سفارش سے ملازم ہوا تھا اس لیے چیف ایڈیٹر اس کی ملازمت ختم نہیں کر سکتا تھا۔ دراصل اس کے اور چیف ایڈیٹر کے سیاسی خیالات میں بعد ایشرفین تھا۔ چیف ایڈیٹر موجودہ حکومت کے حق میں تھا لیکن اخبار میں گردیزی کی بعض ایسی تحریریں چھپ جاتی تھیں جو اس کے باغیانہ خیالات کی عکاس تھیں۔ وہ اپنے ملک کی حکومت ہی سے نہیں، تمام سیاست دانوں سے دل برداشتہ تھا۔

ایک سمینار میں یہ ظاہر اتفاقہ طور پر اس کی ملاقات پارکنز سے ہوئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ پارکنز سے اس کے تعلقات بڑھتے چلے گئے۔ اسے معلوم ہوا کہ پارکنز خاصا دولت مند شخص تھا جس نے ایک مقامی عورت سے شادی کرنے کے بعد وہیں کی شہریت بھی حاصل کر لی تھی اور اپنا سرمایہ بھی وہیں منتقل کر دیا تھا۔ اپنی بیوی کے نام سے ایک کمپنی کھولی تھی اور بڑے پیمانے پر دوائیں امپورٹ کرنے لگا تھا۔ اسی کے یہ قول اس کے دوا ایک کاروبار اور تھے جن کی تفصیل اس نے گردیزی کو نہیں بتائی تھی۔

چند ماہ بعد ہی گردیزی کی باتوں سے پارکنز پر ظاہر ہوا کہ گردیزی اپنے چیف ایڈیٹر سے خوش نہیں تھا۔ پارکنز نے اس سے کہا کہ وہ اپنا اخبار نکال لے۔ گردیزی نے مالی مشکلات کی بات کی تو پارکنز نے اسے سرمائے کی پیشکش کی۔ پیشکش نہایت سنجیدگی سے کی گئی تھی۔ گردیزی کی باچھیں کھل گئیں۔ پارکنز کی شرط صرف یہ تھی کہ اخبار کے معاملے میں اس کا نام نہیں نہ آنے پائے۔ گردیزی کو اس پر کوئی اعتراض ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے اس کے علاوہ کچھ نہیں سمجھا کہ قدرت اچانک اس پر مہربان ہو گئی تھی۔ پارکنز نے اسے جو سرمایہ فراہم کیا، اس کی اس سے صرف رسید لی جس میں

گردیزی کی آسانی کے لیے یہ بھی لکھا تھا پارکنز کی رقم وہ اس وقت واپس کرے گا جب ادا کرنے کے قابل ہوگا۔ مدت کی کوئی قید نہیں تھی لہذا یہ بھی گردیزی کے حق میں تھا۔

اخبار نکلا اور اسے اپنے قدم جمانے میں بہت زیادہ وقت نہیں لگا کیونکہ عوام تو حکومت اور سیاست دانوں سے بیزار ہو ہی چکے تھے۔ انہیں گردیزی کے اخبار میں وہی کچھ پڑھنے کو ملا تھا جو وہ چاہتے تھے۔ گردیزی لکھنا بھی وہی کچھ چاہتا تھا۔

سال بھر قبل پارکنز نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ اس کے اخبار میں ملازمت یا لکھنے لکھانے کے سلسلے میں کسی کی سفارش کرے گا تو ایک فرقی نام ”گلاب خاں“ استعمال کرے گا کیونکہ وہ اخبار کے معاملے میں اپنا نام تو کسی طور پر بھی نہیں آنے دینا چاہتا۔

گردیزی کے لیے یہ پارکنز کی معمولی سی فرمائش تھی لیکن کئی ماہ تک پارکنز نے کسی کی سفارش ہی نہیں کی۔ اب سے چند ماہ پہلے اس کے پاس جاوید اشرفی کا کالم آیا تھا جس کے ساتھ گلاب خاں کا نام لکھا ہوا تھا۔ گردیزی نے موبائل فون پر اس سفارش کی تصدیق بھی کر لی اور جاوید اشرفی کے کالم چھاپنا شروع کر دیے۔

یہ پہلا موقع تھا جب پارکنز کی وجہ سے گردیزی کو ذہنی اذیت سے دوچار ہونا پڑا۔ جاوید اشرفی ایک سیاست داں کے حق میں لکھتا تھا اور سیاست داں بھی ایسا جس پر بڑے سنگین الزامات تھے جبکہ گردیزی کے اخبار کی پالیسی ہی یہ نہ تھی کہ وہ سیاست دانوں کے حق میں لکھے۔

گردیزی جاوید اشرفی کے کالم چھاپتا رہا۔ بہ تدریج یہ اس کے لیے اور زیادہ تکلیف دہ ہو گیا کہ جاوید اشرفی کے قلم کی جادوگری کے باعث عوامی رائے شوکت باجوہ کے حق میں ہموار ہونے لگی لیکن گردیزی یہ تکلیف برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ پارکنز نے اسے رقم ہی اتنی بڑی دی تھی جو واپس کرنا ابھی اس کے لیے خاصا مشکل تھا۔

ذہنی اذیت برداشت کرتے ہوئے گردیزی کو کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ اب اس پر جاوید اشرفی کی وجہ سے ایسی افتاد آ پڑی تھی کہ اس کی جان آدمی ہو گئی تھی۔ بیٹی کا اغوا ہو جانا کسی باپ کے لیے معمولی سانحہ نہیں ہو سکتا۔ گردیزی بے چینی کے عالم میں ٹھٹھکتا رہا۔ موجودہ صورت حال میں وہ اپنے دفتر تو جابھی نہیں سکتا تھا۔ اسے خیال آیا کہ اس کا شو فرکار کے ساتھ پورچ میں اس کا منتظر ہوگا۔ وہ ڈرائنگ روم سے باہر نکلا۔ شو فراس کی طرف دیکھنے لگا۔

”آج میں دفتر نہیں جاؤں گا۔“ گردیزی نے اس سے کہا۔

شو فر نے سر ہلایا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ انجن اسٹارٹ کر کے وہ کار گیرج کی طرف لے جانے لگا۔

گردیزی نے برآمدے میں کھڑے کھڑے اپنے موبائل پر دفتر سے رابطہ کیا اور اپنے ڈپٹی سے کہا۔ ”آج میں نہیں آسکوں گا۔ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ تم دیکھ لیتا۔“

ذہنی حالت ایسی تھی کہ اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر وہ اندر جانے کے لیے واپس مڑنے ہی والا تھا کہ بیٹلے کے پھانک کے باہر اسے کسی کار کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ ہیڈ لائٹس کا رخ بند پھانک کی طرف تھا۔ گویا کوئی کار اس کے بیٹلے میں آنا چاہتی تھی۔ گردیزی نے ہارن کی آواز بھی سنی۔

ہارن کی آواز سن کر پھانک کے قریب موجود چوکیدار بھی سرگما کر پھانک کی طرف دیکھنے لگا۔

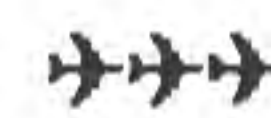
پھر پکا ایک ہیڈ لائٹس تیزی سے پیچھے ہوئیں۔ کار نہایت برقی سرعت سے پیچھے ہٹی تھی۔ پھر ایک چٹختی ہوئی آواز سنائی دی۔ کسی نے کار والے سے رکنے کے لیے کہا تھا۔ انداز میں دھمکی تھی۔

کار تیزی سے مڑ کر ایک طرف جانے لگی۔ اس وقت ایک فائر ہوا۔ گردیزی کو خیال آیا کہ شاید وہ گولی کار پر ہی چلائی گئی تھی۔

کار تیز رفتاری سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔ پھر ایسی آواز سنائی دی جیسے قریب ہی کہیں کوئی اور کار اسٹارٹ کی گئی ہو، اس کی ہیڈ لائٹس کی چمک بھی دکھائی دی۔ گردیزی نے ہیڈ لائٹس ہی کی حرکت سے اندازہ لگایا کہ وہ کار تیزی سے اسی جانب روانہ ہوئی تھی جس طرف پہلی کار گئی تھی۔

رہائشی علاقہ ہونے کے باعث گردیزی کے بیٹلے کی سامنے کی سڑک اندھیرا پھیلنے کے بعد تقریباً سناں ہی ہو جاتی تھی۔ اکادکا ہی گاڑیاں گزرتی نظر آتی تھیں لیکن جب یہ واقعہ ہوا، اس وقت دور تک شاید کوئی اور گاڑی نہیں تھی۔

گردیزی حیران کھڑا تھا کہ اس نے سڑک پر ان چوکیداروں کی شور مچاتی آوازیں سنیں جو آس پاس کے بنگلوں کے ملازم تھے۔



اتفاق ہی تھا کہ اس دن بابر اندھیرا پھیلنے کے ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی اپنے گھر پہنچ گیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر وہ کپڑے تبدیل کرنے والا ہی تھا کہ اس کے موبائل فون کی

گھنٹی بج اٹھی۔ بابر نے موبائل جیب سے نکال کر اس کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ چمکتے ہوئے حروف ”گلاب خاں“ کا نام ظاہر کر رہے تھے۔

بابر نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو!“

”تم اس وقت کہاں ہو؟“ دوسری طرف سے بے چین انداز میں پوچھا گیا۔ آواز بابر کے لیے جانی پہچانی تھی۔ وہ گلاب خاں ہی تھا۔

”میں ابھی اپنے گھر پہنچا ہوں۔“

اس جواب کے بعد بابر کچھ اور بھی کہتا لیکن دوسری طرف سے فوراً کہا گیا۔ ”یہ تو بہت اچھا ہوا۔ یہ بتاؤ، تمہارے پاس یو ایس بی ہے؟“

”ہاں، یوں ہی ایک مرتبہ خرید کر ڈال لی تھی۔ مجھے اس کی ضرورت تو نہیں۔“

”اس وقت پڑ گئی ہے ضرورت۔“ دوسری طرف سے بڑی تیزی سے کہا گیا۔ ”تم کالموں کے سلسلے میں یادداشتیں بھی محفوظ کرتے ہو گے، لیکن اس وقت بات صرف یادداشتوں کی نہیں۔ تم کمپیوٹر سے اپنا سارا ڈیٹا یو ایس بی میں منتقل کر لو، کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک بھی نکال لو، کمپیوٹر خالی کر دو اور اپنے گھر سے نکل آؤ۔ تمہیں اپنے علاقے کے میکڈونلڈ تک پہنچنے میں دس منٹ سے زیادہ نہ لگیں۔“ لہجہ تاکید ہو گیا تھا۔ ”میں بھی اتنی دیر میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ سرخ شیراؤ ہے میرے پاس! اس کا نمبر ذہن نشین کر لو۔“ گلاب خاں نے نمبر بتایا جو بہت آسانی سے ذہن نشین ہو سکتا تھا۔

”آخر بات کیا ہے؟“ بابر نے پریشانی سے پوچھا۔

”یہ ان باتوں کا وقت نہیں۔ جلدی کرو ورنہ خطرے میں پڑ جاؤ گے۔ کمپیوٹر سے اپنا سارا ڈیٹا یو ایس بی میں منتقل کر کے دونوں چیزوں کے ساتھ میکڈونلڈ پہنچو۔“

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

”خطرے“ کا لفظ سن کر بابر کا جسم سننا گیا تھا۔ صحافیوں کے لیے خطرات اس کے لیے کوئی ان سنی بات نہیں تھی۔ گزشتہ ڈیڑھ سال میں کئی صحافی اغوا کیے جا چکے تھے اور ایک دو کو ہلاک بھی کیا جا چکا تھا۔

بابر کو یہ احساس بھی تھا کہ اس نے اپنے بعض کالموں میں کچھ غیر معمولی انکشافات بھی کیے تھے۔ ان رازوں سے پردہ اٹھانے والا خود گلاب خاں تھا۔ اس نے بذریعہ ای میل ان باتوں کے ثبوت بھی بابر کو بھیجے تھے۔ انہی باتوں کی وجہ سے بابر کو گلاب خاں کی زبانی ملنے والی خطرے کی اطلاع بے وزن نہیں معلوم ہوئی۔ اس کے دماغ میں یہ سوال بھی

ابھرا کہ خطرے کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے اور اسے خطرہ کس کی طرف سے ہو سکتا ہے؟

ان خیالات کے ساتھ ہی اس نے کمپیوٹر کا سارا ڈیٹا ایک یو ایس بی پر منتقل کر لیا۔ پھر ہارڈ ڈسک نکالنے کے لیے اسے دو بیچ کھولنا تھے۔ وہ بیچ کھولنے سے پہلے اس نے ایک فیصلہ بہر حال کر لیا۔ اس نے موبائل فون سے ایک کال کی اور دو تین ہی جملوں میں بات مکمل کر کے کمپیوٹر سے ہارڈ ڈسک نکالنے لگا۔

ذرا دیر بعد وہ اپنے کمرے سے نکلا تو اس کے انداز سے عجلت صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ فوراً ہی اس کا سامنا عنبر سے ہو گیا۔

”کیا پھر کہیں جا رہے ہیں بھیا؟“ وہ بابر کے ہاتھ میں ایک موٹا سا بریف کیس دیکھتے ہی تیزی سے بولی۔

”ہاں۔“ بابر نے بریف کیس ایک طرف رکھ کر عنبر کو بڑی محبت سے اپنے قریب کیا اور اس کی پیشانی چومی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ کچھ جذباتی بھی ہو گیا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ بات چکرار ہی تھی کہ اب وہ اپنی بہن سے نہ جانے کب مل سکے۔

”ابھی تو آئے تھے آپ!“ عنبر بولی۔ ”اب پھر.....“

بابر نے اس کی بات کاٹی۔ ”امی جان کہاں ہیں؟“

”کچن میں۔ آخر بات کیا ہے، آپ کچھ پریشان نظر آرہے ہیں۔“

”آؤ!“ بابر نے ایک ہاتھ سے بریف کیس اٹھا کر دوسرا ہاتھ عنبر کے شانوں پر پھیلا دیا اور اسی طرح اسے اپنے ساتھ لیے ہوئے کچن کی طرف بڑھا۔

”کچھ بتائیں تو بھیا!“ عنبر پریشان نظر آنے لگی۔

”آخر.....“

”کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے عنبر!“ بابر نے کہا۔

”اچانک ہی ایک ضروری کام سے جانا پڑ رہا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے دو چار دن کے لیے شہر سے جانا پڑ جائے۔“

”کہاں؟“ عنبر چونک کر بولی۔

”لاہور۔“ بابر نے یوں ہی کہہ دیا۔ اسے ابھی بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے وقت میں اسے کب، کہاں، کیا فیصلہ کرنا پڑے گا۔

عنبر بولی۔ ”تو کیا ابھی واپس نہیں آئیں گے؟ میرا مطلب ہے، جہاں آپ ابھی جا رہے ہیں، کسی کام سے!“

”ہاں عنبر!“ بابر نے کہا۔ ”شاید میں وہیں سے چلا جاؤں۔“

وہ دونوں کچن کے قریب پہنچ گئے تھے۔ عذرا بیگم کچن سے باہر آتی دکھائی دیں۔

”امی جان!“ عنبر نے تقریباً چیخنے کے سے انداز میں کہا۔ ”بھیالا ہو رہا ہے ہیں۔“

”خیریت..... کیوں؟“ عذرا بیگم چونکیں۔

”اچانک کچھ کام پڑ گیا ہے۔ ابھی تو ہمیں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو گھنٹے میں واپس آ جاؤں لیکن اگر ضروری ہو تو وہیں سے ایر پورٹ چلا جاؤں گا۔ دو گھنٹے بعد ایک فلائٹ لاہور جانے کے لیے تیار ہوگی۔“

حقیقتاً بابر کو اس کا علم نہیں تھا کہ دو گھنٹے بعد کوئی فلائٹ لاہور جانے والی ہوگی۔

”بس آپ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دے دیں۔“ بابر نے مزید کہا۔

”تم تو اس طرح بہت پریشان کر کے جا رہے ہو۔“ عذرا بیگم نے کہا مگر ساتھ ہی انہوں نے بابر کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

بابر بولا۔ ”دعا کیجیے گا کہ میں کامیاب لوٹوں۔“

”ماں کی دعائیں تو اولاد کے ساتھ ہمیشہ رہتی ہیں بیٹا!“ عذرا بیگم نے کہا، پھر بولیں۔ ”اپنے باپ سے مل کر نہیں جاؤ گے؟“

”وقت کم ہے امی جان!“ بابر نے کہا۔ ”میڈیکل اسٹور جاؤں گا تو دیر ہو سکتی ہے۔“

سیف بھدانی اس وقت میڈیکل اسٹور ہوتے تھے۔ عنبر کی پلکیں اس وقت بھیگ گئی تھیں۔ وہ بھرائی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ”زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ چوبیس گھنٹے کے لیے بھی گھر سے دور رہے ہوں۔“

”کام تو کام ہوتا ہے پگی!“ بابر نے جبری ہنسی کے ساتھ عنبر کا گال تھپکا۔ ”اچھا امی جان! اجازت دیجیے۔“

”جاؤ بیٹا! اللہ کے سپرد!“

عنبر، بابر کے سننے سے لگ کر رونے لگی۔

”ارے! یہ کیا پگی!“ بابر خود اتنا الجھا ہوا تھا کہ اسے ہنسنے کے لیے خود پر ایک بار پھر جبر کرنا پڑا۔ ”ارے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں دو گھنٹے بعد ہی واپس آ جاؤں۔ لاہور جانا ہی نہ پڑے۔“

حقیقتاً بابر کو اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے وقت میں اسے کیا فیصلہ کرنا پڑے گا۔ بس کچھ قیاسات تھے جو اس کے دماغ میں چکرارہے تھے۔

عذرا بیگم اور عنبر اسے رخصت کرنے کے لیے

دروازے تک آئیں۔

”اچھا خدا حافظ۔“ بابر نے کہا اور باہر نکل کر تیزی سے کار کی طرف بڑھا جو گھر کے باہر ہی کھڑی رہتی تھی۔ جب وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا، اس وقت بھی عذرا بیگم اور عنبر دروازے پر کھڑی ہوئی تھیں۔ بابر سے نظریں ملنے ہی ان دونوں نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلائے۔ جواب میں بابر نے بھی ہاتھ ہلایا اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔

کار کچھ آگے نکل گئی تو بابر نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ عنبر دروازے سے باہر آ کر کار کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلا رہی تھی۔

بابر نے ٹھنڈی سانس لے کر ایکسپریس پر دباؤ بڑھا دیا۔ وہ اب جذباتیت سے تو نکل آیا تھا لیکن فکر مندی اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ بارونق اور کم ٹریفک کی سڑکوں سے گزرتا ہوا وہ تیزی سے ایک جانب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جہاں بھی اسے موقع ملتا، کار کی رفتار تیز ہو جاتی۔ بار بار وہ اپنی کھڑی پر بھی نظر ڈالتا جا رہا تھا۔

موبائل کی کھنٹی کی آواز سن کر وہ ذرا بھی نہیں چونکا۔ اسے اس کی توقع تھی۔ کال کرنے والا گلاب خاں تھا۔ بابر نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالتے اور کار کی رفتار کچھ کم کرتے ہوئے موبائل کان سے لگایا۔ ”ہیلو!“

”تم کہاں رہ گئے بابر!“ گلاب خاں کی آواز میں اضطراب تھا۔ ”میں پانچ منٹ سے تمہارا منتظر ہوں۔“

”میں ابھی تمہیں فون کرنے ہی والا تھا کہ مجھے تھوڑی سی دیر ہو جائے گی۔“ بابر نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیوں؟ کیا کام میں کسی قسم کی رکاوٹ پڑ گئی؟“ بے چینی سے پوچھا گیا۔

”نہیں۔ کام تو میں نے کر لیا ہے۔ دونوں چیزیں اس وقت میرے پاس ہیں۔ دراصل ابا جان کا فون آ گیا تھا۔ انہوں نے ایک ضروری لیکن چھوٹا سا کام میرے سپرد کر دیا ہے۔ وہ کام کر کے میں پون گھنٹے میں میکڈونلڈ پہنچ جاؤں گا۔“

”تم نے وہ کام ٹال کیوں نہیں دیا؟“ گلاب خاں کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی لیکن پھر فوراً ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پالیا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ”تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں تمہیں کس خطرے سے بچانا چاہتا ہوں۔“

”مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے۔ غالباً کسی کو میرا ای میل ایڈریس معلوم ہو گیا ہے اور وہ مجھے ٹریس کر سکتا ہے۔“

”ذہن آدمی ہو، تم نے صحیح اندازہ لگایا ہے۔ اب تم

کہاں ہو؟“

”ابا جان کے کام سے جا رہا ہوں۔ ہارڈ ڈسک بھی میرے پاس ہے اور یو ایس بی بھی!“ بابر نے جواب دیا۔

”میں دس منٹ میں اس جگہ پہنچ جاؤں گا جہاں کام ہے۔ وہاں بس پانچ منٹ رکنا ہے۔ اس کے بعد مجھے میکڈونلڈ پہنچنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے گا۔ مجھے ایک اطمینان یہ بھی ہے گلاب خاں کہ میرا گھراتی جلدی ٹریس نہیں کیا جاسکتا۔ تم مطمئن رہو۔ میں پون گھنٹے میں تم تک پہنچ جاؤں گا۔“

”کیا گڑبڑ کی ہے تم نے!“ دوسری طرف گلاب خاں نے ایک طویل سانس لی۔ ”خیر!..... میں میکڈونلڈ کے باہر کار میں ہی تمہارا منتظر ہوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“

بابر نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے چہرے سے اب بھی پریشانی اور سوچ بچار کا اظہار ہو رہا تھا۔ دس منٹ بعد اس نے کار کی رفتار کم کرنا شروع کی اور پھر ایک جگہ روک دی۔ اس کی دائیں جانب سڑک پار وہی شاپنگ سینٹر تھا جہاں اس کی ملاقات رخسار سے ہوئی تھی۔ اس نے رخسار کی کار دیکھی جو پارکنگ میں نہیں لگائی گئی تھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر رخسار موجود تھی اور اس نے بھی بابر کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر ہلایا۔ جواب میں بابر نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ اپنی کار ہی میں بیٹھی رہے۔

بابر نے کمپیوٹر سے ڈسک نکالتے وقت ایک مختصر سی کال رخسار ہی کو کی تھی اور اسے اسی جگہ بلایا تھا۔ وہ جگہ بابر اور رخسار کے گھر کے تقریباً درمیان میں تھی۔ اس طرح وہ دونوں کم وقت میں ایک دوسرے تک پہنچ گئے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس وقت بابر چاہتا بھی نہیں تھا کہ رخسار کے گھر جائے۔ کار کا انجن بند کر کے اس نے برابر کی سیٹ پر رکھا ہوا بریف کیس اٹھایا۔ اس میں ہارڈ ڈسک کے ساتھ ایک چھوٹا سا بریف کیس بھی تھا۔ بابر نے وہ بریف کیس نکال کر بڑا بریف کیس بند کر کے سیٹ پر رکھا اور چھوٹا بریف کیس ہاتھ میں لیے کار سے اتر آیا۔ سڑک پار کرنے سے پہلے وہ اپنی کار لاک کرنا نہیں بھولا تھا۔ اس نے عادت ڈال لی تھی کہ دروازہ چابی ہی سے لاک کیا کرے۔

سڑک پار کر کے وہ رخسار کی کار کی اس سمت میں پہنچا جو ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کی سیٹ کی طرف تھی۔ رخسار نے اس کے لیے خود دروازہ کھول دیا۔ بابر نے اندر بیٹھ کر خود

دروازہ بند کیا۔

”آخر بات کیا ہے بابر!“ رخسار کے لہجے سے الجھن آشکارا تھی۔ ”فون پر تم نے اس کے علاوہ کچھ کہا ہی نہیں کہ میں فوراً یہاں پہنچوں۔“

”وقت نہیں تھا کہ تمہیں تفصیل بتا سکتا۔ میں تمہیں اپنی ایک امانت سونپنا چاہتا ہوں۔“ بابر نے کہتے ہوئے چھوٹا سا بریف کیس رخسار کی گود میں رکھ دیا۔

”کیا ہے یہ؟“

”بریف کیس۔“

”وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔“ رخسار تھوڑی سی جھنجھلا گئی۔ ”بریف کیس میں کیا ہے؟“

”میں کوئی تحریب کار نہیں ہوں کہ اس میں بم رکھ کر تمہیں دے دوں۔“ بابر نے پھسکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، پھر بولا۔ ”یہ بھول جاؤ کہ اس میں کیا ہے۔ بس یہ اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس کا علم چچا جان کو بھی ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ میں تمہیں اپنی قسم دیتا ہوں کہ اس بارے میں تمہیں اپنی زبان بالکل بند رکھنا ہے۔“

”آخر معاملہ کیا ہے بابر!“ رخسار پریشان ہو گئی۔

”میں بہت جلدی میں ہوں۔ اس وقت تمہیں تفصیل نہیں بتا سکتا۔“ بابر نے کار سے اترنے کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد تم سے رابطہ کر کے اپنی امانت واپس لے لوں۔ اسی وقت تمہیں تفصیل بھی بتا دوں گا۔“

”لیکن.....“

”پلیز رخسار! کوئی سوال نہیں۔ میں بہت جلدی میں ہوں۔ اچھا بس۔“ بابر کار سے اترنے لگا۔

”تم مجھے بہت الجھن میں ڈال کر جا رہے ہو۔“ رخسار کی آواز بھرا گئی۔

”مجبوری ہے کچھ رخسار!“ بابر نے دروازہ بند کر کے کھڑکی سے رخسار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں جلد ہی تم سے رابطہ کروں گا۔“

لیکن اس وقت بابر کو علم نہیں تھا کہ وہ رخسار سے کب رابطہ کر سکے گا۔ اس نے بس رخسار کو کسی حد تک مطمئن کرنے کے لیے یہ بات کہہ دی تھی۔ اس نے رخسار کے مزید کچھ بولنے کا انتظار نہیں کیا اور تیزی سے سڑک سڑک پار کر کے اپنی کار کی طرف جانے لگا۔

جب اس نے کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا تو دیکھا کہ رخسار اپنی کار حرکت میں نہیں لائی تھی اور بابر کی طرف

دیکھتے جارہی تھی۔

بابر نے دوبارہ اس کی طرف نہیں دیکھا اور اپنی کار چلا دی۔ وہ مطمئن تھا کہ اس نے رخسار پر اعتماد کر کے غلطی نہیں کی تھی۔ وہ اس معاملے میں کسی اور پر اعتماد کر ہی نہیں سکتا تھا۔

کار اب تیز رفتاری سے میکڈونلڈ کی طرف جارہی تھی۔ جو خیالات اس کے دماغ میں ابتداء ہی سے دوڑنے لگے تھے، ان سے اب بھی اس کا دماغ خالی نہیں تھا۔ کالم نگاری کی ابتدا ہی میں اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ کسی ایجنسی کا آلہ کار بن گیا ہے اور وہ ایجنسی کسی بھی وجہ سے شوکت باجوہ کو سیاسی طور پر اوپر لانا چاہتی ہے۔

بابر کے خیال کے مطابق اگر اس معاملے میں ایجنسی کا کردار نہ ہوتا تو خود شوکت باجوہ ہی اس سے رابطہ کرتا۔ کسی غیر ملکی کو اس سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی جس نے اسے اپنا نام گلاب خاں بتایا تھا، اس نے فون پر اردو ہی میں بات کی تھی لیکن اس کا لہجہ کسی اہل زبان کا نہیں ہو سکتا تھا۔ بابر کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ یہ بات عام طور پر سننے میں آئی تھی کہ بعض صحافی کسی نہ کسی ایجنسی کے آلہ کار بن کر ٹھاٹھ سے زندگی گزار رہے تھے لہذا بابر نے بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لینا برا نہ سمجھا۔ ویسے بھی اسے اپنے ملک کے سیاست دانوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ کسی ایسے موقع کی تلاش میں بھی تھا جو اسے اس کے خیال کے مطابق معجزانہ طور پر ملتا تھا۔

جب اسے گلاب خاں سے خطرے کی اطلاع کے ساتھ کچھ ہدایات بھی ملی تھیں تو بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکر اٹگئے تھے۔ ان میں سے ایک خیال یہ بھی تھا کہ کوئی مقامی خفیہ ایجنسی اس کے کالموں کو کسی خاص نظر سے دیکھتی رہی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس غیر ملکی ایجنٹ سے بھی واقف ہو گئی ہو اور اس نے کسی طرح وہ ای میل ایڈریس معلوم کر لیا ہو جس سے وہ مضامین کے، اسے گردیزی کے ای میل ایڈریس پر بھیجے جاتے تھے۔ ایسی صورت میں مقامی ایجنسی وہ جگہ ٹریس کر سکتی تھی جہاں سے وہ مضامین بھیجے جاتے تھے۔ مقامی ایجنسی کے باخبر ہونے کی خبر گلاب خاں کو بھی مل سکتی تھی اور بابر کے خیال کے مطابق ایسا ہی ہوا تھا۔ اسی لیے گلاب خاں نے اسے یہ ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے کمپیوٹر کا ڈیٹا یو ایس بی میں منتقل کرنے کے ساتھ ہی کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک بھی نکال کر فوراً اپنا گھر چھوڑ دے تاکہ مقامی ایجنسی کے ہاتھوں پکڑا نہ جاسکے۔

بابر ابھی طرح چانتا تھا کہ غیر ملکی ایجنٹوں کو اس حصے کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی جسے وہ اپنا آلہ کار بناتے ہیں۔ صورت حال میں کسی خرابی کے باعث اگر ان کا مہرہ یعنی ان کا آلہ کار، پٹ جائے تو ان کی بلا سے۔

لیکن گلاب خاں بابر کو بچانا چاہتا تھا یا نہیں، اس کا اندازہ ابھی بابر کو نہیں تھا۔ گلاب خاں کو یہ فکر لاحق ہو سکتی تھی کہ وہ بابر کو جو خفیہ معلومات فراہم کرتا رہتا تھا، وہ بھی ہارڈ ڈسک میں مقامی ایجنسی کو مل جاتی اور اس طرح گلاب خاں کو کسی قسم کا نقصان پہنچ سکتا تھا لہذا یہ بات بھی ممکن تھی کہ اسے صرف ہارڈ ڈسک حاصل کرنے سے دلچسپی ہو۔

بابر کو خوب اندازہ تھا کہ جن باتوں نے اس کے کالم کو مقبول بنایا تھا، اس میں ان خفیہ معلومات کا بہت ہاتھ تھا جو گلاب خاں اسے فراہم کرتا رہتا تھا۔ وہ معلومات حاصل کرنے کے لیے اس نے سرکاری دفاتر کے اہلکاروں کو پیسے کے بل پر اپنی منہمی میں لے رکھا ہوگا۔

بابر ان معلومات کو اپنے کالم میں جوں کا توں استعمال کرنے کے بجائے صرف اشاروں کنایوں سے کام لیا کرتا تھا لیکن ایسی مہارت کے ساتھ کہ اشارے کنائے سمجھنے والے پوری بات سمجھ لیتے تھے۔

ہارڈ ڈسک کے ساتھ ہی گلاب خاں نے سارا ڈیٹا یو ایس بی میں بھی منتقل کرایا تھا۔ اس کا صرف یہی ایک مقصد ہو سکتا تھا کہ یو ایس بی کے ذریعے وہ سارا ڈیٹا کسی لیپ ٹاپ میں منتقل کیا جاسکے۔ ہارڈ ڈسک لیپ ٹاپ میں استعمال نہیں کی جاسکتی تھی اور لیپ ٹاپ کے ذریعے کام کرنے والا اپنا مقام سکونت تیزی سے تبدیل کرتا رہتا تو خفیہ ایجنسی لیپ ٹاپ کے ذریعے کام کرنے والے تک کسی صورت نہیں پہنچ سکتی تھی۔

گردیزی کے گھر کے باہر جو صورت حال پیدا ہوئی تھی، اس کی اطلاع پڑوس ہی کے کسی شخص نے پولیس کو دے دی تھی۔ جس کے نتیجے میں پولیس کو گردیزی کے گھر پہنچنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

گردیزی کو پولیس آفیسر کے سوالات کا سامنا کرنا پڑا۔

”وہ کون تھا جو آپ سے ملنے آیا تھا؟“

”مجھ سے ملنے تو کوئی نہیں آیا۔“ گردیزی نے جواب دیا۔

”لیکن ہمیں تو یہی اطلاع ملی ہے کہ ایک کار آپ کے

گھر کے پھانک پر آ کر رکی تھی۔“ پولیس آفیسر نے کہا۔ ”ہیڈ لائنس کا رخ آپ کے پھانک کی طرف تھا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کار میں جو بھی تھا، اسے پھانک کھلنے کا انتظار ہوگا۔“

”میں اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔“ گردیزی نے جواب دیا۔ ”مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ باہر کیا صورت حال پیش آئی تھی۔ وہ تو میرے چوکیدار نے باہر جا کر معلومات کی تھیں اور پھر واپس آ کر اسی نے مجھے بتایا تھا کہ جو کار میرے پھانک پر آ کر رکی تھی، وہی اچانک اس وقت بھاگ نکلی جب آس پاس کسی جگہ موجود افراد تیزی سے اس کار کی طرف لپکے۔ پڑوس کے چوکیداروں کے بیان کے مطابق انہی لوگوں کو دیکھ کر وہ کار والا شاید گھبرا گیا تھا اور یہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ جو لوگ اس کی کار کی طرف بڑھے تھے، انہی میں سے کسی نے چیخ کر اس کار والے سے رکنے کے لیے کہا تھا لیکن جب وہ نہیں رکی تو انہی لوگوں میں سے کسی نے اس کار پر گولی چلائی لیکن یا تو نشانہ خطا گیا تھا یا کار ہی تیز رفتاری سے اتنی دور نکل گئی تھی کہ ریوالور سے چلائی جانے والی گولی اس تک نہیں پہنچ سکی۔ پھر نہ جانے کدھر سے ایک اور کار وہاں آئی۔ وہ لوگ اس کار میں بیٹھ گئے اور وہ کار شاید اس کار کے تعاقب میں دوڑ گئی جو یہاں سے فرار ہوئی تھی۔“ گردیزی نے وضاحت سے جواب دینے کے بعد پوچھا۔ ”کیا آپ لوگوں کو ان کاروں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔“

”ہم جادوگر نہیں ہیں مسٹر گردیزی!“ پولیس آفیسر کا لہجہ خشک ہو گیا۔ ”ہمیں پوچھ گچھ کرنے ہی سے کوئی سراغ مل سکتا ہے۔ یہاں جن چوکیداروں نے ان کاروں کو دیکھا تھا، ان میں سے کوئی بھی ان دونوں کاروں میں سے کسی ایک کا نمبر بھی نہیں بتا سکا ہے۔ اب تو ہم آپ ہی سے کچھ توقع کر سکتے تھے۔“

”مجھ سے.....؟ توقع..... کیا مطلب؟“

”یہی کہ آپ سے ملنے کون آیا تھا؟“

”میں پہلے ہی جواب دے چکا ہوں کہ میں اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔“

یہ جوابات دیتے ہوئے گردیزی پریشان بھی تھا۔ اسے اپنی اغوا شدہ بیٹی کی فکر لاحق تھی۔ اگرچہ پارکنز نے اسے تسلی دی تھی کہ اس کی بیٹی کو کچھ نہیں ہوگا لیکن یہ بات گردیزی کے لیے اطمینان بخش نہیں تھی۔ پارکنز نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ اس کی بیٹی کو اغوا کرنے والا اب شاید اسے فون نہ کرے

لیکن یہ بات بھی گردیزی کی فہم سے بالاتر تھی۔ اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ پارکنز نے ایسی باتیں کیوں کی تھیں۔ گردیزی کے لیے وہ باتیں عجیب و غریب ہی تھیں۔ وہ بہ دستور پریشان تھا کہ دس پانچ منٹ میں اس شخص کا فون آنے والا ہوگا جس نے اس کی بیٹی کو اغوا کیا تھا۔

پولیس آفیسر نے کوئی سوال کیا تو وہ چونک گیا۔

”کیا کہا آپ نے؟“ اس نے بے اختیار پوچھا۔

پولیس آفیسر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ اتنے پریشان کیوں ہیں مسٹر گردیزی؟“

”میرے گھر کے سامنے ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے اور مجھے اس وقت بلا وجہ آپ لوگوں کے سامنے جواب دہی کرنا پڑ رہی ہے۔“ گردیزی نے جواب دیا اور پھر جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ”کیا یہ میرے لیے پریشان کن صورت حال نہیں؟“

”میرا خیال ہے، اتنی زیادہ پریشان کن نہیں کہ آپ کا ایک ایسے خیالوں میں کھو گئے کہ میرا سوال ہی نہیں سن سکے۔“

”جس پر گزرتی ہے، وہی جانتا ہے۔“ گردیزی نے منہ بنا کر کہا۔ ”آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے، جلدی سے پوچھ لیں۔“

”میں نے یہ معلوم کیا تھا کہ آپ یہاں اکیلے ہی رہتے ہیں؟ میرا مطلب ہے، ملازمین کے علاوہ!“

”میں یہاں اپنی بیٹی کے ساتھ رہتا ہوں اور کوئی نہیں ہے۔ میری بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔“

”آپ کی بیٹی کہاں ہیں؟“

”کسی سے ملنے گئی ہوئی ہے۔“ گردیزی نے جواب دیا، پھر جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اب شاید آپ اس کا نام بھی پوچھیں گے۔ میں بتائے دیتا ہوں، اس کا نام فردوز ہے۔ آخر اس قسم کے سوالات کا آپ کی تفتیش سے کیا تعلق؟“

اس سے پہلے کہ پولیس آفیسر کچھ کہتا، ڈرائنگ روم میں موجود ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

”ایلیکسیو زمی!“ گردیزی نے پولیس آفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے خشک لہجے میں کہا اور اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

ڈرائنگ روم خاصا وسیع تھا۔ اس کے ایک کونے میں رکھے ہوئے ٹیلی فون پر کی جانے والی بات کی ہلکی سی بھٹک بھی پولیس آفیسر کے کانوں میں نہیں پڑ سکتی تھی اگر لہجہ دھیمّا رکھا جاتا۔

ریسورٹ اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے گردیزی نے کہا۔
”ہیلو!“

”تم اب بھی اپنی بیٹی کے لیے پریشان ہو گے؟“
دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر گردیزی چونک پڑا۔ وہ کال پارکنز کی تھی۔

”تم!“ گردیزی کے منہ سے نکلا۔ ”میرا مطلب ہے..... ٹیلی فون پر! آج سے پہلے تم نے ہمیشہ میرے موبائل پر ہی کال کی ہے۔“

”اس وقت میں نے احتیاط سے کام لیا ہے۔“ پارکنز کی آواز آئی۔ ”مجھے اس واقعے کی اطلاع مل گئی تھی جو تمہارے گھر کے سامنے پیش آیا تھا اور یہ بات بھی معلوم ہو گئی تھی کہ پولیس تمہارے گھر پہنچ چکی ہے۔ وہ لوگ تم سے اس کار کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہوں گے۔“

”ہاں۔“ جواب دیتے ہوئے گردیزی مڑاتا کہ پولیس آفیسر پر نظر رکھ سکے جو اس وقت اسی کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن گردیزی کو اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے نظریں چرا لیں۔

اس وقت گردیزی نے کوشش کی کہ اس کا چہرہ جذبات سے عاری رہے۔ وہ پارکنز کی آواز سن رہا تھا۔ ”مجھے امید ہے کہ تم نے پولیس والوں کو اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہوگا۔“

”لیکن میں اس کے لیے پریشان ہوں۔“
”میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ فکر مند نہ ہو۔ کچھ نہیں ہوگا تمہاری بیٹی کو۔“ پارکنز نے کہا، پھر پوچھا۔ ”فون تو نہیں آیا اس نامعلوم شخص کا؟“

”ابھی پورا ایک گھنٹا نہیں ہوا۔“ گردیزی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے امید ہے کہ ایک گھنٹے بعد بھی فون نہیں آئے گا اور میرا خیال غلط ثابت ہو تو تم اس سے وہی بات کہہ دینا جو میں تمہیں سمجھا چکا ہوں۔ ابھی مجھے یقین تھا کہ تم پولیس والوں کے ساتھ بیٹھے ہو گے اس لیے مناسب نہیں تھا کہ میں تمہارے موبائل پر کال کرتا۔ یہ میں دیکھ چکا ہوں کہ ڈرائنگ روم میں ٹیلی فون کہاں رکھا ہوا ہے۔ وہاں سے تمہاری آواز پولیس والوں تک نہیں پہنچ سکتی۔“

گردیزی ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

پارکنز بولتا رہا۔ ”اب تم پولیس والوں سے چھٹکارا حاصل کرو۔ یہ لوگ بڑی عیاری سے سوالات کرتے ہیں۔ تمہارے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو بعد میں تمہارے لیے پریشانی کا سبب بنے۔“

”میں کیسے چھٹکارا حاصل کروں؟ کیسے کہہ دوں کہ وہ جائیں!“
”کہہ سکتے ہو تم! کوئی جرم نہیں کیا ہے تم نے کہ وہ تم پر کسی قسم کا دباؤ ڈال سکیں۔ تم ان سے یہ بہانہ کرو کہ تمہیں اپنے دفتر جانا ہے اور تمہیں پہلے ہی خاصی تاخیر ہو چکی ہے۔“ گردیزی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں! یہ بہانہ کیا جاسکتا ہے۔“

”بہانہ ہی نہیں، اس پر عمل بھی کرنا ہوگا۔ اگر رخصت ہو جانے کے بعد بھی پولیس کا کوئی آدمی آس پاس ہو تو وہ دیکھ لے کہ تم واقعی اپنے گھر سے روانہ ہو گئے ہو۔ تم واقعی اپنے دفتر چلے جاؤ۔ میں کچھ دیر بعد تمہیں وہیں فون کروں گا۔“ ٹھیک ہے، لیکن میں بہت پریشان ہوں پارکنز!“
”وقتی بات ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
”اچھا!“ گردیزی نے مردہ دلی سے کہا۔ ”تو میں چلتا ہوں۔“

”گڈ لک۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔
گردیزی نے سلسلہ منقطع ہونے کی آواز بھی سنی اور ریسورٹ رکھ کر پولیس آفیسر کی طرف بڑھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون آف کر دیا تھا۔

”میرے دفتر سے فون آیا تھا۔“ گردیزی نے پولیس آفیسر کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو اگر کچھ اور معلوم کرنا ہے تو جلدی کر لیجیے؟ ویسے اگر بعد میں بھی ضرورت ہو تو آپ مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ یہ میرا کارڈ ہے۔“ اس نے کارڈ پولیس آفیسر کی طرف بڑھایا۔ ”دفتر، گھر، کبھی جگہ کے فون نمبرز موجود ہیں اس پر! موبائل نمبر بھی ہے۔“
”شکریہ۔“ پولیس آفیسر کھڑا ہو گیا۔ ”اگر ضرورت پڑی تو میں آپ سے رابطہ کر لوں گا۔“

”ضرور۔“
پولیس آفیسر گردیزی کے ساتھ ہی باہر نکلا۔ برآمدے میں دو کانسٹیبل موجود تھے۔ پورچ میں پولیس موبائل کھڑی تھی۔ اس میں بھی پولیس والے موجود تھے۔

گردیزی نے برآمدے میں کھڑے کھڑے شو فر کو آواز دے کر اس سے کار نکالنے کے لیے کہا۔

پولیس موبائل جب پھانک کی طرف جا رہی تھی تو گردیزی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا موبائل فون آن کر لیا۔ اسے آف کرنے کا خیال اس خدشے کے تحت آیا تھا کہ پولیس آفیسر کے سامنے ہی اس شخص کی کال نہ آجائے جس نے اس کی بیٹی کو اغوا کیا تھا۔

شو فر کار لے آیا اور جلدی سے اتر کر پچھلی نشست کا دروازہ کھولنا چاہتا تھا کہ گردیزی خود ہی دروازہ کھول کر کار میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”چلو۔“
پولیس موبائل پھانک سے باہر جا چکی تھی لیکن چونکیدار پھانک کھولے کھڑا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ گردیزی جانے کے لیے تیار ہے۔
کار پھانک سے نکلی۔

”دفتر ہی چلنا ہے نا صاحب؟“ شو فر نے پوچھا۔
”ہوں۔“ گردیزی نے اثبات میں سر بھی ہلایا۔ پولیس آفیسر کے سامنے اس نے کسی نہ کسی حد تک خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی تھی مگر اب اضطراب اس کے چہرے پر پوری طرح نمایاں تھا۔ بیٹی کی فکر تو تھی ہی، وہ کسی بھی لمحے اغوا کرنے والے کی کال کی توقع بھی کر رہا تھا۔ اب ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔

روشنیوں سے جگمگاتی سڑکوں پر کاررواں دواں تھی۔ اسے کسی کسی سنگل پر رکنا بھی پڑ رہا تھا۔ وہ ایک سنگل پر رکی تو اچانک گردیزی کی طرف کا دروازہ کھلا اور کوئی اسے دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ اسی نے دروازہ بھی بند کر لیا تھا۔ یہ سارے کام برقی سرعت سے کئے گئے تھے اور پھر گردیزی نے ایک پستول کی ہلکی سی جھلک دیکھی جس کی نال اس کی کمر سے لگادی گئی۔

”ڈرائیور!“ پستول والے نے شو فر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اپنے ہاتھ اسٹیرنگ سے نہ ہٹانا ورنہ میں تمہارے مالک کو گولی مار دوں گا۔“

شو فر بوکھلا گیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ سر موڑ کر پیچھے تو دیکھا لیکن اسٹیرنگ سے اپنے ہاتھ نہیں ہٹائے۔

”سب کچھ اپنی جیب سے نکال دو۔“ گردیزی کو حکم دیا گیا۔ ”پرس بھی اور اپنا موبائل بھی۔“

گردیزی کے لیے حکم کی تعمیل کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ شہر میں ان دنوں اس قسم کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ لوگوں کو سہرا لٹا جاتا تھا اور مزاحمت کرنے والوں کو بے دریغ گولی مار دی جاتی تھی۔ سنگل کی سبز روشنی کے ساتھ ٹریفک حرکت میں آیا۔

پستول والے نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ ”آگے بائیں ہاتھ پر ایک گلی آئے گی، کار اسی میں موڑ لیٹا۔“ اس نے گردیزی سے اس کا پرس اور موبائل لے لیے تھے۔

پرس میں اچھی خاصی رقم تھی لیکن گردیزی کی پریشانی کا سبب موبائل کا ہاتھ سے نکل جانا تھا۔ اگرچہ ابھی تک اس کی بیٹی کو اغوا کرنے والے کی کال نہیں آئی تھی اور ایک گھنٹے سے

پندرہ منٹ زیادہ ہو چکے تھے لیکن یہ ممکن تھا کہ اسے ڈرائیور سے فون کیا جاتا۔
”میرا موبائل واپس کر دو۔“ گردیزی بھڑائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں تمہیں کل رقم کا چیک دے دیتا ہوں۔ یہ موبائل پندرہ ہزار کا ہے۔ میں تمہیں بیس ہزار کا چیک دے دوں گا۔“

”بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔“ پستول والے نے منہ بنا کر کہا۔ ”اپنے بینک میں گرفتار کروانا چاہتے ہو مجھے۔“

گردیزی چپ رہا۔ اسے اندازہ بھی ہو گیا کہ اس نے ایک احمقانہ پیشکش کی تھی۔ اس قسم کے لوگ ایسی کوئی پیشکش قبول نہیں کر سکتے تھے۔
کار اب سنگل سے گزر چکی تھی۔

پستول والے نے پرس اور موبائل اپنی واسٹ کی جیب میں رکھ لیے تھے۔ گردیزی نے اپنے ہونٹ خشک ہوتے محسوس کیے۔

جلد ہی کار اس گلی میں مڑی جس کے بارے میں اس نے کہا تھا۔

اس گلی میں ٹریفک نہیں تھا۔ ایک دو گنا راہ گیر آ جا رہے تھے۔

”بس روک دو گاڑی“ اس نے کہا۔ ”یہاں میں اتر جاؤں گا۔ میرے اترتے ہی تم سیدھے نکلے چلے جانا۔ اس طرف بھی مین روڈ ہے۔ اگر تم لوگوں نے شور مچایا تو میں تمہاری کار پر گولیاں برسا دوں گا۔ تم دونوں مارے جاسکتے ہو۔“

شو فر نے گاڑی روک دی۔ اس نے تیزی سے اتر کر دروازہ بھی بند کر دیا۔ اس وقت پستول اس نے چھپایا تھا ورنہ کسی راہ گیر کی نظر اس پر پڑ جاتی۔

”تیزی سے نکل چلو۔“ گردیزی نے شو فر سے کہا۔ وہ اس وقت اس طرح ہانپنے لگا تھا جیسے کوئی چڑھائی طے کی ہو۔
”پپ..... پولیس اسٹیشن؟“
”جہیں۔“

گردیزی جانتا تھا کہ اس قسم کی رپورٹس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اس نے پرس اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ پستول والے نے صرف رقم نکالنے پر اکتفا کیا تھا۔ پرس سیٹ پر ہی ڈال گیا تھا۔

پندرہ منٹ میں وہ دفتر پہنچ گیا۔ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے ٹیلی فون پر اپنے موبائل کا نمبر ملایا۔ اسے توقع تھی کہ کوئی جواب نہیں ملے گا۔ اس کے موبائل کی سم نکالی جا چکی

ہوگی لیکن اس وقت اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا جب دوسری طرف نہ صرف گھنٹی بجی بلکہ کال بھی ریسو کی گئی۔

”سنو!“ دوسری طرف سے بڑے سرد لہجے میں کہا گیا۔ ”میرا یہ خیال تو صحیح ثابت ہوا ہے کہ تم نے رپورٹ کرانے کے لیے پولیس اسٹیشن کا رخ نہیں کیا۔ اب دوسری عقل مندی یہ بھی کرنا کہ اس کہنی کو بھی چوری کی اطلاع نہ دینا جس کی سم تمہارے موبائل میں ہے۔ تم کوئی دوسرا موبائل خرید لو۔ یہ تمہارے لیے کوئی بڑا نقصان نہیں ہے۔ مجھے تمہارے روپوں کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ میں نے صرف اس لیے نکال لیے تھے کہ تمہارا ڈرائیور اسے عام قسم کی واردات سمجھے..... اگر تم نے میری ان ہدایات کے خلاف کچھ کیا تو اس کا خمیازہ بھی بھگتو گے۔“

گردیزی کا جواب سنے بغیر دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

ریسیور رکھنے کے بعد گردیزی کا ہاتھ ریسور پر ہی رہ گیا۔ ایک بار پھر سننا ہٹ اس کی ایڑی سے چوٹی تک پھیل گئی تھی۔ اس کے دماغ میں پہلا خیال یہ آیا تھا کہ اس کا موبائل اڑانے کی حرکت بھی شاید انہی لوگوں کی ہو جنہوں نے اس کی بیٹی کو اغوا کیا تھا۔

مگر کیوں؟ اس کا جواب گردیزی کے پاس نہیں تھا۔ ان حالات نے اس کی حالت غیر کر دی تھی۔ ابتدا میں تو جب پارکنز نے اسے اخبار کے لیے سرمایہ فراہم کیا تھا تو اس نے اسے صرف ایک دوست کا خلوص سمجھا تھا لیکن جب جاوید اشرفی کے کالم چھپنا شروع ہوئے تھے تو پہلی مرتبہ اسے کسی گڑبڑ کا شبہ ہوا تھا اور اب جو حالات پیدا ہوئے تھے، انہوں نے تو اسے یقین دلادیا تھا کہ وہ کسی خطرناک جال میں پھنس چکا ہے۔

دوسرے ٹیلی فون کی گھنٹی نے اسے چونکا یا۔ اس کا دایاں ہاتھ ریسور پر ہی جما رہا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے دوسرے فون کا ریسور اٹھایا۔ دوسری طرف سے آپریٹر بولا تھا۔ اس نے اطلاع دی تھی کہ پشاور سے اس کے اخبار کا نمائندہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔

”وہ بتا رہا تھا کہ موبائل پر آپ کال ریسو نہیں کر رہے ہیں۔“ آپریٹر نے مزید کہا۔ ”حالانکہ اسے گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی ہے۔“

گردیزی کی ذہنی کیفیت اس وقت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنے اخبار کے نمائندوں سے بات کر سکتا، وہ بولا۔ ”اس سے

کہو، میں کچھ مصروف ہوں۔ بعد میں اسے خود فون کر لوں گا۔“ آپریٹر کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ یہ بات اس کے لیے ناقابل فہم تھی کہ اس کے موبائل کی گھنٹی اب بھی بج رہی تھی۔ پشاور کے نمائندے نے یہی بتایا تھا۔ وہ خاصا الجھ گیا۔ اس کے موبائل سے سم اب تک نہیں نکالی گئی تھی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی۔ اسی فون کے ریسور پر گردیزی کا ہاتھ تھا۔ یہ اس کا ڈائریکٹ فون تھا۔

”ہیلو!“ اس نے ریسور اٹھاتے وقت بڑے تعجب سے دیکھا تھا کہ سی ایل آئی پر نظر آنے والے نمبر اس کے لیے اجنبی تھے۔

”گلاب خاں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

گردیزی چونکا۔ ”مگر یہ نمبر؟“

”میں دوسرے موبائل سے بات کر رہا ہوں۔ یہ پوچھنا

تھا کہ اس کی کال تو نہیں آئی؟“

”میرا موبائل ہی چھن گیا ہے۔“

”کب؟“

گردیزی کو عجیب سا لگا کہ پارکنز ذرا بھی نہیں چونکا

تھا۔ گردیزی نے اسے وقت بتایا۔

پارکنز بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ سوا گھنٹے بعد بھی

تمہیں فون نہیں کیا گیا۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ

فون نہیں کرے گا اور تمہاری بیٹی بھی خیریت سے رہے گی۔“

”ابھی اس شخص سے بھی بات ہوئی تھی جس نے موبائل چھینا

تھا۔“

”کیا کہہ رہا تھا؟“ پارکنز نے پوچھا۔

گردیزی نے ساری بات بتادی۔

پارکنز بولا۔ ”تم نے اس کی ہدایت کی خلاف ورزی تو

نہیں کی؟“

”نہیں۔“

”یہ تم نے اچھا کیا۔ حالات ایسے ہی ہیں کہ تمہیں محتاط

رہنا چاہیے۔ اچھا خیر! میں نے بس یہی پوچھنے کے لیے فون

کیا تھا۔“

گردیزی کا دماغ پھر چکرانے لگا۔ پارکنز نے وہ ساری

باتیں بڑے سرسری انداز میں کی تھیں۔ گردیزی کے دماغ

میں سوال ابھرا، کیا اس کا موبائل پارکنز ہی نے چھنوا یا ہے؟

مگر کیوں؟..... کیوں؟..... کیوں؟

یہ سوالات گردیزی کے دماغ میں کسی وزنی شے کی طرح دھمک پیدا کر رہے تھے۔ وہ بے چینی سے اٹھا اور ٹہلنے

لگا۔ اس کی حرکات و سکنات سے اس کے بڑھے ہوئے اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا۔ پہلی مرتبہ اس کے دماغ میں یہ بات آ رہی تھی کہ کیا وہ اس شرط پر پولیس کو سب کچھ بتا دے کہ سارا معاملہ خفیہ رکھا جائے گا؟

→→→

بابر کی کار میکڈونلڈ پہنچ گئی۔ سرخ شیراڈ پر اس کی نظریں فوراً پڑ گئیں۔ وہ پارک کی ہوئی کاروں کے پیچھے اس طرح کھڑی ہوئی تھی جیسے اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو کسی کا انتظار ہو۔ اس کے قریب ہوتے ہوتے بابر نے اس کا نمبر بھی دیکھ لیا۔ وہی نمبر تھا جو گلاب خاں نے اسے بتایا تھا۔

بابر آہستگی سے اپنی کار شیراڈ کے برابر میں لے گیا تو اسے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص بھی نظر آ گیا۔ اپنے نقش و نگار کے باعث وہ کوئی غیر ملکی ہی معلوم ہو رہا تھا۔

”گلاب خاں۔“ وہ بابر کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی

آواز میں بولا۔ ”میری گاڑی کے پیچھے پیچھے آؤ۔“

بابر کے کچھ بولنے سے پہلے شیراڈ حرکت میں آ چکی تھی۔

بابر کے چہرے پر فکر مندی کے تاثرات تو پہلے ہی تھے،

اب ان تاثرات میں تشویش کا رنگ بھی گھل گیا۔ پہلے اس کا

خیال تھا کہ اس سے میکڈونلڈ ہی میں ملاقات ہوگی اور وہ

وہیں اس سے ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی مانگے گا لیکن وہ اسے

اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتا تھا۔

شیراڈ کے پیچھے پیچھے اپنی کار چلاتے ہوئے وہ سوچ رہا

تھا کہ صورت حال اس کی توقع کے خلاف سامنے آئی تھی۔

بہر حال، بابر نے سوچا، اس نے کچھ بندوبست تو کر ہی

لیا ہے۔

سفر پندرہ منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ شیراڈ قدیم طرز

کے ایک چھوٹے سے بنگلے کے سامنے رکی جو مکمل تاریکی میں

ڈوبا ہوا تھا۔

شیراڈ کی ہیڈ لائٹس بجھا کر وہ غیر ملکی اس سے اترا جواب

تک بابر کو اپنا نام گلاب خاں بتاتا رہا تھا۔ بابر نے اسے پھانک

کی طرف جاتے دیکھا۔ بابر نے اپنی کار کی ہیڈ لائٹس بند نہیں

کی تھیں۔ ہلکی سی روشنی پھانک پر بھی پڑ رہی تھی۔ بابر نے اس

میں قفل پڑا ہوا دیکھا۔ غیر ملکی اسے کھول رہا تھا۔ پھر اس نے

پھانک بھی پوری طرح کھول دیا اور شیراڈ میں واپس آ بیٹھا۔ اس

نے ہاتھ سے بابر کو اشارہ کیا تھا۔ اس اشارے کا مطلب یہ تھا

کہ بابر بھی اپنی کار بنگلے کے احاطے میں لے آئے۔

بابر کے تذبذب میں اضافہ ہوا لیکن کچھ سوچنے اور فیصلہ

کرنے کی مہلت اسے مل ہی نہیں سکی کیونکہ شیراڈ کے اندر

جانے کے بعد اسے اپنی کار بھی حرکت میں لانا ہی پڑی تھی۔ چھوٹے سے بنگلے کا احاطہ بھی چھوٹا ہی سا تھا۔ دو کاریں کھڑی ہونے کے بعد وہاں بالکل گنجائش نہیں رہی۔ دائیں جانب چھوٹا سالان تھا۔

شیراڈ کی ہیڈ لائٹس اور انجن بند ہوا تو بابر کو بھی ایسا ہی

کرنا پڑا۔ غیر ملکی شیراڈ سے اتر کر قریب آیا۔

”اتر آؤ تم بھی۔“ اس نے بابر سے کہا۔ ”میں ذرا

پھانک بند کر آؤں۔“

بابر کار سے اتر آیا۔ پھانک بند کر کے غیر ملکی لوٹا۔

”ہارڈ ڈسک لائے ہوتا؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ بابر نے جواب دیا۔ ”بریف کیس میں

ہے۔“

”تو بریف کیس نکال لو اور میرے پیچھے آؤ۔“

وہ تیزی سے بنگلے کے برآمدے کی طرف بڑھا۔ اس کا

انداز ایسا تھا جیسے بابر کی طرف سے بالکل بے فکر ہو۔

بابر بریف کیس لے کر اس کے قریب پہنچا۔

برآمدے میں دو دروازے دائیں بائیں اور ایک

سامنے کی جانب تھا۔ غیر ملکی نے اسی کا لاک کھولا۔ اب اس

نے اپنی جیب سے ایک پشیل ٹارچ نکال لی تھی۔ اس کی روشنی

میں وہ اندر داخل ہوا۔

روشنی میں بابر نے غیر ملکی کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ وہ

نہایت سرخ و سفید رنگ کا مالک تھا۔ آنکھیں سمندر کی طرح

سبزی مائل نیلی تھیں۔ گل چھوٹوں کی طرح سر کے بال بھی

بھورے اور خاصے بڑے بڑے تھے۔

”آؤ!“ اس نے مڑ کر بابر سے کہا۔

اس وقت بابر کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئی تھیں۔ وہ

اندر داخل ہوا۔ غیر ملکی نے دروازہ بند کیا اور پھر قریب ہی کے

سوچ بورڈ کے کئی بٹن دبائے۔ کمرابقہ نور بن گیا۔ وہاں کے

فرنیچر سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کمر صرف ڈرائنگ روم کے

طور پر استعمال کیا جاتا ہوگا۔ اندرونی جانب اس کے دو

دروازے تھے جن میں سے ایک بند تھا، دوسرے پر روشنی

پردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں کمپیوٹر رکھا تھا۔

اس کے سامنے ایک کرسی پڑی ہوئی تھی۔

”آؤ، بیٹھو!“ غیر ملکی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”معاف کرنا۔ میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔ تمہاری خاطر

مدارات نہیں کر سکوں گا۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“ بابر نے ایک صوفے پر بیٹھے

ہوئے پوچھا۔

وہ ہنس۔ ”سمجھ گئے تم؟“

”تمہیں دیکھ کر کوئی بھی سمجھ سکتا ہے کہ تم غیر ملکی ہو۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو تم! میرا نام پارکنز ہے۔“

”اور تمہارا تعلق کسی غیر ملکی ایجنسی سے ہے۔“

”حالات کے باعث تم یہ بھی سمجھ سکتے ہو، لیکن کیا اس سے تمہارے لیے کوئی فرق پڑتا ہے؟“

”نہیں۔“ بابر نے کہا۔ ”مجھے اندازہ ہے کہ میرے ملک میں غیر ملکی سرگرمیاں بہت تیزی سے بڑھ رہی ہیں لیکن مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ میں صرف پیسا کمانا چاہتا ہوں۔ طریقہ کوئی بھی ہو۔“

”ہارڈ ڈسک نکالو۔“ پارکنز نے کہا۔ وہ بہت سکون سے باتیں کر رہا تھا لیکن بابر نے محسوس کر لیا کہ وہ ہارڈ ڈسک کے لیے بہت بے چین تھا۔

بابر نے ہند سے سیٹ کر کے بریف کیس کھولا۔ اس میں سے ہارڈ ڈسک نکال کر تپائی پر رکھی، پھر جیب سے ایک یو ایس بی بھی نکال کر ڈسک کے قریب رکھ دی۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ سب کچھ کیوں؟“ بابر بولا۔

”ہاں۔“ پارکنز ایک ٹھنڈی سانس لے کر صوفے سے اٹھا اور ٹہلے ہوئے بولا۔ ”مجھے اس کا بے حد افسوس ہے کہ گرویزی کی حماقت سے میں تم جیسا ایک قلم کار ضائع کر بیٹھا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”جب تم یہ سمجھ چکے ہو کہ میرا تعلق کسی غیر ملکی ایجنسی سے ہے، تو پھر تم یہ اندازہ بھی لگا سکتے ہو کہ یہاں کی خفیہ ایجنسیاں میری دشمن ہوں گی۔“

بابر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

پارکنز بولتا رہا۔ ”ایک ایجنسی کو تمہارے قلمی نام، یعنی جاوید اشرفی پر شبہ ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے سرسری انداز میں گرویزی سے تمہارے بارے میں..... یعنی جاوید اشرفی کے بارے میں جاننا چاہا۔ جب گرویزی نے انہیں کچھ نہیں بتایا تو انہوں نے گرویزی کی بیٹی کو اغوا کر لیا۔“

”اوہ!“ بابر کے منہ سے نکلا۔

”اس وقت گرویزی کے اعصاب ٹوٹ گئے۔“ پارکنز کہتا رہا۔ ”وہ ان لوگوں کو تمہارا ای میل ایڈریس بتا بیٹھا۔ یہ تم بھی جانتے ہو گے کہ اس ذریعے سے ہر اس آدمی کا پتا لگایا جاسکتا ہے جس کا ای میل ایڈریس معلوم ہو جائے۔“

بابر کے ہونٹ ہنچ گئے۔

”زیادہ سے زیادہ کل صبح تک وہ تمہارے گھر تک بھی پہنچ جائیں گے۔“ پارکنز نے بات جاری رکھی۔ ”تمہارے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک کے باعث وہ جان لیتے کہ تمہی جاوید اشرفی کے نام سے لکھتے ہو۔ انہیں وہ معلومات بھی حاصل ہو جاتیں جو میں وقتاً فوقتاً تمہیں بھیجتا رہا ہوں۔ اس طرح انہیں میرا ای میل ایڈریس بھی معلوم ہو جاتا اور وہ میرا یہ گھر بھی ٹریس کر لیتے۔“

”ہوں!“ بابر نے ایک طویل سانس لی۔ فی الحال وہ کچھ بولنے کی پوزیشن میں تھا ہی نہیں۔ اس کے دماغ میں صرف یہ سوال چکرارہا تھا کہ اب پارکنز آئندہ کے لیے کیا سوچے گا یا کیا سوچ چکا ہے؟

”اسی لیے میں نے تم سے ہارڈ ڈسک منگوائی۔“ پارکنز کہہ رہا تھا۔ ”یو ایس بی میں وہ سب کچھ اس لیے منتقل کروایا کہ اب یہ لیپ ٹاپ میں استعمال کی جاسکتی ہے۔ ہارڈ ڈسک تو لیپ ٹاپ میں لگ نہیں سکتی اور لیپ ٹاپ پر کام کرتے ہوئے اگر جگہ تیزی سے تبدیل کی جانی رہے تو یہ کام کرنے والے کو ٹریس نہیں کیا جاسکتا۔“

”تو کیا اب تم یہ چاہتے ہو کہ میں لیپ ٹاپ کے ساتھ تمہاری ہدایت کے مطابق کام کرتے ہوئے کراچی میں ادھر ادھر گھومتا رہوں؟“

”فوری طور پر..... میرا مطلب ہے جب میں نے تم سے ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی منگوائی تھی، میرے دماغ میں یہی خیال ابھرا تھا لیکن میں نے کراچی کی بات نہیں سوچی تھی۔ یہ سوچا تھا کہ تم کسی دور دراز شہر میں چلے جاؤ۔ کیونکہ اب خفیہ ایجنسی والوں کو تمہاری شخصیت کا علم ہو جائے گا اس لیے اگر تم کراچی میں رہے تو وہ تمہیں آسانی سے ڈھونڈ نکالیں گے۔ تم بیرون شہر جا کے ہی میری ہدایات کے مطابق کام کر سکتے ہو لیکن میں اس وقت سے اب تک اسی سوچ میں ہوں کہ کیا تم ایسا کر سکو گے..... میں اس بارے میں پوری یکسوئی سے سوچتا تو کوئی فیصلہ کر لیتا لیکن اس دوران میں مجھے دوسری ایجنسیں بھی لاحق رہیں۔ موبائل پر میں اپنے دوسرے ساتھیوں سے رابطے میں رہا اور کیونکہ یہاں میں ہیڈ ہوں اس لیے ساری ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ مجھے ہر پہلو سے بچاؤ کے لیے سوچنا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ گرویزی نے شاید اپنے موبائل فون پر میرے بارے میں کچھ یادداشتیں فیڈ کر رکھی ہوں اس لیے میری ہدایت پر میرے آدمی نے اس سے اس کا موبائل فون چھین لیا ہے۔ اسی دوران میں مجھے ایک مرتبہ گرویزی سے بھی بات کرنا پڑی۔“

پانچواں آدمی

احتیاطاً میں نے اپنا موبائل فون بھی بند کر دیا ہے اور سیٹلائٹ فون استعمال کر رہا ہوں۔ دراصل مجھے شبہ تھا کہ گرویزی کا موبائل فون اگر یہاں کی ایجنسی نے اس سے لے لیا تو انہیں میرا موبائل فون نمبر بھی معلوم ہو جائے گا۔ وہ میرا سراغ بھی لگا لیں گے۔“

”گرویزی سے تمہیں موبائل فون چھنونا کیوں پڑا؟ کیا وہ تم سے تعاون نہیں کر رہا ہے؟“ بابر نے پوچھا۔

”وہ تعاون تو کر رہا تھا۔ اسی لیے میں نے اپنے ایک آدمی کو اس کے گھر بھیجا تھا۔ وہ گلاب خاں کا نام لیتا تو گرویزی اس کی ہر بات مان لیتا یا زیادہ سے زیادہ مجھے خود بھی اسے فون کرنا پڑتا لیکن اس کی نوبت نہیں آسکی۔ میرے آدمی کی کار گرویزی کے ہینکے کے پھانک پر رکی ہی تھی کہ ادھر ادھر چھپے ہوئے کچھ آدمی اس پر جھپٹ پڑے۔ وہ یہاں کی خفیہ ایجنسی ہی کے لوگ ہوں گے۔ میرے آدمی کو دیکھتے ہی انہوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ مغربی ملک کا ہے۔ وہ اس نتیجے پر بھی پہنچ گئے ہوں گے کہ وہ میرا ساتھی ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کو اپنی طرف جھپٹتے دیکھ کر میرا آدمی وہاں سے بھاگ نکلا۔ ان میں سے کسی نے فائر کر کے میرے آدمی کی کار کا ٹائر برسٹ کرنا چاہا تھا لیکن اس کا نشانہ خطا گیا۔ پھر دوسرا فائر کرنے کی نوبت اس لیے نہیں آئی کہ میرے آدمی نے کار ایک سڑک پر موڑ لی تھی۔ خفیہ ایجنسی والے ایک کار میں بیٹھ کر اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ اگرچہ میرا آدمی ان کے ہاتھ نہیں لگ سکا لیکن میں نے اس سے موبائل فون پر رابطہ کر لیا تھا۔ میری ہی ہدایات کے مطابق عمل کر کے وہ یہاں کی ایجنسی والوں کو غچہ دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو سکا۔“

بابر نے اس دوران میں دو باتیں محسوس کیں۔ ایک تو یہ کہ پارکنز مضطرب تھا۔ اضطراب ہی کی وجہ سے وہ ہل ہل کر باتیں کر رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ بولتے بولتے اس طرح رک بھی جاتا جیسے اس کے دماغ میں کوئی خیال آ گیا ہو۔ پھر کسی حد تک چونکے ہوئے انداز میں بولنا شروع کر دیتا۔

”ابھی ایک کام اور باقی ہے۔“ پارکنز کہہ رہا تھا۔ ”گرویزی کے کمپیوٹر کی ڈسک بھی میرے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے دو آدمیوں کو اس بارے میں ہدایات دے دی ہیں۔ وہ آج رات کسی وقت گرویزی کے گھر میں گھس کر ہارڈ ڈسک وہاں سے نکال لائیں گے۔“

بابر نے پر خیال انداز میں سر ہلایا، پھر بولا۔ ”تم نے میری اس بات کا جواب نہیں دیا کہ گرویزی سے موبائل چھنوانے کی ضرورت کیوں پیش آئی جبکہ وہ اب بھی تم سے

تعاون کر رہا ہے۔“

”حالات کی وجہ سے۔“ پارکنز نے جواب دیا۔ ”مجھے اس کا موبائل جلد از جلد حاصل کر لینا تھا۔ میں نے اسے فون پر ہدایت کی کہ وہ پولیس والوں سے چھٹکارا حاصل کر کے.....“

”پولیس؟“ بابر چونکا۔

”ہاں۔“ پارکنز پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ ”اس کے ہینکے کے پھانک پر رکنے والی کار اچانک بھاگ نکلی تھی اور اس پر کیے جانے والے فائر کی وجہ سے آس پاس کے علاقے میں ہیجان پھیل گیا تھا۔ ایسے میں کسی نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ پولیس وہاں پہنچ گئی تھی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ مفرد کار گرویزی کے پھانک پر رکی تھی، اس لیے ظاہر ہے کہ پولیس والے گرویزی سے پوچھ گچھ تو کریں گے۔“

”ہوں۔“ بابر نے سر ہلایا۔

”تو میں یہ بتا رہا تھا کہ جب گرویزی اپنے گھر سے اپنے دفتر کی طرف روانہ ہوا تو.....“

پارکنز نے بابر کو وہ صورت حال بتائی جس سے گرویزی دوچار ہوا تھا۔ وہ جیسے ہی خاموش ہوا، بابر بول پڑا۔

”لیکن وہ آدمی گلاب خاں کا نام لے کر بھی تو گرویزی سے اس کا موبائل فون لے سکتا تھا۔“

”گرویزی کے ساتھ اس کا شو فر بھی تھا۔ اسے شبہ ہو جاتا۔ یہ بات ناممکن نہیں کہی جاسکتی کہ وہ کسی وقت پولیس کو کچھ بتا بیٹھتا۔“

بابر نے بھی جاننا چاہتا تھا کہ پارکنز کے آدمی گرویزی کے گھر سے اس کے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک کس طرح حاصل کریں گے لیکن اس سوال کے بجائے بابر کا دھیان دوسری طرف چلا گیا۔

پارکنز ٹہلے ٹہلے اس اندرونی دروازے پر جا رہا تھا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ پردہ بالکل درست حالت میں تھا لیکن گرویزی اسے ادھر ادھر سے خواخوہشک کرنے لگا۔

”تم بہت بے چین نظر آ رہے ہو پارکنز!“ بابر بولے بغیر نہ رہ سکا۔

پارکنز چونکے ہوئے سے انداز میں مڑا اور پھر وہیں کھڑے کھڑے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”صحیح سمجھا تم نے! میں نے ابھی تمہیں بتایا تھا کہ انہی سب حالات میں الجھا رہنے کی وجہ سے میں فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ تم سے اب کس طرح کام لیا جائے۔ یہاں آنے کے بعد بھی تم سے باتیں کرتے ہوئے میں اسی سوچ بچار میں رہا ہوں۔“

اب بابر کی سمجھ میں آیا کہ پارکنز بے چین کیوں تھا اور

بولتے بولتے اچانک اس طرح رک کیوں جاتا تھا جیسے دماغ میں کوئی خیال آیا ہو۔

”لیکن آخر کار..... اب۔“ پارکنز نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یہ پردہ ٹھیک کرتے ہوئے میں اس فیصلے پر پہنچا کہ اب پردہ گر جانا ہی مناسب ہوگا۔ کھیل ختم ہو چکا ہے۔“

”کیا مطلب!“ بابر نے تعجب سے پوچھا۔ ”میں سمجھا نہیں۔“

پارکنز جہاں تھا، وہیں کھڑا رہا۔ اب اچانک اس کے چہرے پر گہرے تاثرات پھیل گئے تھے۔

”بابر!“ وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ”میں دراصل اب تک یہ سوچتا رہا ہوں کہ اب تم سے کام لوں یا نہ لوں! ایک صورت یہ ممکن تھی کہ میں تمہیں ایک لیپ ٹاپ کے ساتھ اس شہر سے کہیں دور بھیج دیتا لیکن آخر میں اس نتیجے تک پہنچ گیا ہوں کہ یہ ممکن نہیں۔ تم ساری زندگی تو اپنے گھر والوں سے دور نہیں رہ سکتے۔ کسی نتیجے تک پہنچنے ہی کے لیے میں تم سے اتنی دیر تک باتیں کرتا رہا ہوں، لیکن مجھ سے ایک غلطی اور ہوئی۔

میں نے تمہیں ایسی باتیں بھی بتا دیں جو مجھے نہیں بتانا چاہیے تھیں۔ ان باتوں سے پہلے میں یہ فیصلہ بھی کر سکتا تھا کہ اب تم اپنے گھر واپس چلے جاؤ۔ یہاں کے ادارے تم پر کوئی سنگین مقدمہ نہیں بنا سکتے تھے۔ تمہارا یہ بیان کافی ہوتا کہ تم نادانستگی میں کسی کے آلہ کار بن گئے تھے لیکن اب یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تمہیں واپس بھیج دوں۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ تمہیں اپنے ملک اور یہاں حکومت کرنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن میری یہ باتیں، جو میں ابھی کر چکا ہوں، اگر کسی وقت بے خیالی میں بھی تمہاری زبان پر آگئیں تو میرے لیے پریشانی کا سبب بن سکتی ہیں۔“

”تو؟“ بابر بے چین ہوا۔ ”اب تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”ابھی میں نے کہا تھا نا! پردہ گر جانا چاہیے۔ کھیل ختم ہو چکا ہے۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا!“

”مجھے بے حد افسوس ہے۔“ پارکنز نے دھیمی آواز میں کہتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ”تم نے میرے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا لیکن اب تمہاری زندگی میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔“ اس کا ہاتھ کوٹ کی جیب سے باہر آیا تو بابر کا سارا جسم سنسنا گیا۔

پارکنز کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نال بابر کو نشانہ بنائے ہوئے تھی۔ بابر گہرا کے کھڑا ہو گیا۔

”میں ابھی کہہ چکا ہوں بابر کہ مجھے بے حد افسوس ہے۔ مجھے یہ فیصلہ مجبوراً کرنا پڑ رہا ہے۔“ پارکنز نے کوٹ کی دوسری جیب سے سائمنسرنکالا اور ریوالور کی نال پر فٹ کرنے لگا۔

”مجھے خیال آیا تھا کہ میں کسی خطرے میں پڑ سکتا ہوں۔“ بابر نے تیزی سے کہا۔ ”اسی لیے میں نے اپنے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی کہیں اور پہنچا دی ہے۔“

”کیا!“ پارکنز چونکا۔

”ہاں۔“ بابر نے کہا۔ ”میں نے تم سے بہانہ کیا تھا کہ مجھے میرے والد نے کسی کام سے بھیج دیا ہے۔ دراصل میں ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی کسی جگہ چھپانے گیا تھا۔ جو ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی میں لایا ہوں، یہ خالی ہے۔ اس میں کچھ نہیں ہے۔ میرے پاس اسپئر ہارڈ ڈسک بھی تھی۔“

پارکنز کا چہرہ فق پڑ گیا۔

”ہاں پارکنز!“ بابر نے کہا۔ ”اگر تم نے مجھے مار ڈالا تو وہ ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی میرے ایک دوست کو مل جائے گی اور تم اس کی وجہ سے پریشانی میں پڑ جاؤ گے۔“ وہ ہارڈ ڈسک ہی اب میری زندگی کی ضمانت ہے۔“

”بکواس کر رہے ہو تم اپنی جان بچانے کے لیے!“

پارکنز غرایا۔ اس کا لہجہ اب یکسر بدل گیا تھا۔

”یہاں کمپیوٹر موجود ہے۔“ بابر نے کہا۔ ”تم چیک کر سکتے ہو کہ یہ ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی خالی ہیں۔“

پارکنز کے چہرے سے اب بھی بے اعتباری مترشح تھی لیکن اس کے باوجود وہ غصے میں نظر آنے لگا تھا۔

بابر نے اس خیال سے سکون محسوس کیا کہ پارکنز اب اسے گولی نہیں مارے گا، وہ بولا۔ ”تم چیک کر لو یہ دونوں چیزیں۔“

پارکنز کے ہونٹ بھیج گئے۔ وہ بابر کو بڑی تیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ غالباً اب اس کی بے اعتباری بھی ختم ہو رہی تھی۔

”چند قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔“ وہ لپکا لپکا غرایا۔

بابر پیچھے ہٹ گیا تو پارکنز نے آگے آکر ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی اٹھائی۔ اس کے ریوالور کا رخ اب بھی بابر ہی کی طرف تھا۔ کمپیوٹر کی طرف جاتے ہوئے بھی اس نے بابر کی طرف پشت نہیں کی تھی۔

بابر اب قدرے مطمئن ہونے کے باوجود اس خیال سے بیجان اور پریشانی کا شکار بھی تھا کہ ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی خالی ملنے کے بعد پارکنز کا رویہ کیا ہوگا۔

جلد ہی پارکنز کو معلوم ہو گیا کہ بابر نے غلط نہیں بتایا تھا۔

پانچواں آدمی

اس کے جسم میں داخل ہوئی تھی۔

رخسار کی چلائی ہوئی گولی نے پارکنز کے اس ہاتھ کو زخمی کیا تھا جس میں ریوالور تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ پارکنز نے فوراً اس دروازے کی طرف جست لگائی جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔

”رک جاؤ!“ رخسار انگریزی میں چیخی۔ ساتھ ہی اس نے دوسرا فائر بھی کیا لیکن اس کا نشانہ خطا گیا۔ پارکنز دوسری طرف نکل گیا تھا۔

بابر کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ اسی عالم میں وہ ڈمگا کر فرش پر گرا۔ تیزی سے بہتا ہوا خون اس کے کپڑے تر بہ کر رہا تھا۔

”بابر!..... بابر!“ رخسار کی آواز بابر کو کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں زور سے کھینچ کر کھولیں۔ اس طرح اس نے اپنی آنکھوں کے آگے آتا ہوا اندھیرا ختم کرنے کی کوشش کی تھی اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب رہا۔ اس نے دیکھا کہ رخسار اپنے بائیں ہاتھ میں دبا ہوا موبائل فون کان سے لگائے ہوئے تھی اور دوسرا ہاتھ اس نے بابر کے زخم پر سختی سے جمار کھا تھا۔ اس طرح وہ خون کے بہاؤ کی شدت روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا وہ ہاتھ بابر کے خون میں رنگا ہوا تھا۔

”وہ..... وہ..... پانچواں..... پارکن.....“ بابر پورا نام نہیں لے سکا۔

”اگر تم اس غیر ملکی کی بات کر رہے ہو تو وہ فرار ہو چکا ہے۔ اس کمرے میں ایک کھڑکی ہے جس سے.....“ رخسار نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور موبائل فون پر کسی سے کہنے لگی۔ ”ہاں خالد! میں ہی بول رہی ہوں۔ تم فوراً ایمبولینس لے کر میرے بتائے ہوئے پتے پر پہنچو.....! بہت جلدی خالد! بہت جلدی، ایمبولینس میں آئیجن اور طبی امداد کا سامان ضرور ہونا چاہیے!“ پھر اس نے اس جگہ کے بارے میں بتایا جہاں بنگلا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسپتال کا نام بھی بتایا جو اس جگہ سے دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔

بابر کی پلکیں پھر جھکتی چلی جا رہی تھیں۔

”تمہیں کچھ نہیں ہوگا بابر! تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ رخسار اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہذیانی انداز میں بولی مگر اس وقت اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ”میں پارکنز کا تعاقب کرتی لیکن تمہاری حالت کی وجہ سے.....“ اس کی آواز اس کے حلق میں گھٹ گئی۔

بابر کے جسم کو جھٹکا لگا، گولی اس کی پسلیوں کے پاس سے

”اب مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں رہی۔“ وہ بابر کو گھورتے ہوئے کھا جانے والے انداز میں بولا۔ ”اور تمہیں یہ تو بتانا ہی پڑے گا کہ اصل ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی کہاں ہے؟“

”یہ بتا کر میں اپنی موت کو دعوت نہیں دے سکتا پارکنز!“ بابر نے سنجیدگی سے کہا۔ ”وہ حاصل کرنے کے بعد تم مجھے زندہ تو نہیں چھوڑو گے۔“

”یہ تو ظاہر ہے، لیکن اگر تم نہیں بتاؤ گے تو میں تمہارا وہ حال کردوں گا کہ تم موت کی خواہش کرو گے۔“

”تم مجھ پر تشدد کرو گے؟“

”یقیناً۔“

”تو میں سک سک کر مر جاؤں گا لیکن زبان نہیں کھولوں گا۔“ بابر نے کہا۔ ”اگر موت ہر حال میں میرا مقدر بن چکی ہے تو میں دوسری صورت میں مرنے کو ترجیح دوں گا۔

اس طرح میرے بعد تم بھی نہیں بچ سکو گے۔ اصل ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی آخر کار یہاں کی ایجنسی والوں کو مل ہی جائے گی۔“

”اس سے پہلے کہ وہ ایجنسی والوں کے ہاتھ لگے، میں خود اس کا سراغ لگا لوں گا۔ وہ تم نے یا تو اپنے گھر پر ہی کہیں چھپائی ہوگی یا اس لڑکی کو دے آئے ہو گے جس سے تم محبت کرتے ہو۔ میں تمہارے بارے میں مکمل چھان بین کرنے کے بعد ہی تمہاری طرف متوجہ ہوا تھا۔ ہارڈ ڈسک میں کسی طرح بھی حاصل کر لوں گا اور موت تمہارا مقدر بن چکی ہے۔“ پارکنز کے انداز سے ایسا ظاہر ہوا جیسے اس نے فوراً ہی بابر کو گولی مار دینے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

بابر کے جسم میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔ موت کو سامنے دیکھنا آسان نہیں ہوتا۔

لیکا ایک اس دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی جس سے وہ دونوں اندر آئے تھے۔ پارکنز چونکا۔ باہر سے کسی نے دروازے کو دھکا دیا۔ اندر سے بولٹ نہیں کیا گیا تھا، دروازہ چوپٹ کھل گیا۔

وہ منظر بابر کے لیے بھی حیران کن تھا کہ ریوالور ہاتھ میں لیے اندر آنے والی رخسار تھی۔

غصے اور گہرا ہٹ میں پارکنز کے منہ سے کچھ عجیب سی آواز نکلی۔ اسی عالم میں اس نے بابر پر فائر جھونک دیا، اس کے بعد وہ رخسار کو نشانہ بنانا چاہتا ہوگا لیکن جس وقت پارکنز کے ریوالور سے گولی نکلی، ٹھیک اسی وقت رخسار کے ریوالور سے بھی فائر ہوا تھا۔

بابر کے جسم کو جھٹکا لگا، گولی اس کی پسلیوں کے پاس سے



ایران کے جزیرہ

کیش کے ایک مرد رویش نے اپنی بد صورت بھوی کو چہرے پر پاؤ ڈر لگاتے ہوئے دیکھ کر کیا ہی اچھا جملہ کہا۔ ”جب تقدیر کے ہاتھوں نے تجھے بد صورت بنایا ہے تو پھر چہرے پر پاؤ ڈر ملنے سے کیا حاصل؟ نہ تو طاقت سے نیک بختی خریدی جاسکتی ہے اور نہ ہی اندھی آنکھ سرمہ لگانے سے روشن ہو سکتی ہے۔ کتے سلائی کا کام نہیں کر سکتے اور کینے نیک بختوں والا کام نہیں کر سکتے اور اگر یونان و روم کے تمام فلسفی بھی اکٹھے ہو جائیں تو تصور سے شہد نہیں بنا سکتے۔ جتنی بھی کوشش کر لو وحشی، انسان نہیں بن سکے گا، کوشش ہی ضائع ہوگی۔ آئینہ کا رنگ تو صاف ہو سکتا ہے مگر پتھر کا آئینہ بننا محال ہے۔ بیر کی شاخ سے پھول کبھی نہ اگے گا اور حبشی کو پورا سمندر بھی سفید نہ کر سکے گا۔“

شیخ سعدی کی کتاب ”بوستان سعدی“ کے ترجمہ مولانا غلام حسن قادری سے اقتباس

طبع

ایک بھوی بی ایک فاقوں کی ماری ہوئی بوڑھی عورت کے گھر میں گھس گئی۔ چند دن پہلے کھڑے کھا کر گزارا کرتی رہی۔ ایک دن ترنوالے کے لالچ میں امیر شہر کے محل میں جا کر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ امیر کے نوکروں نے ایسا تیر مارا کہ بے چاری بی زبان حال سے کہہ رہی تھی۔ ”اگر خدا نے میری جان بچالی تو میں چوہے کھا کر گزارا کر لوں گی لیکن بڑھیا کی جھونپڑی نہیں چھوڑ دوں گی۔“

شیخ سعدی کی کتاب ”بوستان سعدی“ کے ترجمہ مولانا غلام حسن قادری سے اقتباس

مرسلہ: محمد مجید رشید خان، لہ

”یہ اچھا ہوا۔“ رخسار نے کہا۔ ”تم میری گاڑی میں آؤ۔ میں ایسولینس میں ہی جاؤں گی۔“

اسی وقت ایک اور تیز رفتار کار وہاں آ کے رکی۔ اس میں سے چار آدمی اتر کر تیزی سے آگے آئے۔ ان لوگوں کا تعلق بھی رخسار ہی کے ادارے سے تھا۔ انہیں بھی رخسار ہی نے فون کر کے بلایا تھا۔ اس نے ان تینوں کو اس بنگلے اور وہاں موجود سرخ شیراڈ کے بارے میں بتایا اور ایسولینس میں سوار ہو گئی۔

ایسولینس میں موجود اسپتال کے افراد بابر کو ابتدائی طبی امداد دینے میں مصروف ہو گئے۔ یہ ضروری تھا کہ بابر کے خون کا بہاؤ کم سے کم کیا جاسکے۔ اتنی دیر میں بھی اس کا اتنا خون بہہ چکا تھا کہ چہرے پر زردی چھانے لگی تھی۔

”بابر!“ رخسار نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ ”یہ میرا عہد ہے اگر خدا نخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں اس شخص کو ڈھونڈ کر اس کے ٹکڑے اڑا دوں گی۔“

ایسولینس سائرن بجاتی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ رخسار نے موبائل فون پر خالد سے رابطہ کیا۔

”میری گاڑی میں ایک بریف کیس ہے خالد!“ اس نے کہا۔ ”وہ نمبروں کی ترتیب سے کھل سکتا ہے اور نمبروں کا مجھے علم نہیں۔ تم اسے توڑ ڈالو اور دیکھو کہ اس میں کیا ہے، میں تمہاری کال کا انتظار کروں گی۔“

اس کو یہ ہدایت دینے کے بعد رخسار نے اپنے والد کیف ہمدانی سے رابطہ کیا۔ باپ کو اس نے صرف اتنا بتایا کہ بابر کو کسی نے گولی مار دی ہے اور وہ بابر کو اسپتال لے جا رہی ہے۔

”یہ کیسے ہوا؟“ کیف ہمدانی نے تیزی سے پوچھا، پھر جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔ ”تم نے بھائی صاحب کو اطلاع دی؟“

”انہیں آپ فون کیجیے! بس خیریت معلوم کیجیے! انہیں ابھی کچھ اور نہ بتائیں تو بہتر ہے۔ بابر کے بارے میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ رخسار کی آواز بھرا گئی۔ پھر اس نے اس اسپتال کا نام بتایا جہاں وہ بابر کو لے جا رہی تھی۔ بات ختم کرنے کے بعد وہ بے چین نگاہوں سے بابر کی طرف دیکھنے لگی جسے آکسیجن دی جا رہی تھی۔

ایسولینس اسپتال کے قریب پہنچنے والی تھی۔ رخسار نے خالد کی کال وصول کی۔ ”میں نے کھول لیا ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اس میں کسی کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک اور ایک یو ایس بی کے علاوہ کچھ نہیں۔“

ہارڈ ڈسک کی بات نے رخسار کو چونکا دیا۔ وہ اس بنگلے

ملاقات کے لیے کہا تو بھی وہ ریوالور کے ساتھ ہی وہاں پہنچی تھی۔ بابر جب اسے بریف کیس دے کر گیا تھا تو وہ بہت فاصلے سے اس کی کار کے تعاقب میں لگ گئی تھی۔ اس نے بابر کے چہرے سے ظاہر پریشانی سے اندازہ لگایا تھا کہ بابر کسی غیر معمولی صورت حال سے دوچار ہے۔ یہ اندازہ اس وقت یقین میں بدل گیا جب اس نے بابر کی کار ایک سرخ شیراڈ کے پاس رکتے دیکھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی غیر ملکی بیٹھا تھا۔

جب بابر کی کار سرخ شیراڈ کے پیچھے جا رہی تھی، اس وقت بھی رخسار نے بابر کا تعاقب جاری رکھا تھا۔

بنگلے میں ان دونوں کے چلے جانے کے بعد رخسار اپنی کار کچھ فاصلے پر کھڑی کر کے بابر کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگی تھی لیکن اس سے زیادہ انتظار نہیں ہو سکا تھا۔ بابر کی پریشانی اسے احساس دلا رہی تھی کہ بابر کسی خطرے میں پڑ سکتا تھا۔

اس کے بعد ناممکن تھا کہ رخسار اس بنگلے میں داخل نہ ہوتی۔ وہ کمرے کے دروازے پر اس وقت پہنچی تھی جب پارکنز بابر سے کسی ہارڈ ڈسک کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ وہ اسے کسی نہ کسی طرح حاصل کر لے گا اور بابر کو ختم کرنا اب اس کے لیے لازمی ہو چکا ہے۔

رخسار نے دروازے پر ہلکا سا پاؤ ڈال کر اندازہ لگایا تھا کہ وہ اندر سے بند نہیں تھا لہذا وہ دروازے کو زور سے دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو گئی تھی۔ تربیت کے باعث رخسار کو یقین تھا کہ دروازہ کھلنے کی غیر متوقع آواز بابر کے دشمن کو چونکا دے گی لہذا وہ انہی دو تین لمحوں میں صورت حال کو اپنے حق میں کر لے گی لیکن جب اس نے دیکھا کہ پارکنز بابر پر گولی چلانے ہی والا تھا تو وہ بھی پارکنز کے ہاتھ پر فائر کر بیٹھی۔

پارکنز زخمی تو ہو گیا تھا لیکن وہ دوسرے کمرے کی کھڑکی سے کود کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا اور رخسار اس کے پیچھے جانے کے بجائے بابر کو دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

اب اس نے خالد نامی جس شخص کو ایسولینس کے ساتھ بلایا تھا، وہ خفیہ ادارے میں اس کے ساتھ کام کرتا تھا۔ خالد جب ایسولینس کے ساتھ وہاں پہنچا تو رخسار بے ہوش بابر کو کسی نہ کسی طرح کمرے سے برآمدے میں لے آئی تھی۔

جس وقت بابر کا اسٹریچر ایسولینس میں چڑھایا جا رہا تھا، رخسار نے خالد سے پوچھا۔ ”تمہاری گاڑی کہاں ہے؟“

”میں ایسولینس میں ہی آ گیا۔ کار اسپتال میں چھوڑ دی تھی۔“

بابر نے اس کی آواز شاید ہی سنی ہو۔ اس پر غشی طاری ہونے لگی تھی یا طاری ہو چکی تھی۔

رخسار کی حالت اس وقت کچھ غیر سی تھی۔ ایک طرف بابر کا خیال تھا اور دوسری طرف اس غیر ملکی کے فرار ہو جانے کا افسوس! ساتھ ہی ساتھ یہ خیالات بھی اس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے کہ وہ بابر کے گھر والوں کو اس صورت حال کی اطلاع دے یا نہ دے۔

بابر اس وقت ہوش میں ہوتا تو حیران ضرور ہوتا کہ رخسار اچانک وہاں کیسے پہنچ گئی؟ اس کے پاس ریوالور کی موجودگی اور پھر گولی چلانے کی مشاقی؟ بابر کے لیے کبھی کچھ حیران کن ثابت ہوتا۔ اسے قطعاً علم نہیں تھا کہ رخسار جب فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی تو اس نے ”اسپاننگ اینڈ کاؤنٹر اسپاننگ“ کے نام سے انگریزی میں ایک مضمون لکھ کر ملک کے کئی خفیہ اداروں کو چونکا دیا تھا۔ انہی میں سے ایک ادارے نے اس سے رابطہ بھی کیا تھا۔ ان کی زبان سے سراغ رسانی کے معاملے میں اپنی بیٹی کی ذہانت کا علم ہونے پر کیف ہمدانی کو بے حد خوشی ہوئی تھی۔ رخسار کے لیے تو وہ بڑے خوش کن اور سنسنی خیز لمحات تھے جب اس ادارے نے اس کی خدمات حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس نے اس شرط کے ساتھ اس ادارے کی پیشکش قبول کر لی کہ وہ اپنی تعلیم نامکمل نہیں چھوڑے گی۔ خود کیف ہمدانی بھی یہی چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی کم از کم گریجویشن ضرور کر لے۔

خفیہ ادارے نے رخسار کی شرط مان لی تھی۔ اس کے بعد کا ڈھائی سال کا عرصہ اس طرح گزرا تھا کہ رخسار نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی تھی اور خفیہ ادارہ اس کی تربیت بھی کرتا رہا تھا۔

چھ ماہ قبل رخسار اس ادارے کی باقاعدہ رکن بن چکی تھی۔ اس عرصے میں اس نے دہشت گردوں کے ایک گروہ کے چار آدمیوں کو گرفتار بھی کرایا تھا لیکن ادارہ خود یہ چاہتا تھا کہ رخسار جب تک اپنی تعلیم مکمل نہ کر لے، اس پر زیادہ کام کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔

رخسار بھی اپنی تعلیم پر بھرپور توجہ دے رہی تھی کیونکہ یہ اس کا آخری سال تھا لیکن شہر کے حالات اور چار دہشت گردوں کو گرفتار کرانے کے باعث وہ خود کو خطرے میں محسوس کرتی تھی۔ اسی خطرے کے باعث اسے محتاط رہنا پڑتا تھا۔ جب بھی وہ گھر نکلتی، اس کے پاس ریوالور ضرور ہوتا تھا۔ اس رات جب بابر نے پریشان سے لب و لہجے میں اس سے موبائل پر بات کی اور اس سے ایک خاص جگہ پہنچ کر

جنت میں داخلہ کا سبب

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کہا۔
”مجھے ایسا عمل بتائیں جو مجھے جنت میں داخل کر دے؟“ لوگوں نے کہا۔ ”اسے کیا ہے، اسے کیا ہے؟“ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ ”اسے کوئی اہم حاجت صرف ایک اللہ کی عبادت کر اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کر، نماز قائم کر، زکوٰۃ ادا کر اور صلہ رحمی کر (یعنی قرابت داروں کا حق ادا کر)“ صحیح بخاری سے اقتباس
مرسلہ: محمد قیس شہزادہ داخل، خلع راجن پور

پانچواں آدمی

نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ جاوید اشرفی فرضی نام ہے۔ اس نام سے جو شخص کالم لکھتا تھا، وہ اس وقت اسپتال میں ہے۔ اسے گولی ماری گئی ہے۔“
”واہٹ!“ جعفری تقریباً چیخ پڑا۔
”جی ہاں۔“ رخسار نے کہا۔ ”آپ اسپتال آ جائیں تو بہتر ہوگا۔“

”میں آتا ہوں۔“ جعفری نے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی تھی۔ ”لیکن جہاں میں ہوں، یہاں مجھے پانچ منٹ لگیں گے۔ یہاں سے میں سیدھا اسپتال ہی آؤں گا۔ اسپتال.....؟“
رخسار نے جعفری کی بات مکمل ہونے سے پہلے اسپتال کا نام بتا دیا۔

جعفری نے موبائل بند کر کے گردیزی کی طرف دیکھا۔ اس کی بیٹی افروز صوفے پر اس کے شانے سے لگی بیٹھی تھی۔ وہ گردیزی کے دفتری کمرے کے برابر کراہتا تھا۔
”یہ آپ کے حق میں بہت اچھا ہوا ہے کہ آپ نے مجھے سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔ اگر آپ رازداری برتتے تو آپ کے لیے سخت مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ اب آپ سرکاری گواہ بن کر اس بکھیڑے سے نکل جائیں گے۔ آپ کو یقین تو آچکا ہے نا کہ آپ ایک غیر ملکی ایجنٹ کے ہاتھوں میں کھیلے رہے ہیں؟“

”اب اس میں کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔“ گردیزی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ”پارکنز نے بھی بڑے یقین سے کہا تھا کہ میری بیٹی کو کچھ نہیں ہوگا۔ غیر ملکی ایجنٹ ہونے ہی کی وجہ سے اس کو خیال آیا ہوگا کہ میری بیٹی کے اغوا میں مقامی ایجنسی کا ہاتھ ہے جو ظاہر ہے کہ میری بیٹی کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔“

”اب آپ صبح تک اپنے گھر نہیں جائے گا اور اپنی بیٹی کو بھی یہیں رکھیے گا۔ دفتر میں بھی کسی کو معلوم نہیں ہونے پائے کہ آپ کی بیٹی یہاں ہیں۔“

جعفری افروز کو برقعہ اوڑھا کر بہت خفیہ طریقے سے گردیزی کے دفتر پہنچ کر اس سے ملا تھا۔

گردیزی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ افروز اس دوران میں بالکل خاموش بیٹھی رہی تھی۔

جعفری کھڑا ہو گیا۔

”اگر پارکنز مجھے فون کرے؟“ گردیزی جلدی سے

بولی۔

ساری صورت حال مانیٹر تو کرنا ہوگی۔ تم مجھے باہر کی حالت سے باخبر کرتی رہنا۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو بھائی صاحب اور.....“ ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ کیف ہمدانی نے خاموشی اختیار کر لی۔

”میں آپ سے رابطے میں رہوں گی۔“
دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ کیف ہمدانی کا مزاج کچھ ایسا ہی تھا۔ اگر باہر کے بجائے رخسار کو گولی لگی ہوتی تب بھی وہ اپنے بنیادی فرائض کو ترجیح دیتا۔
آدھے گھنٹے بعد رخسار نے خالد کی کال ریسیو کی۔
”ڈسک چیک کر لی ہے میں نے۔“ خالد کہہ رہا تھا۔
”اس سے تو ظاہر ہو رہا ہے کہ بابر صاحب جاوید اشرفی کے نام سے کالم لکھا کرتے تھے اور یہ ڈسک انہی کے کمپیوٹر کی ہے۔“
رخسار چونک گئی۔

خالد کہتا رہا۔ ”بابر صاحب کا کسی گلاب خاں سے بھی رابطہ تھا۔ اس سے بابر صاحب کو بڑی اہم بلکہ غیر معمولی رپورٹس ملا کرتی تھیں۔“
”ڈسک محفوظ کر کے فوراً اسپتال آ جاؤ۔“ رخسار نے تیزی سے کہا۔ ”گلاب خاں کا ای میل ایڈریس مجھے ایس ایم ایس کر دو۔“
”بہتر۔“

رخسار کے جسم میں سنسنات پھیل گئی تھی۔ یہ جان کر اس کے دماغ کو خاصا جھٹکا لگا تھا کہ بابر ہی جاوید اشرفی تھا۔ اس نے موبائل پر اپنے ادارے کے ایک شخص جعفری سے رابطہ کیا۔

”خیریت تو ہے رخسار صاحبہ!“ جعفری خوش مزاجی سے بولا۔

”ایک بات پوچھنا ہے۔ جاوید اشرفی کے بارے میں تحقیقات کی ذمہ داری آپ ہی کو سونپی گئی تھی۔ کچھ معلوم ہوا اس کے بارے میں؟“

”آپ کو اس کا خیال کیوں آ گیا؟“ جعفری نے تعجب سے پوچھا۔

”تفصیلی بات ہے۔ ملاقات پر ہی ہو سکے گی لیکن فی الحال میں کہیں انجھی ہوئی ہوں۔ آپ میری بات کا جواب تو دے دیں۔“

”بس اب کچھ ہی دیر میں وہ جگہ معلوم ہو جائے گی جہاں سے جاوید اشرفی اخبار کے ایڈیٹر کو اپنے مضمون ای میل کرتا تھا۔“

”اب اس چکر میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔“ رخسار

میں غیر ملکی کی آواز سن چکی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ہارڈ ڈسک تو کسی نہ کسی طرح حاصل کر لی جائے گی۔
”خالد!“ رخسار نے تیزی سے کہا۔ ”تم اسپتال کی طرف آنے کے بجائے سیدھے اپنے گھر جاؤ۔ ہارڈ ڈسک اپنے کمپیوٹر میں لگا کر دیکھو کہ اس میں کیا ڈیٹا ہے اور یو ایس بی بھی چیک کر لیتا۔“
”بہتر۔“

رخسار نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس وقت ایمبولینس اسپتال کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔ رخسار نے وہاں دو پولیس موبائلز دیکھیں۔

بابر کو ایمبولینس سے اتار کر تیزی سے آپریشن تھیٹر کی طرف لے جایا جانے لگا۔ اس وقت پولیس والے بھی تیزی سے قریب آ گئے۔ وہ رخسار کو کیف ہمدانی کی بیٹی کی حیثیت سے جانتے تھے۔ وہ اپنے ایس پی کی ہدایت پر وہاں پہنچے تھے اور اسپتال میں خود ایس پی بھی موجود تھا۔ رخسار سمجھ گئی کہ ایس پی کو اس کے والد نے اسپتال پہنچنے کی ہدایت کی ہوگی۔
ایس پی کے ساتھ رخسار بے چینی سے آپریشن تھیٹر کے سامنے ٹھہرنے لگی۔ ایس پی کو اس نے ٹھیک ٹھیک نہیں بتایا کہ بابر کو کہاں گولی ماری گئی تھی اور کس نے ماری تھی۔
رخسار کے موبائل کی گھنٹی بجی تو اس نے دیکھا کہ کال اس کے والد کی تھی۔

”جی ڈیڈی!“ اس نے کال ریسیو کی۔
”میں اسپتال آ رہا تھا رخسار.....“
وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن رخسار تیزی سے بول پڑی۔
”آپ نے چچا جان کو فون کیا؟“

”کر چکا ہوں، بھائی صاحب تو ابھی اسٹور پر ہی ہیں۔ بھائی اور عنبر پریشان ہیں۔ بابر بڑی پریشانی کی حالت میں گھر سے گیا تھا۔ عنبر اور بھائی کی پریشانی کا سبب بابر کی یہ بات ہے کہ وہ شاید کچھ دن کے لیے شہر سے چلا جائے۔“

آخری جملہ رخسار کے لیے قابل غور تھا۔
”بہر حال۔“ کیف ہمدانی کی بات جاری رہی۔
”میں نے ابھی ان لوگوں کو بابر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ میں اسپتال پہنچ کر تم سے اس بارے میں بات کرتا لیکن راستے ہی میں مجھے ایک ایسا فون مل گیا کہ میں اب دفتر کی طرف جا رہا ہوں۔ اطلاع ملی ہے کہ بہ یک وقت دو علاقوں میں دو گروہوں میں تصادم ہو گیا ہے۔ شدید فائرنگ ہو رہی ہے۔ ہدایات تو میں نے جاری کر دی ہیں لیکن دفتر جا کے

صبر اور اجر

حضرت علی کرم اللہ وجہہ بازار سے گزر رہے تھے۔ دکان دار گوشت فروخت کر رہا تھا اس نے آپ سے کہا۔ ”سرکار، گوشت خرید لیجیے۔“ حضرت علی نے فرمایا۔ ”میری جیب اجازت نہیں دیتی۔“ اس نے کہا۔ ”میں آپ سے ادھار بھی کر سکتا ہوں۔“ حضرت علیؑ نے فرمایا۔ ”تم سے ادھار کرنے سے بہتر ہے کیوں نہ میں اپنے پیٹ سے ادھار کر لوں، اس صبر کا اجر مجھے حشر کے دن بہت زیادہ ملے گا۔“

مرسلہ: تفسیر عباس بابر۔ ادا کاڑھ

پھر جعفری بھی تیزی سے رخسار کے پیچھے قدم بڑھاتا چلا گیا۔ اس کے موبائل کی کھنٹی بجی تو وہ اس نے جیب سے نکال کر کان سے لگا لیا۔ ”ییس!“ دوسری طرف سے کوئی ایسی اطلاع دی گئی کہ اس کے چہرے سے تعجب کا اظہار ہوا۔ ”بھلے کی سخت نگرانی سخت کی جائے۔“ وہ رخسار کے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”زیادہ افراد کی ضرورت ہو تو اپنے ساتھیوں کو بلا لو۔ پندرہ منٹ بعد میں تم سے پھر رابطہ کروں گا۔“ دوسری طرف سے کچھ سن کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس وقت آگے جاتی ہوئی رخسار اپنے موبائل پر کہہ رہی تھی۔ ”نہیں ڈیڈی!..... چچا جان کو ابھی اطلاع نہ دیں۔ ممکن ہے کہ صبح تک بابر کو آئی سی یو سے کمرے میں منتقل کر دیا جائے۔ چچا جان وغیرہ اسی وقت یہاں آئیں تو بہتر ہے۔“ جعفری سمجھ گیا کہ رخسار اس وقت اپنے ڈیڈی ڈی آئی جی کیف ہمدانی سے بات کر رہی تھی۔ جب اس نے رابطہ منقطع کیا تو جعفری اس کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ رخسار کا خیال درست ثابت ہوا۔ دوسری صبح بابر کو ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ سیف ہمدانی کو اطلاع دے دی گئی۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ اسپتال پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے ایک وقت میں دو سے زیادہ افراد کو بابر کے

نظر میں بھی اس کی طرف اٹھ گئیں۔ کینٹین میں داخل ہونے والا شخص خالد تھا جس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات بھی دبے ہوئے تھے۔ اسے کسی سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ رخسار کینٹین کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

”مجھے آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔“ وہ قریب آ کر چھوٹے ہی بولا۔ ”دراصل ہارڈ ڈسک میں کچھ ایسی چیزیں تھیں جو مجھے مشتبہ محسوس ہوئیں۔ میں ان سب کے پرنٹ نکال لایا ہوں۔“ اس نے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے کاغذات رخسار کے سامنے رکھ دیے۔ وہ جعفری کو جانتا تھا ورنہ اس کے سامنے رخسار سے یہ سب کچھ نہ کہتا۔ ”آپ دیکھ لیں۔“ رخسار نے کاغذات جعفری کی طرف بڑھاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ جعفری نے کاغذات اٹھائے اور ان پر اچھتی سی نظریں دوڑانے لگا۔

خالد بولا۔ ”اس میں کسی گلاب خاں کے ای میل بھی ہیں جو مجھے مشتبہ معلوم ہوئے۔“

”بالکل ٹھیک۔“ جعفری کاغذات پر نظریں جمائے ہوئے بڑبڑایا۔ ”اس میں کچھ اہم سرکاری اطلاعات ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ جو پانچواں شخص ابھی میری نظر میں نہیں آیا، وہ اپنی جگہ سرکاری شخصیات میں بننا چاہتا ہے۔“

اس وقت رخسار چونکی جب اس نے ایک نرس کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ رخسار کچھ پریشان ہو کر کھڑی ہو گئی۔ جعفری نے اس کی حالت دیکھ کر کاغذات سمیٹ لیے۔ خالد بھی نرس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”گھبرائیے نہیں۔“ نرس نے قریب آ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ رخسار سے کہا۔ ”میں ایک اچھی اطلاع لائی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کو توقع نہیں تھی کہ بابر صاحب کو اتنی جلدی ہوش آجائے گا۔“

”اوہ!“ رخسار کے تن جانے والے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

”آپ آئی سی یو میں جا کر بابر صاحب سے مل سکتی ہیں۔“ نرس نے مزید کہا۔ ”لیکن زیادہ سے زیادہ دو منٹ کے لیے۔“

”شکر ہے۔“ رخسار کے منہ سے نکلا اور اس نے تیزی سے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

”جائے منگوائی تھی ابھی۔“ جعفری نے خالد سے کہا۔ ”تم مل ادا کر دینا۔“

بھج دیے گئے ہیں۔ انہی اطلاعات کے باعث جاوید اشرفی پر شبہ کیا گیا کیونکہ وہ اپنے کالموں میں شوکت باجوہ کی کیریئر بلڈنگ کر رہا تھا۔

”اس وقت تفصیلات میں نہ جائیے گا۔“ رخسار بولی۔ ”میرا ذہن بابر میں الجھا ہوا ہے۔ مختصر طور پر بتا دیجیے کہ اب تک کی پروگریس کیا ہے!“

”تین غیر ملکی ہماری نظر میں آچکے ہیں۔ ان کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہے۔ وہ صحافیوں سے میل جول بڑھا رہے ہیں۔ ان کے موبائل فون کے ایس ایم ایس ٹریس کرنے سے اندازہ ہوا ہے کہ ان لوگوں کی تعداد پانچ ہے اور انہی پانچوں میں سے ایک ان چاروں کا ہیڈ ہے۔ آج ایک نیا نام سامنے آیا ہے۔ میرا مطلب ہے، جو تھا شخص!..... پانچواں ابھی سامنے نہیں آیا۔ آپ ابھی بتا چکی ہیں کہ بابر صاحب کو جس غیر ملکی نے گولی ماری تھی، اس کا نام پارکن ہے لیکن بات شاید یوں ہے کہ بابر صاحب زخمی ہونے کے باعث اس کا پورا نام زبان پر نہیں لاسکے۔ اس کا نام غالباً پارکنز ہوگا۔ یہی نام مجھے گردیزی نے بتایا ہے جو اس اخبار کا مالک ہے جس میں جاوید اشرفی کے نام سے کالم چھپتے رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہی اپنے باقی چاروں ساتھیوں کا ہیڈ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ ان پانچوں کو بہ یک وقت گرفتار کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ آج ہی رات وہ پانچواں شخص بھی سامنے آجائے۔“

ان باتوں میں کئی مقامات ایسے تھے کہ رخسار کے ذہن میں کچھ سوالات ابھرنا چاہیے تھے لیکن وہ بابر کے بارے میں پوچھ بیٹھی۔

”اس سارے معاملے میں بابر کی قانونی پوزیشن کیا ہوگی؟“

”واقعی آپ کا ذہن بہت الجھا ہوا ہے۔“ جعفری نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”یہ آپ خود بھی سمجھ سکتی ہیں کہ بابر صاحب کے بیان سے پہلے ان کی قانونی پوزیشن واضح نہیں ہو سکتی مگر زیادہ امکان یہ ہے کہ ان پر کوئی بڑا چارج نہیں لگ سکے گا۔ اس قسم کے معاملات میں بعض صحافی نادانستہ طور پر غیر ملکیوں کے آلہ کار بن جاتے ہیں اور.....“

جعفری کی بات ادھوری رہ گئی۔ ایک ویٹر جو کچھ دیر سے ان کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا، آخر خود ہی ان کے قریب آ گیا۔ جعفری نے اس سے چائے کے لیے کہہ کر اسے رخصت کر دیا۔

رخسار نے یکا یک ایک جانب دیکھا تو جعفری کی

گردیزی ہی سے معلوم ہوا تھا اور اسے اب ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ گردیزی نے اسے غلط ایڈریس بتایا ہوگا۔ اس کے علاوہ آئندہ بھی اس کی طرف سے دھوکا دہی نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ بہت خوف زدہ ہو چکا تھا۔

جعفری اس وقت اسپتال پہنچا جب بابر کو آپریشن تھیمز سے آئی سی یو میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ جعفری نے حیرت سے دیکھا کہ اس وقت رخسار کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

جعفری کے چہرے پر آنے والا سوال رخسار نے پڑھ لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”وہ میرا کزن بابر ہے جعفری!“

جعفری چونکا۔ ”کیف صاحب کا بھتیجا؟“

”ہاں۔“ رخسار نے جواب دیتے ہوئے رومال سے اپنی آنکھیں خشک کیں اور ایک طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”چلیں کینٹین میں چل کر بات کرتے ہیں۔ بابر سے ابھی ملاقات نہیں ہو سکتی۔ گولی تو اس کے جسم سے نکال لی گئی ہے۔ گولی سے مہلک زخم بھی نہیں آیا ہے لیکن خون بہت زیادہ نکل جانے کے باعث.....“ اس کی آواز پھر رندھ گئی۔

”ڈاکٹر نے کہا ہوگا کہ ابھی اس سے ملاقات نہیں کی جاسکتی۔“

”ہاں۔“ رخسار نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

”آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ بابر ہی جاوید اشرفی کے نام سے.....“

”بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“ رخسار نے بات کاٹ دی۔

جعفری اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

وہ دونوں کینٹین کے ایک گوشے میں جا بیٹھے! جعفری سوالیہ نظروں سے رخسار کی طرف دیکھنے لگا۔

رخسار نے پوچھا۔ ”ہمارے ادارے کو جاوید اشرفی کے نام پر کیا شبہ تھا کہ آپ کو اس کے بارے میں چھان بین کی ہدایات ملیں۔“

”شبہ کا سبب اس کے اخباری کالم بنے تھے۔“

جعفری نے جواب دیا۔ ”باہر سے ہمارے ادارے کو اطلاعات ملی تھیں کہ آئندہ انتخابات سے پہلے پہلے شوکت باجوہ کو قومی دھارے میں لانے اور اسے ایک مقبول لیڈر بنانے کی کوششیں کی جائیں گی۔ ایک مغربی طاقت اسے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے اور اس کام کے لیے کئی جاسوس بھی غیر قانونی یا قانونی طور پر ہمارے ملک میں

ڈسپلن

جوہوں کا انسانی زندگی میں اہم رول ہے۔ یہ جوہوں کا انکسار ہے کہ وہ جنگوں میں آزادی سے ٹھونسنے کے بجائے ہمارے گھروں میں گھسنے اور بلوں میں گھسنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بعض جانور دل میں گھر کر جاتے ہیں جبکہ چوہے گھر میں مل کر جاتے ہیں۔ انسان پر دواؤں اور جراحی کے تجربے کرنے سے پہلے جوہوں کی ہی چیر پھاڑ کی جاتی ہے۔ گویا دونوں ایک سی صفات کے حامل ہیں۔ انسان تو انسان، مٹی بھی مرے ہوئے چوہے کو نہیں بخشتی۔ اسے اچھا اچھا کر اپنے بچوں کو جھپٹنے پلٹنے، پلٹ کر جھپٹنے کی مشق کراتی ہے لیکن وہ بڑے ہو کر سب سبق بھول جاتے ہیں اور تمام عمر خواب میں جھپٹنے ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ کہاں کہیں وہ بلیاں، چوہے کو دیکھ کر جن کی رگ ہلاکت، پھڑکتی ہے؟ دوسری طرف چوہے بھی اپنے بچوں کو مٹی سے بچنے اور اسے چکھا دینے کے گر سکھاتے ہیں لیکن وہ بھی بڑے ہو کر مٹی کو چکھا دینے کے بجائے اس کی چمکتی آنکھوں میں اپنی بجھتی آنکھیں ڈال کر چمکنے کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا پہلے ہی دن مٹی مارنا چاہتے ہوں۔

جوہوں کی ایک عادت ہمیں پسند نہیں کہ ان کے ہاں ڈسپلن نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جتنا کھاتے ہیں اس سے کہیں زیادہ خانہ خرابی کرتے ہیں اور جب ان 'کھانا خرابوں' کی چوری پکڑی جاتی ہے تو بوکھلاہٹ میں یہ آگے پیچھے نہیں دیکھتے۔ بندوق کی گولی کی طرح سٹ سٹ چھوٹتے ہیں۔ بندوق کی گولی تو کم از کم لحاظ رکھتے ہوئے نشانے کے آس پاس سے گزر جاتی ہے، لیکن یہ جس سے بچنا چاہتے ہیں اسی کی ٹانگوں میں آ جاتے ہیں۔ ڈسپلن تو چیونٹیوں کے ہاں ہوتا ہے۔ چاہے کچھ ہو جائے، وہ اپنی ترتیب بگڑنے سے نہیں دیتیں۔ اس ڈسپلن کے لیے بڑا حوصلہ چاہیے، جس کی توقع چوہوں سے نہیں کی جاسکتی۔

نادر خان سرگروہ کی کتاب
”باداد با محاورہ ہوشیار“ سے اقتباس

ہے کہ پارکنز اب بھی وہیں ہے۔ اس سے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پارکنز کی سکونت صرف اس ہنگامے میں تھی جہاں وہ بابر صاحب کو لے گیا تھا۔ اب چونکہ وہ بنگلا اس کے لیے مخدوش ہو چکا ہے اس لیے اس نے دوبارہ وہاں جانا خطرناک سمجھا ہوگا۔“

”وہ اپنے ساتھیوں میں سے بھی کسی کے گھر جاسکتا تھا۔“ رخسار بولی۔

”ہاں، لیکن مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ اس نے شوکت باجوہ ہی کے گھر میں پناہ لی ہے۔ جب تک اس کا ہاتھ ٹھیک نہیں ہو جاتا، وہ وہیں رہے گا یا اس دوران میں اس کے ساتھی اس کے لیے کسی دوسری جگہ کا بندوبست کر لیں گے۔“

”آپ مجھے اس لیے لے جا رہے ہیں کہ میں پارکنز کو پہچان سکتی ہوں؟“

”جی.....“ جعفری نے کہا۔ ”اسے آپ یا بابر صاحب ہی شناخت کر سکتے ہیں۔“

رخسار نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بولی۔ ”اگر پارکنز وہیں ہے تو اس کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ شوکت باجوہ نادانستگی میں ان غیر ملکیوں کا آلہ کار نہیں بن رہا ہے۔“

”ظاہر ہے۔“ جعفری نے کہا، پھر بولا۔ ”ایک اور وجہ سے بھی مجھے یقین ہے کہ پارکنز وہیں ہوگا۔ جو چار افراد میری نظر میں آچکے ہیں، ان کے موبائل فون برابر ٹریس کیے جا رہے ہیں۔ ان دونوں کو ہدایت ملی تھی کہ رات کو وہ گردیزی کے گھر میں گھسیں اور ہر صورت میں اس کے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک نکال لائیں۔“

رخسار نے بے اختیار ایک طویل سانس لی۔

”ہارڈ ڈسک۔“

”ہاں۔“ جعفری خفیف سا مسکرایا۔ ”وہ بابر صاحب کے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک کے لیے بھی پریشان رہا تھا جو اسے نہیں مل سکی لیکن گردیزی کے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک رات کو اس کے آدمی نکال کر لے گئے۔ میں اس میں رکاوٹ بھی نہیں بنا۔ بس ان دونوں آدمیوں کی نگرانی جاری رہی۔ وہ دونوں بھی شوکت باجوہ کے گھر گئے تھے۔ ہارڈ ڈسک انہیں پارکنز کو دینا ہوگی۔“

”تو وہ دونوں بھی وہاں ہو سکتے ہیں۔“

”نہیں۔“ جعفری نے جواب دیا۔ ”وہ دو چار منٹ بعد ہی باجوہ کے گھر سے چلے گئے تھے۔“

”اگر پارکنز وہاں مل گیا تو شوکت باجوہ کی گردن بھی پوری طرح پھس جائے گی۔“

نکلے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

✽✽✽

پندرہ منٹ بعد جعفری وہاں پہنچ گیا۔ رخسار نے اسے ہدایت دی۔ سیف ہمدانی اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ جا چکے تھے۔ جعفری کے منگے کا ایک آدمی اور تھا۔

”تم میری کار لے کر پیچھے آؤ۔“ جعفری نے اس سے کہا، پھر رخسار سے کہا۔ ”میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“

رخسار کی کار رات سے اسپتال ہی میں تھی۔ ذرا دیر بعد اس کی کار اسپتال کے احاطے سے نکلی۔ جعفری ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔

رخسار نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ میری ابھن ختم کر دیں تو اچھا ہے۔ آپ مجھے اپنے ساتھ کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟“

”کیا بابر صاحب کی وجہ سے آپ کو اس معاملے سے دلچسپی نہیں؟“

”دلچسپی تو یقیناً ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ باجوہ سے ملنے جا رہے ہیں تو مجھے خود یہ خواہش ہوتی کہ آپ کے ساتھ جاؤں اور دیکھوں کہ شوکت باجوہ کی گفتگو سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ اب براہ راست اس سے بھی پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہوں گے۔ مجھے ابھن یہ ہے کہ آپ نے مجھے ساتھ لے جانا کیوں ضروری سمجھا۔“

”رات کو مجھے ایک ایسی ہی اطلاع ملی تھی کہ اب شوکت باجوہ سے ملنا ضروری ہو گیا ہے۔ جو غیر ملکی میری نظر میں آچکے ہیں، ان میں سے دو آدمی ایک ڈاکٹر کو اغوا کر کے شوکت باجوہ کے گھر لے گئے تھے۔“

رخسار چونکی۔

جعفری نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”ڈاکٹر کو اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر شوکت باجوہ کے ہنگامے میں لے جایا گیا تھا۔ بعد میں اسے واپس اس کے گھر بھی چھوڑا جا چکا ہے۔ واپسی میں بھی ڈاکٹر کی آنکھوں پر پٹی رکھی گئی تھی۔“

”اس کا مطلب ہے.....“ رخسار تیزی سے بولی۔

”جی ہاں۔“ جعفری نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ ”آپ نے بتایا تھا کہ پارکنز کا ہاتھ آپ کی چلائی ہوئی گولی سے زخمی ہوا تھا۔ اسی لیے مجھے خیال آیا کہ پارکنز ہی کی ڈرائیونگ کردانے کے لیے ڈاکٹر کو اغوا کیا گیا ہوگا۔ رات بھر شوکت باجوہ کے گھر کی کڑی نگرانی کی گئی ہے۔ کسی کو وہاں سے جاتے نہیں دیکھا گیا۔ اس کا مطلب

کمرے میں جانے کی اجازت نہیں دی اور ان سب کو صرف آدھا گھنٹا دیا۔ گویا دو دو افراد دس دس منٹ سے زیادہ نہیں مل سکتے تھے۔

ڈی آئی جی کیف ہمدانی رات گئے اسپتال کا ایک چکر لگا چکا تھا۔ اس وقت وہ پھر آ گیا تھا۔ وہ سیف ہمدانی کے ساتھ بابر کے کمرے میں گیا۔ دس منٹ بعد جب وہ نکل آئے تو عذرا بیگم اپنی بیٹی عنبر کے ساتھ گئیں۔ ان دونوں کے بعد رخسار کو جانا تھا۔ وہ رات بھر اسپتال ہی میں رہی تھی۔ جعفری رات کو چلا گیا تھا اور خالد کو بھی رخسار نے رخصت کر دیا تھا۔ ڈی آئی جی کیف ہمدانی گھر سے رخسار کا کوٹ لیتا آیا تھا کیونکہ صبح سردی کچھ بڑھ گئی تھی۔

”مجھے اب دفتر جانا ہے۔“ کیف ہمدانی نے رخسار سے کہا۔ ”تم بھی بابر سے مل کر اب گھر جا کے آرام کرنا۔ رات بھر کی جاگی ہوئی ہو۔“

”جی ڈیڈی!“

کیف ہمدانی چلا گیا۔ رخسار نے کوٹ پہن لیا تھا اور ٹھنڈ سے بچ کر آسودگی محسوس کی تھی۔ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف جعفری تھا۔

”کیا پوزیشن ہے؟“ اس نے پوچھا۔

رخسار نے اسے صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔ ”اب بابر سے ملنے کے بعد میں گھر جاؤں گی۔“

”ابھی آپ اسپتال میں رکیں۔ میں پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“

”بابر کا بیان.....“

”نہیں۔“ جعفری نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں ڈاکٹر سے بات کر چکا ہوں۔ بیان لینے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ ڈاکٹر سے مجھے اجازت نہیں ملی۔ بابر کا بیان کل صبح لیا جاسکے گا۔“

”تو پھر آپ کیوں آرہے ہیں؟“

”آپ ہی سے کچھ کام ہے۔“

”مجھ سے؟“

”ہاں۔ میں نے ابھی تک اس معاملے کے اہم کردار شوکت باجوہ سے ملاقات نہیں کی ہے۔ اب اس سے ملنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔“

”میری کیا ضرورت ہے؟“ رخسار الجھ گئی۔

”وہاں آکر ہی بتاؤں گا۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ رخسار نے جلدی سے رابطہ منقطع کر دیا کیونکہ اس نے عذرا بیگم اور عنبر کو بابر کے کمرے سے

”اگر کی بات نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ پارکنز وہیں ہوگا۔“

اس گفتگو کے دوران میں جعفری ہاتھ کے اشارے سے راستوں کے بارے میں بتاتا رہا تھا کیونکہ رخسار، باجہ کے گھر سے واقف نہیں تھی۔

کار جب شوکت باجہ کے گھر میں داخل ہو رہی تھی، اس وقت جعفری نے رخسار کو یہ بھی بتایا کہ وہ فون پر شوکت باجہ کو بتا چکا تھا کہ وہ ایک خاص معاملے میں پوچھ گچھ کرنے کے لیے اس کے گھر آ رہا ہے۔

رخسار بولی۔ ”وہ پریشان تو ہوا ہوگا۔“
”ہونا چاہیے، لیکن بات کرتے ہوئے اس نے خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کی تھی اور تعجب کا اظہار بھی کیا تھا کہ میرے محلے کو اس سے آخر کس قسم کی پوچھ گچھ کرنا ہے۔“
جعفری نے جواب میں کہا۔ ”میں نے اس سے کہا تھا کہ یہ میں اسے ملاقات پر ہی بتا سکوں گا۔“

رخسار نے برآمدے کے قریب کار روک دی اور جعفری کے ساتھ اتری۔

شوکت باجہ نے ایک ملازم کے ذریعے ان دونوں کو فوراً ڈرائنگ روم میں بلوایا۔

”تشریف رکھیے!“ اس نے غور سے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی رعوت سے کہا۔ ”میں حیران ہوں کہ آپ کے محلے کو اچانک مجھ سے کیا دلچسپی ہوگئی۔“

”کچھ ایسے ہی حالات سامنے آئے ہیں باجہ صاحب! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے ایڈوائزر مسٹر بابر اس وقت کہاں ہوں گے۔“

”اپنے گھر پر ہوگا اور کہاں ہوگا۔“

”کیا وہ آپ کی خواہش کے مطابق ایک فرضی نام سے ایک اخبار میں کالم لکھتے رہے ہیں؟“

اس سوال پر شوکت باجہ قدرے بے چین نظر آیا اور بولا۔ ”اگر ایسی کوئی بات ہے تو میرے علم میں نہیں ہے۔“

”آپ کے علم میں غالباً یہ بھی نہیں ہوگا کہ ایک مغربی طاقت سیاست کے میدان میں آپ کو ایک قدآور شخصیت بنانا چاہتی ہے۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ!“ شوکت باجہ نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہنے کی کوشش کی۔ ”کس نے حق دیا ہے آپ کو کہ مجھ سے اس قسم کی باتیں کریں؟“

جعفری کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ جعفری نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کال ریسیو کی۔ ”ہاں، بولو!“

رخسار قریب ہی بیٹھی تھی۔ اس نے دوسری طرف سے بولنے والے کی مدھم آواز سنی۔ ”ریجنرز آگئے ہیں سر!“

”ٹھیک ہے۔ میں نے یہی وقت دیا تھا۔“
فوراً دوسری طرف سے پھر کہا گیا۔ ”میجر صاحب میرے قریب کھڑے ہیں اور آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”کراؤ بات!“ جعفری نے کہا۔

اب دوسری طرف سے ایک نئی آواز سنائی دی۔ جعفری نے اس سے کہا۔ ”آپ سب تیزی سے اندر آجائیں اور بیٹھنے کے گرد پھرا بھی کڑا رہے۔ چڑیا کا ایک بچہ بھی یہاں سے نہیں نکلنا چاہیے۔“

شوکت باجہ تیزی سے کھڑا ہوا۔ ”کیسی باتیں ہو رہی ہیں یہ!“

جعفری نے موبائل اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میری اطلاع کے مطابق کل رات ایک ڈاکٹر کو اغوا کر کے یہاں لایا گیا تھا۔ کل رات ہی غیر ملکی جاسوسوں میں سے ایک زخمی ہو کر فرار ہوا تھا۔ مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ اس کے ہاتھ کی ڈرینگ کرانے ہی کے لیے ڈاکٹر کو اغوا کر کے یہاں لایا گیا تھا۔“

”بکواس ہے یہ سب!“ شوکت باجہ گرجا۔ ”کوئی غیر ملکی نہیں ہے میرے گھر میں۔“

”خاصا بڑا گھر ہے آپ کا۔“ جعفری نے سکون سے کہا۔ ”تلاشی لینے میں خاصا وقت لگ سکتا ہے۔“

”مذاق ہے کوئی!“ شوکت باجہ بہ دستور بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں کسی کو یہ اختیار نہیں دے سکتا کہ وہ میرے گھر کی تلاشی لے۔“

”سرج و وارنٹ لے کر آیا ہوں میں باجہ صاحب!“

جعفری نے جیب سے ایک کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔

رخسار اس دوران میں کچھ نہیں بولی تھی لیکن پوری طرح شوکت باجہ کی طرف متوجہ رہی تھی۔

سرج و وارنٹ دیکھنے کے بعد وہ شوکت باجہ نے غصے سے ایک طرف پھینکا اور پھولی ہوئی سانوں کے ساتھ بولا۔

”پچھتاؤ گے تم! میرے گھر میں تمہیں کوئی غیر ملکی نہیں ملے گا۔“

”کیا کوئی خفیہ تہ خانہ بھی ہے یہاں؟“ جعفری نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

شوکت باجہ اسے گھورتا رہ گیا۔ اسی وقت وزنی جوتوں کی دھمک تیزی سے قریب آتی چلی گئی۔

”تمام ملازمین کو گھر سے باہر نکال کر اپنے آدمیوں کی تحویل میں دے دیں۔“ جعفری نے میجر سے کہا۔ ”اور اس

گھر کے ایک ایک چپے کی تلاشی لیں۔“

رخسار کو اس کا علم بعد میں ہوا کہ شوکت باجہ کی جو ایک جاگیر تھی، وہیں اس کی ایک حویلی بھی تھی۔ اس کے بیوی بچے اسی حویلی میں رہتے تھے۔

ریجنرز بیٹھنے میں پھیل گئے۔ صرف دو اہلکار ڈرائنگ روم ہی میں رکے تھے اور اپنے اسلحے کے ساتھ پوری طرح مستعد تھے۔

”یہاں میرے علاوہ کوئی نہیں ہے، تمہیں اس کا خیالہ بھگتنا پڑے گا آفسر!“ شوکت باجہ نے جعفری کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ معاملہ بہت اوپر تک لے جاؤں گا۔“

”آسمان تک لے جانا۔“ جعفری نے بے پروائی سے کہا اور کھڑے ہو کر رخسار سے بولا۔ ”آپ یہیں بیٹھیں!“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”ریجنرز کو صرف اتنا معلوم ہے کہ انہیں یہاں کسی غیر ملکی کو تلاش کرنا ہے۔ میں یہ بھی چیک کرتا ہوں کہ یہاں کوئی خفیہ تہ خانہ بھی ہو سکتا ہے۔“

ذرا دیر پہلے بھی جعفری کی زبان پر تہ خانے کا ذکر آچکا تھا لیکن اس مرتبہ رخسار نے محسوس کیا کہ اس بار شوکت باجہ قدرے بے چین نظر آیا تھا۔ صوفے پر بیٹھے بیٹھے اس نے عجیب انداز میں پہلو بدلا تھا۔ رخسار غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

بیٹھنے میں وزنی جوتوں کی دھمک ادھر سے ادھر پھیلی رہی۔ ملازمین کو بیٹھنے کے باہر بھیج دیا گیا تھا۔ وہ سب بہت خوف زدہ نظر آ رہے تھے۔

آدھے گھنٹے کے قریب گزر چکا تھا کہ رخسار نے لگا لگا کر اپنا موبائل سنبھالا اور اس پر کوئی پیغام ٹائپ کرنے لگی۔ شوکت باجہ جواب تک رخسار کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے رہا تھا، لگتی باندھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ رخسار کیا کر رہی تھی۔

رخسار نے پیغام ٹائپ کر کے جعفری کے موبائل نمبر پر بھیج دیا اور بے تعلقی سے فرش کی طرف دیکھنے لگی۔

ریجنرز کے دونوں اہل کار اس وقت بھی پوری طرح مستعد تھے۔

پانچ منٹ اور گزرے تھے کہ تلاشی لینے والے ریجنرز واپس آنا شروع ہو گئے۔ اب ان کا رخ بیرونی دروازے کی طرف تھا۔ ان سب کے بعد میجر اور جعفری

باجہ ایک کراہ کے ساتھ گرا۔ ریوالور اب بھی اس کے

ڈرائنگ روم میں آئے۔

”مل گیا غیر ملکی؟“ شوکت باجہ نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے تھے مسٹر باجہ!“ جعفری نے کہا اور شوکت باجہ کے صوفے کے قریب آتے ہوئے بولا۔

”یہاں تمہارے علاوہ کوئی نہیں ہے۔“

”تو سوچ لو کہ اب تمہیں اس کا خیالہ بھی بھگتنا پڑے گا۔“

”آپ کا ایس ایم ایس مجھے مل گیا تھا رخسار!“

جعفری بیٹھنے کے سے انداز میں اس صوفے کے عقب میں چلا گیا جس پر شوکت باجہ بیٹھا ہوا تھا۔

رخسار سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

جعفری بولا۔ ”میں آپ کا ایس ایم ایس ملنے کے بعد فوراً یہاں آتا لیکن تھوڑی سی مصروفیت تھی، خیر!..... اب میں آپ کے مشاہدے کی حقیقت جان لوں گا۔ ممکن ہے آپ کا شک درست ہو۔ آپ کو مسٹر باجہ اور پارکنز میں مشابہت نظر آئی ہے نا اور آپ کو ان کی چادر کے نیچے ایک زخمی ہاتھ کی جھلک بھی نظر آئی تھی لہذا.....“

شوکت باجہ چونکا لیکن اس کے کسی بھی رد عمل سے پہلے جعفری نے ایک جھٹکے سے وہ شال کھینچ لی جو شوکت باجہ اوڑھے ہوئے تھا۔

شال میں چھپا ہوا شوکت باجہ کا دایاں ہاتھ سامنے آ گیا جو گردن میں پڑی ہوئی پٹی میں تھا۔ اس ہاتھ پر ڈرینگ بھی نظر آرہی تھی۔

رخسار بے اختیار کھڑی ہوگئی۔ وہ جواتی دیر سے اسے یہ غور دیکھ رہی تھی اور اچانک چھپے ہوئے ہاتھ پر نگاہ پڑ گئی تھی۔ اسے شک گزرا تھا کہ یہی پارکنز ہے۔ شوکت باجہ کا چہرہ فق پڑ چکا تھا۔

”اب میں تمہیں کس نام سے مخاطب کروں؟“

جعفری نے چپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مسٹر باجہ یا مسٹر پارکنز؟“

ابتدائی ذہنی جھٹکے سے باہر آتے ہی باجہ تیزی سے کھڑا ہو گیا۔ نہ جانے کہاں سے اس نے ریوالور بھی نکال لیا تھا۔ اس کی یہ حرکت اضطرابی تھی۔ اس نے سوچا نہیں تھا کہ وہاں ریجنرز کے دو اہلکار موجود تھے مگر ان اہلکاروں سے پہلے ان کے میجر نے ریوالور سے گولی چلا کر باجہ کی ٹانگ زخمی کر دی۔

باجہ ایک کراہ کے ساتھ گرا۔ ریوالور اب بھی اس کے

باجہ ایک کراہ کے ساتھ گرا۔ ریوالور اب بھی اس کے

باجہ ایک کراہ کے ساتھ گرا۔ ریوالور اب بھی اس کے

پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپ کو تمام ڈائجسٹ

ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ

آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ

لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>

اب شوکت باجوہ کی صرف ٹانگ سے ہی نہیں، دائیں ہاتھ سے بھی خون بہنے لگا تھا۔ اس کی بینڈیج کھل گئی تھی، خون فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔
”ایمبولینس منگوائیے!“ جعفری نے اسے جواب دیا اور پھر موبائل پر کسی سے کہا۔ ”اب ان چاروں کو گرفتار کر لو۔ پانچواں میرے ہاتھ لگ چکا ہے۔“

”آپ اب جائیں۔“ جعفری نے موبائل اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے رخسار سے کہا۔ ”رات بھر کی جاگی ہوئی ہیں۔ جا کر آرام کریں۔ مجھے تو ابھی یہاں خاموشی لگے گا۔“
رخسار کو اس دن شام کو موبائل پر جعفری سے معلوم ہو سکا کہ جسے گرفتار کیا گیا تھا، وہ پارکنز ہی تھا۔ چار دوسرے جاسوسوں کے ساتھ اسے یہاں بھیجا ہی اس لیے گیا تھا کہ وہ شوکت باجوہ سے حیرت انگیز طور پر مشابہت رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اصل شوکت باجوہ کو اغوا کر کے ہلاک کر دیا تھا اور اس کی لاش ایک گٹر میں بہا دی تھی۔
دوسرے مقامی لوگوں سے رابطہ رکھنے کے لیے وہ گل مچوں والا ماسک استعمال کرتا تھا۔
”بابر کے معاملے میں کیا رہے گا!“ رخسار نے پوچھا۔

”ان کا بیان میں کل لے سکوں گا لیکن اندازہ تو آپ بھی لگا سکتی ہیں کہ اس مقدمے میں ان کے خلاف کوئی شدید کارروائی غالباً ممکن نہیں ہوگی۔“
جعفری کی اس بات سے رخسار کو اتفاق تھا۔

دوسرے دن دوپہر کو رخسار اپنے والد کے ساتھ اسپتال میں بابر سے باتیں کر رہی تھی۔ سیف ہمدانی اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ وہاں پہنچنے والے تھے۔
”بابر!“ ڈی آئی جی کیف ہمدانی نے سنجیدگی سے کہا۔
”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تمہیں اپنے ملک کے سیاست دانوں سے سخت اختلاف ہے لیکن تمہیں ایسا کوئی کلام نہیں کرنا چاہیے جو تمہارے ملک کے لیے نقصان کا سبب بن جائے۔“
بابر نے نظریں جھکا لیں۔ رخسار خفیف سا مسکرا رہی تھی۔

”اور.....“ ڈی آئی جی نے کہا۔ ”میری بیٹی کو تو اس سے کوئی غرض ہی نہیں کہ تم دولت مند ہو یا نہیں!“
بات بالکل صاف تھی، رخسار جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب گئی اور اس کا پردہ درست کرنے لگی۔

ہاتھ میں تھا لیکن دوسرے ہل وہ اس سے محروم ہو گیا کیونکہ جعفری نے اس کے ہاتھ پر بہت زور سے ٹھوکر ماری تھی۔
باجوہ جہاں گرا تھا، وہیں پڑا رہ گیا۔ زخمی ٹانگ کی وجہ سے اس کے لیے کھڑا ہونا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کا ڈریسنگ کیا ہوا ہاتھ بھی گردن سے لٹکی ہوئی سے نکل کر فرش سے ٹکرا گیا تھا۔
اذیت اس کے چہرے پر صاف دکھائی دی تھی لیکن اس نے دانت بچھنچھ کر خود کو کراہنے سے بھی باز رکھا تھا۔
میجر نے دونوں اہلکاروں کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔ ”اب اگر یہ کوئی غلط حرکت کرے تو گولیوں سے اس کی ٹانگیں چھلنی کر دینا۔“

رخسار نے جعفری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کو دیکھتے ہی مجھے خفیف سا احساس ہوا تھا کہ یہ پارکنز سے مشابہت رکھتا ہے۔ اگر اس کے چہرے پر گل مچھے اور بال بڑے بڑے اور بھورے ہوں تو اس میں اور پارکنز میں صرف آنکھوں کی رنگت کا فرق رہ جائے گا۔“
”گل مچھے تو یہ رہے۔“ جعفری نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک ماسک نکال کر دکھایا جس میں بھورے رنگ کے گل مچھے لگے ہوئے تھے۔

”بالوں کے لیے یہ دگ استعمال کرتا ہوگا۔“ جعفری نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ”یہ مجھے ایک کمرے سے ملے ہیں جو اس کا بیڈروم ہو سکتا ہے۔ دگ بھی وہیں کہیں مل جائے گی۔ وہاں سے مجھے وہ ہارڈسک بھی مل گئی ہے جو کل رات گر دیزی کے گھر سے چوری کی گئی ہے۔ ریجنر زان چیزوں کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ میں اسی خیال سے تلاشی کی مہم میں شامل ہوا تھا۔“

”مگر اس کی آنکھوں کا رنگ؟“
”یہ کنٹیکٹ لینس ہو سکتے ہیں۔“
میجر آگے بڑھا اور فرش پر پڑے ہوئے باجوہ پر جھکا۔ اسی نے تصدیق کی کہ باجوہ لینس لگائے ہوئے تھا۔
”لیکن یہ شوکت باجوہ ہے یا پارکنز؟“ رخسار بولی۔
جعفری نے سوالیہ نظروں سے باجوہ کی طرف دیکھا تو باجوہ نے اپنے ہونٹ سختی سے بند کر کے گویا اشارہ دیا کہ وہ کچھ نہیں بتائے گا۔

”زبان تو تمہارے فرشتے بھی کھولیں گے۔“ جعفری نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے حقارت سے کہا۔ وہ اس وقت اپنے موبائل پر کسی سے رابطہ کر رہا تھا۔
”اب اس کا کیا کرنا ہے سر؟“ میجر نے جعفری سے پوچھا۔